فہرست تصاویر

نمبر شمار	اسمائے اشخاص		حوالۂ صفحہ وغیرہ
۱	شہید ادب پنڈت سندر نراین مشران	...	اندرونی سرورق کے بعد
۲	عکس تحریر شہید ادب	...	تصویر نمبر ۱ کی پشت پر
۳	شاعر آل محمد نسیم امروہوی	...	عکس تحریر شہید ادب کے بعد
۴	خدائے سخن میر ببر علی انیس	...	صفحہ ۱۸ کے بعد
۵	آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو	...	صفحہ ۲۵ سے پہلے
۶	رائے بہادر پنڈت راج ناتھ "صاحب"	...	صفحہ ۳۰ کے بعد
۷	سر سید اعظم	...	صفحہ ۳۴ کے بعد
۸	رائے پنڈت اندر نراین	...	صفحہ ۴۶ کے بعد
۹	مس ایڈگر	...	صفحہ ۵۸ کے بعد
۱۰	رائے بہادر بابو درگا پرشاد	...	صفحہ ۸۸ کے بعد
۱۱	مسٹر گوکھلے	...	صفحہ ۱۱۹ سے پہلے
۱۲	پنڈت بشن نراین در	...	صفحہ ۱۲۳ کے بعد
۱۳	سر- سی- وائی- چنتامنی	...	صفحہ ۲۲۸ کے بعد
۱۴	پنڈت موتی لال نہرو	...	صفحہ ۲۳۹ سے پہلے
۱۵	مہاتما گاندھی	...	صفحہ ۲۵۸ کے بعد
۱۶	پبلک لیبریری فرخ آباد	...	صفحہ ۳۱۹ سے پہلے

خطباتِ مُشران

شہید ادب جناب پنڈت سندر نراین صاحب مشران فرخ آبادی

ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن)

کے

خطبوں اور تقریروں کا مجموعہ

مع مقدمہ وغیرہ

نوشتہ شاعر آل محمد جناب نسیم صاحب امروہوی

ہیڈ مولوی نیشنل ہائی اسکول لکھنؤ

ناشر و مولف

پنڈت جگموہن نراین مُشران ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج یو۔ پی

سنہ ۱۹۴۲ء

سندر نراین مشران کی یاد میں

حسب ذیل اشعار بتاریخ ۷ ارجنوری ۱۹۳۷ء فرخ آباد کے جلسہ ماتمی میں پڑھے گئے اور "مجیب" کے مشران نمبر میں شائع ہوئے

آہ اے سندر نراین مایۂ علم و ادب — فرخ آباد آپ کے غم میں نہ ہو کیوں سوگوار
آپ کی ہر بات تھی آئینۂ تہذیب شرق — تیوروں سے آپ کے شانِ شرافت آشکار
آپ کی شیریں زبانی آپ کا حسن بیاں — جس سے دو باتیں بھی کرلیں ہوگیا دل سے نثار
شوکت و حشمت نمایاں آپ کے چہرے سے تھی — صدرِ ہر محفل نظر آتا تھا مشراں کا وقار
قوم کی اصلاح ہو یا ملک و ملت کی فلاح — آپ کی ہستی پہ تھا ہر کام کا دار و مدار
اتحاد مسلم و ہندو کے حامی با خلوص — مونس ہر رنج و غم ہمدردِ ملت غمگسار
ایک شعر و شاعری کیا، علم کی ہر بزم میں — آپ کی ذات گرامی تھی ہمارا اعتبار
کہہ رہی ہے آج پبلک لیبریری شہر سے — میں بھی ہوں سندر نراین جی کی زندہ یادگار
چل بسے بزم سخن میں خطبہ پڑھتے پڑھتے آہ — ہے یہ ایسی موت جس پر زندگانی بھی نثار
علم کی خدمت کا شوق اتنا تو ہو ایسا تو ہو — علم کی خدمت ہی میں رخصت ہو جان بیقرار

فکر تھی تاریخ رحلت کی کہ ہاتف نے کہا
ہاں یہی ہستی عالی تھی ادب کی یادگار

حفیظ مجیبی

۱۳۵۵ھ

ماخوذ از مشران نمبر اخبار مجیب فرخ آباد

دیدہ و دل کو غمِ مشران خوں رُلوائے گا — ایسا لعل بے بہا اب ہاتھ کیونکر آئے گا
کیا خبر تھی دورِ گردوں یہ سماں دکھلائے گا — دفترِ علم و ادب گنگا پہ پھُونکا جائے گا

اک ادیبِ نکتہ داں سے شہر خالی ہوگیا
گوہرِ یکتا بھری محفل میں گر کر کھو گیا

۱۲ جنوری ۱۹۳۷ء برنگ — حفیظ سہیمی

سال وفات
سنہ ۱۳۵۵ھ

سنہ ۱۹۳۷ عیسوی



شبیہ شہیدِ ادب پنڈت سندر نراین مشران مرحوم

قطعہ تاریخ وفات از جناب نسیم صاحب

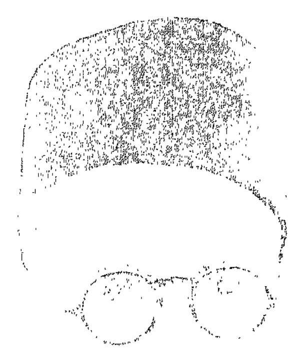
اُف علم و ادب کے گلشن کا، وہ سُندر غنچہ ٹوٹ گیا — اس دور میں جس کے دم سے تھا، کشمیر کا تازہ نخلِ امل
کیا خوب کہا سبحان اللہ تاریخ کا مصرع ہاتف نے
جب بزمِ سخن ہو بے مشراں، پھر تیغِ ادب ہے بے صیقل

۱۱۸۷=۲۳۰ – ۱۴۱۷   ۱۶۸=۵۹۱ – ۷۵۹

سنہ ۱۳۵۵ھ = ۱۱۸۷ + ۱۶۸

عکسِ تحریر شہید ادب

تھا اور آسمان نیلگوں شامیانہ تانے ہوئے تھا۔ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اور پہاڑوں کے آبشاروں کی آوازیں
دور کے نغموں کی طرح خوش کر رہی تھیں۔ آئینہ جلوہ ہوتی تھی سے کشیدہ سر بسر کوہسار سے۔ زرد گوں لب طلے مرغزار سے بہ بہر جا سبزہ از کاکر
و میوہ۔ رخ خوباں پہ بیشتر خط کشیدہ بہ عذارش آب و رنگِ چہرہ گل۔ گیسوئے دلربائے زلف سنبل۔ یہ معلوم ہوتا تھا
کہ قوم میدان جنگ کو سجتی جا رہی ہے بلکہ کوئی بڑی خوشی کا جلسہ ہے جس میں شرکت کے لیے کیواسطے لوگ تصویر اڑا رہے ان کے اسفند تری ہیں
اور اس شاندار اور دلچسپ مقام میں جمع ہو گئے ہیں۔ تمام شہر کو یوں خوشنما جھنڈیوں سے سجایا تھا اور جا بجا برطانیہ فرانس اور
بلجیم کے نشان اور جھنڈے لہرا رہے تھے۔ فرنچ فوج جب بلجیم کے میدان جنگ میں جانے کے لیے طیار ہوئی تو سپاہیوں کا
جوش یا یقین۔ اور ہوا یہ اپنی جنگی آنکھوں سے فخریہ خوش اور جدائی کے سبب آنسو بھر رہے تھے اور سپاہیوں کے بوسے
لیتی تھیں گویا انکو رخصت کرتی تھیں۔ برٹش فوج مع فرنچ فوج کے ۱۳ اگست کو بلجیم روانہ ہوئی اور دوسرے دن تک یہ
فوجیں اسی طرح روانہ ہوتی رہیں۔ لوگ انکو دیکھ کر کہتے تھے کہ ایسے گرانڈیل خوبصورت چست و چالاک تنومند اور
مضبوط جوان لڑائی پر جا رہے ہیں اسکو فال نیک سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت فوج بلجیم روانہ ہوئی تو شہنشاہ جارج پنجم کا ایک شاہی خط بمقام Southampton
میں فوج کو سنایا گیا جو حسب ذیل تھا "You are leaving home for the safety
& honour of my Empire. Belgium, which country we are
pledged to defend has been attacked, and France is
about to be invaded by the same powerful
foe. I have implicit confidence in you, my soldiers.
Duty is your watchword & I know your duty will be
nobly done. I shall follow your every movement
with the deepest interest, and mark with eager
satisfaction your daily progress. Indeed your
welfare will never be absent from my



شاعرِ آلِ محمدؐ نسیم امروہوی
جنہوں نے زیرِ نظر خطبات پر ایک بسیط عالمانہ مقدمہ تحریر فرمایا

فہرست مضامین

نمبر	عنوان	صفحہ
	اعتذار از مولف	
	ریویو از جناب ڈاکٹر وحید مرزا صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی)	
	ریویو از اخبار جدت وغیرہ	
	تنقید منظوم مشتمل بر تاریخ طبع و اشاعت	
	مقدمہ از جناب نسیم صاحب	۳ تا ۴۲
	خطبات	
۱	عقیدت کے پھول	۱
۲	شعراء کا خیر مقدم اور شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ	۴
۳	وداعی تقریر	۲۱
۴	تعزیتی تقریر	۲۵
۵	وداعیہ خطبہ	۳۰
۶	سرسید میموریل فنڈ	۳۴
۷	قیصرۂ ہند کو مبارکباد	۴۱
۸	رخصتی تقریر	۴۶
۹	ملکہ وکٹوریہ کا ماتم	۵۰
۱۰	ایک یتیم خانے کی امداد کے لیے اپیل	۵۴
۱۱	ایک تھیاسوفسٹ مس صاحبہ کا تعارف	۵۸
۱۲	جلسہ تقسیم انعام میں صدر و حاضرین کا شکریہ	۶۰
۱۳	محفل مشاعرہ میں حاضرین کی ضیافت طبع	۶۲
۱۴	طاعون سے بچنے کی تدابیر	۶۸
۱۵	دسہرا	۷۸
۱۶	علمائے اسلام کا شکریہ	۸۴
۱۷	تقریر تعزیت	۸۸
۱۸	ایڈورڈ ہفتم کی وفات	۹۲
۱۹	ہندو کالج کے لیے چندہ کی اپیل	۱۰۹
۲۰	ایمبولینس ایسوسی ایشن پر ایک نظر	۹۷
۲۱	جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تکالیف	۱۰۲
۲۲	گوکھلے کا غم	۱۱۹
۲۳	بشن نراین در کا ماتم	۱۲۴
۲۴	یورپ کی جنگ عظیم پر پہلا لکچر (زبانی)	۱۲۸
۲۵	〃 〃 〃 〃 (تحریری)	۱۳۶
۲۶	یورپ کی جنگ عظیم پر دوسرا لکچر (زبانی)	۱۶۴
۲۷	〃 〃 〃 〃 (تحریری)	۱۷۰
۲۸	〃 〃 〃 تیسرا لکچر (〃)	۲۰۱
۲۹	جنگ عظیم میں برطانیہ کی فتح	۲۱۲
۳۰	مسٹر چنتامنی کی ایک تحریک کی تائید	۲۲۸
۳۱	مسیحی جماعت اور مقررین کا شکریہ	۲۳۱
۳۲	ایک قطعہ تہنیت کی جوابی تقریر	۲۳۵
۳۳	قحط سالی میں غربا کی امداد	۲۳۸
۳۴	شفاخانے کے لیے چندہ کی اپیل	۲۴۴
۳۵	موتی کی خدمت میں خیر مقدم کے ہار	۲۴۹
۳۶	مصطفےٰ کمال کی فتح	۲۵۱
۳۷	گاندھی جنم دن	۲۵۸
۳۸	سوامی پورنانند جی کا تعارف	۲۷۰
۳۹	ایک کتب خانے کی امدادی رقم میں اضافہ کی تحریک	۲۷۸
۴۰	تقسیم انعام کے بعد!	۲۸۱
۴۱	ہندو مسلم اتحاد	۲۸۴
۴۲	عید اضحیٰ	۲۸۸
۴۳	حاضرین مشاعرہ کا خیر مقدم	۲۹۰
۴۴	آداب شاعری اور حالات شعراء	۲۹۰
۴۵	سارداِبل	۳۰۶
۴۶	رامائن پر ایک نظر	۳۱۶
۴۷	سپاسنامہ اور جواب سپاسنامہ	۳۱۹
۴۸	موسیقی کانفرنس کا پہلا اجلاس	۳۲۷
۴۹	موسیقی کانفرنس کا دوسرا اجلاس	۳۳۱
۵۰	نویک سدھا رسمتی	۳۳۷
۵۱	سیرۃ النبی	۳۴۴
۵۲	تھیوزافیکل سوسائٹی کی ڈائمنڈ جوبلی	۳۵۱
۵۳	آموں کی نمائش	۳۵۸

اعتذار

ہزار ہزار شکر اُس خداوند کا ہے جس کے فضل و کرم سے جناب والد مرحوم اعلی اللہ مقامہ کے خطبات جن کو دور حاضر کے ادیب اردو زبان میں ایک گرانقدر علمی و ادبی خزانہ خیال[لہ] فرما رہے ہیں، شائع ہو گئے۔

میری دلی خواہش تو یہ تھی کہ جس طرح یہ خطبات مطالب و معانی کے باطنی محاسن سے آراستہ ہیں، اسی طرح میں ان کو طباعت و کتابت کی ظاہری خوشنمائیوں اور رعنائیوں سے پیراستہ کر دوں، مگر افسوس ہے کہ ایک معقول رقم خرچ کرنے کے باوجود نہ چھپنے کی ایسی سیاہی دستیاب ہوئی اور نہ ولیسا کاغذ ہاتھ آیا، جس کی وجہ سے حسب دلخواہ آب و تاب اس کتاب میں پیدا نہ ہو سکی۔ اُمید ہے کہ ناظرین باتمکین اس باب میں مجھ کو قاصر سمجھیں گے نہ کہ مقصر۔

میری عمر کا زیادہ حصہ ملازمت میں صرف ہوا ہے اور تصنیف و تالیف کے کوچہ سے نابلد رہا ہوں۔ یقیناً ان جواہرات کی ترتیب و تالیف میں بہت سے نقائص رہ گئے ہوں گے، مگر اُمید ہے کہ ارباب نظر ان کو نظر انداز فرما کر میرے اعترافِ خطا ہی کو نقصانوں کا کفارہ سمجھیں گے۔

خاکسار
جگموہن نراین مشران

لہ دیکھیے مقدمہ و ریویو ۱۲

خطباتِ مشران پر ریویو

(۱)

از عالیجناب ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ السنہ مشرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی

پنڈت سندر نراین مشران صاحب کے ان خطبات کا مجموعہ جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف علمی اور ادبی مجلسوں میں پڑھے اس وقت میرے پیش نظر ہے اور مجھے یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ ادبی، اخلاقی اور معاشرتی پہلوؤں سے یہ خطبات بہت ہی قابل قدر ہیں۔ زبان اردو سے جو خصوصیت کشمیری پنڈتوں کو رہی ہے وہ سب کو بخوبی معلوم ہے اور کون ہے جو پنڈت رتن ناتھ سرشار یا چکبست کے نام سے واقف نہیں اور اُردو ادب پر ان کے گوناگوں احسانات کا معترف نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اُردو کو ہمیشہ اپنی زبان سمجھا اور اپنی قوت تخئیل اور تازگی خیالات سے اس زبان کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ کشمیر کے سرسبز مرغزار، وہاں کے سیم پاش چشمے اور چناروں کے زیر سایہ خوابیدہ نیلگوں جھیلیں، جہاں اپنے باشندوں کے حسن جسمانی کی آئینہ دار ہیں وہاں ان کی شگفتگی طبیعت، خوش طبعی اور حسن مذاق کی بھی ضامن ہیں اور اسی لیے ادب اردو کا وہ حصۂ نظم و نثر جو ان انشا پردازوں کے سحر قلم کا رہین منت ہے، بعض ایسی خصوصیات رکھتا ہے جو ہر طرح قابل قدر و ستایش ہیں۔

عام طور پر خطبوں کو کوئی علمی یا ادبی رتبہ حاصل نہیں ہوتا اس لیے کہ خطبے ایک وقتی ضرورت اور ایک عارضی ماحول کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ اُن کا زیادہ تر مقصد یہ ہوتا ہے کہ سامعین کے جذبات پر اثر ڈالا جائے اور چونکہ خطیب کو اس کا احساس رہتا ہے کہ "دو بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی" بلکہ وہ جانتا ہے کہ تماشائی عام طور پر اہل نظر سے ایسے موقعوں پر زیادہ ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے خطبے میں "سخن آرائی" کی طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے اور تحقیق علمی سے تساہل برتتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب خطبے اسی قسم کے ہوتے ہیں اور انہی ممتاز اور متثنیٰ خطبوں میں پنڈت مشران صاحب کے خطبے بھی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ان کی وسعت نظر اور گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ ایک شخص کس طرح ایسے مختلف مضامین اور متنوع فنون پر ایسی قدرت رکھ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے دو خطبوں کو لیجیے جن میں انھوں نے شعر و شاعری کے موضوع سے بحث کی ہے۔ جن لوگوں نے مولانا شبلی کی تصنیف شعرالعجم میں اس مضمون کو پڑھا ہے اُنھیں مشران صاحب کے خطبے پڑھنے میں ایک خاص لطف حاصل ہوگا، اس لیے کہ اگرچہ مضمون ایک ہی ہے لیکن طرز بیان مختلف ہے اور مشران صاحب نے ایک نئے اور دلچسپ پیرایے میں استدلال کیا ہے۔ جا بجا جو منتخب اشعار انیس، قاآنی، فردوسی اور نظامی وغیرہ کے کلام سے دیے گئے ہیں ان سے پنڈت صاحب کے ذوق سخن اور پاکیزگی مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی طرح ایک اور خطبے میں آپ نے سیرت رسول صلعم پر طبع آزمائی کی ہے جس تحقیق اور تدقیق سے آپ نے یہ مضمون لکھا ہے وہ واقعی حیرت انگیز ہے اور کسی غیر مسلم سے یہ توقع کم ہو سکتی ہے کہ وہ اس موضوع پر اس خوش اسلوبی

سے لکھ سکے۔ اس خطبے میں دو باتیں صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مشران صاحب جہاں اور علوم و فنون میں کامل دسترس رکھتے تھے وہاں اسلام اور اسلامیات سے بھی بخوبی واقف تھے اور دوسرے یہ کہ وہ اس مذہبی تعصب سے بالکل بری تھے جو بدقسمتی سے آج کل بہت عام ہو گیا ہے۔ حقیقی علم وہی ہے جو تنگ ظرفی اور جاہلانہ تعصب سے بالاتر ہو۔ وسعت نظر کے ساتھ ایک عالم ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے جو نوع انسانی کو مذہبی یا معاشرتی تعصبات کی زنجیروں میں باندھے رکھتی ہیں اور سچائی کی تلاش میں وہ کفر و ایمان کی تفریق اصطلاحی کو بھول جاتا ہے۔ مشران صاحب کے اس خطبے کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ اُن کا علم اسی بلند پائے کا تھا۔

یہ امر بہت قابل امتنان ہے کہ مشران صاحب کے پراگندہ خطبوں کو جمع کرنے کا کام بعض اہل ادب کی سعی سے تکمیل کو پہونچ چکا ہے اور عنقریب وہ ناقدان علم و ہنر کے سامنے جلوہ گر ہو کر اس خراج تحسین و آفرین کو وصول کر سکیں گے جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق ہیں۔

(۲)

از اخبار جدت

آنجہانی پنڈت سندر نراین مشران فرخ آباد کے مشہور و معزز رئیس تھے۔ بلند پایہ علمی و ادبی ذوق آپ کی زندگی کی نمایاں خصوصیات میں سے تھا۔ پنڈت جی کو اُردو کی ترویج و ترقی سے غیر معمولی دلچسپی اور عربی و فارسی ادب پر عالمانہ عبور حاصل تھا۔ ہمیں یہ معلوم ہو کر انتہائی مسرت ہوئی کہ موصوف کے علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی خطبات کا ایک شاندار مجموعہ پنڈت جی کے خلف الصدق جناب پنڈت جگموہن نراین مشران صاحب کی زیر نگرانی (مع مقدمہ نسیم الشعرا جناب مولوی قائم رضا صاحب نسیم مدظلہ جانشین فرزدق ہند حضرت شمیم مرحوم اعلی اللہ مقامہ) طباعت و ترتیب وغیرہ کی تمام رعنائیوں کے ساتھ زیر تکمیل ہے۔ ہمارے مجموعہ علوم و فنون میں علمی خطبات کی صنف بہت حد تک تشنہ تکمیل ہے۔ جبکہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں اس صنف کے ماتحت اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں اور مجموعے موجود ہیں۔ اُمید ہے کہ خطبات مشران اس کمی کی تلافی کر دیں گے۔ یہ خطبات، علم و ادب، تاریخ و سیاست، شعر و سخن اور تحقیق و بصیرت کے ہر شعبہ کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ ان کی زبان نہایت سلیس و رواں اور انداز بیان نہایت دلچسپ و خوشگوار ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کے متعلق جتنے خطبات ہیں ان کا مطالعہ یورپ کی موجودہ سیاسی حالت کے پیش نظر ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اُردو ادبیات کے متعلق بھی موصوف نے اپنے خطبات میں بیش قیمت مواد پیش کیا ہے۔ بہرحال ان خطبات کی تکمیل اُردو ادب کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

ہم خطبات مشران کی پیشکش پر تمام اہل علم حضرات کی طرف سے موصوف کے حقیقی جانشین پنڈت جگموہن نراین صاحب مشران کو مبارکباد دیتے ہیں۔

از مخبر عالم

اردو ادب میں علمی و ادبی خطبات کی کمی ہمیشہ محسوس کی گئی ہے۔ ہمارے ادب میں خطبات کے نام سے جس قدر لٹریچر پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر مذہبی مواعظ و خطبات پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں علمی و ادبی موضوعات پر خطبات کے صدہا مجموعے موجود ہیں۔ تمام بہی خواہان اُردو کو اس خبر سے مسرت ہوگی کہ آخر ادب اُردو کی اس کمی کی تلافی ہونے والی ہے اور فرخ آباد کے مشہور رئیس اعظم علم دوست، ادب نواز، وسیع النظر اور تحقیق پسند بزرگ، آنجہانی جناب پنڈت سندر نراین صاحب مشران کے علمی خطبات کا مجموعہ موصوف کے خلف الرشید جناب پنڈت جگموہن نراین صاحب مشران کی ادب نوازی اور علمی دلچسپی کی بدولت منظر عام پر آنے والا ہے۔ سورگباشی پنڈت سندر نراین صاحب مشران کے خطبات ادب اُردو کی دنیا میں ایک گرانقدر اور بیش بہا اضافہ ہیں۔ سیاست، تاریخ، ادب، معاشرت، فنون لطیفہ، شاعری، فلسفہ اور قومی زندگی کے بہت سے مسائل و معاملات پر اِن خطبات میں روشنی ڈالی گئی ہے اور نہایت تحقیق و وضاحت کے ساتھ خطبات کی شکل میں ان کو پیش کیا گیا ہے۔ خطبات مشران کی دلکش خصوصیت ان کا انداز بیان ہے۔ پنڈت جی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ جس بات کو کہتے تھے غالب کے اس شعر کی تفسیر کر دیتے تھے کہ ؎

دیکھیے تقریر کی خوبی کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

امید ہے کہ خطبات مشران کا یہ بلند پایہ مجموعہ اُردو دنیا میں غیر معمولی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے گا اور ارباب علم و ادب اس سے خاطر خواہ فوائد حاصل کریں گے۔ ہم اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین اور تحریک و اہتمام کے لئے پنڈت جی کے خلف الرشید عالی جناب پنڈت جگموہن نراین صاحب مشران کی اولوالعزمی اور علم نوازی اور سرگرمی و دلچسپی کے شکرگذار ہیں اور یہ شکریہ تمام دنیائے اُردو کی طرف سے ہے۔

تنقید منظوم مشتمل بر تاریخ طبع و اشاعت

از جناب رئیس التحریر مولانا محمد مہدی صاحب رئیس ایڈیٹر رسالہ مسافر

میں کیوں اپنی حالت پہ ہوں اشک افشاں   مرا عہد ماضی ہے اب تک درخشاں
زمانہ کہاں تک بھلائے گا آخر   مرے عصر اقبال کے ساز و ساماں
زمانے میں میرے وطن کے مقابل   نہ آشور و بابل نہ مصر اور یوناں
ہمالہ کے کہسار پر پہلے چمکی   نظام تمدن کی صبح درخشاں
ہے آئینہ اک میری طبع رواں کا   یہ گنگا یہ سرچشمۂ علم و عرفاں
یہیں آریوں نے وہ دنیا بسائی   کہ ہیں جس کے آثار اب تک نمایاں
یہیں فن نغمہ نے بنسی بجائی   یہیں علم و حکمت کے مہکے گلستاں
یہیں طب نے امرت کے دریا بہائے   ہوا تندرستی و صحت کا ساماں
یہیں آنکھ پہلے تصوف نے کھولی   یہیں سے گیا قرب خالق میں انساں
یہیں گل کھلائے ریاضی نے دل   کیا جس میں ہیئت نے آکر چراغاں
غرض میرا ماضی ہے وہ عہد زریں   کہ جس پر ہے تاریخ اقوام نازاں
اسی سرزمیں کی زیارت کی خاطر   بہت دور سے چل کر آئے مسلماں
ہوا گنگ و دجلہ کا وہ پاک سنگم   اٹھے جس سے ملک ترقی کے طوفاں
بڑھا اس قدر ربط شیخ و برہمن   ہوئے کعبہ و دیر دو جسم و یک جاں
خصوصاً وہ گھل مل گئیں دو زبانیں   ہوئے ایک بولی میں ہندی غزلخواں
نئے زمزموں سے چمن گونج اٹھا   ہوئے ہمنوا ساکنان گلستاں
نشانی اسی زندگی کی ہے اردو   ہے ملک و ملت کی جو فخر ساماں
سخن سنج پیدا ہوئے کیسے کیسے   ہے علم و ادب جن کا ممنون احساں
ولی میر آزاد چکبست غالب   رتن ناتھ شبلی سخن رس سخنداں
غرض بزم اردو سجی اس ادا سے   نظر جس نے ڈالی ہوا دل سے قرباں

انہی میں سے تھے مرحوم سندر نراین   خطیب سخنور ادیب سخنداں
وہ نثر ادب کے حقیقی محافظ   وسیع النظر صاحب علم و عرفاں
کہیں نثر میں نظم کی سی سلاست   کہیں نظم میں نثر کا رابط و عنواں
کہیں فن منطق کی جادو بیانی   کہیں فلسفہ کے وہ اسرار پنہاں
کہیں علم تاریخ کی نکتہ سنجی   کہیں شان تحقیق، حکمت کے شایاں
ادب کا سیاست کا شعر و سخن کا   مکمل نمونہ ہیں خطبات شیراں
عرب کے لیے تھا سحبان وائل   ہمارے لیے آپ تھے تیغ سحباں
دم نطق موتی برستے تھے گویا   گہر بار ہو جس طرح ابر نیساں
زہے حسن تقریر و شان خطابت   فصاحت بھی صدقے بلاغت بھی قرباں
خوشا لذت نثر و شان تکلم   کہ تھا سامعہ اپنی قسمت پہ نازاں
وہ زریں مقالے وہ دلچسپ خطبے   مطالب کے دفتر معانی کے دیواں
وہ پند و نصائح کا اسلوب دلکش   کہ ہو عالم و جاہل [illegible]
تکلف سے پرہیز حسب ضرورت   حقیقت کا اظہار تا حد امکاں
سخن سنجیوں پر ہمیشہ توجہ   سخن پروری سے ہمیشہ گریزاں
کہیں دین و مذہب کے نازک لطائف   کہیں علم و حکمت کے اسرار پنہاں
رموز و مطالب کا پیرایہ نو   بیان و ادا کا نیا طرز و عنواں
غرض ہیں یہ خطبات رنگین اردو   ادب کے چمن میں بہار گل افشاں
رئیس [illegible] یہ تالیف زریں   رئیس [illegible] یہ ترتیب دیواں
طباعت کا میں نے سنا جبکہ مژدہ   ہوا بہر تاریخ سر در گریباں
پکارا یہ ہاتف بصد شان و شوکت   ہیں خطبات یا دُرّ کان فصاحت

۱۹۴۲ء

مقدمه

مقدمہ

پنڈت سندر نراین مُشران مرحوم کے خطبات پر مقدمہ کی حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر مشکل ہے، اس کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جس کی طبع رسا، ان بلند پایہ خطبات کی علمی اور ادبی گہرائیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہ خطبات، جو معاشرت، ادب، تاریخ، سیاست اور علم و حکمت کے مختلف اور بیشتر شعبوں پر حاوی ہیں، اپنے تعارف و تبصرہ کے لئے ایک فکر نکتہ رس اور طبع نقاد کے محتاج ہیں۔ مشہور ہے کہ جب گبن نے اپنی مشہور تاریخ "عروج و زوال روما" لکھ کر ختم کی تھی تو اس نے جوش مسرت میں مفتخرانہ انداز سے کہا تھا:۔

"میں اپنی کتاب کے لئے مقدمہ نویس کہاں سے لاؤں"

گبن نے ان چند لفظوں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری تصنیف جس پایہ کی ہے، اس کے شایان شان مقدمہ لکھنے والا صفحۂ ارض پر کوئی موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ گبن کو اپنی تاریخ کے لیے کوئی ایسا مقدمہ نویس مل جاتا جو اس کے معیار علم و تنقید پر پورا اترتا، لیکن جہاں تک خطباتِ مشران کی بلند پایگی اور ادبی قدر و قیمت کا تعلق ہے، یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ قلم جو کہ ان خطبات کی حقیقی اہمیت کو واضح کر سکے، کم سے کم اس شخص کے پاس نہیں ہے، جو اس وقت اس سلسلہ میں خامہ فرسائی کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ یہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ خطبات مشران پر کچھ لکھنا آسان نہیں۔ ان خطبوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایک نظر غائر اور فکر جامع کا محتاج ہے۔ اول تو ادبیات میں "خطبہ" یوں ہی ایک مشکل ترین اور جامع ترین صنعت ہے اور پھر اس صنف ادب کی خصوصیات کو علمی اصول پر بیان کرنا اور اس کی تمام وسعتوں کو چند سطروں میں سمیٹ کر کسی خطیب کے خطبوں کی ادبی اور علمی خوبیوں پر روشنی ڈالنا اس قدر دشوار اور جامعیت طلب ہے جس کی حد و انتہا نہیں۔

پنڈت جی کے خطبات علم و ادب، تاریخ و سیاست، تمدن و معاشرت اور نفسیات کے بیشمار اور اہم ترین مسائل پر مشتمل ہیں، جن سے اس مجموعے میں ایک مستقل علمی تصنیف کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ موصوف نے جس موضوع کو بھی لیا ہے اس کی جزئی تفصیلات تک بیان کر دی ہیں۔ درحقیقت ان کا ہر خطبہ بجائے خود ایک معنی خیز مقالہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مقالہ نگار اپنے خیالات کو پہلے قلمبند کر لیتا ہے پھر منظر عام پر لاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک خطیب اپنے دلائل کو زبانی بیان کرتا ہے اور ادائے ما فی الضمیر میں زبان قلم کی ترجمانی کا محتاج نہیں ہوتا۔ مقالہ نگار اظہار خیالات کے وقت آزاد ہوتا ہے۔ وہ ایک فقرہ لکھ کر ہزار بار مٹا سکتا ہے اور دس ہزار بار بنا سکتا ہے لیکن ایک خطیب کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔ وہ عوام کے مجمع میں گھرا ہوتا ہے۔ اس کے پاس اظہار و بیان کے لیے محدود وقت اور محدود گنجائش ہوتی ہے۔ اُسے اپنے دل، دماغ اور زبان تینوں اعضاء سے بیک وقت کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے پاس سوچنے کو وقت نہیں ہوتا اور نہ اثنائے تقریر میں اپنی یادداشت کو تازہ کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں خطبہ کی علمی شان قائم و برقرار رکھنا کس قدر مشکل ہے۔

زیر نظر خطبات وہ تقاریر ہیں جو پنڈت جی نے مختلف سیاسی، ادبی اور معاشرتی مجلسوں میں ارشاد فرمائیں اور اسی وقت ان کے کاتب خاص نے قلمبند کرلیں۔ وہ تقریر کرتے جاتے تھے اور کاتب لکھتا جاتا تھا۔ ایسا اتفاق بہت کم ہوا ہے کہ موصوف نے ان پر نظر ثانی کی زحمت گوارا فرمائی ہو۔ کل مجموعے میں صرف تین خطبے ایسے ہیں جو پہلے سے لکھے گئے تھے اور پنڈت جی نے جلسوں میں انھیں پڑھکر سنایا تھا۔ یہ تینوں خطبات گزشتہ جنگ عظیم کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ وہ سرتاسر تاریخی موضوعات تھے، متعدد ممالک کی جغرافیائی بری اور بحری پوزیشن سے بحث کرنا ان کے لئے ناگزیر تھا اور ملکی نظم ونسق کے اندرونی اسرار کا انکشاف بھی ضروری تھا اس لئے محض تقریر کے دامن میں ان کا سمانا امکان کے حدود سے باہر تھا۔ ان خطبات کے علاوہ بقیہ تمام خطبے وہ ہیں جو اظہار و بیان سے قبل قید تحریر میں نہیں آئے اور اس وقت لکھے گئے جبکہ وہ کسی جلسے میں ادا ہورہے تھے۔

خارج از موضوع نہ ہوگا اگر اس موقع پر صنف خطبہ و تقریر کے متعلق منطقیانہ زاویۂ نگاہ سے کچھ بیان کردیا جائے جس کے بعد ان خطبات کی اہمیت واضح ہونے کے مزید امکانات پیدا ہوجائیں گے۔ خطبہ کیا ہے — ؟ وہ تقریر جو کسی جلسے میں کی جائے۔ اس بیان کے مطابق فن تقریر و خطابت میں بظاہر کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا مگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تقریر اس بیان کو کہتے ہیں جو کسی جلسے یا صحبت میں کسی بھی موضوع یا مسئلہ پر ارادۃً دیا گیا ہو مگر خطبہ صرف وہی بیان ہے جو علمی مسائل کی تحقیق و تشریح کے لئے یا کسی موضوع کو عالمانہ لہجے اور انداز بیان میں سامعین کے ذہن نشین کرنے کے لئے کسی منبر یا پلیٹ فارم سے دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ تقریر میں یہ حدبندی نہیں ہوتی۔ گویا خطبہ و تقریر میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ اسی بات کو زیادہ واضح لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ صرف علمی تقاریر کو ہی خطبات کہا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں مقرر ہزاروں لاکھوں ہوتے ہیں مگر ان بیشمار مقرروں میں خطیب انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ مقرر اور خطیب میں وہی فرق ہے جو ایک مصنف اور محقق میں ہوتا ہے۔ اگرچہ محقق بھی اپنی تحقیقات کی تصنیف و تالیف کے اعتبار سے مصنف کہلاتا ہے مگر اس کا درجہ محض مصنف سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک خطیب بھی ایک مقرر سے اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے۔

خطبہ کی تعریف کے بعد سرسری طور سے یہ لکھدینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل و ابتدا کہاں سے ہوئی۔ درحقیقت خطبہ اُس عہد کی پیداوار ہے جب دنیا میں کتابوں کا رواج عام نہ تھا۔ اس لئے اُس عہد کے علماء و فضلا اپنی تحقیقات کو مستقل تصنیف و تحریر کی شکل میں پیش کرنے کے بجائے اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کردیتے تھے۔ گویا آج جس طرح درسگاہوں میں علمی مسائل پر لکچر دیے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح عہد قدیم میں خطبات کا رواج تھا۔ فرق یہ ہے کہ آج لکچر ایک اضافی چیز ہے' مگر اُس زمانے میں ایک خطبہ ہی سب کچھ ہوتا تھا اور تعلیم و تدریس کا واحد ذریعہ وہی تھا۔ اساتذہ اپنے شاگردوں سے مختلف موضوعات پر خطبے دلواتے تھے۔ یہ گویا ان کی علمی استعداد اور قابلیت کا امتحان ہوتا تھا۔ جوں جوں تحریر و کتابت کا رواج بڑھتا گیا، خطبات کی اہمیت و مقبولیت میں کمی آتی گئی — یونان علم و حکمت کا گھر تھا اور اسی لئے وہ اپنے خطباء کی جادو بیانی اور علمی عظمت کے لئے مشہور ہے۔ یونان کے بعد علمی دنیا میں روما کا نمبر آتا ہے۔ رومی خطیب بھی تاریخ میں غیر فانی ہستی رکھتے ہیں۔ مشرق میں عربی خطباء اپنی فصاحت و بلاغت کے لئے ضرب المثل ہیں، مگر عربی خطیبوں کی تقاریر میں (حضرت علیؑ کی نہج البلاغہ کے علاوہ) علمی مسائل کی اتنی فراوانی نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی خطباء صرف اپنی زبان دانی اور

قدرت کلام کا اظہار کرنے کے لیے منبر خطابت کو زیب دیتے تھے۔ عہد جدید میں خطابت کا رواج عام طور پر بہت کم ہے ہماری مراد ہندوستان سے ہے۔ ہندوستان میں مقرر بہت سے ہیں مگر خطبا کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اگر کچھ خطیب ہیں بھی تو ان کے خطبے بہت کم قید تحریر میں آئے ہیں۔ ہمارے ذخیرۂ علوم و مصنفات میں شمس العلما، مولوی نذیر احمد مرحوم اور سرسید عظیم کے خطبات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان میں اور خطبات مشران میں بیّن فرق ہے۔ وہ خطبے یا تو ایسے ہیں جو ادل مضمون نگاری کے اصول پر قلمبند کرلیے گئے، اس کے بعد مجلس میں پیش ہوئے یا اُن میں صرف تقریر کی شان ہے خطبہ کا انداز بیان نہیں، نیز ان میں خطبات مشران کی برابر تنوع موضوع بھی نہیں پایا جاتا۔ اس لئے ہم ہر دو مذکور الصدر حضرات کی خطابت کی جامعیت کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کرسکتے۔ ان دونوں بزرگوں کے علاوہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، کوئی مستقل اور اہتمم بالشان خطابیاتی مجموعہ اُردو میں مرتب نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے پنڈت جی کے خطبات کا مجموعہ اور بھی قابل قدر ہو جاتا ہے، کیونکہ اس مجموعے نے ہماری زبان میں ایک ایسی تالیف کا اضافہ کیا ہے جس کی ہم پایہ مؤلفات کی اردو ادب میں بہت کمی تھی اور اس کمی کے باعث ہمارا لٹریچر، روم و یونان و عرب کے ادبیات کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

اس زمانہ میں جبکہ بعض تنگ نظر حلقوں کی طرف سے زبان میں بھی فرقہ پرستی کے زہر کو داخل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مبارک ہیں وہ شخصیتیں اور وہ نفوس جو اپنی زبان اور اپنے ادب کی ترقی کے لئے بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی بہترین کوشش صرف کررہے ہیں۔ پنڈت جی کے خطبات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل علم و حکمت کے پہلو بہ پہلو ایسے ہی صدق و صفا کا مخزن تھا۔ عالم انسانیت کے بہترین حکیموں اور بلند نظر فلسفیوں کی طرح ان کی نگاہ، رنگ، نسل، خون، جغرافیہ، سماج اور قوم و ملت کی تمام حدبندیوں سے بالاتر تھی۔ وہ عربی و فارسی و انگریزی کے بہترین عالم تھے ان کو ادبی خدمات سے عشق تھا۔ انھوں نے ادب کے ہر شعبے میں کامل عبور اور حقیقی دستگاہ بہم پہنچائی تھی اور دماغ فلسفیانہ، زبان عارفانہ، فکر حکیمانہ اور دل شاعرانہ پایا تھا ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

ان کا مجموعۂ خطبات اکاون خطبوں اور تقریروں پر مشتمل ہے۔ اگر موضوع کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی جائے تو اس مجموعے میں ادبی، سیاسی، مذہبی، تاریخی، طبی، معاشرتی اور عام نوعیت کے خطبات ہیں۔ دو خطبے فن موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض خطبات کسی خاص تحریک یا تقریب کے سلسلے میں ہیں۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے لئے چندہ کی اپیل وغیرہ۔ بعض رخصتی تقاریر ہیں۔ بعض خطبے نیم سیاسی اور نیم تاریخی ہیں۔ جنگ عظیم کے موضوع پر جس قدر خطبے ہیں وہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں۔ بعض خطبے ایسے ہیں جن میں رہنمایان قوم و ملت یا بانیان مذاہب کے اوصاف حسنہ پر سبق آموز تبصرہ کرکے ایک خطیب کے فرائض انجام دیے ہیں جو کہ شاعر کے بعد سب سے پہلے اصلاح ملک و قوم کا فطری حق رکھتا ہے۔ اس مجموعے کو دیکھکر ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً پنڈت مشران اُن گرانمایہ قوم پرستوں میں سے تھے جو ہندوستان کی واحد قومیت، ہندوستان کے مشترکہ ادب اور ہندوستان کے تمدنی خصوصیات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ پنڈت جی کی شخصیت ہندو مسلم ملاپ کا ادبی اور انسانی سنگم تھی۔ اُن کے خطبات، اُن کی فراخدلی، صلح کل حکمت عملی اور انسانی عظمت و کمال کا گہرا اثر

قلب پرڈالتے ہیں، وہ ہماری اس ادبی تحریک کے علمبردار ہیں جو ہندو مسلم و دیگر اقوام ہند کی سوسائٹی کی مشترکہ ترقی اور ہم آہنگی کا نمایندہ ہے ـــــ وہ ادبی تحریک جس کا پودا ہند وعجم کی معتدل آب و ہوا میں نصب ہوا، مغل حکومت اور ہندی ریاستوں نے اس کی آبیاری کی، عوام نے بارآور کیا اور پنڈت جی کے ایسے نیک نفس اور عالی ظرف ادیبوں نے پروان چڑھایا۔

ہر زبان اور ادب کی تخلیق کسی نہ کسی تمدنی معاشرتی یا اور کسی نوع کے اعلیٰ ترین اور عظیم ترین عمرانی اور انقلابی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے ماتحت ہوا کرتی ہے اور اُس زبان کے ادبیات میں صرف وہی تصنیف ایک باوقار جگہ پانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے، جو اس مقصد سے بعید نہ ہو جائے۔ بنابریں یہ بیان کرنے سے پہلے کہ پنڈت جی کے خطبات میں کس حد تک یہ ادبی روح پائی جاتی ہے اور ان سے کس قدر وہ مقصد پورا ہوتا ہے جو اردو کی تخلیق میں مضمر تھا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اول اردو کی ابتدا اور نشوونما کے تاریخی مرقع پر ایک نظر ڈالی جائے اور اُردو ادب کے سماجی اور ذہنی پس منظر کو اوراُجاگر کر دیا جائے۔ یہ نہ صرف ایک دلچسپ علمی مشغلہ ہوگا بلکہ اس طرح ہم یہ بھی محسوس کریں گے کہ علم و ادب اور تمدن و تہذیب کی وہ کون سی فضا تھی جو پنڈت مشران جیسے قوم پرست ادیبوں کو پیدا کرتی تھی۔ اس اہم مسئلہ کا مختصر سا تذکرہ کرنے کے بعد ہم پنڈت جی کے زیرِ نظر خطبات کی ادبی اہمیت اور علمی پایگی کے متعلق اظہار خیال کریں گے اور بتائیں گے کہ اردو کے بازار میں، وہ کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

فرانس کے غیرفانی ادیب ژان ژاک روسو کا مقولہ ہے کہ:۔

"اگر تم کسی سوسائٹی کی دماغی اور تمدنی کیفیات کا صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہو تو اُس کے ادبی کارناموں کا مطالعہ کرو۔ یہ دیکھو کہ جس ادب کی وہ نمایندگی کرتی ہے وہ انقلاب و تغیر کے کتنے دوروں اور عہد و زمانہ کی کتنی گردشوں سے گذر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے۔ جب تم اُس کے ادب کے مختلف ادوار سے واقف ہو جاؤگے تو تمھیں اس سوسائٹی کی تاریخی رفتار اور تدریجی تبدیلیوں کا پتہ لگانے میں آسانی ہوگی۔"

ان لفظوں میں روسو نے ادب کو قوموں کی اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کی ذہنی کیفیت اور تدریجی ترقی کا معیار و مظہر قرار دیا ہے اور پھر ادب کی زبردست طاقتوں اور اس کے روحانی اور اخلاقی نتائج پر بحث کرتے ہوئے ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ:۔

"ادب انسانی تصور کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ ادب کے مندر میں انسانیت کی دیوی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ اپنے پجاریوں کو ذہن و دماغ اور علم و حکمت کی ایسی بلند ترین چوٹی پر لیجانا چاہتی ہے جہاں رنگ، نسل، خون اور وطن کے امتیازات مٹ جائیں اور انسان کاہنوں، مذہبی لیڈروں اور کلیسا کے علمبرداروں کی گرفت سے آزاد ہو کر حقیقی انسان بن سکے،

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مصنف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ:۔

"اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو نہ مذہب کے نام پر کبھی لڑائیاں ہوں اور نہ وطنیت کے لئے خانہ جنگیاں"

حقیقت بھی یہی ہے کہ ادب عالمگیر انسانی تصور کی نمایندگی کرتا ہے۔ وہ بین الاقوامیت کا ترجمان اور آزاد ضمیر و خیال کا نقیب ہے۔ حقیقی ادب وہی ہے جو اس معیار پر پورا اُترے اور حقیقی ادیب وہی ہے جو اس معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔

آئیے متذکرہ حقیقتوں اور سچائیوں کی روشنی میں ہم اپنے ادب کا جائزہ لیں۔

روسو نے لکھا ہے کہ ادب سوسائٹی کی ترقیوں اور سماجی تبدیلیوں کا آلۂ حرکت پیا ہے۔ ادب کی انسانی قدر و قیمت کے متعلق کہا گیا ہے کہ حقیقی ادب، حقیقی انسانیت کا ترجمان ہے اور اسی کے ذریعہ انسانیت کے مختلف اجزا کو ایک رشتہ اتحاد و اخوت میں پرو دیا جا سکتا ہے یعنی بین الاقوامی اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ادب اور صرف ادب ہے۔

ادبیات اردو کی تاریخ ظہور و آغاز، اس کی عہد بعہد تبدیلیوں اور ارتقائی مدارج پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو آسانی کے ساتھ ہم اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ سماجی ترقیوں اور متحدہ تہذیب و تمدن کی تشکیل و ترتیب کے مختلف مدارج میں کارفرما پا سکتے ہیں۔ اردو ہندو مسلم کی شہرۂ آفاق تہذیبوں کا ایک ذہنی و دماغی سنگم ہے۔ اردو کے حرف حرف اور نقطہ نقطہ پر ہندو مسلم اتحاد کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ درحقیقت اُردو کا ظہور ہی اس تاریخی ضرورت کے ماتحت ہوا کہ مسلم نو واردوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان کوئی مشترک رابطہ پیدا کیا جائے۔ قدرت نے ان تمدنی و معاشرتی ضروریات کی تکمیل کے لئے اردو کا سانچہ بنایا اور اگر ہم یہ کہیں تو بجا ہے کہ آج وہ مشترکہ قومیت جس پر ہم اس قدر نازاں ہیں ادب اور زبان کے اسی قدرتی سانچہ سے ڈھل کر نکلی ہے۔

جب مسلمان نو وارد کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تو ہر قدم پر مہمان اور میزبان کو اختلاف زبان و بیان کی دقتیں محسوس ہونے لگیں۔ ہندوستان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر قوم کو اپنا لیتا ہے اور پھر وہ قوم ہندوستان کی دوسری قوموں سے اس قدر گھل مل جاتی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی اور اپنے اور پرائے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ مسلمان ابتداً ہندوستان کے لئے اجنبی تھے۔ وہ شروع شروع میں اس عظیم الشان براعظم کے اندر تنہا سے نظر آتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ہندوستان کا پوشیدہ جادو اُن پر اثر کر رہا تھا۔ وہ ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی سماج میں غیر ارادی طور پر جذب ہوتے جا رہے تھے جوں جوں ہندو اور مسلمان کے درمیان ارتباط بڑھتا جاتا تھا، ایک ایسی قدرتی بولی خود بخود عالم وجود میں آتی جاتی تھی، جو ہندو اور مسلمان دونوں کی محبوب اور دلپسند تھی۔ یہ بولی تمام حد بندیوں سے آزاد تھی۔ یہ زبان تمام بندشوں سے بلند تھی۔ اسے ادیبوں اور شاعروں کی کسی جماعت نے پیدا نہیں کیا تھا۔ اسے عوام نے پیدا کیا تھا۔ یہ عوام کی گود میں پلی تھی۔ اسے سوسائٹی کے نچلے طبقے اظہار خیالات کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی تخلیق کا سہرا کسی جماعت کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ وہ خود بخود اس طرح وجود میں آگئی جس طرح تمام فطری طاقتیں مناسب وقت آنے پر ظہور میں آجاتی ہیں۔ برکھا رت میں زمین پر جو ننھے ننھے پودے لہلہانے لگتے ہیں، ان کی تخم ریزی کوئی نہیں کیا کرتا۔ موسم بہار میں جگہ جگہ جو پھول کھل جاتے ہیں، اُن کی آبیاری

کسی کے ذمہ نہیں ہوتی۔ قدرت ان معصوم پودوں کی خود دایہ گیری کرتی ہے اور انھیں پروان چڑھاتی ہے۔ ہماری زبان بھی اسی قدرتی عمل کا نتیجہ ہے۔ تاریخ کا ہاتھ تیزی کے ساتھ ہند و مسلم تہذیبوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے رہا تھا اور اردو اس نئی تہذیب کے بطن میں پرورش پا رہی تھی۔ مختلف قومیں ایک مرکز پر جمع ہو رہی تھیں، مختلف بولیاں ایک محفل میں بولی جا رہی تھیں۔ چمن میں بھانت بھانت کے پرندے تھے اور ہر ایک مختلف راگ الاپ رہا تھا لیکن اس رنگا رنگی اور بیگانگی کے پردے میں ایک نیا یگانگت کا راگ پیدا ہو رہا تھا اور وہ نغمۂ نو اُردو کا نغمہ تھا۔

اردو کی اصل برج بھاشا اور فارسی کو بتایا جاتا ہے۔ برج کے علاقے میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ شیریں ہندی زبان تھی۔ جب مسلمان سندھ اور پنجاب کو عبور کر کے شمالی ہند میں پہونچے اور دہلی نئی حکومت کا پایۂ تخت قرار پایا تو ہندو مسلم اختلاط اور بڑھ گیا۔ سب سے پہلے مسلمان نو وارد کی حیثیت سے سندھ کے سواحل پر لنگر انداز ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان ریاستوں کی سرکاری زبان عربی تھی اور ان کے درباروں پر بھی عربی تہذیب و تمدن کا اثر غالب تھا۔

عربوں کی یہ ایک تاریخی خصوصیت رہی ہے کہ وہ جس سرزمین پر پہونچتے تھے اُسے اپنا لیتے تھے۔ وہ مقبوضہ علاقوں کے دل و دماغ کو بالکل اپنے سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔ ایران اس کی ایک بہترین مثال ہمارے واسطے مہیا کرتا ہے۔ ایرانیوں کو اپنی تہذیب و تمدن پر ناز رہا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ایشیائی قوموں میں ایرانی اپنی نفاستِ ذوق، پاکیزگیٔ فکر اور ذہنی و دماغی اوصاف کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہے ہیں۔ فردوسی کہتا ہے کہ ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسیداست کار

کہ تاج کیاں را کنند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

لیکن جب عربوں نے ایران کو فتح کیا تو انہی اونٹ کا دودھ پینے والے بدویوں نے جمشید و کیخسرو کی سرزمین کے ذرے ذرے کو عربی رنگ میں رنگ دیا۔ عربی اثر سے ایرانیوں نے نہ صرف اپنا مذہب بدل دیا بلکہ اپنی قومی خصوصیات، اپنے ملکی رسوم، اپنی زبان، اپنی ہزار سالہ تہذیب، غرض اپنا سب کچھ اپنے فاتحوں کے حوالہ کر دیا۔ عربوں نے ایران کے جنت نظیر سبزہ زاروں پر ہی قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ ایرانی دل و دماغ کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ بلاشبہ عرب بھی ایرانیوں سے متاثر ہوئے اور اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی عربی روح تک کو بھول گئے۔ چنانچہ مورخین کا اتفاق ہے کہ خلافتِ عباسیہ تہذیب اور ایرانی اثر و نفوذ کا مکمل نمونہ تھی۔ یہ ایک ضمنی بحث تھی جس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ عرب فاتحین کے ہاتھوں میں مسخر کرنے والے ہتھیار ہی نہ تھے بلکہ ان کے دماغوں میں دل فتح کرنے والی طاقت اور ان کی باتوں میں من موہنے والا جادو بھی تھا۔ ہندوستان میں کبھی خالص عربی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ البتہ سندھ کے چند علاقوں میں کچھ دن کے لئے چند اسلامی ریاستیں برسرِ اقتدار آئیں۔ اگرچہ ان کا سیاسی وقار بہت محدود تھا لیکن اس کے باوجود سندھی زبان و تہذیب پر عربی ادب اور سماج کے جو نقوش ثبت ہوئے وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ سندھی زبان میں آج تک عربی الفاظ و محاورات کی کثرت ہے اور وہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عربی کے یہ اثرات سندھ تک محدود رہے۔ شمالی اور وسطی ہند میں جو اسلامی

نو وارد داخل ہوئے وہ عرب نہ تھے، ایرانی، افغانی اور ترک تھے۔ لہٰذا ہندوستان میں اس کے بعد جو تہذیبی اور ادبی تحریکیں بار آور ہوئیں ان میں عربی اثرات سے زیادہ ایرانی و ترکی اور افغانی رنگ جھلک رہا تھا۔ چنانچہ اردو جو ہندو مسلم ملاپ کا خوشگوار پھل ہے وہ عربی رنگ و بو کا سرمایہ دار نہیں بلکہ اس میں ایرانی حلاوت، افغانی پختگی، ترکی ذائقہ اور ہندوستانی رس یہ چاروں عناصر بیک وقت پائے جاتے ہیں ہم نے گذشتہ سطور میں فرانسیسی ادیب "ژاں ژاک روسو" کا ایک مقولہ نقل کیا تھا کہ

"ہر قوم کا ادب اس کی تاریخی سماجی تبدیلیوں کا آئینہ ہوا کرتا ہے"

آئیے اردو کے آئینہ میں ہم ہندوستانی قومیت کی مختلف تاریخی اور سماجی تبدیلیوں اور تدریجی انقلابات کے خال و خط کا معائنہ کریں ـــــ اگر ہم کسی ادبی تحریک کا تاریخی جائزہ لینا چاہتے ہیں تو خارجی شہادتوں سے قطع نظر تین پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالی جائے گی تاکہ اس ادب کی حقیقی روح کو بے نقاب کیا جاسکے اور یہ بتلایا جاسکے کہ وہ تاریخی انقلابات کے کتنے دوروں سے گذر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس ادب کی تعمیر کن کن زبانوں سے ہوئی ہے یعنی کن کن مختلف زبان بولنے والی قوموں نے ادب کو پیدا کیا ہے۔ بطور مثال آپ فارسی ادب پر ایک نظر ڈالیے۔ خود فارسی زبان کے الفاظ، محاورات، لسانی تراکیب، اصطلاحات اور مصادر و افعال آپ کو بتلا دیں گے کہ فارسی ادب و زبان کو عربوں اور ایرانیوں نے پیدا کیا ہے۔ ترکی زبان بھی عربوں اور ترکوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ انگریزی رومیوں اور اینگلو سیکسن نسل کے لوگوں نے بنائی ہے۔ یہ ایک داخلی شہادت ہے اس ادب کے تاریخی ظہور و ارتقا کی ـــــ آج ہم صرف فارسی زبان کی ساخت سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ زبان ایک ایسی مشترک سوسائٹی نے پیدا کی تھی جو عربوں اور ایرانیوں پر مشتمل تھی۔ ان دو نوں قوموں نے اپنے اپنے الفاظ، اپنے اپنے محاورات اور اپنی اپنی اصطلاحات اس نئی زبان کو دیں اور یہ رفتہ رفتہ اپنی موجودہ شکل میں آگئی ـــــ ضمنی طور پر فارسی زبان کی تشکیل سے اُن تعلقات و روابط کا پتہ چلتا ہے جو عربوں اور ایرانیوں کے درمیان تھے۔ ہم اُس زمانہ کی پوری تاریخ محض فارسی زبان کے مطالعہ سے سمجھ سکتے ہیں ـــــ نئی فارسی زبان میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فارسی کے دامن میں ان لفظوں کی موجودگی ایران کے جدید سیاسی انقلابات کا براہ راست نتیجہ ہے۔ جس طرح قدیم فارسی زبان کے مطالعہ سے (جس پر عربی اثر غالب تھا) ہم عرب ایرانی روابط کی وضاحت کرسکتے ہیں اُسی طرح نئی فارسی زبان اُن تاریخی واقعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے جو ماضی قریب میں ایران کے اندر پیش آتے رہے اور اپنا دیرپا اثر ایرانی ادب و سماج پر ڈالتے رہے۔

ادب کی لسانی ساخت کے علاوہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ ادب ماضی میں کن کن سماجی، تاریخی اور مذہبی ماحولوں سے گذرا ہے ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ادب کے روایاتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے یعنی یہ دیکھا جائے کہ اس ادب میں کس کس قسم کی ادبی، تاریخی اور مذہبی روایات کی نمائندگی پائی جاتی ہے۔ بطور مثال انگریزی لٹریچر یونانی علم الاصنام کی کہانیوں سے بھرپور ہے۔ عربی ادب میں یہودی روایات اور مسیحی تلمیحات کی کثرت ہے۔ فارسی کی تمام تر روایات عرب سے ماخوذ ہیں۔ آپ فارسی ادب میں عشق و محبت کا قصصی اور مثالی کردار اگر تلاش کریں گے تو لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا اور یوسف زلیخا

کے رومان قدم قدم پر ملیں گے۔ فارسی ادب میں یہ روایات بالکل عام ہیں — انگریزی لٹریچر میں یونانی علم الاصنام کی جھلک رومی برطانی اختلاط اور اُن تاریخی واقعات کی صریحی شہادت ہے جو رومن امپائر کے عروج و کمال سے وابستہ ہیں، جب جزیرۂ برطانیہ رومی شاہنشاہیت کا ایک جزو تھا اور انگریزی دل و دماغ رومی اور یونانی اثرات سے معمور تھے۔ عربی ادب میں اسرائیلی اور مسیحی روایات کی موجودگی، عرب کی اُس ذہنی، دماغی اور سیاسی حالت کا قدرتی نتیجہ ہے جو قبل از اسلام وہاں پائی جاتی تھی۔ فارسی ادب میں عربی روایات کی کثرت، عربی ایرانی تعلقات اور مذہبی و تمدنی اتحاد کا واضح اور غیر مشتبہ ثبوت ہے

کسی ادب کی تاریخی و تمدنی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے ایک تیسرا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس ادب کے نفسیاتی رجحانات کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔ ہر ادب میں ایک مخصوص روح پائی جاتی ہے، جو اُس قوم کے اجتماعی مزاج سے پیدا ہوتی ہے جس نے اُس ادب کی تشکیل میں حصہ لیا۔ فارسی ادب کے رنگین و لطیف رجحانات ایرانیوں کے قومی شعور اور اجتماعی مزاج کی پردہ دری کرتے ہیں۔ عربی ادب کے رُجحانات ایک مخصوص کیفیت رکھتے ہیں، یہ مخصوص کیفیت درحقیقت عربوں کے نفسیاتی پس منظر کا عکس ہے۔

بہتر ہے کہ ہم اردو کی تحریک ادبی اور تاریخی نشو و نما کا جائزہ لینے کے لئے انہی تینوں طریقوں کو استعمال کریں۔ ہمارا دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ شروع ہی سے تسلیم کرلیا گیا ہے) کہ اردو، ہندو مسلم تہذیبوں اور قومیتوں کے امتزاج و اتحاد کا نتیجہ ہے۔ آئیے اس دعویٰ کو امتحان کی کسوٹی پر رکھیں۔

(الف) اردو زبان کی ساخت برج بھاشا اور فارسی کے ملاپ سے ہوئی ہے۔ اردو کی لسانی تشکیل اس کی گواہ ہے۔ اردو کے تمام افعال و مصادر و روابط و حروف ہندی اور خالص ہندی ہیں۔ اردو میں پچاس فی صدی اسماء ہندوستانی بولیوں سے لیے گئے ہیں۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اردو دو قوموں کے ارتباط سے ظہور میں آئی ہے۔ ایک وہ قوم جس کی بولی برج بھاشا تھی دوسری وہ قوم جو فارسی زبان استعمال کرتی تھی۔ آپ ہندو مسلم تہذیبوں کے اتصال کا حقیقی پرتو اردو میں دیکھ لیجیے۔ کیا ضرورت ہے کہ آپ ہندو مسلم تعلقات و روابط کی تحقیق کے لئے تاریخی دلائل کے انبار لگا دیں۔ کیا فقط اردو کی بناوٹ یہ نہیں بتاتی کہ ایسی ملی جلی بولی صرف وہی قومیں بنا سکتی ہیں جن کے دل و دماغ ایک ہی سانچہ میں ڈھل گئے ہوں۔

(ب) ادب اردو کی روایات ہندو مسلم روایات اور علم الاصنام کے اتصال کا بہترین نمونہ ہیں۔ اردو ادب شجاعت و جوانمردی کی روایات کا مظہر جہاں رستم و سہراب کو قرار دیتا ہے وہاں ارجن اور بھیم کو بھی نہیں بھولتا۔ روایاتِ عشق و محبت کی ترجمانی ہم فقط لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گل و بلبل اور شمع و پروانہ ہی کے ذریعہ نہیں کرتے بلکہ نل دمن، بھونرا اور کنول، چاند اور چکور اور پپیہے اور کوئل بھی عشق و محبت کے ادب اردو میں بہترین کردار پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ادب میں یوسف کا حسن اور آدم و حوا کی باہمی محبت ایک مثالیہ کیرکٹر کی حیثیت رکھتی ہے مگر جب عصمت و عفت کا آدرش قائم کرنا پڑے گا تو کون ہے جو سیتا کو بھول جائے اردو کا ادیب ظلم و شقاوت کا آئیڈیل نمرود و فرعون کے ساتھ راون کو بھی سمجھنے میں تامل نہیں کرتا۔ بیسیوں کے افسانوں اور کوہ طور کے قصوں کے ساتھ ہم ہمالیہ اور بندھیاچل کے بھی گیت گاتے ہیں ؎

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

دجلہ اور فرات کے کنارے گلگشت کرتے کرتے ہم گنگ و جمن کی وادیوں میں بھی جا سکتے ہیں۔ نوروز اور شب برات کے ساتھ دیوالی اور ہولی کے تذکروں سے بھی ہمارا لٹریچر معمور ہے۔ موسم بہار کے جشن شگوفہ کی افسانہ طرازی کے دوش بدوش بھارت کی البیلی رنگینیاں بھی ہمارے لٹریچر کے مرقع میں نظر آتی ہیں۔ ہماری عشقیہ مثنویوں میں راجہ اندر کے اکھاڑے کے ساتھ کوہ قاف کے پریزادوں کے حسن و جمال کی بھی تعریف ہے۔ غرضکہ آپ اُردو لٹریچر کا اول سے آخر تک جائزہ لیجیے، آپ کو ہندو مسلم روایات دوش بدوش نظر آئیں گی۔ یہ تمام چیزیں سماجی ملاپ کی گہرائی، مذہبی خیالات کی یکرنگی، اور ذہنی پس منظر کے اتحاد کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اردو کی ساخت اور ادب اردو کی مشترک روایات، ہندوستان کی قومیت مشترکہ کی نشانی ہیں۔ تاریخ نے ہمارے دلوں ہمارے دماغوں اور ہمارے ذہنوں کو ایک ہی سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ یہ سانچہ ادب اردو کا سانچہ تھا، مشترک تمدنی روایات کا سانچہ تھا، متحدہ قومیت کا سانچہ تھا۔ اگر آج ادب اردو کو ہمارے درمیان سے اُٹھا دیا جائے تو متحدہ قومیت، مشترکہ ہندوستانی سماج اور ہندی ایرانی تہذیب (انڈو ایرین کلچر) کی تمام شاندار روایات مہمل ہو کر رہ جائیں گی۔ اردو اور صرف اُردو اُن ہزار سالہ کوششوں کی شہادت دے سکتی ہے جو ہندوستانی قوموں نے باہمی یکجہتی اور اتحاد کے لئے سماج، تمدن، فلسفہ، عقیدہ اور تہذیب کے ہر گوشے میں کیں۔ ہم نے اپنی پیاری زبان کو پریم کا بندھن اور محبت کا رشتہ بنا کر ٹوٹتے ہوئے دلوں اور بکھرے ہوئے دماغوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اُردو کے دامن میں ہر زبان کے لفظ ہیں، پنجابی، سندھی، فارسی، ترکی، عربی، بنگالی، مرہٹی، انگریزی، پرتگالی، لاطینی، فرانسیسی غرض مشرق و مغرب میں جتنی جاندار بولیاں اور ترقی یافتہ زبانیں ہیں سب سے اردو نے استفادہ کیا ہے۔ آپ ایک سرسری نظر ہی میں ان لفظوں کو تلاش کر سکتے ہیں اور اس سے اردو کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ "چٹا" معمولی سا لفظ ہے جسے ہم روزانہ برتتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اردو نے اسے پنجابیوں سے لیا ہے۔ باورچی، چلمن، آقا ترکی زبان سے لیے گئے ہیں۔ نیلام پرتگالی ہے۔ گلاس انگریزی ہے۔ یہ لفظ بطور مثال زبان پر آ گئے ہیں ورنہ اُردو کے خزانہ میں مختلف النوع جواہر ریزوں کی کمی نہیں ؂

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(ج) یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہمارا ادب ہندوستان کی ہزار سالہ سماجی تبدیلیوں اور تمدنی ترقیوں کی کس حد تک نمائندگی کرتا ہے ہم نے اردو کی لسانی بناوٹ اور روایاتی پس منظر کو بطور تمثیل پیش کیا۔ اس سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اگر ہمیں ہندو مسلم تہذیبوں کو صحیح طور پر ایک دوسرے کے قریب لانا ہے تو ان نفسیاتی رجحانات سے فائدہ اُٹھانا پڑے گا جو ادب اردو کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ہر سوسائٹی کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ہر قوم کا ایک مخصوص زاویۂ نظر ہوا کرتا ہے اور اس کے ادب میں بھی وہی مخصوص قومی روح پائی جاتی ہے جو اس قوم یا اس سوسائٹی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ انگریزی لٹریچر میں جو نفسی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی انگریزی ادب و شعر کے مطالعہ سے آپ پر جو اثر پڑتا ہے، وہ حقیقت میں برطانی قوم کی مخصوص اجتماعی روح کا تاثر ہے۔ عرب جاہلیت کے قصائد سے ہم آج بھی ایام جاہلیت کی قومی روح کو مس کر سکتے ہیں۔ ہم امرؤ القیس، زہیر اور ایام جاہلیت کے دوسرے شعرائے عرب کے قصیدوں میں عربی نفسیات، عربی شعور اور عرب کی اجتماعی زندگی کے نقوش کی جھلکیں

دیکھ سکتے ہیں۔ ایرانی لٹریچر ایرانیوں کی نفسی زندگی اور ان کے قومی تاثر و احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اردو ادب کا بھی ایک خاص نفسیاتی مزاج ہے، ایک مخصوص اثر ہے جو اردو نظم و نثر کا مطالعہ ہم پر ڈالتا ہے۔ اردو لٹریچر کے رجحانات اور امکانات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں مختلف ادبی رجحانوں، مختلف سماجی نظریوں اور مختلف دماغی تحریکوں کو اپنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اردو ایک ایسا جاذب ہے جو ہر نقش کو جذب کر لیتا ہے۔ ماضی بعید میں اس نے ہندی اور فارسی کی قابلیتوں کو چوسا۔ دکن میں پہونچی تو مرہٹی، تامل، تیلگو اور دوسری مقامی بولیوں کا دودھ پیا۔ دہلی دربار میں ترکوں سے سابقہ پڑا تو ترکی سے مانوس ہو گئی۔ جب اٹھارھویں صدی میں دانایان فرنگ نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو اردو نے ان اجنبیوں کی آؤ بھگت کی اور آج اردو لٹریچر مغربی ادب سے جس قدر متاثر ہو چکا ہے وہ محتاج بیان نہیں —— اردو ادب کا مطالعہ ہمیں ایک خاص زاویۂ نظر قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ زاویۂ نظر ہے، ہندوستانی قومیت کے مخصوص رجحانات کا —— اردو میں ایک طرف، ہندو قوم کا حلم، سادگی اور نرمی ہے تو دوسری طرف مغل ایرانیوں اور ترکوں کی شان و شکوہ۔ اردو میں گیت بھی ہیں، اور نظمیں بھی، دوہے بھی ہیں اور غزلیں بھی، ویدانت بھی ہے تصوف بھی، برہمنیت بھی ہے اسلامیت بھی، راجپوتی آن بان بھی ہے اور عربی شکوہ و شان بھی۔ اردو ادب کا مزاج ہندوستانیوں کے عام اجتماعی مزاج کی طرح حلیم، بردبار اور ملنسار ہے۔ انگریزی ادب و تمدن کے اثر سے ہمارے رجحانات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ادب اردو ان کا بھی آئینہ دار ہے۔ ہمارا قومی مزاج تاریخ کی دس گذشتہ صدیوں میں جن فکری منزلوں اور شعوری مرحلوں سے گذرا ہے، ہمارا ادب ان سب کے اثرات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ادب ہی کسی قوم کی سماجی اور فکری گہرائیوں کے ناپنے کا آلہ ہے

ان تمام حقیقتوں کے دوہرانے کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان میں گذشتہ ہزار سال کے اندر جس قدر سیاسی، سماجی، مذہبی اور فکری انقلابات ہوئے ان کی گود میں اردو نے جنم لیا۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ ایک شدید انقلاب کی تمہید تھا۔ مسلمان ہندوستان کے دروازے میں داخل ہو کر ایک ایسی دنیائے قدیم کی حدود میں باریاب ہوئے تھے جہاں چار ہزار برس سے ایک مخصوص تہذیب کا دیا جل رہا تھا، علوم و فنون کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان بھی مصر، بابل، یونان، روم اور چین کی طرح اپنے شاندار ماضی پر فخر کر سکتا ہے۔ ہندوؤں نے دنیائے عتیق ہی میں اپنی ذہانت سے تہذیب کے ان تمام مدارج کو طے کر لیا تھا جو دنیا کی دوسری قوموں نے سیکڑوں ہزاروں برس بعد طے کیے۔ ہندوستان کسی وقت بھی نیم وحشی اور غیر متمدن نہیں رہا۔ کم سے کم تاریخ کی جہاں تک یادداشت ہے اس نے ہمیشہ ہندوستان کو شعر و ادب، موسیقی، ریاضی، نجوم، ڈراما، قانون اور روحانیت کا گہوارہ پایا ہے۔ مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو اگرچہ اس وقت یہ عظیم ملک اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے عالم زوال و انحطاط میں تھا، مگر چار پانچ ہزار برس میں آریوں نے جس قدر دماغی و علمی ترقیاں کی تھیں، ان سب کے نقوش باقی تھے۔ البیرونی جو غزنویہ عہد میں ہندوستان آیا تھا جی کھول کر ہندوستانی کمالات کی داد دیتا ہے۔ اس نے ہندوستانی علوم ریاضی کو حیرت اور تعجب کی نظروں سے دیکھا اور اپنے سفرنامہ میں ہندوؤں کو دنیا کی سب سے زیادہ عالم و ریاضی داں قوم قرار دیا۔ مسلمان ہندوستان میں اپنے علوم اپنے ساتھ لائے، ان کی تہذیب، ان کا تمدن، ان کی زبان اور ان کی قومی خصوصیات ہندوؤں سے جداگانہ تھیں، مگر اب یہ اجنبیت و بیگانگی باقی نہ رہ سکتی تھی کیونکہ ادھر ہندوؤں کو بھی نئے مہمانوں کی مزاجدانی

اور نئی دنیا کی ہم زبانی ضروری تھی۔ مسلمان ہندوستان کو فتح کرنے نہیں اپنا وطن بنانے آئے تھے اور جس ملک کو وہ اپنا وطن قرار دے چکے تھے قدرتی طور پر وہ اس کے دوسرے باشندوں سے بیگانہ اور آزاد نہ رہ سکتے تھے۔ جب دو برابر کی طاقتیں آپس میں ملتی ہیں تو کچھ دیر تک توان میں کشمکش کی سی کیفیت رہتی ہے لیکن اس کے بعد اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے یک جان و دو قالب ہو کر ایک ایسی بہتر و پسندیدہ تر شکل اختیار کر لیتی ہیں جس میں دونوں عنصروں کی بہترین صلاحیتیں موجود ہوں۔ بسا اوقات دو مختلف پودوں کا پیوند بار آور ہو کر اس قدر لطیف، بامزہ اور خوشگوار پھل پیدا کرتا ہے کہ وہ خصوصیات پہلی صورت میں ہرگز نہ پیدا ہو سکتی تھیں۔ ہندو مسلم تہذیبیں بھی اسی قانون قدرت کے ماتحت پہلے پہل متصادم رہیں لیکن اس کے بعد ان میں قربت و یکجائی پیدا ہونے لگی۔ اس تہذیبی اتصال کے جو نتائج برآمد ہوئے اس کی سب سے زیادہ دلکش مثال اُردو ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اردو میں شاعرانہ سرگرمیوں کا آغاز کب ہوا؟ تاریخ صرف اتنا پتہ دیتی ہے کہ وہ سب سے پہلا شاعر جس نے اس نئی بولی کو منہ لگایا لاہور کے عہد غزنویہ کا ایک ادیب سعد سلیمان تھا۔ سعد سلیمان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس نے ہندوستانی میں اپنا کچھ کلام مرتب کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ سعد کے تذکرہ نویسوں نے اس کی اس خصوصیت کا بھی ذکر کر دیا ورنہ معلوم نہیں کتنے شوخ طبع لوگوں نے اس نئی بولی میں (جو ابھی تک عوام میں مروج نہ تھی) اپنی موزونیت طبع کے پھول کھلائے ہوں گے جو کہ بغیر مہکے ہوئے گمنامی کی باد سموم سے کملا کر رہ گئے۔

بلاشبہ اردو کی ترویج و ترقی میں اُن صوفیوں اور مبلغوں کا بھی کافی حصہ ہے جو مذہبی تبلیغ یا خدا پرستی کے شوق میں عوام کی تہذیب و اصلاح کی غرض سے دور دور نکل گئے تھے اور خدا کی باتیں بندوں کو ان کی اپنی زبان میں سکھاتے پھرتے تھے۔ صوفیہ کے تذکروں میں ان کے اکثر وہ ملفوظات و اقوال نقل کیے گئے ہیں جو اس دعوے پر بطور ثبوت و دلیل پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جب ہم اُردو کے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو بیساختہ ہماری نظریں امیر خسرو پر ٹھہر جاتی ہیں جن کے گیت ہمارے گھروں میں آج تک گائے جاتے ہیں، جن کی پہیلیاں ہمیں اب تک یاد ہیں، جن کی کہہ مکرنیاں، جن کے بول اور جن کی کہاوتیں آج بھی ادب اُردو کی قدامت کے نشان ہیں۔ امیر خسرو ہندوستانی نژاد تھے۔ اس لئے انھوں نے ہندوستانی میں جو کچھ لکھا وہ اپنی مادری زبان میں لکھا۔ انھیں قدرت نے طبع موزوں اور قدرت نظم دی تھی اس لئے وہ جو کچھ فرما گئے وہ ہمیں اب تک ازبر ہے مگر ان کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں آدمیوں نے اس زبان میں کچھ نہ کچھ کہا اور سنا ہوگا لیکن ان کی گمنامی ان کے تمام کارناموں کو لے ڈوبی۔ اس بحث میں یہ بیان کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اردو کا حقیقی سرچشمہ ہندوستان کی کون سی بولی ہے۔ ہمارے صوبہ کے لائق مصنف اور مشہور اہل قلم ڈاکٹر تارا چند صاحب اردو کی قومی اہمیت اور اس کی لسانی اصلیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> "اس وقت ہندوستان میں جتنی بولیاں مروج ہیں ان میں سے کوئی بھی سنسکرت سے نہیں نکلی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جدید ہندی سنسکرت سے مشتق ہے۔ وہ ہرگز سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہماری قومی زبانوں میں کوئی بھی سنسکرت سے مشتق نہیں"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تاریخی دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اردو میں ہندو سماج کی مناسب حصہ داری اور ان کی تمدنی زندگی کی پوری پوری نمایندگی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان لوگوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے جو اردو کو ایک

بدیسی زبان بتلانے کی جرأت کرتے ہیں، اسی ضمن میں موصوف نے اردو اور جدید ہندی کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں اور ایک ہی زبان کی دو شکلیں بتلایا ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ

"اردو ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے کی کوشش احمقانہ اور طفلانہ ہے۔ سنسکرت آمیز ہندی اور عربی آمیز اردو کا پروپیگنڈا کوئی صحت در قومی تحریک نہیں کیونکہ اس سے فرقہ پرستی کے رجحان اور علیحدگی کی پالیسی کو مدد ملتی ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ دعومی زبان (لنگوافرنیکا) میں ہندوستانی قومیت کے تمام اجزا کی نمایندگی ہونا چاہیے اور اس لئے ہر وہ کوشش ناکام رہے گی اور تفرقہ پیدا کرے گی جو کسی ایسی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے لئے کی جائے گی جس کی بنیاد ایک مخصوص تمدن کی روایات پر ہو"

ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلہ پر آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مندرجہ ذیل خیالات کو بطور ثبوت پیش کیا ہے پنڈت جی فرماتے ہیں کہ

"مجھے اب ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اردو کو اب ایک دوسرے کے قریب تر آ جانا چاہیے"

مہاتما گاندھی نے اس بحث میں اس طرح حصہ لیا ہے کہ

"میں ایک ایسی انجمن بنانا چاہتا ہوں جس کے ارکان دونوں بولیوں کو سیکھیں اور دونوں کے رسم الخط سے واقف ہوں اور اس کا پروپیگنڈا بھی کریں اور یہ سب اس امید پر کہ بالآخر دونوں مل کر ہندوستانی کے نام سے ایک بین الصوبجاتی زبان بن جائے گی۔ پھر یہ تمیز نہ ہوگی کہ یہ ہندی ہے اور یہ اردو۔ بلکہ ہندی اور اردو (جو اصلاً ایک ہی ہیں) مشترکہ ہندوستانی زبان کے طور پر ہر صوبہ اور ہر گوشے میں استعمال کی جائیں گی"

حقیقت بھی یہی ہے کہ اردو اور جدید ہندی کے افعال (مصادر) بناوٹ، قواعد اور دوسری لسانی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں۔ ہزاروں محاورے باہم مشترک ہیں۔ خیالات کے سانچے اور اظہار و بیان کے طریقے یکساں اور یک رنگ ہیں۔ صرف رسم الخط کا فرق ہے اور یہ فرق زبان کی اصلیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب لکھا ہے کہ

"اردو ہم سب کا مشترکہ ورثہ ہے جسے ہمارے بزرگوں نے اتحاد اور ملاپ کی نشانی کے طور پر ہم سب کے لئے چھوڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم سب اپنے اس انمول ورثہ کی قدر کریں"

ہمارا سر عقیدت و ارادت کے ساتھ جھک جانا چاہیے ان بزرگوں کے آستانہ پر جن کی پرخلوص کوششوں نے ہماری آزادی زبان کی تشکیل کی، جس میں مشترکہ خیالات و احساسات ، مشترکہ سماجی طریقے، مشترکہ رجحان اور مشترکہ خصوصیتیں عطا کیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلامی حکومتوں کے عہد میں ایک نئی بولی کو رواج دیا۔ جہاں گئے اسے سینہ سے لگا کر لے گئے جس کا پھل ہیں بیٹھے اسی کے گن گائے۔ آج انہی کی کوششوں سے اردو پشاور (سرحد) سے منی پور (آسام) اور سری نگر سے مدراس تک بولی بھی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔

برادران ہنود اپنے علمی شوق، اپنی ذہانت اور اپنی بے نظیر قوت آخذہ کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہیں۔ اسلامی حکومتوں

کے زمانہ میں انھوں نے بہت جلد حالات کا جائزہ لیکر اپنے کو مقتضائے حال کے تناسب اور متوازن بنالیا۔ انھوں نے فارسی زبان کی طرف غیر معمولی توجہ کی اور عہد مغل کے شعراء کا اگر کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے تو یقیناً ایسے ہندو بزرگوں کی کافی تعداد ہمیں ملے گی جو فارسی زبان اور شیرازی لہجہ میں داد سخن دیتے تھے۔ بنا بریں مغلیہ عہد ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کا سنہرا عہد تھا۔ اکبر و جہانگیر کی قومی پالیسی نے ہمیں آپس میں اس قدر قریب تر کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ قرب اپنا انفرادی وجود باقی رکھکر ممکن نہ تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی رنگ میں شرابور اور ایک ہی کیفیت میں سرشار تھے۔ مغلیہ حکومت خالص ہندوستانی حکومت تھی۔ مغل بادشاہوں کے ترکی خون میں ہندوستانی روح دوڑ رہی تھی۔ انھوں نے ہندو مسلمان کے درمیان سے ہر قسم کی غیریت اور بیگانگی ختم کردی تھی۔ مغل تاجداروں نے ہندو رسوم و عادات کو اپنا لیا تھا۔ ان کے درباروں پر ہندو مسلم ملاپ کا گہرا رنگ چھایا ہوا تھا۔ مغلیہ حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے درباروں میں مسلمان شعراء اور ارباب قلم کے پہلو بہ پہلو ہندو شعراء اور اہل فکر بھی داد سخن دیتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہم اکثر ہندو شعراء کے نام دیکھتے ہیں۔ چندربھان برہمن عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر تھا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

چندربھان برہمن کا دیوان دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا مگر تذکروں میں ان کے جتنے شعر بھی ملتے ہیں لاجواب اور انتخاب ہیں۔ چندربھان برہمن کے علاوہ اور بہت سے ہندو شعراء ہندوستانی قومیت کے اس سنہرے زمانہ میں موجود تھے کیا عجیب لطف ہے کہ اس زمانہ میں ہم اکثر مسلمانوں کو سنسکرت سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے پاتے ہیں۔ ایک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور عہد اکبری کے دوسرے اُمراء سنسکرت اور ہندی ادب کے بہترین ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ درحقیقت مغلیہ عہد میں تمام فرقہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے۔ ہندو اور مسلم تہذیبیں اس طرح ایک دوسرے سے آمیز اور یکجان ہوگئی تھیں کہ مذہب، خیالات، عقائد، فلسفہ اور تاریخ کے تمام مختلف طریقے اور مظاہر فنا ہوگئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر اعظم نے متحدہ ہندوستان کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بہت جلد نکل آئی اور اب تک اُردو کی شکل میں ہمارے سامنے یادگار کے طور پر موجود ہے۔

جس زمانہ میں اکبر شمالی ہند میں اس جدید ترقی پذیر ہندوستانی قومیت کی سرپرستی اور آبیاری کر رہا تھا اُس زمانے میں جنوبی ہند کے اسلامی فرمانروا بھی اس فرض سے غافل نہ تھے۔ عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کے درباروں پر بھی ہندوستانی اثرات چھائے ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جنوبی ہند کی اسلامی ریاستوں میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد جس قدر گہری تھی شمالی ہند کو بھی وہ خصوصیت حاصل نہ تھی اور اس کے کچھ تاریخی اسباب بھی تھے کیونکہ جنوبی ہند میں اسلامی حکومت کا قیام ایک برہمن اور ایک مسلمان کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔

دکن میں اردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ ایک طویل داستان ہے۔ خود قطب شاہی اور عادل شاہی خاندانوں کے فرمانروا اس نئی زبان کے سرپرست تھے۔ جب قدرت نے دکنی عظمت و اقبال کی بساط اُلٹی اور بیجاپور اور گولکنڈہ کی اسلامی

ریاستیں تباہ ہوئیں تو اہلِ کمال کا یہ جمگھٹا منتشر ہو گیا۔ مغل حکومت نے جنوبی ہند میں اپنا مستقر جاہ و اقبال اور مرکز جاہ و جلال اورنگ آباد کو قرار دیا جہاں عالمگیر کے موکب شاہی کے ساتھ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے تمام اربابِ فضل و کمال اور شعراء جمع ہو گئے

جدید اردو ادب کا باوا آدم ولی دکنی کو سمجھا جاتا ہے (اگرچہ محققانہ زاویہ نگاہ سے یہ صحیح نہیں) دکنی کو اورنگ آباد کا باشندہ بتلایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اورنگ آباد ان کا آبائی وطن نہ ہو لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اورنگ آباد اسکول کے ایک نامور رکن تھے۔ اس زمانہ میں جنوبی ہند کے تمام ادبی حلقے اس نئی زبان کے ترانوں سے گونج رہے تھے مگر شمالی ہند میں فارسی کا سکہ چلتا تھا اور شمالی ہند کے ہندو اور مسلم اربابِ کمال اردوئے معلیٰ میں کچھ کہنا اپنے علم و فضل کی توہین سمجھتے تھے۔ وہ اگر کبھی اس نئی زبان میں کچھ کہتے بھی تھے تو برسبیل نشاط و تفنن ـــــ لیکن جنوبی ہند میں دکنی اُردو کا ہی بول بالا تھا۔ وہاں بادشاہ، اُمراء اور عوام اپنی زبان ہی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ولی دکنی کا جنوبی ہندوستان سے دہلی آنا اردو تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ ولی اپنے ساتھ اپنا اُردو دیوان بھی لائے اور اس شان سے آئے کہ دہلی میں ولی ہی ولی نظر آنے لگے ہمیں اس موقع پر اردو کی مفصل تاریخ پر نظر ڈالنا نہیں ہے۔ سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کا منشار صرف اتنا تھا کہ عہد مغل کی ادبی روح بے نقاب ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس زمانے کی ادبی فضا، قومی اشتراک اور ذہنی اتحاد کا کتنا مکمل نمونہ اور کتنا شاندار منظر تھی۔

اب ہمیں اس بحث میں ایک خاص نقطہ تک پہونچنا ہے۔ یوں تو ہندوستانی قوم کے ہر طبقہ اور ہر جماعت نے اپنی پیاری زبان اور اپنے قومی ادب کی تشکیل میں حصہ لیا لیکن اگر ہم اردو ادب کے مشاہیر شعر و سخن کا ایک سرسری سا جائزہ لیں تو ہمیں یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ اردو شعرا کے ہندو طبقہ میں کایستھ اور برہمنانِ کشمیر کا جس قدر حصہ ہے، اس کی مثال ہماری سوسائٹی کا کوئی دوسرا حلقہ مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے۔ کایستھ حضرات اور کشمیری پنڈتوں میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے اردو ادب پر غیر معمولی احسانات کیے۔ ان دونوں برادریوں میں اردو فارسی کا ذوق اب تک عام ہے۔ آپ آج بھی کشمیری خاندان میں بہت سے فضلا اور ادبا کو پا سکتے ہیں۔ کشمیر کی صحت مند، توانا اور ولولہ خیز آب و ہوا بے اثر نہیں رہ سکتی۔ کشمیر کی جو فردوس بداماں وادیاں، روح پرور پھول کھلاتی ہیں وہ ولولہ خیز دل و دماغ بھی پیدا کرتی ہیں۔ عرفی نے کہا ہے کہ

هر سوخته جانے که به کشمیر در آید
گر مرغ کباب است که با بال و پر آید

اللہ اللہ جس سرزمین بہشت آئین میں یہ خصوصیت ہو کہ وہ مرغ کباب کو دولت بال و پر اور مشت خاک کو نعمت برگ و ثمر بخشدے، وہ انسانی دل و دماغ، انسانی ذہن و روح بلکہ انسانی وجدان و ضمیر کو کن کن الہامی طاقتوں اور روحانی تازگیوں سے معمور نہ کر دیتی ہو گی۔ کشمیری پنڈت اپنی غیر معمولی ذہانت، اپنی طبعی ذکاوت اور اپنی جودتِ فکر کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اسی خانوادۂ علم و ادب اور گہوارۂ ذہانت و ذکاوت سے تعلق رکھتے تھے یعنی آپ اصلاً کشمیر کے ایک معزز برہمن خاندان کے رکن تھے۔ وہ خود اپنے ایک شعر میں اپنے اس تعلق کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

علامہ اقبال مرحوم کو اردو اور فارسی ادبیات کی تاریخ میں جو بلند پایہ اور غیر فانی مقام حاصل ہے اس کا اظہار بیسود ہے۔ علامہ اقبال سے قطع نظر کشمیری پنڈتوں کی تاریخ اُن ناموروں کے تذکروں سے معمور ہے جو ہمارے لٹریچر میں بلند ترین درجہ رکھتے ہیں۔ اردو کا کون بھی خواہ ایسا ہوگا جس کا سر عقیدت اردو نثر کے زندۂ جاوید ادیب اور اُردو افسانہ نگاری کے موجد و پیشرو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سامنے خم نہ ہو جائے، جن کا فسانۂ آزاد اور سیر کوہسار اردو ادب کے لئے سرمایۂ افتخار ہے اور جنھوں نے ہمیں سب سے پہلے سماجی زندگی کی تصویر کشی اور کردار نگاری کے اصول سے آشنا کیا۔ اگر اُردو ناول نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کو اولیت یا اولویت کا درجہ حاصل ہے تو اردو مثنوی نگاروں کی تاریخ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام نامی بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں، جن کی مثنوی گل بکاؤلی حسن بیان، شکوہ ادا، نزاکت تخئیل، کمال فن، قدرت سخن اور محاسن لفظی و معنوی کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔ یوں تو اردو زبان میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں مگر جو شہرت اور مقبولیت سحر البیان اور گلزار نسیم کو حاصل ہوئی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ان میں سے اول الذکر مثنوی خدائے سخن میر انیس کے جد مرحوم میر حسن کی رعنائی فکر کا نتیجہ ہے اور ثانی الذکر پنڈت دیا شنکر نسیم کی موزونیت طبع کا شاہکار ــــ پنڈت دیا شنکر نسیم کے بعد ادبی دنیا میں چکبست کا نام آتا ہے جو برہمنۂ کشمیر کے نامور رکن تھے۔ چکبست کا مقام ہمارے شعرا میں کس درجہ بلند ہے؟ اس حقیقت کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ مرحوم متاخرین شعرا اردو کے اس طبقہ میں تھے جو جدید رنگ سخن کے اعتبار سے سخنوران متقدمین میں شمار ہوتا ہے یعنی چکبست بھی اقبال، اکبر، حالی، اور شوق قدوائی کی ادبی بزم کے معزز رکن تھے۔ ان کی شاعری کا پس منظر قومی احساس کی کارفرمائی اور ہندوستان کے سیاسی انقلابات پر مشتمل ہے۔ پنڈت چکبست پر لکھنؤ کی سرزمین بجا طور پر نازاں ہے چکبست کی نظمیں، چکبست کے مقالات اور چکبست کے مضامین، غرض چکبست کا تمام مجموعۂ نظم و نثر، علوئے تخئیل، عذوبت بیان، گیرائی نظر، ہمہ گیری طبع حسن ادا اور لطافت اظہار کا ایک طلسم ہے۔ عہد جدید میں کون ہے جو سر تیج بہادر سپرو، علامہ برجموہن دتا تریہ اور پنڈت موتی لال مرحوم کی سیاسی ذہانت، ادبی خدمات اور قومی جوش و خروش کو نظر انداز کر سکے۔ پنڈت موتی لال مرحوم آج اگرچہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے لائق فرزند اور ہندوستان کے جلیل القدر رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے والد بزرگوار کے ذوق علم و ادب کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ:۔

"بچپن میں انھوں نے رواج کے مطابق عربی و فارسی تعلیم حاصل کی تھی اور تمام عمر مشرقی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق انھیں دامنگیر رہا۔ اس معاملے میں اُن کی نظر بہت وسیع اور معلومات ہمہ گیر تھیں۔ وہ قدیم ہندوستانی تہذیب کا مکمل نمونہ تھے"

خود پنڈت جواہر لال نہرو کی ابتدائی تعلیم برایوں کے ایک فارسی عربی داں منشی کے زیر اہتمام ہوئی تھی، جن کی شاندار داڑھی اور غدر کے بیان کردہ درد انگیز افسانوں کا تذکرہ پنڈت جی نے کمال دلچسپی سے اپنی سوانح عمری میں کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے مورث اعلیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارے مورث اعلیٰ کو فرخ سیر بادشاہ دہلی اپنے ہمراہ کشمیر سے لائے تھے۔ وہ عربی فارسی کے علامہ تھے اور ہمارے

خاندان میں ان کی جو تصویر محفوظ ہے وہ مغلیہ لباس میں ہے۔ اس تصویر میں وہ ایک شاندار مغل کے روپ میں نظر آتے ہیں۔"

ان بیانات سے کشمیریوں کی سماجی زندگی، مشترکہ ہندوستانی قومیت سے ان کا لگاؤ اور عربی فارسی کی طرف ان کے طبعی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نہ فقط ملک کے ایک سرکردہ مدبر اور مقنن ہی نہیں ہیں بلکہ انجمن ترقی اردو کے صدر مستقل بھی ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کو اپنی قومی زبان، اُردو سے جو شغف ہے اس سے اردو کا ہر بہی خواہ واقف ہے۔ اکیلے سر تیج بہادر نے اردو کے لئے جو کام کیا ہے اُسے ہزار آدمی بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ تمام ہندوستانی رہنماؤں میں سر تیج بہادر سپرو کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ زبان کے مسئلہ کو اس کی صحیح اسپرٹ میں دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے مشترکہ تمدنی ورثہ کی حفاظت میں زبان اور قلم دونوں سے جہاد کرتے رہتے ہیں۔ علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی تو مجتہد ادب اور امام فن کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ علمی نقادوں اور ادبی کارکنوں کی صف میں ان کے ذوق ادبی اور علمی سرگرمی کا جواب مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ یہ تو وہ نام ہیں جو کشمیری ادیبوں کے تذکرے میں بے ساختہ زبان قلم پر آگئے۔ اس کے علاوہ کتنے ہی ادیب، کتنے ہی اہل قلم اور کتنے ہی سخنور اس خانوادۂ علم و ادب میں پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ آج مغربی علوم کی گرم بازاری نے عام ہندوستانیوں میں مشرقی ادبیات کا ذوق و شوق بہت حد تک کم کر دیا ہے لیکن جہاں تک کشمیری ارباب مذاق کا تعلق ہے وہ مغربی علوم میں دستگاہ کامل اور مہارت تام حاصل کر لینے کے باوجود بھی اپنے مشرقی علوم سے کسی نہ کسی حد تک دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں ؎

گستنیہ محرم باد صبا ست می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمیں باقیست

ہمارے ممدوح پنڈت سندر نراین مشران مرحوم کا تعلق بھی اسی نامور علمی برادری سے تھا۔ پنڈت جی کی نظر کس قدر عمیق، فکر کس درجہ روشن اور ادبی فطرت کتنی ہمہ گیر اور رنگا رنگ تھی، اس کا اندازہ تو خطبات مشران کے مطالعہ ہی پر موقوف ہے لیکن ان کی زندگی بحیثیت علم و ادب اور خدمت و ایثار کے اعتبار سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہے اور وہ ہر وقت ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ آئیے ان کے کمالات ادبیہ اور نوادر علمیہ کے تذکرے سے قبل پنڈت جی کی حیات مستعار کے بعض پہلوؤں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں کہ اسلاف کی زندگی اخلاف کے لئے ایک دستور العمل، ایک اسوۂ ترقی اور ایک سیرت تمثیلی ہوتی ہے جس کے آئینہ میں آنے والی نسلیں اپنے خد و خال اور اپنے مستقبل کے نقش و نگار کا مشاہدہ کیا کرتی ہیں ؎

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

پنڈت سندر نراین مرحوم فرخ آباد کے ایک معزز و موقر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے ایک ایسی فضا اور ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جو علم و ادب کے تذکروں سے معمور تھا۔ ان کے والد ماجد پنڈت لچھمی نراین مشران مرحوم فرخ آباد کے مشہور رئیس اور بزرگ تھے۔ آپ کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور مفتوں تخلص فرماتے تھے۔ پنڈت لچھمی نراین مشران مرحوم سماجی اعتبار سے بھی ایک بلند پوزیشن رکھتے تھے۔ آپ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر ہونے کے باوجود انتہائی سادہ مزاج اور

درویش صفت انسان تھے۔ اس اعتبار سے شعروادب کا علمی وادبی ذوق پنڈت سندر نراین مشران مرحوم کے لئے نہ صرف ذاتی اور انفرادی دلچسپی کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ وہ ان کے والد بزرگوار کا روحانی ترکہ اور معنوی ورثہ بھی تھا، جس کی قدر وقیمت صرف وہی محسوس کرسکتے تھے۔ یہ بھی اپنے والد مرحوم کی طرح علوم عربیہ میں دستگاہ رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کے خطبات وتقاریر کے حرف حرف سے ملتا ہے۔

پنڈت مشران مرحوم کا دل درد قومی اور سوز وگداز ملّی کا آتشکدہ تھا۔ انھیں سماجی اصلاح اور خدمت ملک و وطن کی سچی دُھن تھی۔ وہ فطرۃً ایک اعتدال پسند اور روشن خیال انسان تھے۔ شروع ہی سے انھوں نے اپنے آپ کو قومی خدمات کے لئے وقف کر دیا تھا اور چونکہ وہ انتہا پسندانہ اور جذباتی ہنگاموں سے گریز کرتے تھے اور جذبات کی اندھا دھند رہنمائی کے بجائے عقل وشعور کی روشنی میں قدم اُٹھانے کے عادی تھے، اسی لئے پبلک کے ہر طبقہ میں ان کی قدر تھی۔ حکام ان کے پُرخلوص تعاون کے خواستگار رہتے تھے اور عوام ان کی مدبرانہ رہنمائی کے اُمیدوار۔ اپنے ملک کے اخلاقی انحطاط اور دماغی زوال کو دیکھکر ان کا حساس دل برداشت نہ کرسکا اور انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات خطبات کے ذریعہ ادا کرنا شروع کیے۔ سچائی ضائع نہیں جاتی، خلوص رائگاں نہیں ہوتا، پنڈت جی کی زبان پر سچائی، دل میں خلوص اور ہر تیور میں عزم صمیم کی جھلک تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ ان کی عظیم شخصیت اپنے معاصرین سے اپنی اہمیت وجاذبیت کا لوہا نہ منوالیتی تھوڑے ہی عرصہ میں وہ فرخ آباد کی سب سے زیادہ محبوب شخصیت بن گئے اور ہر انجمن ان کے تذکروں اور ہر سبھا ان کے چرچوں سے معمور نظر آنے لگی ؂

زفرق تا بہ قدم، ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

مرحوم کو قدرت نے فقط جادو نگار قلم ہی نہیں دیا تھا بلکہ سحرکار زبان بھی عطا کی تھی۔ اور تحریر وتقریر کی یہ جامعیت اور زبان وقلم کی یہ مہارت بہت کم انسانوں کے حصہ میں آتی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ آپ ہر بزم کی رونق اور ہر سبھا کا سنگھار تھے۔ عوام وخواص آپ کی تقریر سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ جب کسی جلسہ میں آپ کی تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو پبلک کا ذوق وشوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کی تقریر، فصاحت وبلاغت، حسن بیان اور تاثیر ادا کا ایک طلسم ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ ومعانی کا ایک بحر بیکراں ہے کہ اُبل رہا ہے۔ آپ کو لفظوں پر قدرت کامل اور ادائے خیالات کی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ بولتے تھے اور بولتے چلے جاتے تھے اور تقریر کے دوران میں تاریخی لطائف اور ادبی نکتے اس خوبی سے پیش کرتے جاتے تھے کہ مجمع پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ خشک سے خشک موضوع کو آپ کی سحر بیانی اور ہمہ دانی رنگین اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔

آپ کی تقاریر میں کس قدر ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور دلائل وبراہین کی دروبست، موضوع سے مطابقت اور علمی مواد کی کس درجہ فراوانی ہوتی ہے؟ اس کے ثبوت میں یہی خطبات پیش کیے جاسکتے ہیں، جن کے متعلق یہ بتلایا جا چکا ہے کہ یہ اپنی اصل شکل میں ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم وتنسیخ نہیں کی گئی۔ پنڈت جی کی زبان سے جو لفظ جس نہج واسلوب سے ادا ہوا تھا، اس مجموعہ میں وہ اسی نہج واسلوب سے موجود ہے۔ درحقیقت، یہ مرحوم کی تقاریر کا اصلی ریکارڈ ہے۔ انصاف کیجیے

کیا کسی معمولی اور غیر قادر الکلام خطیب اور مقرر میں یہ روانیِ بیان اور یہ تسلسل ادا پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے۔

آپ کی درخشاں زندگی کی یہ خصوصیت بیان کرنا لازم ہے کہ آپ قومی امراض کے صرف نبّاض ہی نہ تھے بلکہ چارہ گر بھی تھے جہاں آپ کی زبان درد قومی کی مرثیہ خوانی کرتی تھی وہاں آپ کا ہاتھ عقدہ ہائے ملک و ملت کا گرہ کشا بھی تھا۔ دنیا میں علم و عمل کا امتزاج بہت کم دیکھا گیا ہے۔ فردوسی نے سیستان کے ایک شہزور کو قولاً رستم بنا دیا ؎

منش کردہ ام رستم داستان

وگر نہ یلے بود در سیستان

مگر عملاً خود دربار غزنوی سے اپنے لئے انصاف بھی نہ حاصل کر سکا۔ مقصد یہ ہے کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے مگر پنڈت مشران مرحوم کی زندگی علم و عمل کا مکمل نمونہ تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اور محسوس کرتے تھے اُسے کرتے اور عمل میں بھی لاتے تھے۔ پنڈت جی تمام عمر فرقہ وارانہ کشمکش اور جماعت بندی کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کرتے رہے مگر انھوں نے ع نشستند و گفتند و برخاستند پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ فرخ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے یونٹی بورڈ قائم کیا اور عرصہ تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے درحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی قول و فعل کی صحیح عظمت اپنی پوری شان سے نظر آتی ہے۔

یوں تو مرحوم نے اپنے ادبی ذوق کی بہترین یادگار خطبات کی شکل میں ہمارے لئے چھوڑی ہے لیکن فرخ آباد پبلک لائبریری کا ذرہ ذرہ بھی آپ کی علمی خدمات کا ایک مستقل نقش پیش کر رہا ہے۔ بعض علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور پبلک کے مذاق کی اصلاح کے لئے آپ نے ۱۹۰۹ء میں اس لائبریری کا سنگ بنیاد رکھا اور اپنی زندگی ہی میں اس کی ترقی و بقا کے تمام سامان فراہم کر دیے۔ جب یہ لائبریری اپنے وجود کی تینتیس ۳۳ منزلیں طے کر چکی تو ۱۹۳۲ء میں پبلک نے اعتراف خدمات کے طور پر لائبریری ہال میں پنڈت جی کے نام کا سنگ یادگار نصب کر دیا جو ابدالآباد تک علم و ادب کے ساتھ مشران کی وابستگی کا مستقل و مستحکم ثبوت دیتا رہے گا۔ آپ نے اس لائبریری میں ہر علم و فن اور ہر زبان و ادب کی بہترین کتابیں جمع کر دی ہیں اور اس لائبریری کے ذخائر علم و ادب اور نوادر حکمت و تحقیق کو دیکھ کر پنڈت جی کے ذوق انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس لائبریری کا محل وقوع بھی بہت دلچسپ اور پُر بہار ہے۔ شاید حافظ کے اس مصرع کا صحیح استعمال اسی مقام پر ہو سکتا ہے کہ ع

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو نے آپ کی خدمات کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا کہ

> "مشران صاحب تاریخ، فلسفہ، سیاست، ادب اور عمرانیات کے بہترین عالم ہیں۔ جن کی ادبی و علمی خدمات فرخ آباد میں پبلک لائبریری قائم کرنے اور اس کی بقا کے اسباب فراہم کرنے کے باعث کبھی فنا نہیں ہو سکتیں"

یہ پنڈت موتی لال نہرو کے الفاظ ہیں، جو اُن دماغوں میں سے تھے، جن پر ہندوستان کو بحیثیت مجموعی آج تک فخر ہے۔

مشران مرحوم بہ حیثیت انسان بھی اپنی مثال آپ ہی تھے۔ حد درجہ سیر چشم، مہمان نواز، متواضع، و خلیق۔ ان کا مکان اہل کمال کا مرکز تھا اور ان کی صحبت بزرگان سلف کی بزم آرائی کا نمونہ۔ فرخ آباد کے تمام ادارے بلا امتیاز مذہب و ملت ان کے دست کرم کے ممنون اور چشم التفات کے محتاج تھے۔ وہ قومی کاموں میں جی کھول کر حصہ لیتے تھے اور شاید ہی ملک کی کوئی ایسی

مفید تحریک ہو جس میں مشران مرحوم پیش پیش نہ رہے ہوں اور اپنی انتھک کوششوں سے اپنے دائرۂ اثر میں اسے کامیاب نہ بنایا ہو۔ پنڈت جی نطرۃً معتدل اور احتیاط پسند دل و دماغ کے مالک تھے۔ اور غالبًا وہ تمام ہندوستانی رہنما، جو بعد میں سیاسی اعتبار سے انتہا پسند اور باغی کہے جانے لگے، اپنی پبلک زندگی کے آغاز میں اعتدال پسند سیاست دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ گاندھی جی کی سیاسی زندگی کا یہ واقعہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ پچھلی جنگ عظیم میں انھیں جنگی خدمات کے صلہ میں خوشنودیٔ سرکار کا پروانہ اور تمغہ ملا تھا مگر پچھلی لڑائی ختم ہونے کے بعد جو سنگین واقعات رولٹ ایکٹ، پنجاب کی فوجی بھرتی اور جلیانوالہ باغ کی خونچکاں شکل میں پیش آئے، انھوں نے ہندوستانی لبرل ازم کا خاتمہ کر دیا اور ماضی کے اعتدال پسند حال و مستقبل کے سب سے بڑے باغی اور انتہا پسند بن گئے۔ پنڈت سندر نراین مشران نے گذشتہ جنگ عظیم کے موقع پر مساعیٔ جنگ کے سلسلے میں جو تقاریر کی تھیں وہ اس مجموعہ کا اہم حصہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۵ء لغایت ۱۹۲۱ء کے حادثات سے قبل وہ سیاسی حیثیت سے کس نظریہ پر عامل تھے اور کس درجہ سلامت روی، سنجیدگی اور خود ضبطی ان کا شعار تھا لیکن لڑائی ختم ہونے پر ملک میں جو سیاسی زندگی شروع ہوئی اور پنجاب میں جو حادثات پیش آئے انھوں نے پنڈت جی کے صبر و احتیاط کے بند توڑ کر جذبات کی سیل تندرو کو آزاد کر دیا جس طرح جلیانوالہ باغ کے سانحۂ خونیں سے متاثر ہو کر ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹیگور نے سر کا خطاب حکومت کو واپس کر دیا اسی طرح پنڈت جی نے بطور احتجاج سرکاری اعزاز و مناصب ترک کر دیے اور آنریری مجسٹریٹی اور منصفی سے دستبردار ہو گئے۔

ایک مرتبہ سیاست کے میدان میں اُترنے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ مشران کسی سے پیچھے رہیں۔ اب وہ کانگریس کی روح رواں تھے۔ تحریک خلافت کے دست و بازو تھے۔ نوجوان ان کی جراتِ عمل پر دنگ اور پیران آزمودہ کار ان کے جوش و خروش پر انگشت بدنداں تھے۔

بہت کم مشاہیر دنیا میں ایسے گذرے ہیں جن کی موت بھی ان کی زندگی کی طرح شاندار اور پُر عظمت ہو۔ مشران کی موت بھی ان کی زندگی کی طرح موثر اور یادگار تھی اور یہ ان کی خصوصیت بھی بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔ ۹؍ جنوری ۱۹۳۲ء کو فرخ آباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ تھا جس کی شرکت کے لئے دیگر ارباب کمال کے علاوہ شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی بھی فرخ آباد تشریف لائے ہوئے تھے مجمع کا یہ عالم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی سخن فہموں، سخن سنجوں اور سخن گویوں کے اس بلند پایہ اجتماع کی مسند صدارت پر مشران جلوہ گر تھے۔ مشاعرہ کا آغاز پورے ذوق و شوق اور جوش و خروش کے عالم میں ہوا۔ مشران خطبۂ صدارت پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ موزوں لفظوں میں شعرا اور ارباب سخن کا تعارف کرایا، پھر مشاعرے کے اغراض و مقاصد واضح کیے۔ اس کے بعد ادب اُردو پر ایک عالمانہ تقریر شروع کی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس وقت پنڈت جی پر عجب کیفیت طاری تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی تمام روح لب و دہن میں سمٹ آئی ہے اور علم و حکمت کے دریا بہا رہی ہے۔ درمیان میں جابجا موزوں اور برجستہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔ خود بھی وجد میں تھے، سامعین بھی وجد و کیف کے عالم میں تھے کہ ناگہاں مشران کی زبان سے ایک شعر ادا ہوا اور خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ وجد و حال کا غلبہ ہے مگر حقیقت اور کچھ تھی، زندگی کا ساز آخری نغمہ کے بعد خاموش ہو گیا ؎

مرگیا، صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریف دمِ عیسیٰ نہ ہوا

کیا ایسی شاندار موت کسی اور شاندار زندگی کو بھی نصیب ہوئی ہے ؟ کیا شعر و ادب کی محفل میں کسی اور شاعر و ادیب نے بھی یوں جان دی ہے ؟ بیشک شہید ادب کا خطاب مشران ہی کے لئے ہے اور وہ واقعی شہید ادب تھا بھی۔

یقیناً مشران کی موت قابل فخر موت ہے۔ اگر زندگی فنا اور زوال کی کشمکش سے آزاد بھی ہوتی تب بھی جینے والے ایسی موت کی خواہش کرتے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خطباتِ مشران پر ایک تنقیدی نظر!

تمہید۔ فن خطابت۔ ادب و سماج۔ اردو کے محرکات ارتقا اور اسباب ظہور۔ اردو میں ہندو مسلم ادبا کا حصہ۔ ہندوستانی قومیت اور مشترکہ سماج کی تشکیل۔ نونہالان کشمیر کی ادب نوازیاں اور پنڈت مشران مرحوم کی زندگی کی خصوصیات۔ ان تمام ابتدائی اور وسطی مرحلوں سے گذر کر اب ہم اس بحث کے اختتامی یا مرکزی نقطہ تک پہونچ رہے ہیں۔ اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ اردو کی تاریخی اہمیت اور پنڈت جی کی انفرادی خصوصیات کی ایک دلچسپ داستان تھی۔ ناگزیر تھا کہ مشران کی ادبی روح اور ان کے خطبات کی صحیح اور حقیقی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ان تمام نقاط بحث کو چھیڑا جائے۔ کیونکہ ہم نے اپنے ممدوح (ہیرو) کو ایک ایسے ادیب کی شکل میں پیش کیا ہے جو ہندو مسلم اتحاد کا مکمل نمونہ اور ادب اردو کا سچا خادم تھا۔ ہم نے اس بحث کا خاصہ حصہ ایک خاص مسئلہ کی تشریح و وضاحت میں صرف کر دیا ہے۔ وہ مسئلہ بدقسمتی سے اردو اور ہندی کے فرقہ پرستانہ تصادم کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے ڈاکٹر تاراچند اور سر تیج بہادر سپرو کے کچھ اقوال نقل کیے ہیں۔ اب ہم پنڈت مشران مرحوم کے زاویۂ نظر کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ زبان جس کو ہم لوگ اردو، ہمارے بزرگ ہندی اور غیر ملکی ماہرین السنہ (گیرسن و تاسی وغیرہ) ہندوستانی کہکر پکارتے ہیں، کوئی بدیسی بولی نہیں ہے بلکہ یہ خالص ہندوستانی پیداوار ہے۔ جس میں ایرانی، ترکی، عربی اور بعد کو مغربی ادبیات کی رنگ آمیزیاں شامل ہو گئی ہیں۔ یہ زبان یہیں پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی اور یہیں بولی جاتی ہے۔ آپ اسے اردو کے نام سے پکاریے یا ہندی کہیے۔ ناموں کی تبدیلی سے اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ زبان ہزار برس کی سماجی ترقیوں اور تمدنی ملاپ کا نتیجہ ہے۔ آئیے دیکھیں پنڈت مشران اس مسئلہ میں کیا رائے رکھتے ہیں آپ نے ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے اردو ہندی مسئلہ پر ان لفظوں میں اظہار خیال کیا تھا کہ

"لوگ آج کل اردو ہندی کے سوال کو مذہبی رنگ میں پیش کر کے غلامانہ ذہنیت کی بنیادیں مستحکم کر رہے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کی زبان کاٹنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اگر دونوں گونگے ہو گئے تو متمدن اقوام کی نظر میں ہندوستان کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ ہم کو قومی تعمیر اور ملکی تنظیم کے لئے اس غیر ضروری سوال کو چھوڑ کر دوسری سیاسی گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اردو کہو یا ہندی، میرے خیال میں

یہ دونوں ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ اگر اُردو کو عربی اور ہندی کو سنسکرت نہ بنایا جائے تو نتیجہ میں ہم ہندو اور مسلمانوں کی زبان وہی ایک رہ جاتی ہے جو مصلح قوم اکبر اعظم کی تربیت کردہ اور ہندو مسلمان اتحاد کی بولتی ہوئی یادگار ہے۔"

درحقیقت پنڈت جی کے متذکرہ بالا الفاظ ہماری تمام خامہ فرسائی کا نچوڑ ہیں۔ پنڈت جی نے اکبر اعظم کی مساعی اتحاد کی طرف اشارہ کرکے ہندوستان کی پچھلی تاریخ کے اُن پہلوؤں کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے جن پر ہم سطور بالا میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ آپ نے اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا ہے اور تاریخی اعتبار سے صحیح تر بھی یہی ہے کہ ہندی اور اردو کی لسانی بناوٹ میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ پنڈت جی نے اپنے خطبات میں جا بجا اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خود ان کے خیالات، اس حقیقت کی واضح تفسیر تھے۔ پنڈت جی کو اسلامی تاریخ، اسلامی ادبیات اور اسلامی روایات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ قدرت کے غیر مرئی ہاتھ نے کس طرح ہندوستانی قوموں کے اتحاد کے لئے روایات، تہذیب، عقائد، فلسفہ اور خیالات کے مشترک سانچے بنائے تھے اور انہی مشترک سانچوں میں قومیت متحدہ کی پرورش ہوئی جو آج ہم سب کے لئے باعث افتخار ہے۔

پنڈت جی کے خطبات و تقاریر کا مطالعہ گہرے ادبی مسائل کی واقفیت اور علمی تاریخی نکات کے حصول کے لئے ناگزیر ہے۔ آپ چٹکلوں میں وہ گُر بتا جاتے ہیں جو مستقل علمی تصانیف کی ورق گردانی کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ان خطبات کے مطالعہ سے نظر میں وسعت اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

خالی از دلچسپی نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں پنڈت جی کے بعض خطبوں کے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے جائیں۔ آپ نے شعر و شاعری کی عظمت پر جو خطبہ ۲۸ / اپریل ۱۹۲۸ء کو ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، حقیقۃً وہ بجائے خود ایک جامع مقالہ ہے جو فن شعر کی عظمت اور شعراء کے انداز بیان پر تحقیقی روشنی ڈالتا ہے۔ ضمنی طور پر اس خطبہ سے پنڈت جی کے زور بیان اور تسلسل کلام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص بغیر کسی تحریری یادداشت کی مدد کے اتنے اہم موضوع کو کس کمال خوبی اور تسلسل سے کس طرح بیان کر سکتا ہے۔

آپ نے اس خطبہ کے آغاز میں شعراء کی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ عرب اپنے شاعروں کو کس قدر عزیز و قابل فخر سمجھتے تھے۔ مثال میں پنڈت جی نے کسی شاعر کا ایک شعر پیش کیا ہے جس سے شاعر کی قدرت و طاقت کا اندازہ ہوتا ہے شاعر فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ ؎

یکے را زمہ اندر آرم بچاہ
یکے را زچہ برفرازم بماہ

جس کو چاہوں خاک میں ملا دوں اور جس کو چاہوں آسمان پر بٹھا دوں۔ عربی شعراء کے اثر و اقتدار کے تذکرے کے بعد آپ نے عجمی شعراء کا تذکرہ کیا ہے اور بطور مثال فردوسی اور محمود کا واقعہ پیش کیا ہے کہ محمود نے بڑی بڑی سلطنتوں کا نام و نشان مٹا دیا اور بڑے بڑے سلاطین کی ہستی کو خاک میں ملا دیا مگر دہقان[۱] زادۂ طوس یعنی فردوسی کے چند شعر

---

[۱] غزنوی شعراء نے ازراہ تحقیر فردوسی کو یہی خطاب دیا تھا ۱۲

نہ بھلا سکا جو اس نے محمود کی ہجو میں کہے تھے۔ بقول فردوسی ؎

چو شاعر برنجد بگوید ہجا
بماند ہجا تا قیامت بجا

پنڈت جی کی تاریخی نظر بہت وسیع اور بہت ہمہ گیر ہے۔ یہی نہیں کہ عربی و عجمی شعراء کے حالات ہی ان کے پیش نظر ہیں بلکہ ہندوستان کی ادبی تاریخ کا ہر ورق بھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہے چنانچہ اسی خطبہ میں وہ ہندوستانی درباروں کی شاعر نوازی اور شعر فہمی پر ان لفظوں میں روشنی ڈالتے ہیں کہ

"سلاطین مغلیہ کے عہد میں ایران کے بڑے بڑے شعراء اپنا وطن مالوف چھوڑ کر ہندوستان کھنچے ہوئے چلے آتے تھے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانہ کو اپنا قبلۂ مراد قرار دے دیا تھا۔ مغل سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب و زینت سمجھتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے"

ان تاریخی واقعات کے اعادے کے بعد آپ نے حقیقت شعر کے علمی موضوع کی طرف توجہ کی ہے۔ آپ کے اپنے الفاظ میں

"صاحبو! میں نے شعر و شاعری کی عظمت اور شعراء کی قدر و منزلت آپ کی خدمت میں عرض کی۔ اب میں شعر کی حقیقت مختصراً بیان کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارے میں ہیں وہ سناؤں گا"

خطبہ کا یہ حصہ خاص طور پر پڑھنے کی قابل ہے۔ (کاش سننے کا موقع ملتا!) آپ نے ماہیت شعر کی وضاحت ارسطو کے بیان سے کی ہے جس کی غیر فانی کتاب "بوطیقا" فن شعر پر دنیا کی اہم ترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ ارسطو نے شعر کی جو تعریف کی ہے اُسے آپ نے بیان کیا ہے

"شعر ایک قسم کی نقالی یا مصوری کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور مادی اشیاء کی تصویر کشی کرتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات و خیالات کی مصوری پر قادر ہے"

اس کے بعد آپ نے ادبی کتابوں میں شعر کی جو تعریف کی گئی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے یعنی

"وہ کلام جو متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو"

پھر اس منطقی تعریف کی جرح و تعدیل کر کے نظامی عروضی سمرقندی کے خیالات پیش کیے ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جان اسٹوارٹ مل نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کا ایشیائی ناقدوں کی تعریف سے موازنہ کیا ہے، دراصل حقیقت اس طرح ظاہر کی ہے کہ

"شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب نے بیان کیا ہے اور نہ اس قدر وسیع ہے جتنا علمائے عرب و عجم کی تعریفوں سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ شعر کی ماہیت وہی ہے جو ارسطو نے بیان کی ہے یعنی جذبات انسانی اور مناظر قدرت کی تصویر کشی"

اس کے بعد پنڈت جی نے اصول بلاغت کی رو سے شعر کی تحلیل کی ہے اور بتلایا ہے کہ شعر دراصل شعور و احساس کا نام ہے

لہٰذا شاعر وہی ہے جو احساسات و تاثرات کی صحیح اور قدرتی ترجمانی کر سکے۔ ماہیت شعر کے بیان کے بعد آپ نے اجزائے ترکیب شعر کا ذکر کیا ہے کہ شعر دو عناصر پر مشتمل ہے، مادہ اور صورت۔ مادہ یعنی مضمون اور صورت یعنی ترکیب و بندش۔ اسی ضمن میں محاکات اور تخئیل پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے اور محاکات اور مرقع نگاری کے درمیان جو فرق ہے اُسے واضح کیا ہے۔

مرقع نگاری کی مثالیں آپ نے سکندر نامہ اور شاہنامہ سے پیش کی ہیں اور فردوسی کے کمالات سخن کو جی کھول کے سراہا ہے اور یہ آپ کی سخن فہمی کی روشن دلیل ہے۔ پنڈت جی نے فردوسی اور نظامی کے درمیان ایک مرقع نگار اور فطرت شناس شاعر کی حیثیت سے جو فرق بیان کیا ہے اور جن قوی دلیلوں سے فردوسی کی عظمت سخن ظاہر کی ہے وہ موقع لاجواب ہے۔ یہ تمام چیزیں اگرچہ علامہ شبلی نے شعر العجم میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں مگر دونوں میں حال و قال کا فرق ہے۔ پنڈت جی نے اُن تمام دلائل کو نئے انداز سے اپنے خطبہ میں پیش کیا ہے اور جا بجا اپنی ذاتی بصیرت و اجتہاد سے کام لیا ہے۔ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ ہم تفصیل سے ان بحثوں کو دہرا سکیں اور نہ شاید اس کی ضرورت ہی ہے۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ پنڈت جی کے خطبات ادبی نقطۂ نظر سے کس قدر جامع اور تاریخی اعتبار سے کس قدر مکمل ہیں ۔۔ پنڈت جی کی سخن شناسی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اردو شعرا میں ان کا محبوب انیسؔ ہے۔ انھوں نے انیسؔ کو ہر موقع پر بطور مثال پیش کیا ہے۔ انیسؔ کی فطرت شناسی انیسؔ کی واقعہ نگاری، انیسؔ کی منظر کشی انیسؔ کی رفعت تخئیل، غرض انیسؔ کی شاعری کے ہر ہر پہلو کو ہر ہر موقع پر وہ بے نقاب کرتے ہیں اور اپنی ادبی صلاحیتوں کا شاندار ثبوت دیتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس خطبہ میں بھی آپ نے جا بجا انیسؔ کے مرثیوں سے مثالیں دی ہیں اور ضمناً شہدائے کربلا کا اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ ان کی تاریخی بصیرت اور معلومات پر بے ساختہ تحسین و آفریں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعر کی ماہیت و ترکیب کے بیان اور مکمل بیان کے بعد ضمناً آپ نے ایشیائی شاعری پر اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ

"ایشیائی شاعری اخلاقی اور اصلاحی خیالات و مضامین سے تہی دامن ہے اور دور از کار باتوں سے بھری پڑی ہے"

اس اعتراض کا جواب پنڈت جی نے جس قابلیت اور وسعت نظری سے دیا ہے وہ حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔ معترض کو یہ بتانے کے لئے کہ ایشیائی شاعری کا دامن اخلاقی موتیوں سے خالی نہیں ہے، پنڈت جی نے متعدد شعر پیش کیے ہیں اور پھر ان سے جو اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں، انھیں شمار کرایا ہے اور کہا ہے کہ

"یہ کہنا غلط ہے کہ ایشیائی شاعروں نے اخلاقی مضامین نظم کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ گلستان اور بوستاں ہی میں جتنے اخلاقی مسائل پیش کیے گئے ہیں ان کا شمار ناممکن ہے"

سلسلۂ بیان کو نیا ربط دے کر آپ نے توارد، سرقہ، ترجمہ اور استنباط کے موضوع پر جو خیالات ظاہر کیے ہیں، ضرورت ہے کہ ہمارے نوآموز یا نوخیز شعرا، انھیں غور سے پڑھیں اور اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔ اس بحث میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ توارد شعرا کے درمیان ممکن ہے اور وہ عیب نہیں۔ البتہ خیالات کا سرقہ ہو یا لفظوں کی چوری یہ دونوں چیزیں ادبی دنیا میں بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہیں جتنا قانونی دنیا میں۔ ہاں غیر زبانوں کے شعروں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے، مگر خوبی یہ ہے کہ غیر زبان سے کوئی مضمون اگر اخذ کیا جائے تو ترقی کے ساتھ کہ اس سے ادب مالا مال ہوتا ہے لیکن اگر سلیقہ اور اہتمام سے ترجمہ نہیں کیا گیا تو وہ ایک حرکت باطل اور فضول محض ہے۔ دوسرے کے مضامین کو خود سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ نظم کرنا بجائے خود ایک صنعت ہے۔ پنڈت جی

نے اس صورت کو حسن قرار دیا ہے اور مثال میں سعدی کا ایک شعر پیش کیا ہے ؎

ترا ہر آئنہ باید بہ شہر دیگر رفت
کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

پنڈت جی اس شعر کو پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

"خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو درست ہے لیکن طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے۔ عاشق کا محبوب کو یہ مشورہ دینا کہ تم اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلے جاؤ کیونکہ یہاں تمھاری دلبری کے لئے کوئی دل باقی نہیں رہا یہ ایک نازیبا سی بات ہے۔ لہذا انھوں نے اسی مضمون کو ترقی دے کر شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

ایک دوسرے ادبی خطبہ میں آپ نے نظم و نثر کے موضوع پر گلفشانی کی ہے اور نئے نکات پیدا کیے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فصاحت کی تعریف ان لفظوں میں فرمائی ہے کہ

"فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں۔۔۔۔ مثلاً یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمہ کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود فصیح ہے لیکن اگر وہ ایسے سُر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے۔ الفاظ کا بھی یہی حال ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اس کے گرد و پیش ایسے متناسب اور موزوں الفاظ جمع کر دیے جائیں کہ وہ آپس میں میل کھا جائیں اور یہ دلیل کمال فصاحت کی ہے"

اس کے بعد میر انیس کے بعض مصرعے آپ نے مثال میں پیش کیے ہیں اور اس قابلیت سے ان کی خصوصیات فصاحت کو واضح کیا ہے کہ ہر نکتہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ میر انیس کے علاوہ قاآنی کا ایک شعر بھی دلیل میں لائے ہیں ؎

قصورش با فلک ہمسر، ہمہ خشتش ز سیم و زر
لاطش نافۂ از فر، حصاتش لولوے لالا

پنڈت جی نے اس شعر کی جو فنی تحلیل کی ہے وہ ان کی ادبی بصیرت کا شاہکار ہے۔ اسی ضمن میں عجمی اور ہندوستانی شعرا کے فارسی کلام کا موازنہ کیا ہے اور بڑی دلچسپ مثالوں سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے۔ عجمی اور ہندوستانی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے مشر آن مرحوم نے ایک نئی نکتہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"بعض شاعر صنعت سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی وہی صنعت لے آتے ہیں۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے "باید مطلع از صنعت سجع عاری باشد" چنانچہ شعرائے فارس نے اس صنعت میں جس قدر قصائد لکھے ہیں ان میں یہ التزام رکھا ہے لیکن ہندوستانی شعرا اس التزام کو نہیں برتتے اور یہ ان کی غلطی ہے"

پنڈت جی نے اس سلسلے میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے بعد بلاغت کی تعریف نقل کی ہے

"صاحبو! بلاغت کی تعریف علمانے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ (بعض نے) بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دیدیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلاغت کا جزو اعظم ہے "بلاغتہ الکلام مطابق المقام" یعنی یہ کہ کلام حسب مقام ہو۔"
پھر بتلایا ہے کہ آخر علمائے معانی نے بلاغت کی یہ تعریف ناقص قرار دی اور اب بلاغت کا جزو فصاحت بھی قرار پایا۔ لیکن ہارون رشید عباسی کے عہد میں پھر اس تعریف پر اعتراض کیا گیا تھا۔ ہارون کا قول تھا

"احسن الکلام ما قلّ و دلّ"

"اب بلاغت کی تعریف یہ قرار پائی۔ کلام حسب مقام ہو، کلام میں فصاحت ہو اور عبارت ما قلّ و دلّ ہو۔ یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں۔"

اس کے بعد پنڈت جی نے بلیغ نثر کی مثالیں پیش کی ہیں اور رسالہ عساکر عباسیہ، طاہر ذوالیمینین کی ایک عبارت نقل کی ہے اور پھر اس عبارت سے جو بلیغ نکات اخذ کیے ہیں، حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

یہی نہیں کہ اصول بلاغت کی تشریح میں آپ نے صرف نثر ہی کے نمونے پیش کیے ہوں بلکہ نظم کی طرف بھی توجہ کی ہے اور مقبل و انیس کے مراثی کے بعض ٹکڑے پیش کیے ہیں اور انھیں بلاغت کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ اسی بحث میں بعض تاریخی لطائف اس خوبی سے پیش کیے ہیں کہ نہ صرف موضوع پر مکمل روشنی پڑتی ہے بلکہ کلام میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

پنڈت جی کے خطبات میں بعض وقت افسانہ در افسانہ اور داستان در داستان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو بہت لطف دیتی ہے اور خطیب کی اصلی شان ہی یہ ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرے۔ چنانچہ اسی خطبہ میں فصاحت و بلاغت کی بحث کرتے کرتے انھوں نے فن انشاد (شعر خوانی) کے اصول و قواعد پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو ادب کے لئے یہ بحث شاید نئی ہے۔ فن تجوید و قرأت پر ہماری زبان میں اکثر کتابیں لکھی گئیں مگر فن شعر خوانی پر کوئی رسالہ موجود نہیں ہے۔ البتہ مرحوم حامد علی خاں عفا اللہ امروہوی بار۔ ایٹ۔ لا نے اپنے سفرنامۂ انگلستان میں ضمنی طور پر اس فن کا تذکرہ کیا ہے اور انگلستان کے بعض ماہرین فن کے کمالات پر روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت جی فرماتے ہیں کہ

"کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا۔ بہرحال میری نظر سے نہیں گذرا اور باوجود تلاش مجھے نہیں ملا۔ میں اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی ہوگا[۱]"

اس کے بعد پنڈت جی نے اس فن کے اصول بیان کیے ہیں اور چند شعر بطور مثال پیش کیے ہیں اور اس کی خواندگی اور قرأت کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً

نہال باغ علّیین۔ بہار مرغزار دیں
نسیم روضۂ یٰسین۔ شمیم دوحۂ طاہا

---

[۱] خدا معلوم یہ رسالہ مرتب ہوا یا نہیں بہرحال مرحوم کے کتب خانے میں دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ پنڈت جی کا دوسرا رسالہ فن تذکیر و تانیث ملا ہے۔ اُمید ہے جلد اشاعت پذیر ہوگا۔

اس شعر کی خواندگی کا آپ نے جو طریقہ بتلایا ہے۔ اُسے آپ کے ہی لفظوں میں سُنیئے

"مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم روضہ اور شمیم دو حصہ پر زور دینا چاہئے جب شعر اس طرح پڑھا جائے گا تو شعر کی خوبی وہ چند نہیں ہزار چند ہو جائے گی"

پنڈت جی نے خواندگی شعر کے عیوب ان لفظوں میں بیان کیے ہیں

"یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظی کی جگہ مخفی اور مخفی کی جگہ ملفوظی پڑھتے ہیں ؎

گدائے کہ بر خاطرش بند نیست
بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

"بہ" کی "ہ" ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیئے کہ "بہ" کی (ہ) "از" کی (ز) میں مل کر آواز دے اور "از" کا (ا) گر جائے یعنی آواز نہ دے۔ الخ

اسی طرح پنڈت جی نے قرأت شعر کو متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے اور خصوصیت سے یورپ کے اہل کمال کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں :-

"پروفیسر ہارٹلے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس فن کے ماہر تھے۔ وہ جب شعر پڑھتے تھے تو خود شعر کی تصویر بن جاتے تھے۔ میرے خیال میں ہندوستان میں خدائے سخن میر انیس فن انشاد و خواندگی کے ماہر و امام تھے"

پنڈت جی ذوق سلیم اور مذاق صحیح کے مالک تھے۔ جہاں وہ ادبیات اُردو کے محاسن اور خوبیوں کو بتمام و کمال سمجھتے تھے وہاں وہ اس کے نقائص اور اسقام پر نکتہ چینی اور تنقید کرنے میں بھی دلیر تھے۔ آپ اپنے خطبہ میں اردو شعراء اور ادیبوں کو اس طرح مشورہ دیتے ہیں

"نظم اردو میں نئے نئے، مفید اور بکارآمد مضامین داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے خیالات، اس کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال تک پہونچانے والے خیالات، قوم کی غیرت و حمیت کو متحرک کرنے والے خیالات، اگر نظم اُردو میں داخل کیے جائیں تو ملک و قوم کے فروغ کا باعث ہونگے اگر یہ ترمیم اردو شاعری میں ہو جائے (جو بالفعل ہو رہی ہے) تو پھر اردو زبان کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی۔"

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ ایشیائی ادب میں الفاظ پر زیادہ زور دیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ

"ایشیائی شاعری کا پہلا مقصد زباندانی ہے۔ اس میں اخلاقی مضامین کی کمی نہیں۔ یہ مضامین ایسے پیرایہ میں بیان کیے جائیں کہ لوازم شعری کا پورا پورا حق ادا ہو جائے۔ انگریزی اور اردو شاعری میں یہی فرق ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی شاعری میں اخلاقیات کا بیان بہت دلنشین ہے اور واقعات نفس الامری کا مرقع کھینچنے میں خلاف عادت باتیں لکھنے کی ضرورت نہیں"

ہندوستانی اور فارسی شعراء کی پوزیشن ان لفظوں میں صاف کرتے ہیں کہ

"ہندوستان اور فارس میں بہت سے شاعر ایسے گذرے ہیں کہ جنھوں نے تغزل کے رنگ میں اخلاقیات

کے مضامین نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کیے ہیں۔ اور بایں ہمہ صنعت شعری کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے"

اس کے بعد امیر لکھنوی کے بہت سے شعر بطور استناد پیش کیے ہیں اور اپنے نظریہ کو بدلائل واضح ثابت کیا ہے

مختصر یہ ہے کہ پنڈت جی کا ادبی نظریہ؛ ان کی جامعیت تنقیدی، ان کی استعداد علمی اور ذوق کے شایان شان ہے۔ ان کے خطبات، لطیف ادبی نکتوں سے معمور ہیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کی قوت تخیل ہے۔ چونکہ ان کا تاریخی مطالعہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا اس لئے وہ جس نکتہ کو بیان کرتے تھے اس کے ثبوت میں صدہا تاریخی حکایات اور متقدمین کے اقوال نقل کر دیتے تھے۔ وہ عربی، فارسی اور مغربی ادبیات سے کما حقہ آگاہ تھے اور اس منطقی ترتیب سے اپنے دلائل پیش کرتے تھے کہ قبول کر لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

یہ سب کیا تھا؟۔ درحقیقت یہ کرشمہ تھا اُس ماحول کا جس میں ہمارے علم دوست ہیرو نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ ماحول جس میں، ہندو، اسلامی علوم کو کمال رغبت سے حاصل کرتے تھے اور مسلمان ہندو ادبیات، اور ہندو روایات سے غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ دونوں کی رسوم مشترک تھیں۔ دونوں کا فلسفہ مشترک تھا۔ من و تو کا امتیاز مٹ گیا تھا اور کامل اتحاد و اتفاق کا دور دورہ تھا اور اُردو اس وحدت کاملہ کا مظہر تھی جس کے متعلق پنڈت جی نے کہا ہے کہ

"اردو مصلح قوم اکبر اعظم کا عطیہ اور ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ پنڈت جی کا مجموعۂ خطبات ۱۵ خطبوں پر مشتمل ہے جس میں ادبی خطبات تین ہیں۔ ادبی خطبات پر ہم ایک سرسری نظر گذشتہ سطور میں ڈال چکے ہیں۔ بقیہ خطبات میں چار خطبے خالص اسلامی موضوعات پر ہیں۔ سیرۃ النبیؐ، عید قرباں، علمائے اسلام کا شکریہ اور مصطفےٰ کمال کی فتح۔ ہم ان خطبات پر آئندہ سطور میں روشنی ڈالیں گے۔ اسلامی خطبات کے علاوہ مذہبی رنگ کے چند خطبات اور ہیں۔ ان میں سے دو خطبے تھیاسوفی کے موضوع پر، دو خطبے مسیحیت کے متعلق اور بقیہ رامائن اور دسہرہ وغیرہ کے موضوعات پر دیے گئے تھے۔ تھیاسوفی کے موضوع پر پنڈت جی نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دلی خیالات کا عکس ہے کیونکہ تھیاسوفی (ویدانت یا تصوف) سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ ان کی زندگی کا نصب العین ایک شعر تھا ؎

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

اور تھیاسوفی ازم، صلح کل کا علمبردار ہے۔ لہذا پنڈت جی کو تھیاسوفی ازم سے دلچسپی لینا ناگزیر تھی۔ اسلامی موضوعات پر پنڈت جی نے جو کچھ فرمایا ہے شاید ہی کوئی اسلامی خطیب اس پر کچھ اضافہ کر سکے۔ ہم نے مقدمہ کی ابتدا میں ژاں ژاک روسو کا ایک مقولہ نقل کیا تھا۔

"ادب انسانی تصور کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے"

آپ خطبات شرات کو اس مقولہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ ان کے حرف حرف کو پڑھ جائیے۔ آپ کو حقیر ترین تعصبات کی گندگی اور امتیازات آئین و ملت کی آلودگی کہیں نظر نہ آئے گی۔ وہ یقیناً اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق کہنے والے نے کہا ہے کہ

"اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو نہ کہیں مذہب کے نام پر لڑائیاں ہوں

اور نہ وطنیت کے لئے خانہ جنگیاں"

واقعہ یہ ہے کہ پنڈت جی کا مذہب انسانیت اور عقیدہ بین الاقوامیت تھا۔ اس کا صحیح اندازہ ان کے اسلامی خطبات سے ہو سکتا ہے۔ موصوف یوم میلاد النبی کے خطبہ کا آغاز ان لفظوں سے فرماتے ہیں کہ

"صاحبان ذی شان! آج کا روز دلفروز خود نوروز ہے اور یہ روز سعید بجائے خود یوم عید ہے۔ ہندو مسلم بھائیو!
جناب پیغمبر صاحب کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کا احصار کرنا اس ضیق وقت میں محال بلکہ لاطائل
خیال ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کریں کیا مجال ہے۔ لہذا بطور مشتے از خروارے اور قطرہ از دریا بارے عرض
کروں گا"

اور پھر اس مرصع تمہید کے بعد بطور مشتے از خروارے آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ کہیں سیرۃ رسول پر فلسفیانہ حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ کہیں جذبات عقیدت سے مجبور ہو کر نغمہ نعت چھیڑ دیا ہے۔ کہیں تاریخی تبصرہ ہے تو کہیں اخلاقی نقطہ نظر۔ الغرض یہ خطبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ یہ اس بہترین لٹریچر میں شامل کرنے کے قابل ہے جو سیرۃ نگاروں نے سیرت رسول پر دنیا کی کسی زبان میں بھی مرتب کیا ہے۔

پنڈت جی اسلامیات کے بہترین عالم تھے اور آپ اسلامی تاریخ کے جزو و کل سے باخبر تھے۔ ادبی خطبات میں کلام انیس پر بحث کرتے کرتے آپ نے واقعہ کربلا کی جن تلمیحات کو بے نقاب کیا ہے وہ آپ کی وسعت نظر کا ثبوت ہے۔ آپ اپنے خطبات میں جا بجا تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور نمایاں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ضروری نکات کی تشریح کرتے چلے جاتے ہیں چنانچہ خطبات موسیقی میں اسحاق موصلی، عریب (مغنیہ) ہارون الرشید اور معتز باللہ کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور عہد عباسیہ میں فن موسیقی کی جو قدر و منزلت تھی اُسے سراہا ہے۔ ادبی خطبات میں عربی شعراء کے اثر و نفوذ پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ علمائے اسلام پر جو خطبہ دیا ہے وہ اہم تاریخی معلومات سے لبریز ہے۔ آپ نے اپنے خطبوں میں ــــ تاج بغدادی، ابو حاتم رازی، ابوالعلاء ہمدانی، ابو نصر فارابی، ابوالعباس رازی، ابوالبرکات، ابوالحسن طبیب، ابوبکر بن بشار اور ابو عبداللہ اصفہانی کی شخصیتوں اور ان کی مصنفات کا سیر حاصل تذکرہ کیا ہے اور علمائے اسلام کی ادبی، طبی اور تحقیقی خدمات کی داد دی ہے۔

یہ کہنا کہ آپ عربی کے علامۂ اجل تھے، آپ کے کمالات علمی کے اظہار میں بخل کرنا ہے کیونکہ اس مجموعہ کا ناظر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی زبان پر آپ کو اسی قدر عبور حاصل تھا جتنا کسی خالص ولایتی (عجم نژاد) کو ہو سکتا ہے۔ آپ ادبیات فارسی کی ان فنی خوبیوں سے واقف تھے جن تک بہت کم نگاہیں پہونچتی ہیں۔ اس کا اندازہ ناممکن ہے کہ آپ کو اساتذۂ عرب و عجم کے کتنے منتخب اشعار حفظ تھے۔ نثر میں برمحل نظم کا استعمال کرنا بھی ایک فن ہے اور شران مرحوم بلاشبہ اس فن کے مجتہد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی شعراء میں فردوسی، سعدی اور میرزا حبیب قاآنی ان کے محبوب شاعر تھے اور اسی چیز سے ان کی سلامتی طبع اور صحت مذاق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک موصوف کے جن خطبوں کی ذکر ہوا ان کے علاوہ بقیہ خطبات گو کہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے مختلف اور رنگ رنگ ہیں لیکن زبان و بیان کی پاکیزگی، روانی اور سلاست و فصاحت کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی

پنڈت جی کی زبان میں بلا کا لوچ ہے غضب کی آمد ہے۔ وہ کہیں محاورہ بندی اور روزمرہ کا کمال دکھلاتے ہیں اور کہیں مسجع عبارت لکھتے ہیں۔ دونوں جگہ زبان کی گھلاوٹ اور قدرت کلام مزہ دیتی ہے۔

اس سلسلے میں اگر ان کے خطبات کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کیے جائیں تو بحث کا دامن بہت وسیع ہو جائے گا اور وقت کی کمی اور فرصت کا اختصار اس کا متحمل نہیں ہو سکتا مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ ان کا ہر خطبہ اپنی جداگانہ ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بیش بہا علمی مواد کے لحاظ سے اپنے مطالعہ کی خاموش سفارش ہے بلکہ اپنے حسن ادا اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اپنی دلچسپی کی منہ بولتی شہادت ہے۔

تاریخی خطبات جو جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء) کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے موضوع کی عظمت کے لحاظ سے ہماری خاص توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے مگر ہم اس وقت صرف ان کا خاکہ پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے تاکہ نکتہ رس ماہرین فنِ تاریخ اس خاکہ کو پڑھکر اندازہ کر لیں کہ مضمون نگار نے اس موضوع کے کسی بھی دقیق اور اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ پنڈت جی اپنی پبلک زندگی کی ابتدا میں ایک اعتدال پسند اور محتاط شخص تھے چنانچہ ان خطبات میں حرف حرف سے آپ کی معتدل و محتاط سیاست دانی کا پتہ چلتا ہے اور مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ قائل کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہو۔ اس زمانہ میں ہندوستانی سیاست جس نقطہ پر تھی اس کے لحاظ سے لبرل ازم ہی مناسب تھا۔ ہر سہ خطبات کا مجموعی خاکہ یہ ہے۔

اول آپ نے جنگ عظیم کے تاریخی اسباب اور محاربے فریقین کے سیاسی روابط پر قیمتی روشنی ڈالی ہے، پھر سرویا، روس، آسٹریا، جرمن اور فرانس کے باہمی تعلقات، یورپ کی گذشتہ تاریخ مریا ستہائے بلقان کی سیاسی حالت اور جنگ عظیم کے اسبابِ ظہور پر عالمانہ بحث کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ کس طرح سرویا اور آسٹریا کی رقابت نے دول یورپ کو زندگی اور موت کی جدوجہد میں مبتلا کر دیا۔ ضمناً برطانیہ کی معدلت گستری اور انصاف پسندی کا شاندار لفظوں میں قصیدہ بھی پڑھا ہے۔

پھر اتحادیوں کی اخلاقی برتری اور آسٹریا و جرمن کی وحشیانہ حرکات کا مہیب افسانہ بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ آخری فتح کا دارومدار گا ذوری یعنی مادی طاقت کے بیدردانہ استعمال پر نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی طاقت پر ہوتا ہے۔

آگے چل کر اتحادی فوجوں کی شاندار کامیابیوں کی تفصیل پیش کی ہے اور ترکی کی شرکت جنگ کو اسلامی مفاد کے لئے مضر بتایا ہے۔ ترکی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جی نے ترکی کی جرمن نوازی کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان کی سچائی صرف آج کا مورخ ہی جان سکتا ہے جبکہ اس لڑائی کی ہر تفصیل منظر عام پر آ چکی ہے۔ اسی خطبہ میں آپ نے ہندوستانیوں کی امداد جنگ کا تذکرہ کیا ہے اور بلجیم میں جرمن مظالم کی خوفناک روداد سنائی ہے۔

آسٹریا، سرویا اور روس کی لڑائیوں کا تذکرہ کر کے ایک پختہ کار جنگی مبصر کی طرح محاذ جنگ کی مکمل ڈائری پیش کی ہے۔

لکسمبرگ کے تاریخی حالات، بلجیم کی مختصر تاریخ اور دول یورپ کے باہمی عہد ناموں کا ذکر کیا ہے اور ان تمام جزئیات کو بیان کر دیا ہے جو ریچ اینٹ ورپ اور بلجیم کے دوسرے جنگی مورچوں پر فوجی نقل و حرکت کے سلسلے میں پیش آئیں۔ یہ تمام تفصیلات تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔

اس سلسلے کا آخری خطبہ وہ ہے جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں آپ نے یوم فتح کے موقع پر ٹاؤن ہال (فرخ آباد) کے ایک جلسۂ تہنیت میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبہ میں آپ نے ہندوستانی خدمات کو ان لفظوں میں گنایا ہے کہ

"ہمارے ملک ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس نے اس جنگ عظیم میں کافی حصہ لیا۔ اس کی فوجوں نے ایشیا، یورپ اور افریقہ کی فوجوں کے سامنے بہادریاں دکھائیں اور اپنے ملک کا بول بالا کیا۔"

اس کے بعد آپ نے برطانوی مدبرین کے وہ پیغام نقل کیے ہیں جو انھوں نے ہندوستانیوں کی امداد جنگ کے شکریہ میں حکومت ہند کو ارسال کیے تھے اور اس چیز پر خوشی ظاہر کی تھی کہ بین الاقوامی صلح کانفرنس میں ہندوستان کو بھی اپنی نمائندگی کے لئے سر ایس پی سنہا کو بھیجنے کا استحقاق دیا گیا ہے۔

اس تقریر کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوتا ہے

"یا الٰہی! تو نے ہمارے وطن مالوف کو اس لڑائی کی آگ سے محفوظ رکھا اور اس موقع پر تو نے ہم کو برٹش قوم کے سایۂ عاطفت میں پناہ دی جس کی بدولت تمام دنیا کی تہذیب و آزادی برقرار رہی۔ یا الٰہی تو سالہا سال ہمارے شہنشاہ معظم کو سلطنت پر حکمران اور مسرور رکھ!"

ان خطبات سے پنڈت جی کی سیاسی زندگی کے ابتدائی رجحانات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

غالباً اس چیز کے دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس زمانہ میں مشران مرحوم نے یہ خیالات ظاہر کیے تھے اُس وقت ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر اس سے زیادہ کچھ کہنے کا عادی نہ تھا۔ انتہا یہ ہے کہ مہاتما گاندھی بھی (جنھیں وائٹ ہال نے ۱۹۳۱ء میں باغی فقیر کا خطاب دیا تھا) گذشتہ جنگ عظیم کے موقع پر انہی لوگوں کی صف میں تھے جو مساعی جنگ سے کامل تعاون کر رہے تھے لیکن جب لڑائی ۱۹۱۸ء میں حکومت برطانیہ کی عظیم الشان فتح پر ختم ہوئی اور وہ اُمید پوری ہونے کا وقت آیا (جو دوران جنگ میں ہندوستان کی سیاسی اصلاحات اور حقوق کے متعلق اہل ہندوستان کئے بیٹھے تھے) تو صورت حال پلٹ گئی۔ ایتلاف ثلاثہ کی شکست اور ترکی کے زوال سے مشرق وسطیٰ میں نیا سیاسی نظام قائم ہوا جس سے مسلمانان ہند کو سخت اندیشے پیدا ہو گئے۔ اُدھر عام ہندوستانیوں نے یہ محسوس کیا کہ مساعی جنگ کا انعام انھیں نا اُمیدی، مایوسی اور حرماں نصیبی کی شکل میں ملا ہے تو ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک بے اطمینانی، بے اعتمادی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی اور ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ اس شاندار تحریک کی شکل میں نکلا جسے ہم خلافت ایجی ٹیشن کہکر پکارتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ قومی حادثہ تھا جس نے ہندوستان کے سیاسی خیالات کے دھارے کو بدل دیا۔ مہاتما گاندھی نے ملک کو لاتعاون کا حربہ دیا اور ہندو مسلمان کے کامل اتحاد نے ہمارے قومی شعور کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

پنڈت جی ایک سچے قوم پرست اور پکے وطن دوست تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ ان ہنگاموں سے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات نہ پڑتے۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۲ء میں انھوں نے مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش (جنم دن) پر جو خطبہ دیا ہے اور اس میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو خاتمۂ جنگ پر برطانی شاہنشاہیت کا دعاگو اور قصیدہ خواں تھا۔ مگر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک یعنی تین سال کی مختصر مدت میں ہندوستان

کا سیاسی قافلہ کہیں سے کہیں جا پہونچا تھا اور پچھلے دور کے ماڈریٹ عہد نو کے سب سے بڑے انقلابی بن گئے تھے۔

طے میشود این رہ بدرخشیدن برقے
ما بیخبراں منتظر شمع و چراغیم

مہاتما گاندھی کے جنم دن پر پنڈت جی نے جو خطبہ دیا ہے اس میں پہلے ان کے خاندانی حالات بیان کیے ہیں اور پھر خود ان کے ابتدائی حالات کا تذکرہ کرکے ان کے وفائے عہد سچائی اور دیانت کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ کے اُن حوادث کا خاکہ پیش کیا ہے جنھوں نے گاندھی جی کو ستیہ گرہی بنایا۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو مظالم ہوئے تھے ان کی طرف اشارے کیے ہیں اور ٹرانسوال میں گاندھی جی نے ہندوستانی آباد کاروں کے تحفظ حقوق کے لئے جو مہم شروع کی تھی اس پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی اس امداد کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے دوران جنگ میں حکومت کو پیشکش کی۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔

"جب یورپ کی جنگ چھڑی، اس وقت مہاتما گاندھی نے رنگروٹ بھرتی کرانے میں بڑی مدد حکومت برطانیہ کو دی اور تمام ملک کو یہی ہدایت کرتے رہے۔ چنانچہ ۲۲ لاکھ ہندوستانیوں نے اپنا خون پانی کی طرح بہاکر برطانیہ کے لئے فتح حاصل کی لیکن جب مہاتما جی نے دیکھا کہ فتح کے بعد بھی ہندوستان کو مکمل آزادی حاصل نہیں ہوسکی بلکہ ڈومینین اسٹیٹس (یعنی درجہ نوآبادیات) بھی نصیب نہیں ہوا اور ہم

ع پھر آگئے اُسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

کا سراسر مصداق ہوکر رہ گئے تب مہاتما جی نے نہایت مایوس ہوکر ترک موالات کی تحریک شروع کی۔

ہم نے قصداً ان کے خطبہ کا مذکورہ بالا اقتباس پیش کیا ہے کیونکہ اگرچہ اس عبارت میں انھوں نے گاندھی جی کے زاویۂ نظر کی تبدیلی کے اسباب واضح کیے ہیں مگر ان لفظوں میں ہم خود ان کے سیاسی خیالات کے محرکات تغیر و انقلاب کو کارفرما پاتے ہیں اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کے اخلاقی پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کے فلسفۂ عدم تشدد اور نظریۂ لاتعاون کی تفسیر کی ہے۔

پنڈت جی کا دوسرا سیاسی خطبہ وہ ہے جو آپ نے فرخ آباد میں پنڈت موتی لال کی تقریب خیر مقدم میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبہ کا آغاز آپ نے تلک کے ایک مقولہ سے کیا ہے

"سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے ضرور حاصل کروں گا"

اس کے بعد آپ نے پنڈت موتی لال کے ایثار و قربانی کا تذکرہ کیا ہے اور تحریک لاتعاون سے پنڈت جی کی زندگی میں جو انقلاب آگیا تھا اس کو اس شعر سے ظاہر کیا ہے کہ ؎

ادراک حال ما نہ کند می تواں نمود
حرفے زحال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

پھر ہنٹر کمیشن کی تحقیقات کے سلسلہ میں آنجہانی پنڈت موتی لال نے جو قربانیاں کی تھیں ان کی داد دی ہے اور قوم کو

اس عظیم المرتبت انسان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی ہے۔ مشران مرحوم کے سیاسی خطبات کی پہلی کڑی وہ تقریر ہے جو آپ نے نومبر ۱۹۱۳ء میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن (اسپیکر یوپی اسمبلی) کے مکان پر جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تکالیف کے موضوع پر کی تھی۔ اس خطبہ میں اگرچہ جذبات کی وہ تلخی نہیں ہے جو قدرۃً اس کے بعد عام ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں پیدا ہو گئی تھی لیکن خیالات میں انقلابی رنگ جھلک رہا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ پنڈت جی شروع ہی سے خالص قوم پرست اور تند طبیعت کے مالک تھے۔

اس خطبہ میں انھوں نے گاندھی جی کی اُس تحریک کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانی آبادکاروں کے حقوق و مطالبات کے حصول کے لئے شروع کی تھی اور پھر حکومت افریقہ کے مظالم کو بیان کیا ہے۔ ضمنی طور پر انھوں نے حکومت برطانیہ کی توجہ ملکہ وکٹوریہ کے "میگنا چارٹا" (منشورِ آزادی) کی طرف مبذول کرائی ہے اور سختی کے ساتھ اُن قوانین کے خلاف احتجاج کیا ہے جو حکومت افریقہ نے ہندوستانیوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لئے بنائے تھے۔

بہرحال پنڈت جی کے سیاسی خطبات سے ان کے قومی شعور کے درجہ بدرجہ ارتقا کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ شروع میں وہ لبرل عقائد رکھتے تھے، لیکن حالات نے آخر میں انھیں انتہا پسندوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور ان کی زندگی اس شعر کی عملی تفسیر بن گئی کہ؎

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

اب ہم خطباتِ مشران کا وہ اہم ترین وصف منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں جو نہ صرف ہماری نظر میں بلکہ حسنِ فطرت کے نباضوں کی نگاہ میں بھی جملہ خصوصیاتِ کلام سے زیادہ مدح و ثنا کا مستحق ہے۔ کسی خطیب کے خطبات (یا شاعر کے کلام) پر نقد و نظر کرنے میں سب سے عجیب اور دلکش نکتہ جس پر خطبہ یا کلام کے مقبول یا غیر مقبول و مردود ہونے کا انحصار ہے وہ ہے جو اہلِ بلاغت کی اصطلاح میں "مقتضائے حال کی مطابقت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر علم النفس کے ماہرین اس کو "نفسیاتی مصوری" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے اپنے مقالہ کا ایک جزو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ دوہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس کو سامنے رکھ کر ہم اپنے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ واضح کر سکیں گے۔ اس مقالہ کی ابتدا میں کہا جا چکا ہے کہ اگرچہ اظہارِ خیال و بیانِ مطالب کے اعتبار سے شاعر، مصنف اور خطیب بظاہر ایک ہی صف میں آتے ہیں مگر شعراء و مصنفین، اظہارِ خیال و بیانِ مطالب کے وقت صرف اپنے نفس سے مخاطب ہوتے ہیں، ان کے روبرو کوئی مجمع نہیں ہوتا اور نہ اُن کو عوام کے نفسیات کا چنداں لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ لامحدود وقت اور بے پایاں فرصت کے مالک ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ ایک ایک لفظ کی تہذیب و اصلاح پر وہ ایک ایک دن صرف کر دیں یا ایک مطلب کو واضح کرنے کے لیے ہزاروں صفحات استعمال کر ڈالیں۔ شعراء اپنے موضوعِ نظم اور مصنفین اپنے نقطۂ بیان کے سلسلے میں بالکل آزاد ہوتے ہیں، مگر خطیب کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ شاعر اور مصنف کا مقام خلوت و عزلت ہے اور خطیب و مقرر کی جگہ محفل و جلوت۔ خلوت و عزلت میں انسان کے ضمیر، خیال، اور قلم پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا، لیکن ہنگامۂ محفل اور گرمیٔ جلوت کے وقت زبان کھولنا، مطالب کی دلنشینی برقرار رکھنا، محدود وقت کا بہترین استعمال کرنا، حاضرین کو درمیان میں جگہ جگہ

تر و تازہ کر دینا، تقریر کی یکسانگی اور بیان کے بے کیف تعطل کو پاس نہ آنے دینا، موضوع پر قائم رہتے ہوئے مختلف مطالب سے ایسے نتائج استخراج کرنا جو موضوع بحث کو اور زیادہ قوت دیں، سننے والوں کو اُکتا نے نہ دینا، بیان کے دوران میں جابجا ظرافت کا رنگ پیدا کرنا، دلچسپ نکات و لطائف سے اپنے کلام کو رنگین و جاذب بنانا، اثنائے کلام میں موزوں اشعار اور اقوال کی چست بندش کرنا، حاضرین کے خیالات و احساسات کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر رہنا، تقریر کے اجزا و عناصر کو منطقی مہارت سے جدا جدا کرنا اور پھر ہر جزو کی خصوصیات واضح کرنا، اُن سے نتیجہ نکالنا، ان کے باہمی روابط کو روشنی میں لانا، پھر ان منزلوں سے گزر کر اپنے موضوع کو ہاتھ لگانا اور سننے والوں کی کامل و دائمی تائید حاصل کرنا، یہ ہیں ایک خطیب کے فرائض، جنھیں وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں میں بیک وقت انجام دیتا ہے۔ گو کہ ایک مصنف بھی اپنی تصنیف کو انھی چیزوں سے سنوارتا ہے اور ایک شاعر بھی اپنی نظم میں قریب قریب انھی قواعد کی پیروی کرتا ہے، لیکن وہی فرق، کہ شاعر و مصنف ایک نظم یا ایک مقالہ کی ترتیب و تکمیل کے وقت کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔ وہ اگر اپنی پوری عمر صرف ایک موضوع پر گزار دیں، جب بھی ان پر کوئی معترض نہیں ہو سکتا، لیکن خطیب کو یہ سہولت کہاں نصیب۔ ایک خطیب اپنی تقریر میں کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے یا اسے کن کن قواعد کی پیروی کرنا پڑتی ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے علمائے منطق و کلام نے تقریر کو حسب ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ تمہید یعنی خطیب کی تقریر کا وہ ابتدائی حصہ جس میں وہ اپنے موضوع کی مبادیات کو واضح کرتا ہے اور حاضرین کو آیندہ تقریر کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ تقریر کے اس حصے میں دلائل و براہین کی بھرمار نہیں ہوتی بلکہ ابتدا ہوتی ہے۔ خطیب سادہ لفظوں میں اپنے موضوع کلام کا تعارف کرتا ہے اور ان ضروریات کو واضح کرتا ہے جن کی بنا پر اس نے حاضرین کو اپنے گرد و پیش مجتمع کیا ہے۔ اکثر خطیب خطبہ کی ابتدا میں اپنی ہیچمدانی اور ژولیدہ بیانی کا اعتراف بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آگے چل کر تقریر میں کوئی خامی پیدا ہو جائے تو خطیب کا عجز و انکسار ان نقائص کا کفارہ بن کر سامعین کے تنغص کو دور کر دے۔ اس ہیچمدانی اور خاکساری کے ساتھ موضوع کی اہمیت و عظمت کا بھی پُرتاثیر لفظوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ سننے والوں کے دل میں مقرر کے لیے جذبۂ ہمدردی اور موضوع کے لیے جذبۂ عظمت پیدا ہو جائے اور ان پر استعجاب و اشتیاق کی کیفیت طاری ہو جائے۔ زور بیان، طلاقت زبان اور جوہر ادا کے کمالات دکھاتا ہے تاکہ یہ استعجاب و اشتیاق برابر بڑھتا رہے۔ ایک مقرر کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دوران کلام میں برابر اپنے سامعین کے جذبات شوق و حیرت میں اضافہ کرتا رہے تا اینکہ تقریر ختم ہو جائے اور نہ ان کا شعلہ اشتیاق فرو ہو اور نہ حیرت و تعجب میں کمی آئے۔

۲۔ تمہید کے بعد گریز شروع ہوتی ہے یعنی رجوع الی الموضوع۔ تقریر کا سب سے نازک اور اہم حصہ یہی ہے۔ خطیب کس طرح گریز کرتا ہے اور کس عمدگی اور بیساختگی سے اپنے موضوع تک پہنچتا ہے، یہ تقریر و خطابہ کا ایک معرکۃ الآرا جزو ہے، جو آہستہ آہستہ کلام کو اپنے عروج و ارتقا تک پہنچا کر، حُسن بیان کو دلائل و براہین سے مرصع کر دیتا ہے۔ جوں جوں تقریر اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی جاتی ہے، مقرر کے کلام میں جوش و خروش اور سامعین کے قلوب میں ذوق و شوق کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ تقریر کا یہی حصہ جان خطابت کہلاتا ہے۔ کسی خطیب کے کمال فن کو جانچنے کا ایک بہتر طریقہ یہ بھی ہے کہ اس

کی گریز کی لطافت اور رجوع الی الموضوع کی نزاکت کو دیکھا جائے۔

۳۔ خاتمہ۔ ماہرین فن کا اتفاق ہے کہ کلام کی ابتدا جتنی شاندار ہوگی، اس کا مرکزی یا عروجی نقطہ اتنا ہی دلچسپ اور جاذب توجہ ہوگا اور خاتمہ کلام میں بھی وہ زور اور اثر پیدا ہو جائے گا کہ تقریر کے بعد بھی سامعین لطافت کلام سے سیر نہ ہوں گے۔ خاتمہ کلام پر تمام دلائل و براہین سمٹ کر کسی ایک نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں اور موضوع واضح ہو جاتا ہے، لیکن اس موقع پر کمال خطابت یہ ہے کہ پایان تقریر میں اضمحلالی کیفیت اور افسردگی نہ پیدا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقریر کے آخری مراحل میں نہ صرف یہ کہ سننے والے اُکتا جاتے ہیں بلکہ بولنے والا بھی تھک جاتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا اس لئے جلدی جلدی نقطۂ آخر تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عجلت و سراسیگی کے عالم میں بسا اوقات پوری تقریر بے رنگ ہو کر پھیکی پڑ جاتی ہے اور آغاز تقریر نیز وسط تقریر کا تمام اثر و کیف مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

اپنے ہیرو کی نفسیاتی نباضی کا کمال ظاہر کرنے کے لئے سطور بالا میں تمہیداً جو کچھ لکھا گیا اس کے ساتھ یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح مختلف مضامین کے لئے شاعر یا مصنف جداگانہ نوعیتوں کے اسلوب اور الگ الگ قسم کے محاورات و الفاظ انتخاب کرتا ہے، غزل کے الفاظ اور محاورات نازک، نرم، سبک اور لچکیلے ہوتے ہیں، قصائد میں شکوہ الفاظ اور عظمت تراکیب کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، مرثیہ کے لئے پُرسوز الفاظ اور مانوس الحس محاورے استعمال کیے جاتے ہیں یا افسانوں کی زبان جداگانہ ہوتی ہے، تاریخی و علمی مضامین کا اسلوب کچھ اور ہوتا ہے، عورتوں اور بچوں کے لیے جو لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اُس کی بولی اور طرز بیان بھی مختلف ہوتا ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جس فن پر قلم اُٹھایا جائے اُسی کی مناسبت اور اصطلاحات استعمال کی جائیں: فن بلاغت کے یہ اصولی لوازم ہیں جن سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح خطیب کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے لب کشائی کرے۔ جس فن پر وہ بحث کر رہا ہے اسی کے مناسبات و اصطلاحات سے براعۃ الاستہلال و ایہام کے طور پر اپنے کلام کو سجائے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کے مذاق اور معیار ذوق کو بھی پیش نظر رکھے۔ بزم میں فقط اہل نظر ہی نہیں ہوتے، تماشائی بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ اہل نظر کی اقلیت ہوتی ہے اور تماشائیوں کی اکثریت۔ کمال خطابت یہ ہے کہ مقرر دونوں کے مذاق کی تسکین کر سکے۔ مسئلہ زیر بحث کتنا ہی دقیق و پیچیدہ کیوں نہ ہو، طرز ادا اس درجہ سلیس، رواں، برجستہ اور دلچسپ ہونا چاہیے کہ عوام و خواص دونوں اس سے یکساں لطف اُٹھائیں۔ آیئے اب متذکرہ فنی اصول اور نفسی رجحانات کی روشنی میں خطبات مشرا ان پر ایک نظر ڈالیں۔

جنوری ۱۹۲۳ء میں موصوف نے آل انڈیا موسیقی کانفرنس کی صدارت کے سلسلے میں جو خطبات ارشاد فرمائے تھے ان کے مطالعہ سے ہمارا مقصد بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم عوام کی نفسیات کو سمجھ کر اپنے موضوع کو شگفتہ و پُربہار بنانے کا کس قدر ملکہ رکھتے تھے۔ خطبہ موسیقی کی ابتدا ایک رنگین نظم سے ہوتی ہے۔ موسیقی کو نظم سے فطرۃً جو لگاؤ ہے اس کے لحاظ سے یہ ابتدا کس قدر برمحل اور موزوں ہے۔ اس نظم کے چند شعر پڑھ کر دیکھیے اور غور کیجیے کہ

موضوع موسیقی کی تمہید کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور کہاں مل سکتے ہیں ؎

وہ بہار آئی، نواسنج ہیں مرغانِ چمن — غیرتِ باغ ارم آج ہے صحنِ گلشن
جوش میں زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار — کیا تعجب ہے کہ گویا ہو زبانِ سوسن
آبِ شبنم سے کہاں کاسۂ گل ہیں لبریز — جل ترنگ آج بجانے کو ہے معشوقِ چمن

انصاف کیجیے کہ فنِ موسیقی سے تعلق رکھنے والے خطبہ کی ابتدا میں ایک مترنم نظم کے ذریعہ، مرغانِ چمن کی نواسنجی، طیورِ بہار کی زمزمہ سرائی، زبانِ سوسن کی گویائی اور معشوقِ چمن کے جل ترنگ بجانے کا ذکر کس قدر برمحل اور دلچسپ ہے اور سامعین کے احساساتِ نغمہ کو کس نزاکت اور لطافت سے بیدار کیا جا رہا ہے تاکہ وہ آیندہ موضوعِ تقریر سے پوری پوری دلچسپی لینے کے لیے مقرر کے دمساز اور گوش برآواز ہو جائیں۔

اس کے بعد موصوف نے انسانی حواس کی لذت پذیری کے خواص کو واضح کیا ہے اور بتلایا ہے کہ حُسن صورت، اور حُسنِ صوت (جنتِ نظارہ اور فردوسِ گوش) کے اثرات دل و دماغ پر کیا ہوتے ہیں۔ پھر حسنِ نغمہ وصوت کو رعنائیِ شکل و صورت پر ترجیح دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حسنِ ظاہر سے حظِ نفسانی اور حسنِ صوت سے لذتِ روحانی حاصل ہوتی ہے"

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سند کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے ؎

بہ از روے زیبا ست آوازِ خوش
کہ آں حظِ نفس است وایں قوتِ روح

اس کے بعد نہایت رنگین و دلآویز پیرائے میں حسنِ صورت کے ساتھ خوش گلوئی اور خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فنِ موسیقی و کمالِ رقص کو حُسنِ ظاہر کی دلکشی اور دلربائی کا نقطۂ عروج و کمال بتلایا ہے جو حقیقت اور رجحانِ نفس دونوں کے لحاظ سے مسلم الثبوت اور ناقابلِ تردید ہے۔

ہم نے کمالاتِ خطابت کی وضاحت کے سلسلے میں اس چیز پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ عوام کے جذبات اور ان کے نفسیات کو تاریخی لطائف و ظرائف اور اقوالِ مشاہیر سے اُبھار کر تقریر کی کامیابی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا خطابت کی کامیابی کے لیے کس درجہ ضروری ہے۔ مشرانِ مرحوم اس گُر سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ آپ اُن کے ہر خطبے میں خطابیات کا یہ فنی کمال پوری طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اسی خطبہ میں حُسنِ صَوت، خوش آوازی اور فنِ رقص کے امتزاج کی لطافتیں بیان کرتے ہوئے راماین کی ایک روایت کو بطورِ مثال پیش فرماتے ہیں اور وہ بھی نثر میں نہیں نظم میں ؎

گئی بن میں وہ محبوبِ زمانہ — زباں پر تھا قیامت کا ترانہ
لباسِ پُرتکلف تن میں پہنے — تنِ گلرنگ میں پھولوں کے گہنے
غرض گت ناچتی آئی جو بن میں — بہار آئی ہر اک نخل کہن میں
سبھوں نے اپنی درویشی کا لٹکا — تصور بندھ گیا ناگن سی لٹ کا

یہ وہ موقع ہے جب مہاراجہ دسرتھ نے اپنے دربار کی ایک اُپسرا کو شرنگی رکھ کے لانے کے لیے بن میں بھیجا ہے۔ شرنگی رکھ ایک مشہور سادھو تھے۔ اُپسرا نے اپنے حُسن وجمال کے افسوں اور رقص و موسیقی کے جادو سے شرنگی رکھ کو تسخیر کرلیا۔ مشران مرحوم نے اس واقعہ کو حسن و موسیقی کے بے پناہ کمالات کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں جو شعر سنائے ہیں وہ منشی شنکر دیال صاحب فرحت کی منظوم راماین کا ایک ٹکڑا ہیں۔

اس کے بعد مشران مرحوم نے خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بجائے خود فن موسیقی ساز و بربط کی قید سے آزاد ہے۔ اگرچہ چنگ و رباب کی ہمسازی سے اس کا اثر ضرور بڑھ جاتا ہے مگر موسیقی اور ساز و مزامیر لازم و ملزوم نہیں ہیں یا یہ کہ مزامیر کے بغیر نغمہ میں محویت کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی۔ موصوف اس بحث میں فرماتے ہیں :-

"گانے کے ساتھ طبلہ کی تھاپ، بائیں کی گمک، مجیروں اور گھونگھروؤں کی جھنکار ضرور ہونا چاہیے۔ گانے کے ساتھ ساز بھی ہوں تو بعض وقت لَے بندھ جاتی ہے اور لطف نغمہ دوبالا ہو جاتا ہے"

اس کے بعد موصوف نے ایک ماہر فن کی طرح مختلف راگنیوں کے اوقات اور تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہندوستانی موسیقی کی بعض خصوصیات بیان کی ہیں۔ اسی سلسلے میں تال اور سُر نیز کلاسیکل موسیقی اور عوامی مذاق کا فرق بیان کیا ہے۔

مشران مرحوم کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی موضوع کو لیتے تھے تو اس کے باریک سے باریک جزئیات کو بھی بیان کر جاتے تھے۔ چنانچہ موسیقی سے تعلق رکھنے والے اس خطبہ میں مشکل ہی سے انھوں نے کسی گوشہ کو تشنۂ اظہار چھوڑا ہوگا فن موسیقی کی اہمیت، ہندوستانی موسیقی، رقص و موسیقی کا باہمی ربط، راگنیوں کے اوقات، ہندوستانی موسیقاروں کے کمالات اور پھر اس ضمن میں موجودہ و نیز گذرے ہوئے بعض ارباب کمال کا ذکر، عالمانہ تبحر اور وسعت نظر کے ساتھ عربی موسیقاروں اور عہد عباسیہ کی فنی ترقیوں کا بیان، فارسی مغنیوں (باربد، نگیسا) کے دوش بدوش اسحاق موصلی، ابراہیم اور مشہور عرب مغنیہ عریب کا تذکرہ اور پھر اموی اور عباسی خلفا کی قدردانی فن کے بعض واقعات، غرض موسیقی پر فنی اور تاریخی نقطۂ نظر سے مختصر وقت اور محدود پیرائیہ بیان میں عوام کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی بیان کیا جا سکتا ہے، وہ سب کچھ اپنے اس خطبہ میں بیان کر دیا ہے۔ حقیقۃً کمالِ خطابت اسی کو کہتے ہیں۔ مشران مرحوم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

موضوع کلام کتنا ہی عالمانہ کیوں نہ ہو، مگر انداز بیان ایسا پُرکیف ہونا چاہیے کہ نظر بازوں اور نظر والوں کی تسکین مذاق کر سکے اور دونوں کے نفسی رجحانات کے مطابق ہو۔ کہنے میں یہ چیز جتنی آسان ہے کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے علمی تحقیق اور حکیمانہ مسائل کے بیان میں، زبان و بیان کی شگفتگی قائم رکھنا اور عوام کے نفسیات کے مطابق کلام کرنا، خدا داد ذہانت رکھنے والے خطیبوں کا کام ہے۔ فن خطابت کی رو سے خطیب وہی ہے جو زور بیان اور حُسن کلام پر قادر ہو ورنہ بعض

علمی مسائل کا بیان تو کسی آدمی کو خطیب بنانے کے لئے کافی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے واعظ یا ذاکر کہہ سکتے ہیں، خطیب اور چیز ہے۔ خطیب کا مقصد اصلی صرف تحقیق علمی نہیں ہے بلکہ فن تقریر کا کمال بھی ہے۔ یوں سمجھیے کہ غایت خطابت خود خطابت ہے۔ پند و وعظ اور ذکر و فکر، بعد کی منزلیں ہیں۔ عربی خطبار محض اُسی شخص کو خطیب کہتے تھے جو سحر بیان اور جادوئے تقریر سے سامعین کو مسحور کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور حقیقۃً خطیب ہے بھی وہی۔ فن خطابت، فنون لطیفہ کے شمار میں آتا ہے۔ یہ بھی موسیقی، مصوری اور شاعری کی طرح ایک وہبی ملکہ ہے جو قدرتاً انسان کو ودیعت ہوتا ہے۔ مشق و مزاولت سے مہارت کلام پیدا ہو سکتی ہے، مہارت کمال نہیں۔ دنیا میں جتنے مشہور خطیب گذرے ہیں سب قدرت کی طرف سے اس ملکہ کو لیکر آئے تھے سحبان وائل وغیرہ اپنے کمال فن کے لئے کسی مشق و تعلیم کے شرمندۂ احسان نہ تھے۔ خطبات مشران کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشران مرحوم بھی مبدء فیاض سے یہ ملکہ وہبی لیکر پیدا ہوئے تھے البتہ مشق و مزاولت اور وسعت علم و مطالعہ نے اس شراب کو دو آتشہ اور اس ملکہ کو دو چند کر دیا تھا۔

آپ پنڈت جی کے تمام خطبات پر شروع سے آخر تک ایک نظر ڈال جائیے اور پھر یہ غور کیجیے کہ یہ شخص کس طرح خطبہ کا آغاز کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کس طرح موضوع کو چھیڑتا ہے اور گریز کی نزاکت قائم رکھتے ہوئے نفس مضمون کو ہاتھ لگاتا ہے، درمیان میں دلچسپ اشعار سے کلام کو مزین اور بامزہ کرتا جاتا ہے۔ خاتمہ کی طرف کس غیر محسوس طور پر رجوع کرتا ہے اور پھر اچانک کس طرح ختم کر دیتا ہے کہ طبیعت پر انقطاع بیان زرا بار نہیں ہوتا، بلکہ اشتیاق کی آگ شعلہ زن رہتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جس مسئلہ پر بحث کرتا ہے اس کے مطابق، زبان میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور مسئلۂ متعلقہ کی جزئیات اور مناسبات کس طرح واضح ہوتی چلی جاتی ہیں، تو آپ یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اب سے پچاس برس قبل یعنی فروری ۱۹۲۶ء میں پنڈت جی نے آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو وکیل ہائیکورٹ کی بوقت وفات پر ایک تعزیتی تقریر کی تھی۔ اس تعزیتی تقریر کو پڑھنے کے بعد کون شخص ایسا ہو گا جو فاضل مقرر کے انداز خطابت سے متاثر نہ ہو جائے۔ ملحوظ رکھیے کہ یہ ایک تعزیتی تقریر ہے، اس لئے پنڈت جی نے اس کی ابتدا ایک مرثیہ سے کی ہے

؎ ہر ایک گلشن عالم میں مُو پریشاں ہے — چمن میں سنبل تر زلف سوگواراں ہے
ہر ایک شاخ اُٹھائے ہے ہاتھ ماتم کا — ہر ایک نخل پہ بلبل بھی مرثیہ خواں ہے
چمن میں پہنے ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک — برنگ دیدۂ تر نرگس آج گریاں ہے

رواں ز دیدۂ نرگس سرشک شبنم شد
فغاں کہ ہر شجر باغ نخل ماتم شد

ان پُر تاثیر اشعار کے بعد انھوں نے نثر میں اس طرح مرثیہ خوانی کی ہے

"جس طرف دیکھیے حسرت و غم کے آثار نظر آتے ہیں۔ در و دیوار سے ماتم کی آواز آرہی ہے۔ ہر شخص کے

چہرہ پر حزن و ملال ہے۔ آسمان[1] پر ابر سیاہ کے ٹکڑے مجتمع ہیں کہ اشک ریزی کریں۔ آج دوپہر سے آسمان کی آنکھیں اشک آلود نظر آتی ہیں۔ قریب ہے کہ فرطِ غم سے اس کے آنسو ٹپک پڑیں، آپ لوگ خاموش ہیں اور سکتہ کے عالم میں ہیں۔"
اس دردناک اور پُراز جذبات تمہید کے بعد وہ نفسِ مطلب کی طرف گریز کرتے ہیں۔ دیکھیے گریز کس قدر برمحل اور قدرتی ہے:۔

"یہ خاموشی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ کسی بڑے ہر دلعزیز محبِ وطن، بہی خواہِ ملک اور راستباز بزرگ کا ماتم ہے"

اس گریز کے بعد متوفیٰ کا ذکر کیا ہے اور ان کے ایسے اوصاف و کمالات گنائے ہیں جو ہر شخص کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے ہیں۔ مثلاً ان کی ایمانداری، حب الوطنی، عزم محکم، قوم پرستی اور راستبازی وغیرہ وغیرہ۔

متوفیٰ کا ذکر کرتے کرتے نثر میں نظم کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ تاثیرِ بیان، منظر نگاری اور سامعین کے جذبات کو ابھارنے کی ایک شاندار مثال حسبِ ذیل فقرات میں مل سکتی ہے۔ فرماتے ہیں اور کس درد سے فرماتے ہیں۔

"صاحبو! اُس وقت جب متوفیٰ کی رسوم آخرادا ہو رہی تھیں عجیب عبرت انگیز سماں تھا۔ سب لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ جسم جو ملک کے قالب کے لئے روحِ رواں تھا، بے حس و حرکت پڑا ہے اور قریب ہے کہ آگ اس کو جلا کر خاک سیاہ کر دے"

آخری دیدار میت کی منظر کشی ان لفظوں میں کرتے ہیں:۔

"تمام عزیزوں کا لاش کے گرد جمع ہونا، ستم رسیدہ بیوہ، مظلوم ماں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا گریہ و زاری کرنا، سر دھننا، سینہ کوبی کرنا، یہ ایسا سماں تھا کہ خیال کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص کی یہ کیفیت تھی؎

نہاں چہرہ در گرد مظلومے — ز مژگاں رواں اشک محرومے
نہ از رنج کف ہا بسر می زنند — بسوئے عدم بال و پر می زنند

اس کے بعد متوفیٰ کے وارثوں کو تسلی و تشفی دینے کے لئے جو کلمات ارشاد کیے ہیں وہ وقتی تاثیر کے علاوہ حقیقتِ موت کے مشکل ترین فلسفہ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور خود ان کی شاندار موت پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"موت حقیقت میں مادی جسم کو ہلاک کر سکتی ہے، نام نیک کو فنا نہیں کر سکتی۔ دولت و حشمت سب فانی چیزیں ہیں، مگر نام نیک ہمیشہ زندہ رہے گا؎

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نہ مرد کہ نامِ نکو گذاشت

تمہید، گریز، نفسِ مطلب اور کلام کے عروجی نقطہ سے گذر کر خاتمہ کے چند لفظوں میں اپنے تمام جذباتِ تعزیت اس طرح سمو دیتے ہیں

"صاحبو! اب فرطِ رنج و الم، طولِ بیان سے مانع ہے اور طوالتِ کلام اس محل پر خلافِ ادب بھی ہے، لہٰذا

---

[1] اتفاق سے اُس روز ابر فضائے سماوی میں محیط تھا۔

اپنے ماتمی بیان کو اس ریزولیوشن پر ختم کرتا ہوں"۔

اس مختصر سے جلسے میں پنڈت جی نے تمام سامعین کے جذبات کو اپنا لیا ہے اور ختم بیان کرتے ہوئے اپنی تقریر کو سننے والوں کے تعزیتی احساسات کا مرقع بنا دیا ہے۔

خطبات مشران کی ابتدائے تقریر، وسط کلام اور خاتمۂ بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے دعوے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی، تقریر کے آرٹ سے بخوبی واقف تھے، عوام کی نفسیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی، وہ دلوں کو تڑپانے اور دماغوں کے متحرک کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، ان کی زبان میں لوچ تھا، لفظوں میں روانی تھی، نثر کو نظم سے سجاتے تھے اور نظم کو نثر سے تقویت دیتے تھے، دوران تقریر میں عوام کے معیار پر انتخاب کو مدنظر رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات شروع سے آخر تک ایک عجیب قسم کی تاثیر اپنے حرف حرف میں رکھتے ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں ان کے خطبوں کے چند اقتباسات پیش کیے ہیں اور وہ بھی بلا قصد واہتمام کے۔ اگر بامعان مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہر ایک خطبہ میں یہی خصوصیات کم و بیش نظر آتی ہیں۔ پنڈت جی کا ہر خطبہ نظم و نثر کا ایک دلکش مجموعہ ہوتا ہے۔ انتخاب شعر اور پھر نثر کی روانی میں پسندیدہ اشعار کا برمحل استعمال بہت مشکل فن ہے۔ اس کے لئے زبردست حافظہ، غیر معمولی ذوق سخن اور برمحل یادداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم پنڈت جی کے ذوق سخن کا لوہا مانے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرحوم نے نثری فقرات میں شعروں کو اس طرح کھپایا ہے کہ نثر نے دوآتشہ کا مزہ دیتی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ مثال میں معمولی اشعار پیش نہیں فرماتے بلکہ اساتذہ عرب و عجم اور ہندوستان کے مشاہیر شعرا کا اعلیٰ درجہ کا کلام ان کی زبان پر ہے اور وہ بے تامل اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں جا بجا انگریزی شعرا کے حوالے بھی نظر آتے ہیں۔

پنڈت جی، عامیانہ اور بیش پا افتادہ مضامین میں اپنے زور تخیل اور حسن بیان سے ایسی جدت پیدا کر دیتے ہیں کہ خاص و عام اس سے مزہ لیتے ہیں۔ ایک الوداعی خطبہ میں اپنی ہیچ دانی اور اپنے پیشرو مقررین کی عظمت کا اعتراف (جو کہ ایک فرسودہ مضمون ہے) اس طرح کرتے ہیں۔

"ان فصیح و بلیغ مضامین کے بعد جو آپ سن چکے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ میرے لئے زیادہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

میں اپنے خیالات کو شاید اس خوبی سے ظاہر نہ کر سکوں جس خوبی سے میرے دوستوں نے ظاہر فرمائے ہیں کیونکہ میں فصاحت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا پھر سوچتا ہوں کہ چڑیا اگرچہ شاہباز کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاہم چار و ناچار اسے اڑنا ہی پڑتا ہے ؎

دانم نہ رسد ذرہ بخورشید ولیکن
شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

ایک اور وداعیہ خطبہ میں اپنے ممدوح کے لیے جو مدحیہ اور دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں اُن کو ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرنا خالی از لذت نہ ہوگا کیونکہ ان میں جدت پسندی اور حق پسندی جو کہ بظاہر ضدین ہیں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں اور خطیب کے کمال خطابت کی دلیل ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"پنڈت جی! میں خاقانی یا انوری نہیں ہوں کہ ثنا یا دعا میں شاعرانہ مبالغہ کروں۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ آپ فیاضی میں ابر نیساں یا ایثار و کرم میں حاتم دوراں ہیں۔ میں نہ کہوں گا کہ آپ کی عمر ہزار برس کی ہو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ یہ سب جھوٹ سمجھیں گے بلکہ دروغ مصلحت آمیز بھی خیال نہ فرمائیں گے —— پس میں آپ کو اخلاص باطنی سے وہ دعا دوں گا جو سعدی نے اپنے ممدوح کو دی ہے۔ یعنی یہ کہوں گا کہ جب تک آپ اس دارِ فانی میں زندہ رہیں، باکام و بامراد زندگی بسر کریں —— الخ

مختصر یہ ہے کہ جدت ادا، حسن بیان، لطف زبان، ادبی چاشنی، علمی عظمت، روانی، چستی بندش، ندرت تراکیب، معانی و مطالب کی تسہیل اور سب سے بڑھکر عوام کے نفسیات سے لگاؤ، پنڈت جی کے خطبات کی نمایاں خصوصیات ہیں، جن کی توضیح و تشریح کے لیے ہم نے اپنے مضمون میں ان کے بعض خطبوں اور تقریروں کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے مشران مرحوم کی طبعی خداداد اور ذہانت کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر ابھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے لیکن قارئین پر یہ ظلم ہوگا کہ انھیں دیر تک پنڈت جی کے خطبات سے محروم رکھا جائے اور تمہید کو اس قدر طول دیا جائے کہ اہل محفل اُکتا جائیں ع

کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند

البتہ اتنا بتلا دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ پنڈت جی کی جامعیت علمی اور خطابیانہ عظمت کو ان ہی چند خطبوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعہ میں ۱۵ خطبے شامل ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ع

جو ذرہ جس مقام پہ ہے آفتاب ہے

ہر خطبہ اپنے موضوع، اپنے انداز بیان اور اپنے علمی مواد کے اعتبار سے ایک انفرادی خصوصیت رکھتا ہے۔

یقیناً خطبات مشران کی اشاعت سے ادب اردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہو رہا ہے جس کی اشاعت کے لئے ہم مرحوم کے خلف الرشید پنڈت جگموہن نرائن مشران صاحب سابق ڈسٹرکٹ جج کے مرہون منت ہیں کہ موصوف کے علمی شوق نے اس نگارخانۂ سخن کو منظر وجود پر آراستہ کیا ہے

توصیف ار کہ ایں نغمہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آواز من است

ناچیز نسیم امروہوی
۶ / جون سنہ ۱۹۴۲ء

خطابات

۱

عقیدت کے پھول

۱۵ مئی ۱۸۸۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول فرخ آباد کے ہیڈ ماسٹر پنڈت بلدیو پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور کیے گئے اور طلبا نے موصوف کا الوداعی جلسہ منعقد کیا۔ اس وقت منشی پریم چند صاحب مدرسہ مذکور کے درجہ دہم میں تعلیم پاتے تھے۔ موصوف نے اس جلسہ میں حسب ذیل وداعی تقریر فرمائی۔

یہ غالباً موصوف کی سب سے پہلی تقریر ہے جو اسکول میں قلمبند کی گئی۔

جناب ہیڈ ماسٹر صاحب!

ہم لوگ اس مدرسہ کے تمام استاد اور شاگرد اس وقت اس غرض سے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ آپ کو عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مامور ہونے کی مبارکباد دیں، آپ کے پاک قدموں میں عقیدتمندی کے پھول نچھاور کرکے آپ کو باعزاز تمام رخصت کریں، آپ کے عمدہ برتاؤ کی مدح وثنا کریں اور آپ کی مفارقت پر آنسو بہائیں۔ ہم کو یہ سن کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ کی کارگذاریوں اور لیاقتوں کی داد گورنمنٹ نے دی اور آپ کو عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر ممتاز فرمایا۔ ہمارا خیال بنزلہ علم الیقین ہے کہ اس عہدہ سے جیسا اعزاز آپ کو حاصل ہوا ہے، ویسا ہی آپ کے ایسے قابل شخص کی ذات سے اس عہدہ کو حاصل رہے گا۔ ہم سب طالب علم آپ کے عقیدتمند شاگرد ہیں اور آپ کے فیضان تعلیم سے مستفید ہوتے رہے ہیں اور آپ کے ایسے استاد کی شاگردی پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ ہم نہایت صمیم قلب سے آپ کو اس عہدہ کی مبارکباد دیتے ہیں، لیکن آپ کے قدموں سے جدا ہونے کا افسوس ہے۔ اس وقت ہمارا یہ عالم ہے کہ ایک آنکھ خوش وخرم ہے اور دوسری پُرنم ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب! ہم سچے دل سے آپ کی تربیت وتعلیم کے معترف ہیں اور یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپ کا ایسا لائق اور مہربان استاد اب ہم کو مشکل سے ملے گا۔

حضرات انجمن۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر کے عہد میں اس مدرسہ نے نمایاں ترقی کی۔ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ہر سال نتیجۂ امتحان یونیورسٹی، بمقابلہ سابق زیادہ اچھا رہا جس سے تمام اہل شہر کے

نزدیک اس مدرسہ کی تعلیم و تربیت بمقابلہ مشن اسکول وغیرہ کے زیادہ اچھی سمجھی گئی، اور کیوں نہ ہو آپ خود ڈپٹی صاحب ایسے مشہور و معروف ادیب کے شاگرد رشید ہیں جو آگرہ کالج کے نہایت نامور پرنسپل تھے اور آپ نے خود امتحان بی اے، درجہ اول میں نہایت نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کیا ہے۔

تھوڑا عرصہ ہوا کہ یہاں ایک آریہ اسکول کھولا گیا تھا جس کے ہیڈ ماسٹر ایک بنگالی صاحب تھے۔ حامیان مدرسہ نے جن کو علم و عقل سے بہرہ کافی و حظ وافی نہ تھا اپنے مدرسہ کو ہمارے اِس اسکول کا رقیب بنانا چاہا اور وہاں کے معلموں کو بھی شوق چرایا کہ کسی طرح ضلع اسکول کے لڑکوں کو توڑ لیں اور اپنے مدرسہ میں بھرتی کر لیں، مگر یہ نہ سمجھے کہ کجا وہ لوگ علم و ہنر سے بیگانہ اور کجا پنڈت بلدیو پرشاد صاحب یگانۂ زمانہ ؎

کچھ خار مغیلاں گل تر ہو نہیں جاتا   ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا   مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اُسے موسےٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اہالی مدرسہ کا ذوق و شوق جو نمائشی تھا ٹھنڈا پڑ گیا، مدرسہ ٹوٹ گیا اور ہمارے استاذ معظم کے رقیبوں کو شکست فاحش نصیب ہوئی اور آریہ اسکول کے اکثر طالب علم پنڈت صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئے۔

صاحبو۔ ہمارے استاذ معظم کا برتاؤ اپنے ماتحت معلموں کے ساتھ دوستانہ رہا اور شاگردوں کے ساتھ بزرگانہ۔ مدرسہ کے قواعد و ضوابط کی تعمیل خود آپ کی طرف سے اور تمام اہالی مدرسہ کی طرف سے پوری پوری ہوتی رہی۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ آپ کی اعلےٰ علمی لیاقتیں ہر جگہ جہاں آپ تعینات ہوں گے آپ کی قدردانی کا باعث ہونگی اور آپ کی صحبت با سعادت سے ہر کہ و مہ فیضیاب ہوگا۔ جیسا کہ خسرو اقلیم سخندانی شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے کہا ہے کہ ایک عالم آدمی جہاں جائے گا لوگ اس کی فصاحت و بلاغت اور تبحر علمی کے سبب نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کریں گے اور اُس کی صحبت کو غنیمت جانیں گے ؎

وجود مردم دانا مثال زر طلاست   کہ ہر کجا کہ رود قدر و قیمتش دانند

ہم آپ کو اس ترقی عہدہ پر مبارکباد دیتے ہیں جس کے مستحق آپ ہیں اور امید کرتے ہیں کہ جہاں آپ تشریف لے جائینگے، آپ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ آپ کے ہمراہ رہیں گے، جو آپ کو جمہور میں اسی قدر مقبول رکھیں گے جس قدر یہاں ہر دلعزیز رکھا ہے، اور آپ کی نیکنامی کا باعث ہوں گے اور نیکنامی سے بڑھ کر کوئی دوسری یادگار دنیا میں نہیں ہوسکتی۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ جلد کسی وقت ڈپٹی کلکٹری پر ہمارے ضلع میں تشریف لائینگے اور جیسے بہار دورہ کرتی ہے اور باغوں کو تر و تازہ اور سرسبز و شاداب کر دیتی ہے، اسی طرح آپ یہاں تشریف لاکر دوستوں کے دلوں کو تر و تازہ اور باغباغ کر دینگے۔ ہمارے ممدوح کے معاصرین کو چاہیے کہ آپ کے طور و طریق سے سبق سیکھیں اور دیکھیں کہ فرض کی انجام دہی اور لیاقتوں کی یوں علانیہ قدر کی جاتی ہے۔ جیسے انگریزی میں مثل ہے کہ "بیوگرفی (مشاہیر کی سوانح عمری) چلا چلا کر اور سمندر کی موجوں کی طرح شور مچا کر سب سے کہتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو"، ویسے ہی ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کا طریقہ عمل اپنے معاصرین سے اور ہم سب سے باآواز بلند کہہ رہا ہے کہ تم بھی اسی طرح فرض انجام دو اور اپنے ہمچشموں میں عزت حاصل کرو۔ حقیقت میں آدمی کسی حیثیت کا ہو اور کوئی کام یا پیشہ کرتا ہو یا کوئی درجہ یا مرتبہ اعلےٰ یا ادنےٰ دنیا میں رکھتا ہو، اگر وہ محض اپنا فرض انجام دے تو سچی عزت اور نیکنامی اُسے ضرور حاصل ہوگی۔ جیسا کہ ایک انگریزی شاعر نے کہا ہے۔

Honour and shame from no condition rise
Act well your part, there all the honour lies.

صاحبو۔ اب وقت ہے کہ میں اپنے ممدوح کی مدح و ثنا ختم کروں اور تمام حضرات انجمن کی طرف سے آپ کو دعا دوں ؎

الا تا چار چیز از چار چیز اندر وجود آید — خز از کرم و نم از ابر و زر از کان و دُر از دریا
عدوئے بدسگالِ تو شود با درد و غم مُدغم — حبیب بے ہمالِ تو شود با خرمی یکجا

شعرا کا خیر مقدم

اور

شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ

بھارتی پاٹھ شالہ فرخ آباد کی نمایش کے سلسلے میں حسب دستور ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی مسند صدارت پر جناب منشی نصیر الدین صاحب علوی (منصف مین پوری) جلوہ افروز تھے اور شران صاحب استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ موصوف نے اس جلسے میں شعراء و سامعین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد شعر و سخن پر حسب ذیل عالمانہ اور محققانہ خطبہ ارشاد فرمایا، یہ خطبہ درحقیقت موصوف کا علمی و ادبی شاہکار کہلانے کا مستحق ہے۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بطور صدر استقبالیہ کمیٹی کے آپ صاحبوں کا خیر مقدم کروں۔ پہلے مجھے کمیٹی کا شکریہ اپنی طرف سے ادا کرنا چاہیے کہ مجھے اس خدمت کے واسطے انتخاب فرمایا۔ ع۔ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت۔ کاش یہ کام آپ کسی شاعر کو سپرد کرتے جو نظم میں یا شگفتہ نثر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا بخلاف اس کے یہ خدمت ایک شخص غیر شاعر کو تفویض کی گئی ہے جو ٹوٹی پھوٹی نثر میں آپ کا خیر مقدم کرے گا۔

میں استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے تمام ارباب سخن کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس بزم سخن کو رونق تازہ اور زینت بے اندازہ بخشی ہے۔ جو اصحاب دور سے تشریف لائے ہیں وہ خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہم سب کو جناب صدر مشاعرہ اور میزبان مہربان کا شکریہ نہایت گرم جوشی سے ادا کرنا چاہیے، جن کی صدارت اور رہنمائی سے اور جن کی مہمانداری اور خوش انتظامی سے یہ بزم سخن آراستہ و پیراستہ ہوئی ہے۔ آپ دونوں صاحبوں کا اخلاق عمیم اور اس کا جذب مقناطیسی ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے۔

صاحبان والاشان! اب مشاعرہ کی طرف لوگوں کا ذوق بڑھتا جاتا ہے۔ کسی تقریب سے کوئی انجمن کیوں نہ ہو وہ مشاعرہ پر ختم ہوتی ہے۔ جیسے لوگوں کو عمدہ کھانے کھلائے جائیں اور بعد میں اور لذیذ میوے انواع و اقسام کے میز پر چنے جائیں تو باوجودیکہ لوگ سیر ہو چکے ہیں تاہم اُن لذیذ میووں کو نہایت شوق سے کھاتے ہیں، یہی حال مشاعرہ کا اہل ذوق کے ساتھ ہے کہ باوجودیکہ پہلی تقریبوں اور جلسوں کا لطف اٹھا چکے ہیں لیکن آخر میں بزم مشاعرہ میں نہایت شوق سے شریک ہوتے ہیں اور اس کا لطف علٰحدہ حاصل کرتے ہیں۔

صاحبان ذیشان! مجھ سے میرے دوستوں نے یہ فرمائش کی ہے کہ تشکریہ کی تقریر کے ساتھ شعر و سخن کے موضوع پر بھی کچھ بیان کرنا چاہیے، اگر میں تعمیل نہ کروں تو وہی بات ہوگی کہ "آزردن دل دوستاں جہل ست"۔ میں اس وقت فصاحت و بلاغت کے موضوع پر کچھ عرض کروں گا اور فن شعر خوانی کے کچھ اصول بیان کروں گا۔ یہ سب موضوع بزم مشاعرہ سے تعلق خاص رکھتے ہیں۔ میں بہت خوشی سے دیکھتا ہوں کہ طلبہ کی جماعت بھی یہاں موجود ہے جو مشق سخن کرنے والے ہیں۔ ان کو بہت ضرورت ہے کہ وہ شاعری کے آداب سیکھیں، اگر شاعر بننا چاہتے ہیں۔ وہ ابھی نو آموز ہیں؛ میں ان کی خاطر بھی ملحوظ رکھوں گا اور ایسی باتیں عرض کروں گا جو ان کے سمجھنے اور غور کرنے اور عمل کرنے کے قابل ہوں گی۔ اُن کو بہت سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھنا چاہیے۔

ع کاندریں راہ خارہا باشد

اُن کو وہی آداب و قواعد سیکھنا چاہیے، جو فصحا کے نزدیک مسلّمات سے ہیں۔

میں پہلے فصاحت کا ذکر کروں گا۔ فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سادہ، سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں۔ غریب و ثقیل اور قلیل الاستعمال لفظوں سے پرہیز کیا جائے، باہم الفاظ میں تنافر نہ ہو۔ اگر کوئی لفظ غریب یا ثقیل آجائے تو اس ترکیب سے استعمال ہو کہ اس کی غرابت یا ثقالت جاتی رہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمہ کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود فصیح ہے لیکن اگر وہ ایسے سر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اُس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے اور نغمہ بگڑ جائے گا۔ کہیں ضرورت ہے کہ گندھار سُر، لایا جائے اور مغنّی وہاں کوئی دوسرا سُر پنچم، دھیوت، نکھاد، رکھب وغیرہ شروع کر دے تو

نغمہ بگڑ جائے گا۔ یہی حال الفاظ کا ہے۔ لازم ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اُس کے گردوپیش کے الفاظ کو اس کے ساتھ ایک قسم کا تناسب یا توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ ایک مصرع لیجیے ع جنگل کے شیر گونج رہے ہیں کچھار میں۔ جنگل، صحرا اور بادیہ سب مرادفات ہیں لیکن اگر مصرع مذکور میں بجائے جنگل کے صحرا کہیں تو فصاحت کا خون ہو جائے گا۔ حالانکہ تینوں الفاظ مذکورہ بالا سب بجائے خود یکساں فصیح ہیں، اور کثیر الاستعمال بھی ہیں۔ اسی طرح اس مصرع میں کہ ع "تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا" بجائے صحرا کے جنگل کا لفظ نہیں آسکتا اور مخل فصاحت ہے۔ دامن جنگل؛ دامن بادیہ محاورے کے خلاف ہے۔ قاآنی نے اپنے ایک شعر میں قلیل الاستعمال لفظ نظم کیے ہیں، مگر ثقالت و غرابت محسوس نہیں ہوتی۔ اول چند الفاظ کی تشریح سن لیجیے پھر شعر عرض کروں گا۔ قصر کی جمع قصور صحیح ہے لیکن کثرت سے استعمال نہیں ہوتی۔ فارسی میں قصور بمعنی فروگذاشت یا کمی اکثر استعمال ہوا ہے۔ جیسے حور، دور از قصور۔ اسی طرح ملاط بمعنی گارا اور حصات بمعنی سنگریزہ یا روڑا۔ شاعر کہتا ہے ؎

قصورش با فلک ہمسر، ہمہ خشتش ز سیم و زر   ملاطش نافہ از فر، حصاتش لولوئے لالا

غور کیجیے، قصور کے بعد الفاظ "با فلک ہمسر" کو سن کر سامع سمجھ لے گا کہ یہاں قصور بمعنی خطا نہیں ہے کیونکہ الفاظ "با فلک ہمسر" موجود ہیں۔ اسی طرح روڑے اور گارے کی مناسبت سے اینٹ کا لفظ لکھ دیا کہ ایک قسم کا تناسب یا توازن ہو جائے۔ گارے کو نافہ سے اور سنگریزوں کو موتیوں سے تشبیہ دے کر بھی غرابت اور ثقالت کو کم کر دیا۔

فصاحت کے تحت میں مطلع کا حال عرض کروں۔ اکثر شاعر نہیں جانتے کہ مطلع میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔ اکثر اچھے شاعروں سے بعض دفعہ چوک ہو جاتی ہے۔ واضح ہو کہ مطلع میں بہت سلیس اور فصیح الفاظ جو روزمرہ میں داخل ہیں استعمال ہونا چاہیے اور ثقیل اور قلیل الاستعمال اور دقیق الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور اچھے فارسی گو تھے اور ذی علم بھی، انھوں نے اپنی غزل کا مطلع کہا ہے ؎

نہ باشد چوں منے در ملک ہستی کامل دیکتا   لئیق داز کی وارشد طلیق دعاقل ددانا

مشہور شاعر سنجر شیرازی جو میرزا سپہر لسان الملک کا شاگرد رشید تھا، اُس وقت بریلی اور مرادآباد کے

سیر و سیاحت کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ یہ غزل کسی طرح لگ گئی۔ اُس نے اس غزل کے ایک ایک مصرع میں اصلاح دی اور ایسی اصلاح دی کہ باید و شاید۔ اُس نے یہ استدلال کیا کہ ہندیوں کے لہجہ میں واؤ مجہول اور یائے مجہول ہے، لیکن ایرانیوں کے لہجہ میں معروف ہے، مجہول قطعی نہیں۔ لہذا گو ہندی لہجہ میں "منے" کی یا کا لہجہ مجہول کیا جائے گا، مگر ایرانی اُس کو یائے معروف ہی پڑھینگے۔ پس "منی" کا لفظ اکراہ پیدا کرے گا۔ کیونکہ قرینہ دوسرے معنی کا موجود نہیں ہے۔ البتہ خسرو اقلیم سخن سعدی نے کہا ہے ؎

مرا در ارسد کبریا و منی   کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

کبریا کے بعد واو عاطفہ موجود ہونے سے دوسرے معنی کا قرینہ صاف ہے۔ پس یہ مصرع نواب کو یوں کہنا چاہیے تھا۔ ع

نباشد ہمچو من در ملک دانش کامل و یکتا

دوسرا مصرع الفاظ غریب و ثقیل کو شامل ہے۔ یوں بدلنا چاہیے۔

فصیح و خوش بیان و بذلہ سنج و عاقل و دانا

چونکہ میں مطلع کا بیان کر رہا ہوں اس لیے یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ بعض شاعر صنعت سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی صنعت لے آتے ہیں۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے "باید کہ مطلع از صنعت سجع عاری باشد" ہمپایۂ انوری و خاقانی میرزا حبیب اللہ قاآنی (ملک الشعرائے فتح علی شاہ قاچار والی ایران) نے صنعت سجع میں ایک لاجواب قصیدہ کہا ہے، جو کسی وقت بی۔ اے کے کورس میں داخل تھا۔ اس کا مطلع صنعت سجع سے عاری ہے ؎

بگردون تیرہ ابرے بامداد ان برشد از دریا   جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

اور بھی بیسیوں شعرائے عجم نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ سبھوں نے مطلع کو صنعت سجع سے عاری رکھا ہے۔ میرزا سپہر لسان الملک ملک الشعرا کہتا ہے ؎

چہ سودا در سرافتادم کہ نے سرماند نے سودا   چہ طوفاں کند بنیادم کہ ہم شد کلبہ ہم کالا

میرزا فتح علی خاں صبائے کاشانی کہتا ہے ؎

بنازاے تخت اسکندر ببال اے مسند دارا   کہ شد اسکندر دیگر بدارائی سریر آرا

میرزا افضل اللہ خاؔور شیرازی کہتا ہے ؎

خمار از دست در سر با نشاط از دست در دلہا　　　ہمہ مینا ہمہ ساقی ہمہ ساغر ہمہ صہبا

ملاحظہ کیجیے، یہ سب مطلع صنعت سجع سے عاری ہیں حالانکہ یہ نظمیں تمام و کمال صنعت سجع میں ہیں۔ ایک ہندی شاعر نے جس کی غزل بلکہ نظم مثل اہل عجم کے گرانمایہ ہے صنعت سجع میں قصیدہ کہا ہے لیکن مطلع کو صنعت مذکورہ سے عاری نہیں رکھا۔ یہ بمقتضائے بشریت تھا یا ممکن ہے کہ ہندی نژاد ہونے کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ ع "زبان غیر کیا، آتی نہیں اپنی زباں برسوں" وہ کہتا ہے ؎

گذشتم بوستانے راشبے در عالم رویا　　　چہ بستانے مشام آرا طرب انگیز و روح افزا

اب میں بلاغت کا ذکر کروں گا۔

صاحبو! بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کے روبرو بلاغت کی تعریف اس طرح کروں گا کہ سب کے ذہن پر مرتسم ہو جائے اور جو کچھ فصحا نے لکھا ہے اس کا لب لباب ہو۔ جب اول اول بلاغت کے اصول مدوّن کیے گئے تو واضعین نے بلاغت کا جزو اعظم یہ قرار دیا کہ "بلاغۃ الکلام تطابق المقام" یعنی یہ کہ کلام حسب مقتضائے مقام ہو۔ چونکہ مقتضائے مقام کے لحاظ سے بلاغت کے اسلوب بیشمار ہو سکتے ہیں، لہذا ایک جامع و مانع اصول واضع نے قرار دے دیا۔ جب زمانہ نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا تو علما نے دیکھا کہ یہ تعریف بلاغت کافی نہیں ہے۔ بلکہ ناقص ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا کلام حسب مقتضائے مقام ہو لیکن بہت بھدے اور بھونڈے طریقہ سے کہا ہو تو کیا وہ عبارت بلیغ کہی جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ لہذا ضرور ہے کہ عبارت فصیح بھی ہو۔ اب دوسرا جزو بلاغت کا یہ قرار پایا کہ کلام فصیح بھی ہونا چاہیے۔ جب ہارون رشید خلیفہ عباسی کا عہد آیا تب اُس نے کہا کہ ہنوز بلاغت کی تعریف ناقص ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کلام حسب مقتضائے مقام کرے اور فصاحت بھی ہو، لیکن اگر وہ تکرار لفظی کرتا ہے یا مضمون کی تکرار اُس کے کلام میں ہے یا وہ تھوڑے سے مضمون کو بہت مطول عبارت میں کہتا ہے تو کیا اس کا کلام، بلاغت التزام کہا جا سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، اس کا قول تھا وحسن الکلام ما قلّ ودلّ" یعنی سب سے اچھا کلام وہ ہے جس میں تھوڑی عبارت میں وسیع معنی پیدا ہوں۔ چونکہ

ہارون رشید اقسام علوم میں یگانہ روزگار تھا اور مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کا قول علما نے پسند کیا اور تیسرا جزو بلاغت کی تعریف میں حسب تجویز ہارون رشید اضافہ کیا گیا۔ اب بلاغت کی تعریف مکمل ہو گئی یعنی (۱) کلام حسب مقتضائے مقام ہو۔ (۲) کلام میں فصاحت بھی ہو اور (۳) عبارت "ما قلّ و دلّ" ہو۔ یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں۔

میں آپ کو پہلے بلیغ نثر کی ایک مثال دوں جو مورخوں کے نزدیک بہت مشہور ہے۔ مامون الرشید خلیفہ عباسی کا قائد اعظم طاہر ذوالیمینین تھا جو سیف و قلم دونوں کا مالک سمجھا جاتا تھا، اُس نے مامون کو ایک خط لکھا تھا۔ مورخوں نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ وہ یوں ہے "میں امیرالمومنین کو خط لکھ رہا ہوں۔ فوج اور سرداران فوج اطاعت و انقیاد کے اُس اعلیٰ ترین درجہ پر ہیں جہاں تک ایسی فوج کا ہونا ممکن ہے جس کی تنخواہیں چڑھی ہوئی ہوں اور وہ تباہ حال ہو رہی ہو۔" اس جملہ کے چھ معنی ہو سکتے ہیں کہ (۱) طاہر شکایت کرتا ہے کہ آپ کیوں تنخواہیں چڑھائے ہوئے ہیں جس سے فوج تباہ حال ہو رہی ہے۔ تنخواہیں ادا فرمائیے۔ (۲) فوج گو بظاہر مطیع ہے اور بغاوت نہیں کرتی ہے لیکن بہت بیدل ہے اگر تنخواہوں کے ادا کرنے میں دیر ہو گی تو آمادہ بغاوت ہو سکتی ہے۔ (۳) یہ میری کارگذاری بحیثیت سپہ سالار کے ہے کہ فوج مطیع و منقاد ہے اور باوجود اُس کی بے دلی اور تباہ حالی کے میں اُس کو بغاوت سے روکے ہوئے ہوں (۴) فوج کی تنخواہیں فوراً ادا ہونا چاہیئے تاکہ اُس کی تباہی دور ہو، ورنہ وہ جلد بغاوت اختیار کرے گی۔ میں ذمہ دار نہیں ہوں حضور کو اطلاع دے کر اپنے فرض سے ادا ہوتا ہوں۔ بہت اندیشہ ہے کہ ملک میں شورش پیدا ہو جائے۔ (۵) فوج گو مطیع ہے لیکن بے دلی کے ساتھ اطاعت بظاہر کر رہی ہے۔ اس اطاعت و انقیاد پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ ایسی فوج ہرگز جاں نثاری نہیں کر سکتی اور وقت کی منتظر رہے گی اور دھوکا دے گی۔ (۶) اگر تنخواہیں ادا ہو جائیں گی تو فوج کی بیدلی اور تباہی دور ہو جائے گی اور مثل سابق فوج اطاعت شعار فرماں بردار اور جاں نثار ہو جائے گی۔

اب نظم کی مثالیں سنیئے۔ بلاغت کے تمام اسلوب کا احصا کرنا بوجہ ضیق وقت کے ناممکن ہے۔ صرف چند اسلوب کافی ہوں گے۔

مقبلؒ نے فارسی میں مرثیہ کہا ہے۔چنانچہ ایک شعر اُس کا ملاحظہ ہو ؎

بلند مرتبہ شاہے زصدر زین افتاد   اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

امام حسینؑ کو شاہ بھی کہتے ہیں۔جیسے جناب رسالتمآبؐ صلعم کو شہنشاہ عرب۔نقط شاہ کہنا شاعر نے کافی نہ سمجھا۔بلند مرتبہ کے الفاظ بڑھائے۔پھر کہا: زصدرزیں افتاد، زین کو صدر قرار دیا۔اگر شاہ کی جگہ فقط 'حسینؑ' کہتا اور یہ کہتا کہ 'ززین اسپ افتاد' تو مطلب نکل آتا۔ مگر وہی بات ہوتی کہ ؎

دندان تو جملہ درم دہان اند   چشمان تو زیر ابروان اند

جو الفاظ شاعر نے مصرع اول میں کہے اُن سے جناب امام عالی مقام کی شان رفیع دکھائی پھر دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ گویا عرش زمین پر گر پڑا۔ظاہر ہے کہ جب عرش گرے گا تو زمین کے اندام میں لرزہ آجائے گا بلکہ زمین پاش پاش ہو جائے گی۔شاعر کا مقصود ان الفاظ سے یہ ہے کہ سننے والوں کے دل ہل جائیں کہ بڑا سخت واقعہ ہوا۔

اب حضرت انیس مرحوم فردوسی ہند کے کلام سے بلاغت کے اسلوب ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے موقع عرض کر دوں تاکہ پورا لطف حاصل ہو۔موقع یہ ہے کہ حضرت زینبؑ کے دونوں فرزند عونؑ و محمدؑ شربت شہادت نوش فرما چکے ہیں۔حضرت عباسؑ علم بردار حضرت زینب علیہا السلام سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں، مگر وہ انکار کرتی ہیں۔اس بنا پر کہ اگر تم مارے گئے تو میرے ماںجائے کا یار دیا ور کون باقی رہے گا جو تمھاری مثل جاں نثار اور اُن کا قوت بازو ہو، لیکن حضرت عباس اصرار کرتے ہیں کہ میں جاؤں گا۔حضرت انیس حضرت عباسؑ کی زبان سے کہتے ہیں کہ اے بہن ؎

رخصت طلب ہے شاہ سے اکبرؑ سا لالہ فام   شہزادہ مرنے جائے سلامت رہے غلام
للّٰہ رد کیجے نہ اب لے خواہرا مام   وہ امر کیجیے کہ بڑھے جس سے میرا نام

بیکس ہوں ساتھ ماں نہیں سر پر پدر نہیں
میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

صاحبو۔یہ بند بظاہر اس قدر صاف ہے اور سلیس اور عام فہم اور الفاظ اس قدر سادہ

اور دل نشین ہیں کہ بلاغت کے نکتوں کی طرف ذہن یکایک انتقال نہیں کرتا۔ مگر نکات کو ملاحظہ فرمائیے۔ بند کے تیسرے مصرع میں "خواہر امام" کے الفاظ نہایت بلیغ ہیں حضرت عباسؑ حضرت زینبؑ کو امام حسینؑ کی بہن کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ حضرت عباسؑ کی بھی بہن تھیں ان الفاظ سے ان کی شان رفیع دکھانا مقصود ہے اور در پردہ تعریض ہے کہ آپ مجھ سے وہ محبت نہیں رکھتیں جو حقیقی بھائی بہن میں ہوتی ہے۔ چونکہ درحقیقت حضرت زینبؑ اُن کی حقیقی بہن نہیں، یہ تعریض زیادہ چبھتی ہوئی ہے۔ تعریض وہی زیادہ موثر ہوتی ہے، جس میں واقعیت کا پہلو ہوتا ہے۔ پھر ٹیپ کا آخری مصرع نہایت کارگر ہے "میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں" یعنی آپ مجھ کو اگر بیٹا سمجھتیں تو مجھے بھی اپنے صاحبزادوں کی طرح میدان کارزار میں جانے کی اجازت دیتیں۔ تاکہ میں بھی جناب امام حسینؑ پر نثار ہو جاتا اور شہادت کی دولت حاصل کرتا۔ پس مجھے اپنا غلام ہی سمجھ کر اجازت دیدیجیے۔ کیا خوب اپنا انکسار دکھایا ہے اور حضرت زینبؑ کی شان بلند۔

تشبیہ مرکب کا حُسن ملاحظہ فرمائیے۔ جب حضرت عباسؑ پر چاروں طرف سے برچھیاں چلنے لگیں تو اُس منظر کو کس قدر خوشنما اور رفیع کرکے دکھایا ہے۔ کہتے ہیں ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے — جیسے کرن نکلتی ہے گردِ آفتاب کے

یا جب اہل بیت ایک رسی میں باندھے گئے تھے تو اس اہانت آمیز صورت کو کس قدر خوشنما کرکے دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن — جس طرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن

ایک اسلوب بلاغت یہ بھی ہے کہ دشمن کا بیان اپنے ممدوح کے مقابلہ میں کیونکر کیا جائے۔ یہ نازک موقع ہوتا ہے۔ اگر اُس کو ذلیل کمزور اور حقیر کہا جائے تو اُس پر فتح حاصل کرنا شان کو بلند نہیں کرتا اور اگر اس کی شان و شوکت بیان کی جائے تو مرثیہ میں حضرت امامؑ کا تقدس مذہبی اُس کی اجازت نہیں دیتا۔ حضرت انیسؔ دشمن کی مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر بلاغت کا معیار قائم رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر — رو ئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر

ناوک پیامِ مرگ سے ترکشِ اجل کا گھر　　تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

چہرہ مہیب غیظ سے آنکھیں لہو کے جام　　تھرائے سام خوف سے کاندھے پہ وہ حسام
موذی سیاہ بخت سیہ دل سیاہ فام　　کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علیؑ کا نام
کندہ سقر کے قعر کا پتلا گناہ کا
دشمن تھا خاندانِ رسالت پناہ کا

ایک ترک بادشاہ نے اپنے دشمن پر فتح پائی اور وہ قید ہوکر پابجولاں دربار میں لایا گیا۔ پایہ تخت کے شاعر نے مبارک باد کا قصیدہ پیش کیا۔ اس میں ایک شعر کی بلاغت پرغور فرمایئے ؎

ہمائے کہ برعرش کردے خرام　　گرفتی و آزاد کردی ز دام

بادشاہ نے اس شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا۔ قیدی نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ شاعر کو میری طرف سے دس ہزار روپیہ انعام دو۔ شاعر نے پوچھا کہ تم مجھے کس بات کا انعام دیتے ہو۔ میں نے تمھاری شکست لکھی ہے۔ قیدی نے جواب دیا کہ تم نے مجھے ہما کہا اگر تم مجھے شغال کہتے تو میں تمھارا کیا کرسکتا تھا۔ غور فرمایئے کہ شاعر نے دشمن کی تعریف میں کس قدر مبالغہ کیا۔ پہلے تو اُس کو ہما کہا جو ایسا جانور ہے کہ جس پر سایہ ڈال دے وہ بادشاہ ہوجائے۔ پھر اس کی شان رفیع یہ دکھائی کہ وہ عرش پر پرواز کرتا ہے لیکن اپنے بادشاہ کی شان کس قدر بلند کی کہ اُس نے ایسے بلند پرواز ہما کو گرفتار کر لیا اور پھر اُس کی طرف سے ایسا بے پروا اور مستغنی ہے کہ اُس کو چھوڑ بھی دیا۔ کیا اچھا اسلوب بلاغت ہے۔

صاحبو۔ یہاں فتح گڑھ میں ایک جلسہ میں ایک اسپیکر نے اپنی تقریر میں بلاغت کا ایک اسلوب نئی طرح کا برتا۔ وہ آپ کے سننے کے لائق ہے۔ ۱۸۸۸ء میں نواب محمد اسحاق خاں جنٹ مجسٹریٹ ہوکر آئے تھے (یہ وہی اسحاق خاں تھے جو ۱۹۰۷ء میں یہاں ججی کے عہدہ پر تھے) تھوڑے ہی عرصہ میں وہ تبدیل ہوئے تو ان کا رخصتی جلسہ کیا گیا۔

ایک شخص نے وداعی تقریر میں معمولی مدح و ثنا کے بعد اُن کے شوق شکار کی تعریف بھی کی۔ لوگوں میں سرگوشی ہونے لگی کہ یہ عامیانہ تعریف کیسی۔ شوق شکار کیا قابل تعریف چیز ہے لیکن اُس شخص نے اس عامیانہ بات کو شاعرانہ پہلو سے بیان کیا۔ یعنی اُس نے یہ کہا کہ ہمارے نواب صاحب ممدوح کو شکار کا شوق ہے اور یہ اُن کی شان کے شایاں ہے۔ نہ اس لئے کہ جانوران صحرائی ہلاک ہوں اور آپ کی تفریح طبع ہو بلکہ اس وجہ سے کہ اس شکار کے ذریعہ آپ کو دلوں کا شکار کرنے کی مشق بہم پہونچ جائے ؎

شہاں راضرورست مشق شکار　　　　کہ آید پئے صید دل ہا بکار

اس تقریر کے بعد سامعین نے بہت داد دی اور کہا کہ ہم نے پہلے بیان کو عامیانہ سمجھا لیکن تم نے آخر میں شاعرانہ پہلو اختیار کر کے کلام کو بلیغ کر دیا۔ اب میں بلاغت کے موضوع کو ختم کرتا ہوں اور فن شعر خوانی کے کچھ اصول عرض کروں گا۔

فن شعر خوانی

آپ صاحبوں کو میری زبان سے یہ سن کر تعجب ہوگا کہ لوگوں کو فارسی شعر پڑھنا نہیں آتا۔ بعض لوگ فارسی میں خوب استعداد رکھتے ہیں مگر شعر غلط پڑھتے ہیں۔ یعنی جو فن شعر خوانی کے قواعد ہیں اُن سے واقف نہیں۔ پھر اُن پر عمل کرنا یعنی چہ؟ کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن پر یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا ہے۔ بہر حال میری نظر سے نہیں گذرا اور باوجود تلاش کے مجھے نہیں ملا۔ میں ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی ہوگا۔ اس میں مجھے اپنے اجتہاد اور ایجاد و اختراع سے تمام تر کام لینا پڑا۔ اردو کے اشعار میں جب فارسی ترکیبیں آجاتی ہیں تو لوگ اکثر ان کو بھی غلط پڑھتے ہیں، جیسا کہ میں مثالوں کے ذریعہ سے ظاہر کروں گا۔

(۱) یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظ کی جگہ ہائے مختفی اور مختفی کی جگہ ملفوظ پڑھتے ہیں۔

گدائے کہ بر خاطرش بند نیست　　　　بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

یہ کی 'ہا'، ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیئے کہ 'بہ' کی (ہ) 'از' کی (ز) میں مل کر

آواز دے اور "از" کا ہمزہ گر جائے یعنی آواز نہ دے۔ اگر اس کی آواز نکالی جائے گی تو "بہ" کی (ہ) تقطیع میں نہ آئے گی۔ "ہمزہ" کی آواز نکلنا چاہیے۔ اسی طرح اس مصرع میں "دایہ مہر درا بہر طلوع سرِ سپرسہ کی (ہ) کو ملفوظ نہ پڑھنا چاہیے بلکہ یہ ہائے مختفی ہے اور سین کی حرکت کو اشباع ہے۔ گو یہ (ہ) تقطیع میں محسوب ہو لیکن کچھ مضائقہ نہیں۔ چونکہ ہائے ملفوظ و مختفی کا امتیاز مشکل ہے، ان کے کچھ قواعد عرض کر دوں۔

واضح ہو کہ 'ہا' کی دو قسمیں ہیں ایک مختفی اور دوسری ہائے ملفوظ یا مظہرہ۔ سرمہ، نشانہ، خامہ، شانہ میں ہائے مختفی ہے اور مہ، شہ، رہ، گنہ، سیہ، میں ہائے ملفوظ ہے۔ ان دونوں 'ہا' کا قافیہ جائز نہیں۔ قدما کے یہاں مثلاً سعدی، صائب، حزیں کے یہاں شاذ و نادر دونوں کا اجتماع ہو گیا ہے۔ مگر متاخرین کے یہاں جواز نہیں۔ ہائے مختفی اپنے ماقبل کی حرکت کا اظہار کرتی ہے۔ خود 'ہا' کا اظہار کسی طرح روا نہیں۔ اکثر لکھنؤ والے مژہ کو سیہ اور گنہ کی طرح بہائے ملفوظ بولا کرتے ہیں۔ مژہ کی تین صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ یہ لفظ تقطیع میں دو حرفی محسوب ہو وہاں 'ژے' کی حرکت دبی زبان سے پڑھتے ہیں جیسے ع

ستم ست بر نگاہم مژہ را نقاب کردن

دوسرے یہ کہ سہ حرفی محسوب ہو مگر مضاف یا موصوف واقع نہ ہو تو جس طرح 'دل' بحالت اضافت جب سہ حرفی محسوب ہوتا ہے اُس وقت لام کے کسرے کو اشباع کرتے ہیں جیسے۔

دلِ عاشق برنگ برق تڑپا

اسی طرح مژہ کی ژے کی حرکت کھینچ کر پڑھیں گے جیسے۔

ع۔ ہو گئی نوک مژہ نشتر مجھے

تیسرے یہ کہ مضاف یا موصوف واقع ہو وہاں اس 'ہا' کو ہمزہ سے بدل دیں گے جیسے۔

ع مژۂ یار نوک پیکاں ہے

یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ دو حرفی لفظ والی "ہا" کبھی ہمزہ سے نہیں بدلتی۔ یہ بھی جاننے کے لائق ہے کہ ہائے ملفوظ بحالت جمع قائم رہتی ہے۔ جیسے راہ ہا، چاہ ہا، زرہ ہا، گرہ ہا، اور ہائے مختفی بحالت جمع ساقط ہو جاتی ہے جیسے میوہا، جاہا، خاہا، وغیرہ۔ اور بحالت تصغیر

ہائے مختفی کاف عجمی سے بدل جاتی ہے جیسے جامگک، خامگک وغیرہ۔ اور بحالت اضافت ہمزہ سے بدل جاتی ہے جیسے جامۂ من، خامۂ من، جامۂ نو وغیرہ۔ چونکہ دونوں ہائے کے غلط لہجہ سے ادا کرنے میں شعر غلط ہو جاتا ہے اس لیے میں نے یہ حالات بالتفصیل آپ حضرات کی دلچسپی کے لیے بیان کیے۔

(۲) دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ کسی جگہ ذرا ٹھہرنا چاہیے مگر وہاں پڑھنے والا نہ ٹھہرے اور الفاظ کو ملاتا ہوا پڑھے۔ جیسے اس شعر میں سے

دمہ دم فرو گیر چوں چشم گرگ　　　شدہ کارگر کینۂ دوزاں بزرگ

اگر دمہ کے لفظ پر ذرا دم نہ لیا جائے تو سامع سمجھے گا کہ پڑھنے والا دمادم کہہ رہا ہے اور دمبدم ہمعنی معنی قیاس کرے گا جو غلط در غلط ہو جائے گا۔ دمہ کے کئی معنی ہیں۔ ایک معنی سردی کے بھی ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ نظامی نے جاڑے کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے جشن نوشابہ کے ذکر میں۔ جب دمہ کا لفظ ملایا نہ جائے گا تو سامع اگرچہ دمہ کے معنی نہ جانتا ہو لیکن ذرا بھی ذہن سلیم رکھتا ہو گا تو اتنا سمجھ لے گا کہ کوئی چیز ہے جو دم گھونٹے دیتی ہے، چشم گرگ کی طرح۔ پھر آگے کے اشعار جب کہ پڑھے جائیں گے تو اُن میں صاف صاف جاڑے کا ذکر ہے۔ سامع قیاس کرے گا کہ دمہ سردی کے معنی میں ہے۔ لیکن جب کہ دمہ کو دم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا تو سامع سوائے دمادم کے کچھ معنی نہیں سمجھ سکتا۔ نہ آگے کے اشعار اس کو دمادم کے معنی سمجھنے میں مدد دیں گے۔

(۳) اسی طرح کسی موقع پر ایک مصرع کے الفاظ دوسرے مصرع میں ملا کر پڑھے جائیں گے جیسے ان اشعار میں سے۔

الا تا نگرید کہ عرش عظیم　　　بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم
الا تا نخفتی بغفلت کہ نوم　　　حرام ست بر چشم سالار قوم

ان اشعار کے لفظوں کی تقسیم اس طرح پر کرنا چاہیے۔

الا تا نگرید، کہ عرش عظیم بلرزد　　　ہمی چوں بگرید یتیم
الا تا نخفتی بغفلت، کہ نوم حرام ست　　　بر چشم سالار قوم

شعر اول میں لفظ "بگرید" اور شعر دوم میں لفظ "غفلت" پر زرا ٹھہرنا چاہیے ۔

(۴) بعض الفاظ پر زور دینا چاہیے ۔ جس کو انگریزی میں [illegible] کہتے ہیں۔ اُس کے قواعد کا احصا کرنا مشکل ہے ۔ صرف مذاق سلیم سے امتیاز ہو سکتا ہے کہ کون کون الفاظ زور دیے جانے کے قابل ہیں ۔ چند نمونے دکھائے جاتے ہیں جو عام فہم ہیں ۔ موشگافیوں سے قطع نظر کی جاتی ہے ؎

امام ثامن ضامن ۔ حریمش چوں حرم آمن زمیں از حزم او ساکن ۔ سپہر از عزم او پویا

پہلے مصرع میں حریم اور حرم پر اور دوسرے مصرع میں حزم اور عزم پر زور دینا چاہیے ۔ مذاق سلیم بتاتا ہے کہ حزم اور عزم توافی ہیں اور حریم اور حرم میں بڑی جنسیت ہے لہذا انہی پر زور دینا چاہیے ۔ شاعر کی قادر الکلامی یہ الفاظ ظاہر کر رہے ہیں ؎

تنش از تیر آلودہ دلش از شیر آمودہ بدل پُر سر سودہ دروں پُر لولوئے لالا

مصرع اول میں 'تیر' اور 'شیر' پر زور دینا چاہیے ۔

نہال باغ علیتیں بہار مرغزار دیں ۔ نسیم روضہ لیسیں شمیم دوحہ طاہا

مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم روضہ اور شمیم دوحہ گویا چھ الفاظ پر زور دینا چاہیے ؎ ۔

خرد شد ہر دم از گردوں کہ پوشد بر تن ہامون ز سنبل کسوت اکسون ز لالہ خلعت دیبا

اس شعر کے مصرع اول میں 'خرد شد' اور 'پوشد' اور مصرع آخر میں 'کسوت' و 'خلعت' پر زور دینا چاہیے کیونکہ یہ تمام الفاظ جن پر زور دیا گیا ہے شاعر کا کمال شاعری ظاہر کر رہے ہیں ۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سجع کے تین توافی عموماً زور دینے کے لائق اس وجہ سے نہیں ہوتے کہ شاعر ان کے لانے کا پابند ہے اور وہ ان کو تلاش کر کے لانے پر مجبور ہے اُن میں آورد بھی ہو سکتی ہے ۔ لیکن اُن کے علاوہ جو اور توافی شعر میں آ گئے ہیں وہ اس کی روانی اور سلاست طبع پر دلیل قاطع ہیں اور اُس کی قادر الکلامی ظاہر کر رہے ہیں اور محض آمد ہی آمد دکھا رہے ہیں لہذا زور دینے کے لائق ہیں ۔ غرض کہ وجدان صحیح اس معاملہ میں اچھی رہنمائی اور رہبری کرے گا ۔

(۵) شعر صحیح پڑھنے کے لیے ضرور ہے کہ الفاظ کے اعراب غلط نہ کیے جائیں۔ میں صرف دو لفظوں کا ذکر اس وقت کروں گا جو عموماً غلط بولے جاتے اور غلط پڑھے جاتے ہیں۔ "مطلع اور موقع"۔ اردو میں بلا ترکیب فارسی جب یہ لفظ بولے جائیں گے تو عموماً 'لام' اور 'قاف' پر فتحہ کہا جاتا ہے اور یہ ٹھیک ہے الّا اس حال میں کہ جملہ میں یہ الفاظ مفعول یا[۱] مجرد پڑیں۔ اس صورت میں 'لام' اور 'قاف' پر کسرہ بولا جائے گا لیکن فارسی میں چاہے بلا ترکیب یا مع ترکیب ان کا استعمال کسی طرح ہو 'لام' اور 'قاف' مکسور[۲] ہی بولا جائے گا۔ اردو میں بھی جب یہ لفظ ترکیب فارسی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں تو غلطی سے لہجہ میں 'لام' اور 'قاف' کو مفتوح کہا جاتا ہے۔ اس کی احتیاط کرنا چاہیے۔ اسی طرح سیکڑوں الفاظ ہیں جن کے اعراب اگر صحیح معلوم نہیں ہیں تو ان کا لہجہ غلط ہو جائے گا اور شعر غلط پڑھا جائے گا۔ اس موضوع کو ختم کر کے اب میں حرکات اور اشارات کا ذکر کروں گا۔ جن سے شعر خوانی میں کام لیا جاتا ہے۔

[۱] جیسے موقع کو، مطلع سے۔

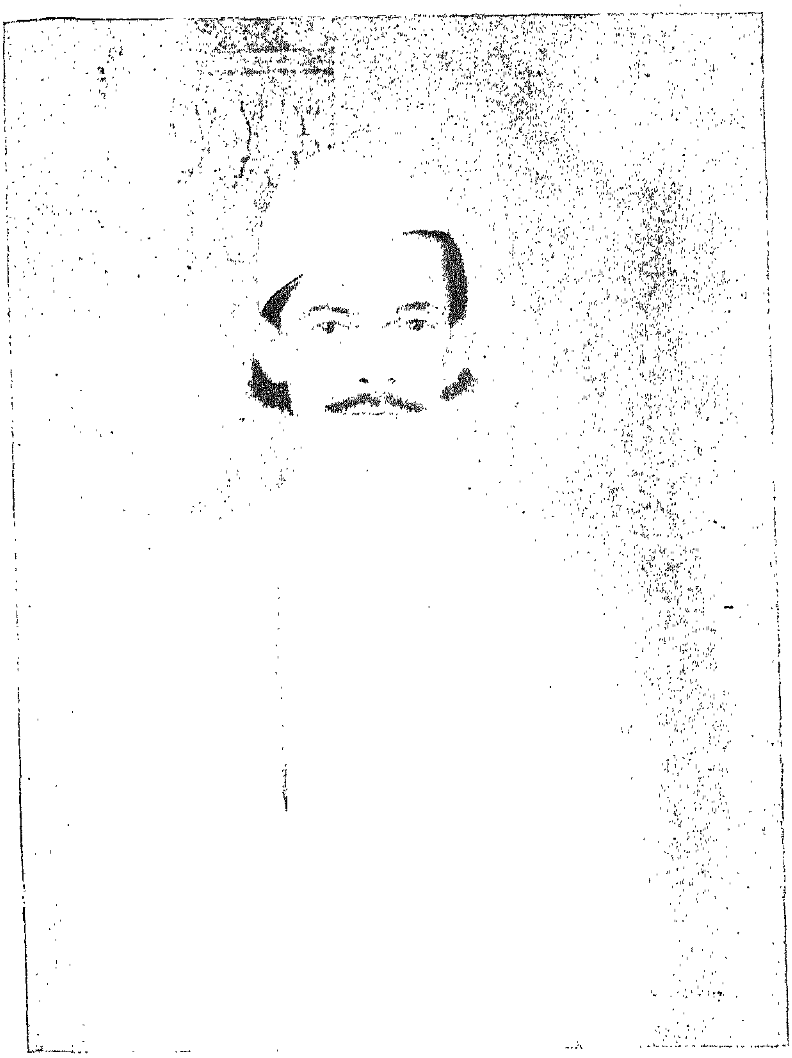
[۲] از غیاث اللغات و منتخب۔

حرکات و سکنات و اشارات

یورپ میں ایسے ماہرین فن ہیں جنھوں نے تمام عمر کسی ایک فن کے حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ پروفیسر ہارڈی فن شعر خوانی کے ماہر آکسفورڈ یونیورسٹی میں تھے جنھوں نے ستّر برس کی عمر تک صرف یہ ایک کام کیا کہ شعر پڑھا اور پڑھایا۔ شعر پڑھتے وقت وہ شعر کی صورت بن جاتے تھے اور شعر میں جو جذبات ہوتے تھے ان کا مجسمہ گویا نظر کے سامنے آجاتا تھا۔ چہرہ کی جھریاں مٹ جاتی تھیں اور خون کا دورہ چہرہ کی رگ و پے میں اس قدر ہوتا تھا کہ چہرہ پر جوانی کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ چشم و ابرو کے اشارات اور تیور سے شعر کے جذبات بتاتے تھے۔ ہاتھ کو یا جسم کے کسی اور حصہ کو جنبش نہیں دیتے تھے۔ شعر میں اگر رنج، خوشی تعجب، حیرت، آرزو، غصہ، رحم، سوگ وغیرہ کا ذکر ہے تو اس کی تصویر نظر کے سامنے آجاتی تھی۔ اس فن کے ماہر ہندوستان میں حضرت انیس مرحوم تھے بلکہ ماہر ہونے کے ساتھ اس کے موجد بھی تھے۔ میرے لڑکپن میں ایک بوڑھے آدمی نے جس نے انیس و دبیر کی

مجالس عزا دیکھی تھیں، حضرت انیسؔ کا حال شعر پڑھنے کا بیان کیا کہ پہلے وہ جس وقت منبر پر جاتے تھے تو مجلس میں خاموشی اور سناٹا ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کسی سے نہ کرتا تھا۔ پہلے وہ آستین چڑھاتے تھے۔ یہ دیکھ کر لوگوں کے دل ہلنے لگتے تھے۔ پھر جب وہ مرثیہ کا بستہ ہاتھ میں لیتے تھے تو رقیق القلب سامعین کو رقت شروع ہونے لگتی تھی۔ اور جب وہ پڑھنا شروع کرتے تھے تو سیکڑوں سامعین چہروں کو رومال سے پوچھتے دکھائی دیتے تھے اور بین پڑھتے وقت تو گریہ و زاری اور آہ و بکا کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

اس بیان میں کوئی بات مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بیمار ہوتا ہے یا کسی کے پھوڑا نکلتا ہے اور ڈاکٹر عمل جراحی کرنے کے واسطے آتا ہے۔ تو اُس وقت عزیز و اقربا دوست و احباب جو مریض کے پاس ہوتے ہیں ڈاکٹر کو دیکھتے ہی ان میں بعض کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ چیر پھاڑ کا وقت بہت قریب ہے پھر جب ڈاکٹر نشتر کا بکس جیب سے نکالتا ہے تو رقیق القلب لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ چیر پھاڑ کون دیکھے حالانکہ ابھی ڈاکٹر نے کوئی کام جراحی کا نہیں کیا ہے۔ پھر ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر مریض کے پاس جاتا ہے اُس وقت اشخاص موجودہ میں سے چند شخص اور منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے سرک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عمل جراحی کے وقت شاید ہی دو ایک شخص ایسے رہتے ہوں جو چیر پھاڑ دیکھنے کی ہمت کرتے ہوں۔ یہی حال ذاکر کا سامعین کے ساتھ ہے کہ اُس کو منبر پر پڑھنے کے لیے تیار اور آمادہ دیکھ کر سامعین کے دلوں پر رنج و غم اور حسرت و افسوس کی ایک کیفیت طاری ہوتی ہوگی اور ہر شخص جوشِ مذہب سے لبریز ہو کر شہدائے کربلا کی شہادت کے حالات سننے اور اہلبیت کی مصیبتوں کا جانکاہ منظر دیکھنے کو آمادہ ہو جاتا ہوگا، اور آمادہ ہو جانا، ہے بھی ایک فطری امر، کیونکہ کربلا کے خونیں میدان میں خاندانِ رسول کے بوڑھوں نوجوانوں اور بچوں کو جس بیدردی سے تڑپا تڑپا کر بھوکا پیاسا شہید کیا گیا، اس کا حال سن کر اپنے تو اپنے اغیار بھی رو دیتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اِس وقت چند ہی کلمات سن کر بعض حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ مناسب ہے کہ تھوڑا یہ حال بھی سنا دیا جائے کیونکہ انیسؔ کی داد دینا ان واقعات کے جاننے پر منحصر ہے۔ لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ کربلا پہنچے تو آپ کے ہمراہ



خدائے سخن میر ببر علی انیس

صرف بہتر آدمی تھے۔ جن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان اور کچھ کم سن بچے تھے۔ کچھ مخدرات عصمت تھیں۔ حضرت امام عالی مقام مسلمانوں کے آخری نبی حضرت محمد صلعم کے چہیتے نواسے، بی بی فاطمہؑ کے لاڈلے بیٹے اور حضرت علی کے پیارے فرزند تھے۔ کربلا کا جب واقعہ رونما ہوا تو ۶۱ھ تھا۔ اس وقت مذہب کی آڑ میں مسلمان وہ سب کچھ کر رہے تھے جو ان کے رسول نے منع کیا تھا۔ وہی لوگ اولاد رسول کے دشمن تھے۔ انہی لوگوں نے امام عالی مقام کو بلا کر مع عزیز واقارب و احباب تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا۔ سب سے اہم واقعہ چھ مہینے کے شیر خوار بچہ کا ہے کہ امام عالی مقام اس کو ہاتھوں پر لے کر میدان میں آئے اور اشقیا سے پانی کا سوال کیا۔ ایک ظالم نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ وہ بے زبان بچہ باپ کے ہاتھوں پر تڑپ کر شہید ہو گیا۔ میرے خیال میں تو ایسا ظلم ازل سے اب تک نہیں ہوا اور قیامت تک نہ ہوگا۔ یہی وہ دردناک واقعات ہیں جن کو سن کر ہر ایک روتا ہے اور امام کے اہلبیت پر شہادت کے بعد جو مظالم ہوئے اور سخت تکالیف و مصائب کا سامنا ہوا وہ حالات سن کر پتھر دل بھی پانی ہو جائیں اور رقیق القلب لوگوں پر رقت کا طاری ہونا تو معمولی بات ہے! اور پھر ذاکر بھی کون حضرت انیسؔ مرحوم جن کے پڑھنے کی دھاک بندھی ہوئی تھی اور جن کا ایک ایک شعر نشتر کا کام کرتا تھا، جس کے ایک ایک لفظ میں خون جگر کی چاشنی ہوتی تھی۔

حضرت انیس صرف چشم و ابرو کے اشارہ سے جذبات کو ادا کرتے تھے۔ کبھی خاص موقعوں پر ہاتھ کو بھی جنبش دیتے تھے لیکن ان کے اشارات و حرکات نہایت متانت کا پہلو لیے ہوتے تھے۔ ایک ذاکر نے ان کی نقل کرنا چاہی اور چاہا کہ مرثیہ پڑھتے وقت ایسا بتائے کہ ہر بات اور ہر جذبہ کو حرکات سے ادا کرے۔ ایک پہلوان کا ذکر آیا۔ مصرع یہ تھا کہ "آیا تھا بھبکتا یہ و بکتا ہوا بھاگا"۔ اس کو انھوں نے یوں بتایا کہ پہلے تو بھبکے اور پھر رُوب کر اور سمٹ کر پیچھے ہٹے۔ ان کا بھبکنا اور دبکنا لوگوں کو ایسا بھونڈا اور بیہودہ معلوم ہوا کہ سب ہنس پڑے اور بہت دیر تک ہنسی بند نہ ہوئی جب انھوں نے بین پڑھے تو کسی کو رقت نہ ہوئی۔ سامعین منہ پر رومال رکھے ہوئے ہنس رہے تھے اور ضبط نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ذاکر کا بھبکنا اور پھر روب کر پیچھے ہٹنا سب کے پیش نظر تھا۔ غرض کہ ذاکر کو بہت شرمندگی ہوئی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ کجا وہ اور کجا انیس ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

مقصود اس سے یہ ہے کہ شعر پڑھتے وقت زیادہ بتانا اور خلاف تہذیب و آداب مجلس اشارات و حرکات کرنا اہلِ مجلس کے لیے موجب ریش خند ہوتا ہے۔ اس سے پرہیز چاہیے بلکہ چشم و ابرو کے اشارے بھی اعتدال کے اندر رہیں۔ ورنہ ان میں بھی مبالغہ کرنا رقاصہ اور مخنث کے بھاؤ سے مشابہ ہو جائے گا۔ بزم مشاعرہ ہو کہ مجلس عزا سامعین کے نزدیک قابل استہزا سمجھا جائے گا۔ ممالک یورپ میں اس فن کے ایسے ماہر ہیں کہ اگر ایک ہی مصرع یا شعر میں متضاد الفاظ پاس پاس جمع ہوں تو ان کو بھی اشارات و حرکات سے اس خوبی کے ساتھ ادا کریں گے کہ تصنع معلوم نہ ہوگا۔ مثلاً رنج و خوشی، آرام و تکلیف، محبت و نفرت کو اس طرح بتائیں گے کہ رنج کے لفظ پر جو لہجہ میں غم ہوگا تو فوراً خوشی کے لفظ پر آواز بدل جائے گی۔ اسی طرح محبت کے لفظ پر ایسی آواز نکلے گی کہ جس سے محبت ٹپکے اور فوراً نفرت کا لفظ آتے ہی آواز اور صورت ایسی بدل جائے گی کہ نفرت برسے۔ یہ تبدیلی آواز اور تغیر صورت بلا قصد ہوگی۔ یہ بات نہایت مشکل ہے۔ عمر بھر محنت کرے تب حاصل ہو سکتی ہے۔ چونکہ اشارات و حرکات سے جذبات کا ادا کرنا فن شعر خوانی سے متعلق ہے اور اس میدان میں قدم رکھ کر لوگ بے راہ چلنے لگتے ہیں اس لیے میں نے بطور مختصر اس کا ذکر کر دیا۔

صاحبان والا شان۔ میں نے جو موضوع قرار دیے تھے وہ وقت مقررہ کے اندر عرض کیے۔ شرح و بسط کے ساتھ عرض کرنے کے واسطے تو کئی روز درکار ہیں۔ اب میں زیادہ سمع خراشی نہ کروں گا۔ اکثر حضرات سادہ جی "چغد الشعرا"[1] کا کلام سننے کے مشتاق ہوں گے تاکہ تفریحِ طبع ہو۔

اب میں صرف بزم مشاعرہ کی نسبت یہ عرض کروں گا کہ ایسی انجمنوں میں شاعروں اور سخن شناسوں کا جمع ہونا علم و ہنر کے حق میں نہایت مفید ہے اور جو حضرات فن شعر گوئی کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے سمند شوق پر تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ ایک دوسری خوبی بزم مشاعرہ میں یہ ہے کہ مختلف مذاہب و مراسم و عقائد کے اشخاص ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور باہم برادرانہ اتحاد سے پیش آتے ہیں جس سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ علم و ہنر کی ترقی کے سوا اتفاق باہمی بھی بڑھتا ہے۔

---

[1] ایک مشہور ظریف شاعر کا تخلص ہے۔ ۱۲

وداعی تقریر

ماہ اپریل ۱۹۰۸ء میں بمقام فتح گڑھ ایک وداعی جلسہ اس غرض سے منعقد کیا گیا کہ محمد اسحاق خاں صاحب سی، ایس، جو اکسٹنٹ مجسٹریٹ بہادر کو جو بسبیل تبادلہ یہاں سے روانہ ہو رہے تھے باعزاز تمام رخصت کیا جائے۔ تمام عہدہ داران سرکاری اور وکلا و روسائے شہر موجود تھے۔ جلسہ کا نوٹس سکرٹیری ایسوسی ایشن اوبھائی سبھا کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ جبکہ ممبروں کی طرف سے ایک ودائی اسپیچ ہو چکی تھی اہل شہر کی طرف سے موصوف کو رخصت کرنے کے لیے مشران صاحب نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن۔

ان فصیح و بلیغ مضامین کے بعد جو آپ سن چکے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ میرے لیے زیادہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کیونکہ جو باتیں کہنے کے قابل تھیں وہ میرے دوست مجھ سے بیشتر بہت کچھ کہہ چکے اور انھوں نے میرے لیے بہت کم چھوڑا ہے۔ اب میں کیا کہوں ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند ۔۔۔ تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

مگر یہ کب ممکن ہے کہ میرے اور دوست محمد اسحاق خاں صاحب کی مدح و ثنا میں رطب اللسان ہوں اور میں اپنا اخلاص ظاہر کرنے سے باز رہوں اور خاموشی کے ساتھ اوروں کی تقریریں سنا کروں۔

سخن دروغ نگویم نمی توانم دید ۔۔۔ کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم

البتہ فرق یہ ہوگا کہ میں اپنے خیالات شاید اس خوبی سے ظاہر نہ کر سکوں گا جس خوبی سے میرے دوستوں نے ظاہر فرمائے ہیں کیونکہ میں فصاحت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر یہ سوچتا ہوں کہ چڑیا اگرچہ پرواز میں شہباز کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاہم چار و ناچار اس کو اڑنا ہی پڑتا ہے۔ ؎

دانم نہ رسد ذرہ بخورشید ولیکن ۔۔۔ شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

صاحبو۔ ہم لوگ اس وقت اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہمارے مخدوم نواب محمد اسحاق خاں

جو بسبیل تبادلہ یہاں سے ضلع اٹاوہ کو تشریف لیے جاتے ہیں، ان سے یک جا ملنے کا موقع حاصل کریں اور ان کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کی تعریف اور ان کی جدائی کا افسوس ظاہر کریں۔ میری یاد میں یہ اپنی قسم کا تیسرا جلسہ ہے۔ اولاً ایسا جلسہ مولوی محمد حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد کی رخصت کے وقت، ثانیاً جناب مسٹر ہیریسن صاحب بہادر جج ضلع ہذا کے تبادلہ پر ہوا تھا۔ جہاں تک میں عام لوگوں کے خیالات سے واقف ہوں، آپ کی جدائی کا افسوس سب کو بہت زیادہ ہے، خصوصاً جن کو آپ کی خدمت میں شرف نیاز حاصل ہے ان کا افسوس محتاج بیان نہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ آپ نے بحیثیت حاکم عدل سے کام لیا اور ہر شخص کے حقوق پر نظر غور رکھی۔ ہنود واہل اسلام کو یکساں سمجھا اور وسعت اخلاق سے اپنے احباب کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر لیا، بلکہ ان کے دلوں کو شکار کر لیا۔

حضرات انجمن جس وقت ہم اپنے ممدوح کے اوصاف حمیدہ یاد کر کے خوش ہوتے ہیں، ساتھ ہی اس کے آپ سے علیٰحدگی کا خیال ہمارے دلوں میں نشتر سا کھٹکتا ہے، ہمارے عیش کو منغص و مکدر کر دیتا ہے اور ہماری خوشی مبدل برنج ہو جاتی ہے۔ گو آپ کو پوری خاندانی ریاست اور حشمت حاصل ہے اور اس پر ہوملین کا عہدہ جلیلہ اور حکومت مستزاد ہے، تاہم آپ اپنے دوستوں سے ملنے جلنے میں زیادہ خلق اور مساوات کا درجہ برتتے ہیں، جس سے پایا جاتا ہے کہ آپ کی طبیعت حلم و منکسر مزاجی سے معمور اور کبر و نخوت سے مہجور ہے اور یہ شیوہ ارباب باطن ہے۔

بادہا خوردن و ہشیار نشستن سہل ست　　گر بدولت برسی مست نگردی مردی

صاحبو۔ نواب صاحب ممدوح نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں یہ خواہش ہمیشہ ظاہر کی کہ یہ دونوں غیر کفو فریق آپس میں اتحاد قلبی پیدا کر کے برادران حقیقی کی طرح ملک ہند کی فلاح و بہبود میں کوشش کریں اور مل جل کر کام کریں۔ یہ خیالات ہمارے دوست کے رفتار زمانہ کے موافق ہیں۔ کیونکہ چند سال سے جو ہندوستان میں پولٹیکل تحریکیں ہو رہی ہیں ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ملکی اصلاح و فلاح میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی اغراض مشترک ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ فیاضانہ خیالات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے اور جو تھوڑا سا اختلاف ان دونوں فریق کے مابین بعض بعض امور کی بابت ہو رہا ہے، اس کے دفعیہ کے لیے

بلکہ اس کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے ہمارے نواب صاحب ہمیشہ کمربستہ رہیں گے۔

آپ کا تبادلہ جس قدر ہم لوگوں کے لیے باعث کلفت ہے اسی قدر اہل اٹاوہ کے حق میں موجب مسرت بلکہ باعث رحمت ہے کیونکہ وہ آپ کی اُن خوبیوں سے اب مستفید ہوں گے جن سے اس وقت تک ہم استفادہ کرتے رہے۔ ہماری گورنمنٹ کے آئین حکومت کا یہ عمدہ اصول ہے کہ اس کے لائق اور عادل حاکموں اور افسروں سے ہر جگہ کی رعایا فائدہ اٹھائے یہی وجہ ہے کہ آپ کا تبادلہ ظہور میں آیا لیکن چونکہ وہ معمول سے کسی قدر جلد بمقتضائے ضروریات گورنمنٹ ہوا اہم کو شاق گذرا کیونکہ ہم کو آپ کی ملاقات سے ذرا بھی سیری نہ ہونے پائی تھی کہ آپ ہم سے جدا ہوگئے اور ہماری امیدیں ذرا آگے قدم اٹھانے پائی تھیں کہ رک گئیں ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد   روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

صاحبو۔ ہمارے دوست کا تعلق جو اہل مقدمہ کے ساتھ بحیثیت حاکم عدالت کے رہا وہ تعصبات ذاتی یا مراعات قومی وغیرہ کے لوث سے پاک رہا اور تمام گروہ مفسدین آپ کی ہیبت اور دبدبہ سیاست سے اندیشہ ناک رہا اور عامہ رعایا اور کافہ برایا کی حفاظت جان و مال کا انتظام بدرجہ کمال ہوا حقیقت میں حاکم دادگر کے میزان انصاف میں ہندو مسلمان یا کافر صاحب ایمان خواہ وہ متوطن ہندوستان ہو یا اہل مازندران سب یکساں ہیں۔ کوئی شخص اُس کے آئین معدلت میں محض اپنے مذہب یا اعتقاد کے سبب مستحق رعایت و ترجیح یا مستوجب زحمت و تصدیع نہیں ہو سکتا۔ اُس کے ہاتھ میں عدل کی ترازو ہے جس کے دونوں پلّوں میں سزا و جزا کے پیمانے ہیں اور بال برابر پاسنگ نہیں۔ وہ ہر شخص کو اُس کے حق کا اندازہ کرکے برابر تول دیتا ہے۔ ہمارے نواب صاحب ایسے حکام کی ایک نمونہ دار نظیر ہیں۔

ہماری آرزوئے دلی ہے کہ ہم آپ کو عہدہ ججی[1] پر ممتاز دیکھیں اور آپ ہمارے ضلع میں بار بار تشریف لائیں اور ہم آپ کا استقبال نہایت گرمجوشی سے کیا کریں اور آپ کو اسی خلوص و محبت کے ساتھ باکرام تمام رخصت کیا کریں جس سے طبیعت کو سچی محبت اور اخلاص ہو اُس سے ملنے میں تو ظاہر ہے کہ سراسر مسرت ہوتی ہی ہے لیکن اُس کو رخصت کرنے میں بھی طبیعت میں جو جذبات اٹھتے ہیں اُن کے

---

[1] ۱۹۰۶ء میں نواب اسحاق خاں صاحب بحیثیت ڈسٹرکٹ و سشن جج فرخ آباد میں دوبارہ تشریف لائے۔

لطف سے مرف درد آشنا طبیعتیں واقف ہوتی ہیں ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

حضرات - اب مناسبِ وقت ہے کہ ختم کلام کرکے اپنے دوست کے حق میں صمیم قلب سے دعا کی جائے - ؎

ختم کرتا ہے بس اب مدح و ثنا کو شیدا جانب عرض دعا طبع کو اب ہے رغبت
چرخ پر تا رہے خورشید منور قائم گرد خورشید کریں تا مہ و انجم حرکت
قدرت خالق کونین سے جب تک قائم زیر و بالا کی رہے ارض و سما میں نسبت
فضل حق سے رہے تو شکل گل تر خنداں چمن دہر کو حاصل رہے تجھ سے زینت
یوں علل دور تری صحت جسمی سے رہیں یک دگر سے ہیں جدا جیسے حروف علت
شاد و آباد جہاں میں ترے فرزند رہیں ان کے حاسد ہوں غریق یم رنج و نکبت

دل غم و فکر سے دائم ترا آزاد رہے
تیرے اعدا کو رہے گھیرے ہمیشہ شامت



آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو

تعزیتی تقریر

بتاریخ ۷ فروری ۱۸۹۲ء روز یکشنبہ مشران صاحب کے دولتکدے پر ایک ماتمی جلسہ جس میں ہر ملت و مذہب اور ہر طبقہ اور زمرہ کے اشخاص کا ازدحام کثیر تھا، اس غرض سے منعقد ہوا کہ آنجہانی آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو، وکیل ہائی کورٹ کی بے وقت وفات پر افسوس ظاہر کیا جائے اور ان کی اعلےٰ لیاقتوں اور ملکی خیرخواہیوں کی قدر کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کو ایک تعزیت نامہ بھیج کر ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جائے۔ مشران صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل تعزیتی تقریر فرمائی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

اشعار

ہر ایک گلشن عالم میں مو پریشاں ہے — چمن میں سنبل تر زلف سوگواراں ہے
ہر ایک شاخ اٹھائے ہے ہاتھ ماتم کا — ہر ایک نخل پہ بلبل بھی مرثیہ خواں ہے
کلی جو چٹکی تو آواز آئی نالوں کی — چمن تمام پہ لبریز شور افغاں ہے
اڑا رہی ہے صبا خاک صحن گلشن میں — گلوں کا چاک گریباں ہے ٹکڑے اماں ہے
چمن میں پہنے ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک — برنگ دیدۂ تر نرگس آج گریاں ہے
کسی روش پہ ہے صیاد خستہ دل گریاں — اسیر دام الم اُس کا طائر جاں ہے
پڑا ہے برگ خزاں کی طرح کہیں گلچیں — برنگ سایۂ گل خاک پر وہ غلطاں ہے
یہ کہہ رہا ہے کہیں باغباں بھی رو رو کر — ہجوم داغ سے سینہ مرا گلستاں ہے
نہ ہیں وہ گل نہ وہ سبزہ نہ وہ بہار چمن — نہ نغمہ سنج ہے بلبل نہ گل ہی خنداں ہے
رواں ز دیدہ نرگس سرشک شبنم شد — فغاں کہ ہر شجر باغ نخل ماتم شد

صاحبو - یہ میرا بڑا دردناک فرض ہے کہ آپ لوگوں پر ظاہر کردوں کہ اس غمکدہ میں اس وقت ہم سب ماتم کرنے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں - ایسا روزسیاہ خدا ہم کو نہ دکھائے جس طرف دیکھیے حسرت و ماتم کے آثار نظر آتے ہیں - درودیوار پر غم چھایا ہوا ہے - ہر شخص کے چہرہ پر حزن و ملال ہے - آسمان پر بھی ایک بھیانک سماں ہے - ہم لوگ زمین پر جمع ہو رہے ہیں کہ گریہ و بکا کریں - آسمان پر ابرسیاہ کے ٹکڑے مجتمع ہیں کہ اشک ریزی کریں - آج دوپہر سے آسمان کی آنکھیں اشک آلود نظر آتی ہیں - قریب ہے کہ فرطِ غم سے اُس کے آنسو ٹپک پڑیں اور حقیقت اُس دن دوپہر سے کالے بادل کے ٹکڑے جمع ہوتے رہے اور قریب شام جلسہ برخاست ہونے کے بعد ترشح بھی ہوا تھا، آپ لوگ خاموش ہیں اور ایک سکتہ کے عالم میں ہیں - یہ خاموشی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ کسی بڑے ہر دلعزیز حبیب وطن، بہی خواہ ملک، راستباز، مقدس بزرگ کا سوگ اور ماتم ہے - یہ بزرگ کون تھے؟ آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ، جو اپنی دائمی مفارقت کا داغ ہم کو دے گئے -

پنڈت صاحب کی قابلیت اور خیر خواہیِ سرکار و رعایا کا حال کہاں تک بیان کیا جائے - الہ آباد میں جب یونیورسٹی قائم ہوئی تو آپ ہندوستانیوں میں اُس کے فیلو یعنی مشیر قرار دیے گئے - لوکل گورنمنٹ کی مجلس قانونی ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی تو ہندوستانیوں میں صرف ہمارے پنڈت صاحب الہ آباد سے اُس کے ممبر مقرر ہوئے - آگرہ کے وکٹوریہ کالج کی بنیاد انہی کے مبارک ہاتھوں سے پڑی - ۱۸۹۰ء میں خیر خواہی سرکار و رعایا کی غرض سے انھوں نے اخبار انڈین ہیرلڈ روزانہ جاری کیا، جس نے تین چار برس ملک کی خدمت باحسن الوجوہ کی اور اخبار پانیر کے مقابلہ میں بہت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا - ۱۸۸۱ء میں پنڈت صاحب کے واسطے ہائی کورٹ کی ججی کے لیے سفارش کی گئی -

ہمارے پنڈت صاحب ہائی کورٹ کے وکلا کے سرگروہ تھے اور تاجرانہ حیثیت سے بڑے دولتمند اور لائق سمجھے جاتے تھے - دو اصول پر آپ کا عمل تھا - آزادی اور ایمانداری - یہی وجہ تھی کہ آپ جس جلسہ میں شریک ہوتے اُس کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے اور کامیابی اسی طور پر آپ کے ہمقرین رہتی تھی، جس طرح زمانہ قدیم میں فتح و ظفر جولیس قیصر اور سکندر اعظم کے ہمرکاب رہا

کرتی تھی۔ آپ نے فقط اپنا مال اور بیش بہا وقت ہی فائدہ عام کے لیے وقف نہیں کر رکھے تھے، بلکہ اپنی جان بھی ملک کی خدمت میں نثار کر دی[1]۔ شکر ہے کہ ملک نے بھی ایسی ہی قدر کی جو واجب تھی۔ تمام اخبار ہمزبانی سے کہہ رہے ہیں کہ پنڈت اجودھیا ناتھ کی وفات قومی اور ملکی مصیبت ہے۔ ہزاروں خط اور سیکڑوں تار ان کے عزیزوں کے پاس اظہار رنج و افسوس کی غرض سے آ رہے ہیں۔ جابجا جلسے اظہار غم و الم کے لیے منعقد ہو رہے ہیں۔ الہ آباد کے چیف جسٹس فرماتے ہیں کہ پنڈت اجودھیا ناتھ وہ شخص تھے کہ جس ملک اور جس قوم اور جس ملک میں پیدا ہوتے ہوتے اس کے لیے باعث فخر ہوتے جس دن پنڈت صاحب نے قضا کی، الہ آباد کے پرائیویٹ مدرسے اور بازار اور ہائی کورٹ سب بند ہو گئے۔ جنازہ کے ساتھ دریا تک ہزاروں آدمیوں کا اژدحام تھا حکام ہائی کورٹ نے پھولوں کی ٹوکریاں دریا پر بھیجیں اور خواہش ظاہر کی کہ ہماری طرف سے پنڈت صاحب کے جنازہ پر یہ پھول ڈالے جائیں۔ صاحبو! اُس وقت عجیب عبرت انگیز سماں تھا۔ سب لوگ برائی العین مشاہدہ کر رہے تھے کہ وہ جسم جو ملک کے قالب کے لیے روح رواں تھا، بےحس و حرکت پڑا ہے اور قریب ہے کہ آگ اُس کو جلا کر خاک سیاہ کر دے۔

اُن کے عزیزوں کے رنج و غم کا حال محتاج بیاں نہیں ہے، تمام عزیزوں کا لاش کے گرد جمع ہونا، ستم رسیدہ بیوہ اور مظلوم ماں اور چھوٹے بچوں کا گریہ و زاری کرنا، سر دھننا اور سینہ کوبی کرنا یہ ایسا سماں تھا کہ خیال کرنے سے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص کی یہ کیفیت تھی کہ

نہاں چہرہ در گرد مظلومئے　　ز مژگاں رواں اشک محرومئے
نہ از رنج کفہا بسر می زند　　بسوئے عدم بال و پر می زند

صاحبو۔ چار سال سے ہمارے پنڈت صاحب نے ہمارے ملک کی بہبود و فلاح کا ذمہ لیا تھا۔ یہ سمجھیے کہ چار برس میں ہفت خوان رستم کی چار منزلیں طے کر لی تھیں کہ ناگاہ موت کی

---

[1] ناگ پور کانگریس میں جو ۱۸۹۱ء ماہ دسمبر میں منعقد ہوئی، پنڈت صاحب نے بڑی محنت و مشقت سے انتظامی خدمات انجام دیں، یہاں تک کہ بخار آنے لگا۔ اُسی حالت میں کانگریس کے اختتام تک شریک رہے۔ الہ آباد واپس آنے پر اُسی بخار میں جان دی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

کڑی منزل پیش آئی جو سب کو پیش آتی ہے ؎

ہر آنکہ زاد بہ ناچار بایدش نوشید　　زجام دہر مئے کُلُّ مَنْ علیہا فان

اِس سال کے آغاز سے ہماری امیدیں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ ہم خوب جانتے تھے کہ امسال دسمبر کی کانگریس میں، جو بمقام الہ آباد ہوگی، ہمارے صوبہ کے لیے پنڈت صاحب عمدہ عمدہ تجویزیں سوچیں گے اور ہم سب کے فائدہ کے لیے نمایاں کوشش کریں گے۔ ہماری بہت امیدیں اُن کی ذات کے ساتھ وابستہ تھیں مگر افسوس ع ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال۔ ہماری وہ سب امیدیں خاک میں مل گئیں۔ موت نے ان کو ہمارے درمیان سے اٹھالیا اور ہم سب بے دست و پا رہ گئے۔ یہ فلک ناہنجار اور چرخ دوّار بڑا ستمگار ہے۔ کون ہے جو اِس کی تیغ جفا کا بسمل نہیں۔ کون ہے جو اس کے جور و ظلم سے بیدل نہیں ؎

نہ دارد بخون سیاوشش دریغ　　چو افراز و افراسیابانہ تیغ

مجو صلح ازدست ایں پیر نبرد　　کہ خون سیاوش درطشت کرد

موت حقیقت میں مادی جسم کو ہلاک کرسکتی ہے مگر نام نیک کو فنا نہیں کرسکتی۔ دولت و حشمت سب فانی چیزیں ہیں مگر نام نیک ہمیشہ زندہ رہے گا ؎

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت　　نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

ڈاکٹر گرو داس بنرجی، جو کلکتہ ہائی کورٹ کے جج اور کلکتہ یونیورسٹی کے نائب میر مجلس ہیں، یونیورسٹی کے ایک جلسہ میں اثنائے تقریر میں فرماتے ہیں کہ "پنڈت اجودھیا ناتھ نے کیا قضا کی کہ ہمارا ایک بڑا تجربہ کار مشیر کم ہوگیا۔ یہ صاحب ہمارے نوجوانوں کی تعلیم اور امیدوں اور حوصلوں پر بڑی گرمجوشی سے نظر توجہ رکھتے تھے اور اِس ملک کی فلاح در فاہ میں درمے، قدمے، سخنے ایسی مدد اور کوشش کرتے تھے کہ تمام ملک اُن پر فریفتہ ہو رہا تھا اور ہم لوگ متوطن بنگالہ اُن کی وفات پر اُسی قدر حسرت و افسوس کر رہے ہیں جس قدر اضلاع مغربی و اودھ کے باشندے ماتم کرتے ہیں،، یہی آواز جو بنگالہ سے بلند ہوئی ہے احاطہ بمبئی و مدراس میں برابر گونج رہی ہے مسٹر ہیوم صاحب فرماتے ہیں کہ "پنڈت صاحب ایسے شخص تھے کہ فرط گرمجوشی اور حصول کامیابی سے کبھی آگ کی مانند گرم نہ ہوتے تھے اور از دیاد سرد مہری اور خوف ناکامی سے کبھی یخ کی مثل سرد

نہ ہوتے تھے ۔ اُن کا مزاج کبھی جادۂ اعتدال سے متجاوز نہ ہوتا تھا ۔ یہ وہ شخص تھے جنھوں نے لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحادِ قلبی پیدا کر دیا ۔"

صاحبو! اس رنج و غم میں ہم کو صرف اِس خیال سے کسی قدر تسکین ہوتی ہے کہ ہمارے پنڈت صاحب جنھوں نے ہماری تمام فکروں اور مشکلوں کو اپنے ذمّہ لیا تھا اِس وقت دنیا کے مکروہات سے نجات پاکر بہشت بریں میں آرام فرمارہے ہیں اور اپنے اعمال نیک کے باعث زندۂ جاوید ہیں ۔ کیا خوب ہوتا اگر الٰہ آباد میں خاص اُسی متبرک مقام پر، جہاں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے ، اِس بہی خواہ ہند کی ایک یادگار بنائی جاتی تاکہ لاکھوں جاتری، جو ہمیشہ الٰہ آباد کے تیرتھ کو سالانہ جاتے ہیں، اِس ملکی شہید کے مزار کی بھی زیارت کیا کرتے ۔ صاحبو! اب فرطِ رنج والم زیادہ بیان کرنے سے مانع ہے اور طولِ کلام اِس محل پر خلافِ ادب بھی ہے، لہٰذا اپنے ماتمی بیان کو اِس رزولیوشن پر ختم کرتا ہوں ۔

رزولیوشن

یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ ہم سب فرخ آباد کے متوطن، ہر قوم و مذہب کے اشخاص، ہر طبقہ و جماعت کے لوگ، اِس عام مجلس ماتمی میں جمع ہو کر مرحوم و مغفور آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ وکیل ہائی کورٹ کی بے وقت وفات حسرت آیات کا غم و اندوہ حوالہ قلم کرکے ان کے اعزہ و اقربا کے ساتھ بدرجہ غایت ہمدردی رکھتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ پنڈت صاحب کی ایمانداری، آزادی، راستبازی، جرات، اعلیٰ قابلیت اور رفاہ ملک کے مساعی جمیلہ نے ہمارے دلوں میں ایک یادگار قائم کی ہے جو سنگین یادگار سے بدرجہا زیادہ مستحکم اور دیرپا رہے گی اور خواہش کرتے ہیں کہ پنڈت صاحب مرحوم کے پس ماندوں کی خدمت میں ایک تعزیت نامہ بھیج کر ہماری اِس تجویز سے اُن کو اطلاع دی جائے ۔

وداعیہ خطبہ

بتاریخ ۲ مئی ۱۸۹۲ء بمقام مبارک باغ "گیان مارگ تھیوزافیکل سوسائٹی فرخ آباد" کی طرف سے ایک جلسہ اس غرض سے منعقد ہوا کہ پنڈت راج ناتھ صاحب منصف کو (جو سوسائٹی کے میر مجلس تھے اور عہدہ سب ججی پر مامور ہو کر کانپور جا رہے تھے) باکرام تمام رخصت کیا جائے۔ مسٹر ان صاحب نے جو کہ سوسائٹی کے سکرٹیری تھے، جلسہ کو ذیل حسب ذیل وداعی تقریر کی۔

صد شکر اپنے دوست کا رتبہ سوا ہوا   فرط طرب سے دور غم جاں گزا ہوا
اجرا اس کو عدل و داد کا اپنی عطا ہوا   لیکن غضب یہ ہے کہ وہ ہم سے جدا ہوا

یارب جہاں یہ دوست رہے شادماں رہے
مسرور و بامراد رہے کامراں رہے

میر مجلس اور حضرات انجمن۔

ہمارے دوست پنڈت راج ناتھ صاحب منصف، جو گیان مارگ تھیوزافیکل سوسائٹی کے میر مجلس ہیں، یہاں سے عہدہ سب ججی پر مامور ہو کر کانپور تشریف لیے جاتے ہیں، لہٰذا ہم سب سبھا کے ممبر اور نیز پنڈت صاحب کے احباب، جو شہر کے ہر طبقہ و جماعت کے اصحاب ہیں، اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ پنڈت صاحب کو ترقی عہدہ پر مبارکباد بادل شاد دیں اور اُن کے اخلاق ستودہ اور صفات پسندیدہ کی داد دیں اور سبھا کی ترقی میں جو نمایاں کوششیں انھوں نے کی ہیں ان کا شکریہ ادا کریں اور پنڈت صاحب کو باکرام تمام اور باحترام مالا کلام رخصت کریں اور جو خاطر افسردگی ہم کو آپ سے جدا ہونے پر ہے اس کا اظہار کریں۔

صاحبو۔ پنڈت صاحب نے یہاں کی تھیوزافیکل سوسائٹی کی ترقی کے لیے جو سعی بلیغ کی وہ بہت قدر کے قابل ہے۔ جب آپ یہاں تشریف لائے تھے اُس وقت ہماری سوسائٹی قالب بیجان کا حکم رکھتی تھی۔ آپ نے روح تازہ اُس کے قالب افسردہ میں پھونکی اور اس وقت سے انجمن



رائے بہادر پنڈت راج ناتھ "صاحب"

جو عمدہ حالت اُس کی ہے، وہ محتاج بیاں نہیں صدر مقام ادیارے سے جو سالانہ رپورٹ سال گذشتہ میں شائع ہوئی اس میں ہماری سوئیٹی (جو پہلے گمنام تھی) اول درجہ کی سوسائیٹیوں میں سمجھی گئی۔ ہماری سوسائیٹی کا مقصد اول یعنی یہ کہ ہر قوم و مذہب کے اشخاص کے ساتھ برادرانہ محبت رکھنا اس پر ہمارے پنڈت صاحب کا پورا عمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب و جماعت کے آدمی آپ سے بدل محبت رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دو روز سے متواتر آپ کے وداعی جلسے ہو رہے ہیں۔ کیا یہ کم فخر کی بات ہے۔ میرے نزدیک یہ پہلا موقع ہے کہ پنڈت صاحب کے رتبہ کے شخص کے لیئے اس قسم کا جلسہ اس شہر میں کیا گیا ہے۔

اگر کوئی شخص خاص خاص لوگوں کو خوش کرے تو یہ فخر کی بات نہیں ہے۔ عام لوگوں کو خوش رکھنا اور اُن کے دلوں کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر لینا البتہ بہت مشکل ہے۔ مگر یہ ہمارے پنڈت صاحب کے حصہ میں ہے۔ ہر طبقہ کے اشخاص کو وہی حاکم خوش رکھ سکتا ہے جو دیانت، محنت، معدلت، راستبازی و خدا ترسی کو اپنا شعار بنالے اور یہ کل اوصاف ہمارے دوست میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ جو شخص مخلوق خدا کو خوش رکھتا ہے وہی خدا کو بھی خوش رکھتا ہے اور انصاف اور نیکو کاری اور خدا ترسی سے زندگی بسر کرنا اور خلق اللہ کی خدمت کرنا بہترین عبادت الٰہی ہے۔

بہ احسانے آسودہ کردن دلے بہ از الف رکعت بہر منزلے

صاحبو۔ ایک عادت ہمارے دوست میں ایسی دیکھی گئی جو اکثر بڑے آدمیوں میں نہیں پائی جاتی ہے، یعنی یہ کہ آپ ایسی انجمنوں میں جو جمہور کے فائدے کے لیے ہوں یا جن سے ملک و قوم کی اصلاح و فلاح متصور ہو، شریک ہونے کے لیے اور ان کو مدد دینے کے لیے ہر وقت آمادہ اور کربستہ رہتے ہیں، بلکہ آپ ایسے جلسوں پر فریفتہ ہیں اور یہ ہمارے دوست کے لیے فخر کی بات ہے کہ آپ ایسے جلسوں کا کام اسی قدر گرمجوشی اور ہمدردی سے انجام دیتے ہیں، جس قدر محنت، دیانت، معدلت اور خدا ترسی کے ساتھ آپ اپنا کارمنصبی انجام دینا فرض عین سمجھتے ہیں۔

جس طرح اہل معاملہ اور عامہ رعایا کی دادرسی آپ کے عہد میں بوجہ احسن ہوئی، اسی طرح آپ کے احباب کو آپ کے اخلاص خاص اور اخلاق شہرۂ آفاق سے مسرت و تقویت بدرجہ اتم میسر رہی جس کا نقش سب کے دلوں پر سویدا کی مانند ہو گیا ہے، جو کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے جانے سے ہم کو پژمردہ دلی ہے۔ دل میں آپ کی مفارقت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو زبان حال سے یہ کہتے ہیں؂

توعزم سفر کردی و خستی جگر ما　　بستی کر خویش و شکستی کمر ما

سچ یہ ہے کہ ایسے ہر دلعزیز حاکم و محسن کی جدائی کا شاق گذرنا کچھ تعجب کا ماجرا نہیں بلکہ انسانیت کا مقتضا ہے؂

غم چیزے رگ جاں راخرا شد　　کہ گاہے باشد و گاہے نباشد

ہمیں امید ہے کہ جیسے ہم کو آپ سے جدا ہونے پر صدمہ ہے، ایسے ہی آپ کو بھی ہم نیازمندوں کی مفارقت گراں گذرتی ہوگی، لیکن ایسے موقع پر ہر شخص مجبور ہے۔ بندگی بیچارگی مشہور ہے۔ جس طرح آپ کی ذات والاصفات کی یاد ہم کبھی دل سے فراموش نہ کریں گے، اسی طرح امید ہے کہ آپ بھی ہمارے حرف یاد کو لوح ضمیر منیر سے ہرگز محو نہ فرمائیں گے۔ ہماری یہ تمنا ہے کہ آپ عہدہ سب ججی پر بحالہٖ مستقل ہو کر پھر ہمارے ضلع میں رونق افروز ہوں اور وہ روز سعید ہمارے لیے بجائے خود نوروز ہوگا جب آپ تشریف لاکر ہم سب کو سرور موفور بخشیں گے۔

پنڈت صاحب۔ میں نہ قاآنی یا انوری نہیں ہوں کہ آپ کی ثنا یا دعا میں شاعرانہ مبالغہ کروں۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ آپ فیاضی میں ابر نیساں یا ایثار و کرم میں حاتم دوراں ہیں، میں نہ کہوں گا کہ آپ کی عمر ہزار برس کی ہو، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ یہ سب جھوٹ سمجھیں گے، بلکہ دروغ مصلحت آمیز بھی خیال نہ فرمائیں گے؂

نگویمت چو زباں آوران رنگ آمیز　　کہ ابر مشک نشانی و بحر گوہر زائے

نہ کار ہر انچہ نوشتست و عمر نفزاید　　پس ایں چہ فائدہ گفتن کہ تا بحشر بپائے

پس میں آپ کو اخلاص باطنی سے وہ سچی دعا دوں گا، جو سعدی نے اپنے ممدوح کو دی ہے۔ یعنی یہ کہوں گا کہ جب تک آپ اس دار فانی میں زندہ رہیں آپ باکام و بامراد زندگی بسر کریں خدا آپ کو اسی طرح نیکی کرنے کی توفیق عطا کرتا رہے۔ آپ ہر شخص کے حقوق پر پوری نظر رکھیں۔ آپ کے دوست، عزیز، اقارب آپ کے بہی خواہ رہیں اور آپ کے کام آئیں اور آپ ان کے کام آئیں۔ رشتۂ حیات بابرکات سالہا سال کی درازی پائے اور اولاد و احفاد کی سلامتی

وتندرستی سے خاطر شریف حظ اٹھائے اور جب آپ اپنی حیات کی ودیعت کو حافظ حقیقی کے سپرد کریں، تو آپ دنیا سے وہ چیز اپنے ساتھ لے جائیں جو دولت وحشمت اور حکومت سے نہیں حاصل ہوتی، بلکہ راستبازی، نکوکاری اور خداترسی سے میسر آتی ہے یعنی نام نیک جو کہ انسان کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے ؎

دولت جاوید یافت ہر کہ نکونام زیست
کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

سر سیّد میموریل فنڈ

اور

مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ کی اپیل

ماہ ستمبر ۱۸۹۸ء میں بمقام ٹون ہال فرخ آباد ایک جلسہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا زیر صدارت جناب مسٹر آر۔ پی ڈیوہرسٹ صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ سرسید میموریل فنڈ کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ علی گڑھ سے ایک ڈیپوٹیشن بسرکردگی جناب آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر آکر فتحگڑھ میں ٹھہرا تھا۔ مرزا عرفان علی بیگ ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد، یہاں کی لوکل کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے اور میر کرار حسین مرحوم مختار عدالت اُس کے سکریٹری تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے مُشران صاحب سے ڈیپوٹیشن کی تائید میں اسپیچ دینے کی فرمائش کی۔ میموریل فنڈ کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کالج کو بیادگار سرسید مرحوم، یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچایا جائے۔

اسپیچ جو دی گئی وہ درج ذیل ہے۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

سجدہ کی جا ہے شکر خدا کا مقام ہے
موقع ہے آج کیجیے کرنا جو کام ہے

کالج کے حامیوں کا یہاں اژدحام ہے
اب حسن اتفاق میں کس کو کلام ہے

وہ کام ہو کہ روم سے تا شام نام ہو
وہ عزم ہو کہ بخت سکندر غلام ہو

آج کا جلسہ ایک خاص نوعیت رکھتا ہے۔ میں نے اس شہر میں بڑے بڑے جلسے دیکھے ہیں کسی میں ہندو مسلمان دونوں اس کثرت سے جمع نہیں ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہندوؤں کا جلسہ ہے تو مسلمانوں کو اس کثرت سے شریک ہوتے ہیں نے نہ دیکھا تھا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ خاص مسلمانوں کا جلسہ ہے تو یہ پہلا موقع ہے کہ ہندو ایسے جلسے میں اس کثیر تعداد سے جمع ہوئے ہیں۔ صاحب کلکٹر بہادر کی رونق افروزی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ جلسہ سرکاری



سر سید اعظم

طور پر کیا گیا ہے کہ جس کے باعث اتنا مجمع ہے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید مرحوم کے نام کا جادو ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے اور اسی شہید قوم کے کارناموں کا نقش ہمارے دلوں پر سویدا کی طرح ہے جو جذب مقناطیسی سے اس وقت ہم سب کو اس جلسہ کی طرف کھینچ رہا ہے۔

میرے نزدیک ہندوؤں نے جوق جوق جمع آ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب لیاقت یا حسن عمل کی داد دینے کا موقع آتا ہے تو وہ فیاضانہ خیالات ظاہر کرتے ہیں اور دریا دلی سے کام لیتے ہیں اور خود غرضی یا مذہب یا قومیت کا خیال چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ دوستی کالے گورے کا امتیاز نہیں جانتی، اسی طرح قدر دانی اور شکر گذاری بھی مذہب اور قومیت کا فرق نہیں رکھتی۔ اگر قابلیت، قومی ہمدردی اور حسن عمل قابل قدر چیزیں ہیں تو ہر شخص کو بلا خیال مذہب و قومیت کے اس فنڈ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں خود اپنی نسبت نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت کس فرقہ اور کس جماعت کی طرف سے اپیل کر رہا ہوں۔ آیا ہندوؤں کی طرف سے یا مسلمانوں کی جانب سے۔ بہر حال میں اس وقت ایسے لوگوں کا قائم مقام ہوں جو انصاف پسند ہیں اور قومی ہمدردی اور لیاقت کی داد دینے والے ہیں اور ملک کی خیر خواہی اور گورنمنٹ کی وفاداری کی قدر کرنے والے ہیں۔ لیاقت کی قدر شناسی کا سبق ہم کو انگریزوں سے سیکھنا چاہیے۔ ابھی حال میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا ہے کہ مسٹر منموہن گھوش کی یادگار منانے کے لئے انگلستان میں چندہ کیا گیا ہے۔ ذرا غور فرمائیے گا، کجا بنگالہ کجا انگلستان سمندر پار ہزاروں میل کا فرق ؏

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

مذہب و ملت اور قومیت کا فرق، اس سے بھی زیادہ گویا سیاہ اور سفید کا فرق۔ اس پر مستزاد، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بنگالیوں سے انگریز بہت جلتے ہیں۔ اس بنگالی کی یادگار منانے میں، ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ قابلیت کی قدر دانی کرنے میں اور دوست کے ساتھ دوستی کا سچا برتاؤ اور اخلاص برتنے میں ہم ذات، مذہب، قوم، جماعت کا کچھ خیال نہیں کرتے، نہ کالے گورے نہ فاتح مفتوح میں کچھ تمیز کرتے ہیں۔

سر گور اوسلی صاحب کا حال آپ نے پڑھا ہو گا جب ۱۸۱۱ء کے شروع میں بعنوان سفارت انگلستان کی طرف سے صاحب موصوف فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں گئے، اس وقت کچھ

عرصہ تک شیراز میں اُن کا قیام رہا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ " میں وہاں اکثر شیخ سعدی کے مزار کی زیارت کیا کرتا تھا۔ مسٹر فرینکلن سیاح نے جو سعدی کی قبر کا حال اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے میں نے وہ بچشم خود دیکھا۔ حقیقت میں قبر بہت بوسیدہ ہوگئی ہے اور عنقریب کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہوکہ وہ خطہ ایران کا فخر، جو زہد و تقویٰ، ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے۔ مجھے جو حسن عقیدت شیخ اور اس کے کلام کے ساتھ تھا، اس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرکے شیخ کے مقبرہ کی مرامت کرادوں، مگر حسین علی میرزا نے جو شاہ ایران کا پانچواں بیٹا اور فارس کا گورنر تھا، مجھ سے بہت اصرار اور سرگرمی سے یہ کہا کہ آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں، میں خود سعدی کی قبر کی مرمت اُسی خوش اسلوبی سے کرادوں گا جس طرح کریم خاں زند نے حافظ شیرازی کے مقبرہ کی مرمت کرائی تھی، لیکن افسوس کہ اُس شہزادے نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا"۔

صاحبو کیا عبرت کی جگہ ہے کہ ایک عیسائی مذہب اپنے ملک سے ہزاروں کوس نکل کر ایک اجنبی ملک میں اپنے کارِ خاص پر جاتا ہے اور وہاں سفر کی حالت میں ایک مسلمان مصنف کی یہ قدر کرتا ہے کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرکے اُس کے مقبرہ کی مرمت کرانا چاہتا ہے حالانکہ کوئی واسطہ مذہب یا قوم یا ملک کا اُس کے ساتھ نہیں رکھتا، اور ایک مسلمان شاہزادہ باوجودیکہ اس مصنف کا ہم وطن، ہم مذہب اور ہم قوم ہے، یہ بے اعتنائی عمل میں لاتا ہے! انہی سرگور کے ایک چھوٹے بھائی اور اہلِ کمال کے قدرشناسوں کے ایک نمونہ ہمارے میرِ مجلس مسٹر ڈیوہرسٹ صاحب بہادر ہیں۔ باوجودیکہ مسلمانوں یا ہندوؤں سے سوائے انسانیت کے رشتہ کے کوئی دوسرا واسطہ قوم یا مذہب یا ملک وغیرہ کا نہیں رکھتے، لیکن سرسید کی قدر دانی میں ان کے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یقیناً اُسی خوشی سے چندہ میں شریک ہوں گے جیسے ہم سب لوگ۔

صاحبو۔ جب کہ مہذب قوموں میں غیر قوموں کے ساتھ یہ قدر دانی ہے، جس کی مثالیں ابھی عرض کی گئیں، تو سرسید تو ہمارے بھائی تھے۔ ہم اُن کے عمدہ کاموں کی داد دیتے ہیں تو، کیا بڑی بات ہے۔ اُس فدائے قوم نے کتنا بڑا احسان اپنی قوم پر کیا ہے کہ اُس کو پستی زوال سے اُبھار کر اوجِ کمال پر پہونچادیا ہے۔ سرسید پہلا شخص تھا جس نے یہ کہا۔ الاسلام ھو الفطرۃ والفطرۃ ھی

"الاسلام" وہ جس ملک اور جس قوم میں پیدا ہوتا، اس کے لئے باعث افتخار ہوتا۔ علی گڑھ کالج قائم کرنے سے سرسید کا منشا یہ تھا کہ ایسا کالج ہونا چاہیے جہاں علم نہ صرف اُستاد کا تعلق شاگردوں کے ساتھ رکھیں، بلکہ اُن کے ولی اور والدین کے قائم مقام ہوں۔ ایسی تعلیم گاہ ہو کہ جہاں تعلیم نظری و عملی دونوں میسر آئیں، جہاں طلبہ آپس کی خیر خواہی اور ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سیکھیں، جہاں خوشیتن داری سکھائی جائے، جس کو انگریزی میں "سلف ریسکٹ" کہتے ہیں۔ ایسا دارالعلم ہو جہاں طلبہ گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری کرنا سیکھیں اور اُن نعمتوں کی قدر دانی کریں جو دولت برطانیہ کی بدولت ہم کو حاصل ہیں۔ وہ یہ بات چاہتے تھے کہ قوم کا ہر فرد نہایت صلح جو اور بکار آمد سٹیزن بن جائے۔ وہ دلدادۂ اسلام یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں اخوت اسلامی اور حمیت اسلامی پیدا ہو جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالج کی یہ اغراض قابل پسند نہیں۔ علی گڑھ کالج اس بات کی یادگار ہے کہ سرسید نے اپنی قوم کی خدمت یوں نمایاں طور پر کی اور اب جو آپ متفقہ کوششوں سے اُس کالج کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچائیں گے، تو وہ اس بات کی یادگار ہوگا کہ قوم نے سر سید کے احسانات کا شکریہ یوں نمایاں طور پر ادا کیا ہے۔

صاحبو۔ کالج کی عمارتوں کو خوب وسیع اور عالیشان کیجیے، بورڈنگ ہاؤس کے طلبہ کی تعداد بڑھائیے، وظائف اور انعامات کثرت سے قائم کیجیے۔ غرضکہ کالج کو تعلیم کا مرکز بنا دیجیے تاکہ وہ مثل بغداد کے مدرسہ نظامیہ یا قرطبہ کی یونیورسٹی یا غرناطہ کے دارالعلوم کے تمام اسلامی دنیا میں مشہور و معروف ہو جائے۔ عہد سلطنت عباسیہ میں مدرسہ نظامیہ نے اور دولت بنی اُمیہ کی بدولت تعلیم گاہ قرطبہ و غرناطہ نے وہ فروغ پایا تھا کہ اسلامی دنیا کے سوا یورپ و افریقہ کے دور دراز ملکوں سے طالب علم وہاں پہونچا کرتے تھے اور جو شخص اُن درس گاہوں سے پڑھ کر نکلتا تھا اُس کے مستند سمجھنے میں کسی کو کوئی کلام نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ علی گڑھ کالج جب محمڈن یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچ جائے گا، تو تمام اسلامی دنیا میں مشہور ہو سکتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے حق میں بڑی رحمت ثابت ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے مدرسے اور مکتب جا بجا قائم کرنے سے احتراز کیجیے، ورنہ قوت تقسیم ہو جائے گی۔ ہر شخص کو چاہیے کہ درمے۔ قدمے۔ سخنے اسی کالج کو مدد دے، تاکہ یہ بڑا کام جو آپ نے ہاتھ میں لیا ہے، انجام پا جائے، ورنہ چھوٹا مدرسہ

چلے گا نہ بڑا کالج، دونوں بے ثبات ہوکر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ فرض کیجیے کہ آفتاب کے بہت سے ٹکڑے کرکے تمام آسمان مری پر پھیلا دیے جائیں تو کیا اُس کا یہ جاہ و جلال باقی رہے گا اور پھر کیا وہ اپنی روشنی و تمازت سے حیوانات و نباتات کو وہی فائدہ پہونچا سکے گا جو اس وقت پہونچا رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر سو مدرسے ایسے ہوں جو ناکافی تعلیم دیتے ہوں، ان کے مقابل میں ایک کالج اچھا جو کامل تعلیم دے سکے۔ جب سرسید نے یہ کالج قائم کرنا چاہا تھا تو ان کے مددگاروں کی رائے یہ تھی کہ کالج کی عمارتوں میں زیادہ روپیہ نہ لگایا جائے، بلکہ وہ تعلیم کی دوسری اغراض کے لئے محفوظ رکھا جائے، مگر واہ رے سرسید! صرف وہی شخص تھا جس نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کالج کی عمارتیں کیمبرج یونیورسٹی کے نمونہ پر شاندار اور وسیع بنوائیں اور کالج کو بہت بڑا مرکزِ تعلیم بناکر ایک زبردست دارالعلوم بنادیا جو تمام ملک میں مشہور ہوکر ہندوستان کے ہر حصہ سے طالب علم کھینچ لایا۔ حسن اتفاق سے سرسید کا اپنے مشیروں کی رائے سے اختلاف کرنا مسلمانوں کے حق میں ایسا ہی رحمت کا باعث ہوا، جیسا جنگ پلاسی کے وقت جنرل کلائیو کا اپنے مشیرانِ مجلس کی رائے سے اختلاف کرنا انگریزوں کے حق میں مفید ہوا تھا۔ اگر کلائیو نے اپنی کونسل کی رائے پر عمل کیا ہوتا اور پلاسی کی لڑائی نہ لڑی ہوتی تو بنگالہ فتح نہ ہوا ہوتا اور سلطنت انگلشیہ کی بنیاد نہ پڑی ہوتی۔ اسی طرح اگر سرسید نے عام رائے سے اتفاق کیا ہوتا تو اس وقت یقیناً بجائے موجودہ عظیم الشان عمارتوں کے چند جھونپڑیاں مکتب خانوں کی ہوتیں جن میں ملا لوگ بوریا بچھائے ہوے لڑکوں کو قرآن پڑھایا کرتے اور اہل محلہ کی خیرات سے اُن کا گذارہ ہوا کرتا اور علی گڑھ سے باہر اِن مکتبوں کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔

صاحبو۔ چھوٹی اور بڑی تعلیم گاہوں کا باہم مقابلہ کیجیے۔ ایک مڈل اسکول لیجیے اور ایک ہائی اسکول۔ دونوں میں مڈل کلاس ہے، دونوں جگہ یکساں کتابیں ہیں، مگر ہائی اسکول کے مڈل کلاس کے طالب علم بمقابلہ مڈل اسکول کے مڈل کلاس کے طلبہ کے، زیادہ لائق ہوں گے۔ پھر ہائی اسکول لیجیے اور کالیجیٹ اسکول۔ دونوں میں انٹرنس کلاس اور دونوں درجوں میں یکساں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مگر کالیجیٹ اسکول کے انٹرنس کے طالب علم بمقابلہ ہائی اسکول کے انٹرنس کے طالب علم کے، زیادہ ہوشیار اور لائق ہوں گے۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ ایک معمولی

کالج ہے اور ایک یونیورسٹی کالج۔ دونوں جگہوں کے ایف، اے۔ بی، اے۔ ایم، اے کے طلبہ کا باہم مقابلہ کیجیے، تو یونیورسٹی کالج کے طلبہ کو آپ زیادہ لائق پائیں گے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جتنی بڑی تعلیم گاہ ہوگی اور جتنے زیادہ لائق اور بیدار مغز اُستاد ہوں گے اُتنے ہی زیادہ لائق اور روشن دماغ اور بلند خیال شاگرد ہوں گے۔ پس آپ لوگ اگر اپنے کالج کو محمڈن یونیورسٹی کے درجہ تک پہونچائیں گے تو یقیناً اور بھی زیادہ عمدہ تعلیم و تربیت آپ کے کالج میں میسر آئے گی اور مسلمانوں کو تعلیمی فائدے اس وقت کے مقابلہ میں بہت زیادہ پہونچیں گے۔

صاحبان والاشان۔ یہ کہنا غلط اور سراسر غلط ہے کہ سرسید صرف مسلمانوں کے ہی خواہ تھے اور قوموں سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا۔ سرسید کی تقریریں جو وائسرائے کی کونسل میں لوکل سلف گورنمنٹ پر اور البرٹ بل کے پُر آشوب زمانہ میں ہوئی ہیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ شخص تمام ہندوستان کا وکیل ہوکر گفتگو کرتا تھا۔ ہمارے صوبہ میں وہ پہلا شخص تھا جو ہندوستان میں پارلیمنٹ ہونے کی ضرورت انگریزوں پر ظاہر کرتا تھا۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہم چند مسائل پر اختلاف رائے تھا تو سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بناکر وہ اختلاف دور کردیں تاکہ مسلمان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ملک کے خیر خواہ بنیں اور ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہوجائیں۔ اصل یہ ہے کہ ہر فرقہ آج کل ملکی اور قومی ترقی کو مدنظر رکھتا ہے، لہٰذا آزادی کے سبب کوئی فرقہ ایک طریق کو اور کوئی گروہ دوسرے اصول کو باعث عروج سمجھتا ہے۔ بہرحال نیک نیتی سے مختلف راہیں اختیار کرنے میں مآل وہی ہے کہ ایک منزل مقصود پر پہونچیں۔

صاحبو۔ مجھے احتمال ہے کہ مبادا میری گفتگو نے طول کھینچا ہو اور یہ بھی خیال ہے کہ ہنوز عملی کارروائی چندہ کی ہونا باقی ہے، لہٰذا میں آپ کو اب زیادہ منتظر نہ رکھوں گا اور بالآخر میں آپ لوگوں کی خدمت میں اپیل کروں گا کہ ایسے کار خیر میں شریک ہوکر داخل حسنات ہوجیے اور اُس فدائے قوم کے مانند جس نے قومی ہمدردی کا سبق آپ کو پڑھایا ہے، اس وقت فیاضی اور دریا دلی سے کام لے کر نام نیک بلکہ ثواب دارین حاصل کیجیے۔ میں آپ کی خدمت میں اسلام کے نام سے اپیل کرتا ہوں جس کا حامی و مددگار سرسید تھا اور جس کی شان و شوکت زمانہ سابق میں بے نظیر تھی۔ آپ مسلمانوں سے اُمید ہے کہ علوم و فنون کی اشاعت اور حکمت و فلسفہ کی سرپرستی میں وہی ذوق

علمی ظاہر کریں گے جو زمانہ متوسط میں خلفائے عباسیہ و بنی اُمیہ کے عہد میں عروج اسلام کا باعث ہوا تھا۔ میں تمام ہندو صاحبوں اور آریا بھائیوں کی خدمت میں یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس کار نیک میں اُسی مستعدی اور فیاضی کے ساتھ شریک ہوں جو آپ کے آباؤ اجداد اور برگزیدہ اسلاف کا مشہور طریقہ تھا۔ آپ لوگوں میں دیش اوپکار یعنی رفاہ ملکی اعلیٰ درجہ کا عمدہ کام سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا اچھا کام ہو سکتا ہے کہ آپ چھ کروڑ مسلمانوں کو بے شمار تعلیمی فائدے پہونچائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے ملک کی فلاح و بہبود کریں گے۔ آخر میں ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ و جماعت کی طرف سے میں آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ اس وقت، بلا خیال مذہب و قوم کے، نہایت سچے دل سے اُس حبیب وطن کی زندہ یادگار بنانے میں شریک ہو جیے۔

قیصرۂ ہند کو مبارکباد

۷؍جون سنہ ۱۹۰۰ء کو جبکہ بذریعہ تار برقی پریٹوریا کے فتح ہونے کی خبر شایع ہوئی، تو قیصرۂ ہند کو اس کامیابی کی مبارکباد دینے کی غرض سے فرخ آباد میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا، جس میں مشران صاحب نے احباب کی فرمائش سے حسب ذیل تقریر فرمائی اور تقریر کے بعد رزولیوشن پیش کیا، جو پاس ہونے کے بعد وائسرائے ہند کو بھیجا گیا۔

میر مجلس اور حضرات انجمن ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

آج ہم لوگ اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اپنی مادر مہربان ملکہ معظمۂ انگلستان پر اپنی ہمدردی و خیر خواہی کا اظہار کریں۔ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جنگ ٹرانسوال میں جو نمایاں فتح سلطنت برطانیہ کو حاصل ہوئی ہے اس پر گورنمنٹ کو بصد مسرت و طرب تہ دل سے مبارکباد دیں۔ سبحان اللہ کیا برٹش قوم ہے جس نے اپنے سرد برفستانی ملک سے نکل کر اپنے ملک اور اپنی قوم کا اقتدار ایک ایسے بر اعظم میں جاکر، اپنا خون آب باراں کی طرح بہاکر قائم کیا جہاں زمین تابش آفتاب سے کورۂ آہنگراں کی مانند گرم رہا کرتی ہے، بلکہ ماہی فلک بھی تمازت آفتاب سے [illegible] ہوئی جاتی ہے۔ جس وقت ہماری فوج نے دریائے ماڈر اور دریائے [illegible] کیا، اس وقت دریاؤں کی وہ طغیانی تھی کہ الاماں ؎

سہمگیں آبے کہ مرغابی درو ایمن نبودے
کمتریں موج آسیا سنگ از کنارش در ربودے

اور سے غنیم باڑھیں مار رہا تھا اور آگ برسا رہا تھا، جو ہمارے سپاہیوں کو بھاڑ کی طرح بھونے ڈالتی تھی، مگر ان بہادروں نے نہ پانی کا خیال کیا نہ آگ کا، بلکہ سینہ سپر ہوکر آگے بڑھ گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آگ اور پانی دونوں عناصر بھی اس خاک کے پتلے قدرت رکھتے ہیں

اور اُن کی وقعت باد ہوائی سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ ان بہادروں کی قدر دانی کے لئے اور ایسے دلاوروں کے پس ماندگان کو تقویت دینے کے لئے اور اُن کا دل بڑھانے کے لئے اور ایسے شیر مردوں کی کامیابی پر ملکہ معظمہ انگلستان کو مبارک باد دینے کے لئے ہم لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ دریاؤں کے عبور کے بعد ہماری فوج لشکر اعدا پر ٹوٹ پڑی اور اُن کے سروں پر بلائے آسمانی کی طرح نازل ہو گئی۔ پھر تو وہ ہنگامہ کارزار گرم ہوا جو جنگ رستم و اسفندیار کی مانند صفحۂ روزگار پر ہمیشہ یادگار رہے گا۔

دو لشکر بہم برزدند ازکمیں — تو گوئی کہ زد آسماں بر زمیں
دو لشکر چو مور و ملخ تاختند — نبرد جہاں در جہاں ساختند
دو ابر از دو سو در خروش آمدند — دو دریائے آتش بجوش آمدند
زبس گرد بر تارک و ترک و زیں — زمیں آسماں آسماں شد زمیں
چناں گرم گشت آتش کارزار — کہ از نعل اسپاں بر آمد شرار

صاحبو۔ گو جنگ ٹرانسوال میں ابتدا میں بور لوگوں کو عارضی کامیابی ہوئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزی فوج کو ہزاروں میل اپنے وطن سے باہر ملک غیر میں، جس سے کچھ واقفیت نہ تھی، جا کر ایک جنگ جو اور نبرد آزما قوم سے لڑنا پڑا، لیکن آخر کو مبارزان دولت انگلشیہ کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکے، کیونکہ قوم برٹش ایک زبردست قوم ہے جو لشکر کثیر اور زر خطیر میں دشمن پر بدرجہا فائق ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر جب لڑتے لڑتے تھک گئے، تو امان چاہی اور متابعت اختیار کر لی۔

اس میں شک نہیں کہ اہل ٹرانسوال نے مقابلہ سخت کیا اور خوب داد شجاعت دی، مگر تقدیر میں شکست اور قوم کی بربادی تھی وہ ظہور میں آئی ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

جتنے مقامات دشمنوں نے فتح کر لیے تھے، وہ یکے بعد دیگرے اولیائے دولت انگلشیہ کے قبضہ میں آ گئے اور اُمید ہوتی ہے کہ آخر کو تمام ملک ٹرانسوال اور آرنج فری اسٹیٹ داخل ممالک محروسہ ہو جائے گا۔

یہ فتحیابی اور کامیابی جو جنگ بوربن ظہور میں آئی، اس کے لئے پورے شکریہ کے مستحق ہمارے بوڑھے جنرل فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس صاحب بہادر ہیں۔ اللہ اللہ کیا دلاور کا نام میری زبان سے نکلا ہے جس پر اس وقت تمام سلطنت برطانیہ فخر کر رہی ہے۔

اس دلاور جنرل نے سلطنت انگلشیہ کی عزت اس وقت رکھی۔ تمام دنیا میں جہاں جہاں حکومت برطانیہ ہے، ہر شخص کی آنکھ لارڈ رابرٹس کی طرف لگی ہوئی تھی کہ دیکھیں ہمارا جنرل کیا کارنمایاں کرتا ہے۔ جس طرح نپولین کے مقابلہ میں ڈیوک ولنگٹن نے جنگ واٹرلو میں برٹش اقتدار قائم رکھا، اسی طرح لارڈ رابرٹس نے اس وقت اپنے ملک و قوم کی عزت بڑھائی۔

ہم لوگوں کو اس جلسہ مبارکباد میں ایک خاص دلچسپی ہے، جو ہر ضلع کو نہیں ہوسکتی۔ وہ یہ ہے کہ ایام غدر میں اس وقت سے تینتالیس برس پیشتر انہی لارڈ رابرٹس نے جو اس وقت صرف فریڈرک رابرٹس تھے بمقام خداگنج باغیوں کی فوج کو بڑی زک دی تھی اور بہت بڑا معرکہ جیتا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب فوج انگریزی باغیوں کے مقابل میں آئی، تو دو سوار لشکر اعدا سے نکلے اور بھالے ہاتھوں میں لیے ہوئے لڑتے مارتے فوج انگریزی میں گھس پڑے اور انگریزی نشان چھین کر گھوڑے اڑاتے ہوئے اپنی فوج سے جا ملے۔ سپہ سالار نے تمام فوج کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ ان دونوں سواروں نے پوری دادمردانگی دی ہے، اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہونا چاہیے کہ ایک سپاہی ان سواروں کا تعاقب کرے اور نشان انگریزی چھین کر واپس لائے۔ فوراً فریڈرک رابرٹس نے بجلی کی طرح کڑک کر جواب دیا کہ میں جاتا ہوں اور فی الفور اسپ برق رفتار اُن سواروں کے پیچھے ڈال دیا۔ سوار اپنے لشکر تک پہونچے تھے کہ یہ بھی سایہ کی طرح اُن کے ساتھ ہی پہونچے۔ پاس پہونچ کر ایک ہاتھ سے اُس سوار کو جس کے ہاتھ میں نشان تھا نیزہ مارا اور اُس کا کام تمام کر دیا دوسرے ہاتھ سے نشان چھین لیا۔

جب نشان لے کر واپس چلے، تو فوج باغی کے اکثر سپاہیوں نے حملے پر حملے کیے مگر یہ سب کو مارتے کاٹتے اور اپنے آپ کو بچاتے ہوئے صاف نکل آئے اور اپنے سپہ سالار کے روبرو نشان لاکر رکھ دیا۔ تمام لشکر انگریزی نے نعرہ "مرحبا و جزاک اللہ" بلند کیا۔ پس ہمارا ضلع جو لارڈ رابرٹس کے معرکے اور اُن کی بہادری اُن کی جوانی میں دیکھ چکا ہے اور اُن کی جولان گاہ رہ چکا ہے وہی

اس وقت اُن کے کارنامے اُن کے بڑھاپے میں دیکھ کر اظہارِ مسرت کر رہا ہے اور مبارک باد دے رہا ہے۔

صاحبو۔ ایک بات اس لڑائی میں ایسی دیکھنے میں آئی جو ہمارے نزدیک اس فتح سے بھی زیادہ فخر کے لائق ہے یعنی یہ کہ دنیا میں جہاں جہاں حکومت برطانیہ ہے ہر ملک اور ہر صوبہ نے انگلستان کو مدد دینے میں پیش قدمی کی اور اس کی مصیبتوں اور مشکلوں کے وقت ہمدردی کا اظہار کیا اور فتح وظفر میں مسرت کا اعلان کیا۔ کل کی بات ہے کہ جب انگلستان پر مصیبت تھی تمام دنیا سے جہاں جہاں سلطنت برطانیہ ہے برٹش یتیموں اور بیواؤں کے واسطے چندے ہوئے اور جب فتح کی خبریں آئیں تو تمام ربع مسکون سے نعرۂ مرحبا و مبارک باد بلند ہوا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت انگلشیہ میں وہ رعایا پروری اور انصاف گستری ہے کہ تمام رعایا بچوں کی طرح اپنی مادر مہربان یعنی ملکۂ انگلستان سے محبت رکھتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت برطانیہ گو چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے، مگر نہایت متحد ہے، یا یوں کہیے کہ جان ایک ہے اور قالب صرف جدا جدا ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ تمام قلمرو ٹرانسوال اور آرنج فری اسٹیٹ، اب جلد تر داخل ممالک محروسہ برطانیہ ہو جائیگا اور تمام قلمرو برطانیہ واقع براعظم افریقہ، آپس میں ملحق و متحد ہو کر ایک سلطنت عظیمہ بن جائے گی۔ رعایائے ٹرانسوال کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ آئندہ وہ تمام حقوق اور نعمتیں حاصل کرے گی جو اور جگہوں میں رعایائے برطانیہ کو حاصل ہیں۔

صاحبو۔ ہم سب کو خدا کی درگاہ میں سجدہ شکر کرنا چاہیے کہ اس نے قوم برٹش کی عظمت قائم و برقرار رکھی اور فتح و نصرت اس کے ہم قرین و ہم رکاب رکھی جس سے ہم تمام رعایائے برطانیہ کا اقتدار سلاطین دنیا کی نظر میں بڑھ گیا۔ اب ہم جملہ رعایائے جاں نثار کی دعائے دلی یہ ہے اور ہر دم یہی تمنائے قلبی ہے کہ ہماری ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کا اقبال روز افزوں ہو اور جو سرکش سر بر آستاں نہ ہو سرنگوں ہو۔ رشتہ حیات ظل سبحانی تا وسعت خیال درازی پائے اور اولاد کی سلامتی و کامرانی سے خاطر اقدس تا ابد حظ اٹھائے۔

اب میں آخر میں آپ صاحبوں کی منظوری کی غرض سے یہ رزولیوشن پیش کرتا ہوں جو حضور وائسرائے کے ذریعہ سے ہماری ملکہ معظمہ دام اقبالہا کی خدمت میں بھیجا جائے گا۔

"ہم سب لوگ ہندو مسلمان عیسائی، رعایائے جاں نثار کے ہر گروہ و جماعت کے اشخاص، اس انجمن عام میں جمع ہو کر جنگ ٹرانسوال کی نمایاں کامیابی پر گوناگوں اظہار مسرت کرتے ہیں اور ملکہ معظمہ انگلستان قیصرہ ہند کو، اس فتح عظیم پر مبارک باد بادل شاد دیتے ہیں اور بصد ادب نواب گورنر جنرل وائسرائے کشور ہند کی خدمت بابرکت میں التجا کرتے ہیں کہ ممدوح الیہ، ہماری یہ مبارک باد، ہماری مادر مہربان یعنی ملکہ معظمہ انگلستان اور قیصرہ ہندوستان کو پہنچا دیں۔"

رخصتی تقریر

ماہ اپریل سنہ ۱۹ء میں رائے پنڈت اندر نرائن صاحب سب جج درجہ اول فرخ آباد کا تبادلہ ہوا۔ اس وقت شہر اور فتحگڑھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اور نیز پبلک لائبریری فرخ آباد کے ممبروں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ایک جلسہ وداعی بمقام ٹون ہال فرخ آباد منعقد کیا جس میں تمام عمائدین شہر و حکام اور نیز عوام کی ہر جماعت کے نمایندے موجود تھے۔ جلسہ کا انتظام مشران صاحب کو بحیثیت سکریٹری تفویض کیا گیا تھا۔ جلسے میں قریب قریب ہر فرقہ اور ہر طبقے کے نمایندوں نے اپنی اپنی جماعت کی طرف سے وداعی تقریریں کیں۔ چنانچہ سب تقریروں کے بعد پبلک لائبریری اور "تھیوزافیکل سوسائٹی فرخ آباد" کے ممبروں کی طرف سے موصوف نے حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

رخصتی جلسے گاہ گاہ شہر و فتحگڑھ میں دیکھنے میں آئے ہیں، مگر ایسا کمتر ہوا ہے کہ کسی حاکم یا افسر کی روانگی کے وقت مختلف جماعتوں کی طرف سے علیحدہ علیحدہ اڈریس دیے گئے ہوں یا قصیدے پڑھے گئے ہوں۔ جیسا کہ ہمارے دوست رائے صاحب کی رخصت کے وقت۔ نہ دلی جذبات کا سچا اظہار ایسی گرمجوشی کے ساتھ کبھی پیشتر کیا گیا تھا، جیسا کہ اس وقت۔ بہرکیف ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے دوست خاص و عام میں بدرجہ غایت ہر دلعزیز رہے ہیں اور سب کو آپ سے جدا ہونے کا بہت افسوس ہے۔ اس وقت میری زبان سے ایسی باتیں نکلیں گی جو رائے صاحب کو ناگوار معلوم ہوں گی، کیونکہ انگریزی تہذیب کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی کی تعریف اُس کے سامنے کی جائے تو اُس کو تلخ و بدمزہ معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے دوست کو انجمنوں کے اشتراک کا بہت شوق ہے۔ آپ لائبریری فرخ آباد، تھیوزافیکل سوسائٹی، ہت اوپکاری سبھا، تین کمیٹیوں کے میر مجلس ہیں اور سب کا کام نہایت شوق، محنت اور ہمدردی سے کرتے ہیں۔ جس طرح ذوق دیانت اور سرگرمی سے آپ اپنے پبلک خدمات اور اپنا



راے پنڈت اندر نراین گرٹو

کار منصبی انجام دینا فرض عین سمجھتے ہیں، پبلک لائبریری کی ابتدا سے اس وقت تک جو کام آپ نے اس کمیٹی کا انجام دیا، یا جو آپ سے امداد لائبریری کو پہونچی، اُس کا بیان کرنا گویا چھ مہینے کی تاریخ لائبریری کو شروع سے آخر تک دوہرانا ہے۔ اس قدر کہنا کافی ہے کہ اس کی بنیاد کو آپ سے استحکام پہونچا جو قابل یادگار ہے۔ میری کوشش اس لائبریری کی بنیاد ڈالنے میں ہرگز اس قدر کامیاب نہ ہوتی، اگر ہمارے پریسیڈنٹ صاحب کی عقل مصلحت اندیش اور مدبرانہ رائے میری رہنما نہ ہوتی۔ اس وقت میں اپنے ذاتی خیالات ظاہر نہیں کرتا بلکہ کل جماعت اہل انجمن کا خیال عرض کر رہا ہوں۔

حکام والا مقام کے لئے عام لوگوں سے زیادہ ملنا اندیشہ سے خالی نہیں ہوتا اور اُن کے عہدہ کی شان کے خلاف بھی ہوتا ہے اور انواع واقسام کے خطرے اس میں رہتے ہیں اور بالکل نہ ملنا بھی نقصان پہونچاتا ہے کیونکہ رفاہ عام کے کام اکثر ایسے ہوتے ہیں، جن میں حکام کی ہمدردی بہت مفید ثابت ہوتی ہے، اُس سے لوگ محروم رہتے ہیں۔ پس دونوں عادتوں میں افراط وتفریط ہے، لہذا دونوں معیوب ہیں۔ اگر پہلی عادت سبکی کی طرف مائل ہوتی ہے تو دوسری عادت سے کبر ونخوت پائی جاتی ہے اور دونوں عادتوں سے کسی نہ کسی طور پر جمہور کو نقصان ہوتا ہے۔

نہ کیا اور مزہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اُسے تیر قضا اس کو پر تیر قضا سمجھے

مگر ہمارے رائے صاحب نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو دونوں کے بین بین ہے "خیر الامور اوسطھا" آپ نے اعتدال کا طریق اختیار کیا ہے یعنی آپ باہمہ اور بے ہمہ ہیں۔ جس کام کو آپ رفاہ عام کا کام سمجھتے ہیں، اُس میں بے تامل شریک ہوتے ہیں اور اس کو بخیر وخوبی انجام دینے میں سعی کرتے ہیں۔ اس طریقہ پر تو آپ باہمہ ہیں لیکن اگر کسی کمیٹی میں دو یا زیادہ فریق باہم اختلاف رکھتے ہوں تو آپ کسی پارٹی میں شریک نہیں ہوتے فقط اُس کا کام انجام دینے سے غرض رکھتے ہیں، یوں آپ بے ہمہ ہیں اور یہ دونوں طریقے نہایت زیادہ مستحسن ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ ہر دلعزیز ہیں۔

ہم آپ کے کیرکٹر پر جو نظر ڈالتے ہیں تو بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ میں دیانت وامانت ویسی ہی ہے، جیسی ایم سلی فریج بین میں تھی محبت ومشقت کی عادت وہی ہے، جو بیرم خاں سپہ سالار اکبر

میں تھی اور انسانی ہمدردی اور محبت آپ کی طبیعت میں اُسی قدر ودیعت کی گئی ہے جس قدر لاس کیبز پکلارک سن کی طبیعت میں۔ اگر ہمارے رائے صاحب کسی چیز کے دشمن ہیں تو وہ تعصب اور بے انصافی ہے اور ہم آپ کی نیک نیتی کا تجربہ کرکے بے خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بالفرض آپ کسی کو نقصان پہونچانے کا ارادہ بھی کریں (اس شکل مفروضہ کے لئے بھی بصد ادب معافی چاہتے ہیں) تو لا کلام اپنے ارادہ میں ناکام رہیں گے، کیونکہ وہ آپ کی عادت اور خصلت بلکہ فطرت کے خلاف ہے۔

وہ نیک ہیں کہ بدی کی طرف خیال نہیں
کسی طرح کا کسی سے کبھی ملال نہیں

پالیسی کے لفظ کو لوگوں نے بدنام کر رکھا ہے۔ جھوٹ بولنا، یا اپنی غرض پوری کرنے لئے جائز و ناجائز وسیلے اختیار کرنا کچھ شرم کی بات نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ یہ پالیسی ہے، لیکن ہمارے رائے صاحب اس طریقہ کو پسند نہیں کرتے کہ ع۔

دل میں تو ہے کچھ اور زباں پہ کچھ اور

آپ نے وہ طریق عمل رکھا ہے جو انگریزی میں ضرب المثل ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔
یعنی ایمانداری سے بڑھ کر دنیا میں کوئی حکمت عملی نہیں ہے۔

آپ نے یہاں گنگا کنارے کچھ عمارت بنوائی ہے جو آپ کے رفاہ عام کے خیالات اور دریا دلی کی یادگار رہے گی، لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ آپ نے اپنے خلق، خوش نیتی اور عدل و انصاف سے ہزاروں بندگان خدا کے دلوں میں ایسی یادگار بنائی ہے جو اس سنگین عمارت کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ مستحکم اور دیرپا رہے گی۔ آپ نے اپنے حاکمانہ برتاؤ میں یا پرائیوٹ حیثیت میں ہر ملت کے اشخاص کو یکساں سمجھا اور ان کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو انسان کو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کرنا چاہیے گویا اس مقولہ پر پورا عمل کیا ؎

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھیں ناگوار ہوتا

صاحبو۔ کوئی چیز ایسی ہوتی ہے کہ جب وہ سامنے آتی ہے تب اُس کی یاد آتی ہے لیکن کوئی ایسی ہوتی ہے کہ جب نہیں ہوتی ہے تو اُس کی عدم موجودگی اُس کی یاد دلاتی ہے۔ جب ہمارے

رائے صاحب ہمارے جلسوں اور کمیٹیوں میں نہ ہوں گے تب ہم کو اُن کی یادگار اور بھی زیادہ آئیگی اور ہم اُس وقت یہ کہیں گے کہ وہ "ہرچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" کے مصداق، نورانی چہرہ فرشتہ سیرت رائے صاحب کہاں گئے اور کس جگہ ہیں - ہمارے دوست کو رائے کا خطاب موروثی حاصل ہے جو اُن کے والد ماجد مرحوم کو برطانیہ کی خیر خواہی کے صلے میں مع ایک علاقہ زمینداری ومعافی کے از روئے سند بعد غدر عطا ہوا تھا۔ آپ ہندو کالج بنارس کے بڑے حامی ومددگار ہیں ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ آپ کی صدارت میں ایک بڑا عام جلسہ کالج مذکور کو امداد چندہ پہونچانے کے واسطے ہوا تھا جس میں چندہ کی ایک رقم معتد بہ جمع ہوگئی تھی اور اس کا بڑا حصہ خود رائے صاحب کی فیاضی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کو طلبہ کی تعلیم وتربیت کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ اہل علم وہنر کے بھی آپ پایہ شناس بدرجہ کمال ہیں اور خود بھی دولت علم وفضل سے مالامال ہیں۔ رائے صاحب اگرچہ آپ کی مدح وثنا سے ہمارے دلوں کو سیری نہیں ہوتی، لیکن ہم مجبوری ختم کلام کرکے آپ کو بادل پر درد الوداع کہتے ہیں اور آپ کے حق میں دعا کرتے ہیں۔

نور افشاں ہوں مہ ومہر جہاں میں جب تک
آسماں فرق زمیں پر رہے تا سایہ فگن

کامراں فیض سے تیرے رہیں احباب مدام
جس طرح باد بہاری سے ہو شاداب چمن

زیب تن تیرے سدا خلعت سرداری ہو
جامہ جسم ترے خصم لعیں کو ہو کفن

عارض صاف سے ہر وقت بشاشت ہو عیاں
رنج سے تیری جبیں پر نہ کبھی آئے شکن

ہے یہ درگاہ الٰہی میں دعا شیدا کی
تو سرافراز ہو پامال ہوں تیرے دشمن

۵۰

ملکہ وکٹوریہ کا ماتم

۲؍فروری سنہ ۱۹۰۱ء کو "ڈائمنڈ جوبلی" لائبریری فتحگڑھ میں ایک عظیم الشان ماتمی جلسہ اس غرض سے منعقد ہوا کہ قیصرہ ہند ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر اظہار افسوس کیا جائے۔ بشراں صاحب نے اکثر احباب کی فرمائش سے اس جلسے میں حسب ذیل تقریر کی ؎

درغم اوست کہ مژگاں صف ماتم زدہ است
غوطہ درچشمہ خوں دیدہ پر نم زدہ است

در غم اوست کہ دست دل آزردۂ ما
ساز و سامان طرب درہم و برہم زدہ است

در غم اوست کہ فریاد جگر سوختگاں
شعلہ در سینہ افلاک دمادم زدہ است

حضرات۔ آج ہم سب لوگ ہندو، مسلمان، عیسائی ہر زمرہ اور ہر فرقہ کے اشخاص اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اپنی مادر مہربان یعنی ملکہ معظمہ انگلستان، ملکہ جزائر فراواں اور قیصرۂ ہندوستاں کا ماتم اور سوگ منائیں۔ ہم لوگ اس وقت صرف بحیثیت خیر خواہ اور جاں نثار رعایا کے، ملکہ مرحومہ کا نوحہ یا مرثیہ نہیں پڑھتے ہیں بلکہ اُن مصیبت زدہ بچوں کی مانند جن کی ماں مرگئی ہو آہ و بکا اور گریہ وزاری کرنے کو جمع ہوئے ہیں۔ ہماری ملکہ کی وفات پر تمام مہذب دنیا نے افسوس ظاہر کیا ہے سلطنت برطانیہ کے ہر حصہ سے تار پر تار تعزیت کے پہنچ رہے ہیں۔ ہر قسم کا کاروبار بند ہے بحر اوقیانوس کے اُس پار ریپبلک اسٹیٹ کی طرف سے تعزیت کے پیام آئے اور جابجا غیر قوموں نے اور غیر ممالک کے بادشاہوں نے بھی فرط ادب تعظیم سے ماتم داری کی۔ گویا پُرانی اور نئی دنیا دونوں مل گئی ہیں کہ ہماری جلیل القدر ملکہ ذوالقرنین کی ماتم داری اور سوگواری کریں۔ بور قیدیوں نے کیپ کالونی میں بمنشا تعظیم اپنے کھیل تماشے بند کر دیے ہیں آج ہماری ملکہ کے جنازہ کے ساتھ چھتیس سلاطین اور شاہزادے ہوں گے۔

جس رعایا پروری اور انصاف گستری کے ساتھ ملکہ فردوس منزل نے ترسٹھ برس تک مختلف قوموں اور فرقوں پر حکمرانی کی اور جو بیشمار نعمتیں اور برکتیں اور حقوق رعایائے برطانیہ کو پہنچے، وہ کسی بادشاہ کے وقت میں کسی ملک اور کسی قوم کو نہیں پہنچے ؎

در روزگارہا نہ تواند شمار یافت
خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت

نہ کسی اور بادشاہ کے عہد میں اس قدر ترقی و عروج دولت برطانیہ کو حاصل ہوا۔ ہماری ملکہ نے رعایا کے دلوں پر حکومت کی، رعایا کو اپنے بچوں کی طرح سمجھا اور مصیبت کے وقت مادرانہ شفقت سے اُن کی دستگیری کی۔ اپنے زخمی سپاہیوں کو دیکھ کر اکثر ملکہ نے آنسو بہائے ہیں۔ ہمارے ملک میں جب کبھی قحط یا وبائی آفت نازل ہوتی تھی تو ہماری مادر مہربان نہایت بیتاب ہو جاتی تھیں۔ تار پر تار اور مراسلہ پر مراسلہ حضور وایسرائے کے پاس بھجواتی تھیں، جن میں یہ لکھا ہوتا کہ ملکہ عالم نہایت بےچین اور بیقرار ہیں، کیونکہ ہندوستان میں ان کے بچوں پر سخت مصیبت ہے۔ کوشش کرو، چاہے کتنا روپیہ خرچ ہو جائے مگر ہماری عزیز رعایائے ہند کی جانیں بچاؤ اور ہلاک نہ ہونے دو۔ فرمائیے ہم ایسی مہربان ملکہ کہاں سے لائیں گے۔

تاریخ دنیا کے ورق اُلٹ کر دیکھیے کسی زمانے میں کسی ملک و قوم میں ایسا بادشاہ نہ پائیے گا، جو ہماری ملکہ عالم کی طرح رعایا پرور اور معدلت گستر ہوا ہو یا جس کے عہد میں رعایا کو ایسے بیشمار حقوق اور نعمتیں حاصل ہوئی ہوں جیسی ملکہ مرحومہ کے وقت میں، یا جس کے عہد میں عامہ رعایا ایسی نمک حلال و فاشعار اور جاں نثار رہی ہو جیسی محتشم الیہا کے عہد معدلت مہد میں۔ ہماری ملکہ نے بڑا عالیشان نام چھوڑا ہے، جو اُن کی سلطنت سے زیادہ عظیم الشان سمجھا جائے گا اور مقدس مانا جائے گا۔ ان کی زندگی پرائیوٹ اور سوشل طور پر و نیز پبلک حیثیت سے ہر طرح پر ایسی گذری ہے جس پر کوئی دھبا نہیں آیا اور جو عورتوں کی عالی دماغی، رحمدلی اور تقدس کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ سچ فرمایا ہے لارڈ روزبری نے کہ "فطرت انسانی کا معیار اور اس کا اعزاز و وقار حضرت ملکہ وکٹوریہ کی ذات قدسی صفات کے باعث بہت بڑھ گیا"۔ اُن کی بیشمار دل و دماغ کی خوبیوں نے خیر خواہ رعایائے برطانیہ کے دلوں پر ایسی یادگار قائم کی ہے، جو

چاندی اور سونے کی یادگار سے بہت زیادہ دیرپا رہے گی۔

ہماری بہنیں یعنی ہمارے ملک کی عورتیں ہم سے بھی زیادہ ملکہ مغفورہ کو یاد کرکے روئیں گی۔ اُن کی حکومت میں عورتوں کی عزت اور اُن کے حقوق بہت بڑھ گئے تھے۔ اُنھوں نے ملکہ کے وقت میں وہ عزت پائی جو کسی بادشاہ ہندوستان کے وقت میں اُن کو میسر نہیں آئی۔ جب کبھی مردوں کی طرف سے ان کے حقوق اور عزت میں کمی کی جاتی تھی، تو ہماری بہنیں مردوں کو یہ کہکر ڈرا دیتی تھیں کہ عورت کا راج ہے یعنی ملکہ وکٹوریا کے راج میں عورتوں کا اعزاز زیادہ ہے اور ان کے حقوق زیادہ بڑھے ہوئے ہیں گویا فخر کرتی تھیں کہ ہماری ایک بڑی بہن اور ہاں ہندوستان کی مہارانی ہے۔ افسوس کہ یہ فخر ہماری مخدرات کا کم ہوگیا اور اُن کو اس کا سخت صدمہ ہے۔

یہی وہ ملکہ تھیں جنھوں نے ۱۸۵۸ء میں وہ فرمان شاہی جاری کیا تھا جس کو ہم لوگ انگریزی خوان "انڈین میگنا چارٹا" کہتے ہیں جس کے وہ الفاظ ہمارے کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں جو تمام شاہان دنیا کے لیے دستور العمل قرار دیے جانے کے لائق ہیں۔ جن کا ترجمہ یہ ہے

"رعایائے ہند کی مرفہ حالی ہی ہماری قوت ہے، اُن کی خوشی اور رضامندی میں ہماری سلطنت کی حفاظت ہے اور اُن کی احسانمندی اور سپاس گذاری ہمارے واسطے صلۂ عظیم ہے۔"

یورپ کی نعمتیں انھی ملکہ مرحومہ کے وقت میں ہم اہل ہند کو میسر آئیں۔ یہ ڈاکخانے، ریل، تار برقی، یہ نہریں اور بڑے بڑے ایکوڈکٹ انجینیرنگ ورکس، یہ شفاخانے، یہ پختہ سڑکیں، یہ تعلیم گاہیں، یہ دارالعلوم، یہ تحریر و تقریر کی آزادی، یہ عامہ رعایا کی آسایش، یہ جان و مال کی حفاظت، یہ مذہبی آزادی، یہ ہندوستان کی تجارت کا یورپ کی مارکٹ میں فروغ پانا، ان نعمتوں اور برکتوں کا شکر ہم باندازہ خیال ادا کرسکیں! کیا مجال! بلکہ ہزار میں سے ایک سپاس گذاری بھی ہم سے پورے طور پر ہونا سراسر محال ہے ؎

گرچہ بسیار گفتیم دریں باب سخن / اندکے بیش نگفتیم ہنوز از بسیار

تا قیامت سخن اندر کرم و رحمت تو / ہمہ گویند و یکے گفتہ نیاید ز ہزار

حضرات۔ ہماری ملکہ معظمہ تو موجود نہیں ہیں، مگر ان کا نام نیک ہمیشہ زندہ رہے گا۔ نئی قوم

پیدا ہوں گی اور نئی سلطنتیں بنیں گی اور تمام آیندہ نسلیں بنی آدم کی ہماری عالی قدر اور ہر دلعزیز ملکہ مرحومہ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کتابوں میں پڑھینگی اور مستفید ہونگی اور سیکڑوں برس تک دنیا میں "یہ گولڈن ایج" یادگار رہے گی۔

ہماری ملکہ کی موت بھی سچے عیسائیوں کی طرح ہوئی۔ لاٹ پادری پہلے سے موجود تھے۔ اُنھوں نے سہ پہر کو دعا پڑھی اور اُس وقت تک کہ اُن کی روح پاک قالب عنصری چھوڑ کے خدا کے جوار رحمت میں گئی، دعائے مغفرت کرتے رہے۔ تمام اولاد اور عزیز اُن کے گرد و پیش جمع تھے۔ بیماری میں بھی زیادہ تکلیف اُنھوں نے نہیں پائی۔ تمام خاندان شاہی کو خوش و خرم اور سلطنت انگلشیہ کو حالت عروج میں چھوڑ کر مریں۔ ایسی اقبال مندی اور خوش نصیبی کی موت کس کو نصیب ہوتی ہے۔

ایک یتیم خانے کی امداد کے لئے اپیل

ماہ فروری سنہ ۱۹۱۰ء میں پنڈت تلسی رام صاحب ایم۔ اے فرخ آباد میں اس غرض سے تشریف لائے کہ یتیم خانہ بریلی کے لیے امداد کی اپیل کریں۔ ٹاؤن ہال فرخ آباد میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں پنڈت صاحب موصوف نے ایک لکچر دیا اور اس میں یتیم خانہ آریہ سماج بریلی کے حالات بیان کیے اور یتیموں کی امداد کے لیے اپیل کی۔ پشران صاحب نے حسب فرمائش پنڈت صاحب موصوف دار باب جلسہ اُن کی تائید میں ایک تقریر کی جو درج ذیل ہے:۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آپ لوگوں نے پنڈت صاحب کا بیان خوب غور سے سنا۔ جو مضامین ہمارے دوست نے بیان فرمائے اُن کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہ مضامین ایسے شخص کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جس نے اپنے آپ کو ہمارے اور ہمارے بچوں کے فائدہ کے لئے وقف کر رکھا ہے، جو ہمارے لیے کڑی اُٹھاتا ہے مشکلیں جھیلتا ہے اور دقتیں اور سختیاں برداشت کرتا ہے اور ہمارے لئے اپنی ذات کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

ہم لوگ سب اپنی اپنی فکروں میں مصروف رہتے ہیں۔ بس ضرور ہے کہ ایسے برگزیدہ اشخاص بھی ہوں جو محض اوروں کے واسطے اپنی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ ہمارے دوست پنڈت صاحب ایسے لوگوں کی ایک نمودار نظیر ہیں۔ اگر آپ چاہتے تو اپنے واسطے بہت کچھ آسائش کے سامان مہیا کر سکتے تھے، روپیہ پیدا کر سکتے اور ذاتی عروج حاصل کر سکتے تھے کیونکہ ان سب باتوں کے واسطے آپ میں جوہر اور قابلیت موجود ہے، مگر آپ نے مناسب سمجھا کہ اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ رہ کر ان کی تکلیفوں میں شریک ہوں، اُن کے ساتھ دکھ اُٹھائیں اور اُن کی مصیبتیں کم کریں اور جو ڈوبتے ہوں اُن کو ڈوبنے سے بچائیں۔ واہ کیا مبارک کام ہے جو آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔

صاحبو۔ بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو کپڑا دینا، غریبوں کی دست گیری کرنا اور بیواؤں کی پرورش

کرنا ایسے کام ہیں جو ہمیشہ سے ہر مذہب و قوم میں نہایت عمدہ کام سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے پنڈت صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے کہ یتیموں کو ہنر سکھایا جائے، اس میں میرے نزدیک تین فائدے متصور ہیں۔ ایک تو سوشل فائدہ ہے یعنی یہ کہ جب یتیم بچے ہنر سیکھ لیں گے تو ہماری قوم کے لئے نہایت بکار آمد ہونگے، عمدہ وسیلہ معاش پیدا کرینگے اور آزادی کے ساتھ کسب معاش کرینگے اور کسی کے محتاج نہ ہونگے۔ سچ کہا ہے ؎

بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر
نہ گردد تہی کیسۂ پیشہ ور

اگر بعضوں نے ہنر میں کمال حاصل کیا تو روپیہ کے ساتھ نام بھی پیدا کرینگے اور ہندوستان کے مشہور صناعوں میں شمار ہونگے۔

جہاں میں نام اگر چاہے تو کر کوئی ہنر پیدا
فن تصویر سے شہرہ ہوا بہزاد و مانی کا

اکثر بے معاش اور محتاج لوگ جرائم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سوسائیٹی کے نقصان کا باعث ہوتے ہیں اس نقصان سے ہم سب لوگ محفوظ رہیں گے۔

دوسرا مذہبی فائدہ ہے۔ یعنی یہ کہ جس مذہب میں انھوں نے نشوونما پائی ہے اور جس قوم کے وہ ہیں اُسی مذہب و قوم میں وہ رہیں گے۔ پس مذہب و قومیت کو جو نقصان اُن کے افلاس اور ترک مذہب سے پہونچتا وہ نہ پہونچے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ افلاس کے باعث ایام قحط میں سیکڑوں لاوارث ہندو لڑکے تبدیل مذہب کر دیتے ہیں۔ اکثر کم سن لڑکیاں یتیمی اور محتاجی کی حالت میں مبتلا ہو کر بازاری کسبیوں اور فاحشہ عورتوں کے ہاتھ پڑ جاتی ہیں اور معصومی کی حالت سے گذر کر معصیت میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ جب یتیموں کی پرورش اور تربیت و تعلیم ہوگی، تو یہ کوئی خرابی نہ پیدا ہوگی۔

تیسرا ملکی فائدہ ہے۔ یعنی جب کہ بریلی میں یتیموں کی اس طرح پرورش اور تعلیم و تربیت ہوگی تو اور اضلاع بھی اُس کی ریس کریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ جو فائدہ اس وقت محدود ہے وہ وسیع ہو کر تمام ملک و قوم کو پہونچے گا اور ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی ہوگی۔ ممکن ہے کہ انہی یتیموں میں سے کوئی بڑے

آدمی بھی نکلیں۔ گارفیلڈ نامی ایک کسان کا لڑکا امریکہ میں تھا اور یتیم بھی تھا وہ آخر میں وہاں کی ریپبلک کا پریسیڈنٹ ہوا کون کہہ سکتا ہے کہ ان یتیموں میں کوئی بڑے آدمی یا مصلح ملک و قوم نہ پیدا ہو سکیں گے، اس لیے ان بیکس بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہم لوگوں پر عین فرض ہے۔
یہی وہ بیکس بچے ہیں جن کے بارے میں ایک بڑا معلم اخلاق ہم کو یوں ہدایت کرتا ہے ؎

پدر مردہ را سایہ بر سر فگن　　غبارش بیفشان و خارش بکن
چو بینی یتیمے سر افگندہ پیش　　مدہ بوسہ بر روئے فرزند خویش
یتیم ار بگرید کہ نازش خورد　　دگر خشم گیرد کہ بارش برد
الا تا نگرید کہ عرش عظیم　　بلرزد ہمے چوں بگرید یتیم
برحمت بکن آبش از دیدہ پاک　　بشفقت بیفشانش از چہرہ خاک
اگر سایہ خود برفت از سرش
تو در سایہ خویشتن پرورش

صاحبو۔ یتیموں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے فائدے ایسے صریح اور بدیہی ہیں کہ مجھ کو بہت مطول تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لہذا میں بنظر اختصار آخر میں آپ کی خدمت میں اُن غریبوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جن پر بیکسی کی مصیبت پڑی ہوئی ہے جو ہماری طرف بڑی آرزو سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک کے بھائی، دیکھیں ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ میں تمام آریا بھائیوں کی خدمت میں، جن کے قائم مقام ہمارے دوست پنڈت تلسی رام صاحب ہیں، اُن بیکس یتیموں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جو اصل میں ہمارے ہی بچے ہیں اور جن کی پرورش اور تربیت ہمارے ذمہ فرض عین ہے۔ ان غریبوں میں بیچارے بہت سے ایسے بھی ہوں گے، جن پر یتیمی کی مصیبت اُس وقت پڑی ہوگی جب کہ وہ ہنوز شیر خوار بچے تھے، جن بیچاروں نے دنیا میں خوشی اور عیش و عشرت کی صورت بھی نہیں دیکھی، جنھوں نے آنکھ کھولتے ہی اور ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو بے ماں باپ کا پایا ؎

آشیانہ نہ چمن میں نہ قفس یاد آیا　　آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ صیاد آیا
دم آغاز جنوں طوق گلو گیر ہوا　　غل مچانے بھی نہ پائے تھے کہ صیاد آیا

میں تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کی خدمت میں اُن مظلوم بچوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جو بیچارے خدا کی درگاہ میں آہ و زاری کے ساتھ، نالہ و شیون کے ساتھ یہ فریاد کیا کرتے ہیں کہ یا خدا تو ہم کو اُٹھالے کیونکہ زمین ہمارا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی، یا یہ حکم دے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اُس میں زندہ سما جائیں ؎

کس کو اب زیرِ فلک طاقت رنج و غم ہے
کاش شق ہوئے زمیں اور سما جائیں ہم

میں اُن ملک کے ہوا خواہوں اور قوم کے خیر اندیشوں کی خاطر سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جنھوں نے اپنے فائدے اور آسائش کو چھوڑ کر قوم کے غریب اور بیکس بچوں کی حالت درست کرنے کے لئے کمر ہمت چست باندھی ہے۔ ان ہی خواہان قوم و ملک کو تقویت دینے کے لئے ہم لوگوں کو بہت فراخ دلی سے خرچ کرنا چاہیے تاکہ جمہور کے فائدے کے لئے کوشش کرنے والے لوگ پیدا ہوں اور ملک و قوم کو فائدہ پہونچائیں۔

میں آپ لوگوں کی خدمت میں اُن مصیبت زدہ یتیموں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جو بیچارے موت کو مہربان دوست سمجھکر ہر وقت بلایا کرتے ہیں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری یہ اپیل ڈگری کریں گے۔ آخر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ ؎

چشم فیاض سے اب ہم کو اشارا ہو جائے
نام ہو آپ کا اور کام ہمارا ہو جائے

ایک تھیاسوفسٹ مس صاحبہ کا تعارف

ماہ مارچ سنہ ۱۹ء میں مس ایڈگر صاحبہ ایم۔ اے۔ تھیاسوفسٹ آسٹریلیا کی رہنے والی حسن اتفاق سے فرخ آباد تشریف لائیں اور فتحگڑھ میں گیان مارگ تھیوزافیکل سوسائٹی کی مہمان رہیں۔ مس صاحبہ نے دو لکچر تھیاسفی کے سبجکٹ پر بمقام ڈائمنڈ جوبلی فتحگڑھ دیے۔ جن میں سے ایک لکچر کا ترجمہ مشران صاحب نے بزبان اردو حسب فرمائش حاضرین جلسہ کیا اور مس صاحبہ موصوفہ کے تعارف میں حسب ذیل تقریر فرمائی۔

حضرات انجمن۔ میں خیال کرتا ہوں کہ مس صاحبہ کو، جو ہماری بہن ہیں، آپ لوگوں سے روشناس کرنے کے لئے مجھے زیادہ مطول تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی ذاتی خوبیوں اور لیاقتوں کے سبب اور ہماری بہی خواہ ہونے کے باعث اس ملک ہند میں اسی قدر مشہور و معروف ہیں جس قدر ملک ہند بجائے خود دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ آپ کو جو ہم ہندوستانیوں سے الفت ہے اور جو محبت ہمارے ملک و قوم کے ساتھ ہے وہ مس صاحبہ کی شکل و شمائل اور وضع و قطع سے عیاں ہو رہی ہے[۱]

ادراک حال ما نگہ بتواں نمود
حرفے ز حال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

اللہ اللہ کیسے کیسے دوست نوع انسان کے دنیا میں ہیں جنھوں نے اپنی زندگی دوسروں کے فائدہ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ دیکھیے کرنل آلکٹ صاحب امریکہ سے تشریف لائے اور میڈم بلیوٹسکی صاحبہ روس سے اور اینی بیسنٹ صاحبہ (جن کو ہم بسنت دیوی کہتے ہیں) انگلستان سے اور مس ایڈگر صاحبہ براعظم آسٹریلیا سے آئیں، اس غرض سے کہ ہم ہندوستانیوں کو فائدہ پہونچائیں، ہمارے درمیان آکر رہیں اور دکھ درد میں شریک ہوں۔ سبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک یہ لوگ ہیں جو باوجود اختلاف مذہب، اختلاف قوم، اختلاف ملک و زبان کے اپنا اپنا

---

[۱] ہندوؤں کی طرح رودراکش کی مالا گلے میں پہنے ہوئے تھیں۔

وطن چھوڑ کر ہمارے ملک میں آتے ہیں اور ہماری خیر خواہی کرتے ہیں کیا کیا تکلیفیں اُٹھاتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ باوصف اتفاق مذہب، اتفاق قوم، اتفاق ملک و زبان کے باہم برائی کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔

صاحبو۔ ہم لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور دوسروں کی پرواہ نہیں کرتے لیکن ایسے برگزیدہ لوگ بھی ہیں جو محض دوسروں کا کام کیا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ خدا جب ضرورت سمجھتا ہے تو اپنے خاص بندوں کو عام لوگوں کی مصلحت کے لئے منتخب کرلیتا ہے اور اس میں سراسر حکمت ہوتی ہے ؎

حکمت محض ست گرلطف جہاں آفریں

خاص کند بندۂ، مصلحت عام را

چنانچہ مس صاحبہ کو خدا نے اس کام کے لئے منتخب کیا ہے کہ وہ ہم کو راہ راست پر لائیں اور ہم لوگوں میں نیکیاں اور بھلائیاں پھیلائیں اور ہمارے اخلاق کو درست کریں۔ آپ آسٹریلیا سے آئی ہیں اور سمندر پار سے تھیاسفی اور یونیورسل برادرہڈ (اخوت) کی آواز اس ملک میں گونجتی چلی آتی ہے۔ جہاں آپ جاتی ہیں صلح و فلاح و بہبود کا پیام لے جاتی ہیں۔ آپ کا اصول یہ ہے کہ "امن عامہ کا لحاظ رکھو اور سب سے نیکی کا برتاؤ کرو"۔ آپ یہاں اس وقت تھیاسفی پر لکچر دینگی جس کے معنی مختصر الفاظ میں "علم الٰہی یا مذہب معقولات" ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ سب صاحب بگوش دل سنینگے اور آپ کی داد دینگے۔

میں اس وقت آپ کی مدح و ثنا زیادہ نہیں کرنا چاہتا جو سچے حالات اور نفس الامری واقعات تھے وہ عرض کردیئے گئے۔ آپ کو مس صاحبہ کا لکچر سننے سے خود تجربہ ہو جائے گا کہ آپ کس قدر بلند خیال اور عالی دماغ عورت ہیں۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

ایسے وقت میں کہ عروس بہار جوانان چمن کی نہانی میں آئی ہوئی ہے اور ہمارے مسلمان بھائیوں کی عید اور ہندو بھائیوں کی ہولی ہے، تھیوزافیکل سوسائٹی کے کامن پلیٹ فارم سے اخوت کی آواز بلند ہونا نہایت موزوں اور حسب موقع معلوم ہوتا ہے۔

جلسہ تقسیم انعام میں صدر صاحب و حاضرین جلسہ کا شکریہ

اپریل سنہ ۱۹۱۱ء میں بمقام ہائی اسکول فرخ آباد زیر صدارت مسٹر وار برٹن صاحب کلکٹر مجسٹریٹ ضلع ایک جلسہ تقسیم انعام طلبہ کا منعقد ہوا جس میں مسز ان صاحب بھی موجود تھے جلسہ کے اختتام پر حسب فرمائش ہیڈ ماسٹر و دیگر احباب موصوف نے اہل شہر کی طرف سے میر مجلس کا شکریہ یوں ادا کیا۔

عالی جاہا۔ ہم لوگ تمام روساء و باشندگان شہر آپ کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتے ہیں کہ ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت میں آپ کو نہایت دلچسپی ہے اور متواتر کئی موقعوں پر آپ نے اُن کو اپنے مبارک ہاتھوں سے انعام عطا فرمایا ہے اور اُن کا دل بڑھایا ہے۔ ایسی عنایتوں سے مستفید ہونے کے مواقع اور علیٰ ہذا القیاس اُن عنایتوں کی سپاس گذاری کے مواقع ہم لوگوں کو آپ سے پیشتر اور حکام کے عہد میں کمتر حاصل ہوئے تھے۔ ہونہار طلبہ کو اپنی کامیابی پر انعام ملنا تعلیم کے حق میں بہت بڑی تقویت ہے خصوصاً جب کہ کلکٹر ضلع کے ہاتھ سے وہ انعام ملے تو اُس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تعلیم و تربیت کے معاملات میں جو آپ کو توجہ اور مذاق ہے اُس کا ثبوت ہم کو اس سے پیشتر اور بھی مل چکا ہے۔ یعنی اُس وقت جب کہ آپ نے ہمارے شہر کے کتب خانہ عام کا مربی ہونا منظور فرمایا تھا۔ کسی قوم کو ترقی دینے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ اس قوم کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دی جائے کیونکہ یہی بچے ہیں جن پر قوم کا بھروسا ہے۔ یہی لڑکے ہیں جن پر ملک کا آسرا ہے۔

ہم لوگ سچے دل سے آپ پر ظاہر کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کی پالیسی جو ہندوستانیوں کی تعلیم کے بارے میں ہے اُس کی قدر ہم کو بہت بڑی ہے۔ ہماری جلیل القدر ملکہ ذوالقرنین، فردوس منزل کے عہد معدلت مہد میں جو تعلیم انگریزی نے وسعت پائی اور جس مادرانہ شفقت سے اُنھوں نے ہمارے بچوں کو پڑھایا اُس کا نقش ہم خیر خواہ رعایا کے دلوں پر سویدا کی مانند ہو گیا ہے جو بمقابلہ ایک سنگین یادگار کے بدرجہا زیادہ پائدار یادگار ہے ۱۸۵۲ء سے جب کہ اس ملک میں یونیورسٹی کی بنیاد پڑی اس

وقت تک کہ پچاس برس گذرے ہیں ہم لوگوں کو تعلیمی فائدے بے انتہا پہنچ چکے ہیں۔

اس ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ رائے قائم ہوگئی ہے کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم ملک وقوم کی موجودہ خرابیاں دور کردے گی۔ بقول لارڈ مکالے کے، انگریزی تعلیم سے ہمارے مجہول خیالات دور ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں محبت بڑھانے والی کوئی چیز ہے، وہ انگریزی تعلیم ہے۔ اگر ہندوستانیوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرانے والی کوئی چیز ہے وہ انگریزی تعلیم ہے۔ اگر ہندوستانیوں کو تاج انگلستان کا خیرخواہ اور جاں نثار بنانے والی ہے، تو انگریزی تعلیم ہے اور خود انگلستان اور ہندوستان میں پورا الحاق پیدا کرانے والی کوئی چیز ہے، تو انگریزی تعلیم ہے۔ اگر سوال کیا جائے کہ قوم ہندی کی غیرت وحمیت کی رگ کو کس طرح حرکت دی جائے تو جواب یہ ملے گا کہ انگریزی تعلیم سے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستانیوں کو پستی ذلت سے ابھار کر اوج کمال پر کیونکر پہونچایا جائے تو جواب یہ ہوگا کہ انگریزی تعلیم سے۔ غرضکہ، انگریزی تعلیم ایک قوم ہندی عظیم الشان بنا رہی ہے، جو کسی وقت ممالک یورپ کی مہذب قوموں کی ہم پایہ ہوجائے گی۔ منجملہ اُن نعمتوں اور برکتوں کے جو دولت انگلشیہ کی بدولت ہم لوگوں کو میسر ہیں، انگریزی تعلیم ایک نعمت عظمیٰ ہے، جس کی قدر ومنزلت ہمارے دلوں میں بدرجہ غایت ہے اور جس کے لئے اگر ہم ہزار زبان سے بھی شکریہ ملکہ جنت آشیاں کا ادا کریں تو پورا حق ادا نہیں کرسکتے ؎

اگر ہر موئے من گردد زبانے
زتو رانم بہر یک داستانے

نیارم گوہر شکر تو سفتن
سرموئے ز احسانِ تو گفتن

اب زیادہ عرض حال موجب طول مقال ہے لہذا مکرر آپ کی تشریف آوری کا شکریہ دوبارہ ادا کرکے ختم کلام کیا جاتا ہے۔

محفل مشاعرہ
میں حاضرین کی ضیافت طبع

ماہ مئی سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک مشاعرہ بمقام چھبرامئو (ضلع فرخ آباد) منشی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل کے مکان پر منعقد ہوا جس میں علاوہ فرخ آباد و فتح گڑھ وغیرہ کے بیرونجات کے بھی کچھ شعراء شریک تھے۔ مشران صاحب بھی حسب الطلب شریک بزم سخن تھے۔ بانی محفل کی فرمائش سے موصوف نے ارباب انجمن کا خیر مقدم کیا۔ سامعین نے یہ فرمائش کی کہ شکریہ کی تقریب میں ارباب مشاعرہ کی ضیافت طبع کا سامان بھی ہو۔ چنانچہ موصوف نے حسب ذیل خطبہ بداہتہً انشا کیا جس کو سن کر حاضرین جلسہ بہت محظوظ ہوئے۔

حضرات انجمن۔ مجھے یہ خدمت تفویض ہوئی ہے کہ میں صاحب خانہ کی طرف سے آپ سب صاحبوں کا خیر مقدم کروں کہ آپ نے اپنی تشریف آوری سے اس بزم سخن کو طراوت تازہ اور رونق بے اندازہ بخشی ہے۔ کاش یہ کام کسی شاعر نغز گفتار کو تفویض کیا جاتا جو نظم میں آپ کا شکریہ ادا کرکے آپ کو محظوظ کرتا۔ بخلاف اس کے اس فرض کی انجام دہی ایک ایسے ہیچمداں نیچہ دہاں کے ذمہ کی گئی ہے جو نظم کا مذاق سلیم اور وجدان صحیح نہیں رکھتا اور نثر میں اور وہ بھی ٹوٹی پھوٹی نثر میں اپنے خیالات ظاہر کرے گا۔ صاحبان ذیشان۔ نثر بمقابلہ نظم کے ایک کم رتبہ اور کم وزن چیز سمجھی جاتی ہے۔ یہ میرے لیے اور بھی مشکل چیز ہے ؎

خوش ہست نثر ولے شان نظم افزون ست
اتاقہ مصحف کلام موزون ست

اس موسم گرما میں آپ لوگوں کا اس جگہ تشریف لانا اور اکثر صاحبوں کا دور دست مقامات سے قدم رنجہ فرمانا (ممتناً) منت ہے اور نہایت شکریہ کے قابل ہے۔ آپ سب حضرات نکتہ سنج کے جمع ہونے سے اس بزم مشاعرہ میں ایسی رونق اور آرائش ہوئی ہے جو باغوں کی زیب و زینت اشتداد بہار سے ہو جاتی ہے۔

آپ تمام احباب کو اور ہر قوم اور ہر جماعت کے اصحاب کو یکجا جمع دیکھ کر میرا جی بے اختیار

چاہتا ہے کہ یہ کہوں ؎

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

صاحبو۔ ہمارا قصبہ چھپرامئو اس ضلع کے اور قصبات کے مقابلہ میں فی الجملہ ایک مردم خیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں متعدد شاعر اور عالم پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک شاعر نے چھپرامئو کی تعریف میں کہا ہے ؎

بصرہ بنا دمشق بنا لکھنؤ بنا
کچھ خاک بچ رہی تھی کہ چھپرامئو بنا

ایسے مقام میں شاعروں اور نکتہ سنجوں کا جمع ہونا علم و فضل کے حق میں بہت مفید ہوگا اور جو لوگ شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے سمند شوق پر تازیانہ کا کام دے گا۔

حضرات۔ علم تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم و ملک میں جب کہ اول اول تہذیب و شائستگی کی روشنی پھیلی تو نظم نے وہاں کے علم ادب پر اپنا تسلط جمایا۔ اُس وقت بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے نظم ہی میں بیان کیے جاتے تھے۔ اس وقت بھی جبکہ نثر اردو نے ہزاروں بکار آمد کتابیں ہمارے اردو علم ادب میں مدوّن کر دی ہیں، نظم کا وہ تسلط کم نہیں ہوا ہے بلکہ زبان والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اب بھی ہے۔ جو نظم کو بہت پسند کرتا ہے اور نظم ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ بعض باتیں جو لطف نظم میں دیتی ہیں، نثر میں ہرگز وہ مزہ نہیں آتا۔ مثلاً زورِ بیان، شوکت الفاظ، تنوع تمثیلات، برجستگی استعارات، شوخی کنایات وغیرہ۔

مگر اب وہ وقت آ گیا ہے کہ نظم اردو میں نئے نئے مفید اور بکار آمد مضامین دخل پائیں۔ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے خیالات، اُس کو پستی زوال سے ابھار کر اوج کمال پر پہنچانیوالے جذبات، قوم کی غیرت اور حمیت کی رگ کو حرکت دینے والے مضامین اور نام و ننگ کے احساس کو برانگیختہ کرنے والے خیالات اگر نظم اردو میں داخل کیے جائیں اور اُس کے ساتھ آداب شاعری کا برتاؤ پورا پورا کیا جائے، تو عام طبائع کے نزدیک نہایت پسندیدہ ہو اور ملک و قوم کے فروغ کا باعث ہو اگر یہ ترمیم نظم اردو میں ہو جائے۔ (جو بالفعل ہو رہی ہے اور امید ہے کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ ہو جائے گی) تو پھر اردو نظم کا مقابلہ دنیا میں کوئی دوسری نظم نہ کر سکے گی۔ آج کل دو شاعر یعنی مولوی

شبلی نعمانی اور مولوی الطاف حسین حالی ایسے ہی نئے خیالات کی روح نظم اُردو کے قالب میں پھونک رہے ہیں اور ملک اور قوم کے شکریہ کے سزاوار ہیں۔

بعض لوگوں نے جن کو نظم کا مذاق بالکل نہیں ہے یا بہت کم ہے اور جنھوں نے ایشیائی شاعری کا پورا لطف حاصل نہیں کیا ہے اور محض انگریزی خیالات کے قدر داں ہیں، یہ خیال کر رکھا ہے بلکہ یکطرفہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ایشیائی نظم خواہ وہ اُردو ہو یا فارسی نہایت ناقص ہے اور سوائے عشقیہ مضامین کے اُس میں اور کچھ نہیں ہے۔ اس خیال کی تردید اگر اس وقت بطور مختصر کی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اُن کو معلوم نہیں ہے کہ ایشیائی نظم کا پہلا اصول زبان سکھاتا ہے۔ آداب و اخلاق کے مضامین جن کی کمی ہرگز نہیں ہے، ایسے پیرایہ میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لوازمات شاعری کا پورا پورا برتاؤ ہو جائے جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آداب شاعری سکھائے جائیں اور اصناف سخن پر عبور ہو۔ ردیف و قافیہ کی قید ایسا قافیہ تنگ کرتی ہے کہ شاعر الفاظ کی تلاش اور بندش میں اور اپنے خیالات کی رو میں حقیقت واقعیہ سے دور پڑ جاتا ہے اور اسی باعث فوق العادۃ باتیں اکثر بیان کرنے لگتا ہے انگریزی نظم ہرگز ہرگز زبان نہیں سکھاتی۔ نہ اُس میں ردیف اور قافیہ کی پابندی ہے، اسی وجہ سے اخلاق کا بیان نہایت سادہ اور دلنشیں ہوتا ہے اور واقعات نفس الامری کا مرقع کھینچنے میں خلاف عادت باتیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شعرائے ہند و پارس میں بہت شاعر ایسے گذرے ہیں جنھوں نے تغزل میں بھی بیشتر آداب و اخلاق کے مضامین نہایت قابل قدر لکھے ہیں اور سیکڑوں مفید اور بکار آمد مضامین باندھے ہیں۔ اور باایں ہمہ صنعت شاعری کا پورا پورا برتاؤ کیا ہے۔ میں آپ کی اجازت سے اس وقت چند اشعار امیر لکھنوی کے سناؤں گا جو بالکل خط و خال کے مضامین سے معرّا ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوگا کہ نظم اُردو میں بھی کس قدر تجربہ کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ اس سے میرے دو مطلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ معترضین کے اعتراض کی تردید ہو اور دوسرا یہ کہ جو لوگ عشقیہ مضامین باندھنے کے عادی ہیں اُن کو معلوم ہو جائے کہ جب امیر ایسے اُستاد کامل فن نے ایسے مضامین باندھے ہیں تو متبعین کو پیروی و تقلید کرنے میں ہرگز مضائقہ نہیں، بلکہ ملک اور قوم کی ضرورتیں داعی ہیں کہ ایسے مضامین بکثرت باندھے جائیں۔

خاموشی کی تعریف کرتا ہے تو کیا بلیغ تمثیل دیتا ہے جو اُسی قدر نرالی ہے جس قدر بلیغ ہے کہتا ہے کہ

خاموشی

زبان خاموش رکھ اے دل کہ قابو ہو نہ دشمن کا
حقیقت میں ہے زنگ کارواں جاسوس رہزن کا

رفاہ عام

وہ ہوں راحت رسان خلق مر کر بھی یہ حسرت ہے
چراغ آ کر کوئی مفلس اٹھا لے جائے مدفن کا

سخت بات کی چوٹ

معاذ اللہ کیا زخم زبان خلق کاری ہے
گلی شمشیر میں بھی کاٹ ہے شمشیر آہن کا

راحت دنیا کی ناپائداری

زمانہ دے اگر راحت پیام مرگ جان اس کو
کہ حلوا زہر سے خالی نہیں ہے دست رہزن کا

اہل حرص کی محرومی

جو اہل حرص ہیں نعمت میں بھی محروم راحت ہیں
دہان بند ایک دم کھلتا نہیں ہے گاو خرمن کا

تملق دشمن نا قابل اعتبار

قدم سے جو لگے ہیں آج کل دیں گے تجھے ایذا
کہ نعل آہنیں دیکھا ہے آ کر داغ توسن کا

رحم دلی

کسی کو پیچ میں دیکھا دل اپنا رحم سے ٹوٹا
خس گرداب دریا سنگ ہے ہم کو فلاخن کا

دشمن کو حقیر نہ سمجھو

ایک سمجھو جان کا دشمن ہو چھوٹا یا بڑا
کام وقت ذبح کرتی ہے چھری تلوار کا

پیری میں کمال کا فروغ ہوتا ہے

عہد پیری میں کمال اپنا ہوا رونق پذیر
دن ڈھلا جب وقت آیا گرمی بازار کا

مذاق عارفانہ

کعبہ و دل دونوں گھر اس کے ہیں پر اتنا ہے فرق
دور کی وہ راہ ہے یہ راستہ نزدیک کا

ظالموں پر ظلم روا ہے

ظلم اہل ظلم پر کچھ ظلم میں شامل نہیں
کون غارت گر ہے مجرم خانہ زنبور کا

جھکے جو آپ سے انسان کو جھکنا اُس سے لازم ہے
جو خم شمشیر میں پایا کیا خم ہم نے گردن کو

متواضع سے جھکنا چاہیے

عدو کی سرکشی موقوف ہو جاتی ہے احساں سے
یہ وہ ہے بوجھ بھاری جو جھکا دیتا ہے گردن کو

دشمن کا دفعیہ احسان ہے

پشیماں ہوں گے جو قصد شکست غیر رکھتے ہیں
بجز سر گشتگی حاصل ہے کیا سنگ فلاخن کو

نقصان چاہنے والا پشیمان ہوتا ہے

حریصوں کو سوائے سوزِ غم نعمت سے کیا حاصل
کہ جلتا ہے فتیلہ جس قدر پیتا ہے روغن کو

حریص زیادہ متفکر رہتا ہے

بلا سے امن اگر چاہے کوئی پیدا حمایت کر
ہوا گل کر نہیں سکتی چراغِ زیرِ دامن کو

حمایت کے سبب بلا سے امن

سوا تذلیل کے کیا ہے غرض جب درمیاں آئی
کہ اونچا ہاتھ منعم کا ہے نیچا ہاتھ سائل کا

غرض باعث ذلت ہے

فروتن واجب التعظیم ہیں کچھ شک نہیں اس میں
جھکی مقتول کی گردن تو اُٹھا ہاتھ قاتل کا

انکسار میں توقیر ہے

صاحبو۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ کس قدر سچے مضامین ہیں اور قدرت و عادت کے مطابق واقع ہوئے ہیں، بااین ہمہ صنعت شعری کا پورا برتاؤ کیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ زبان کس قدر منجھی ہوئی ہے اور پاک صاف اور شستہ ہے گویا آب کوثر میں دھلی ہوئی ہے۔ کوئی لفظ دبتا ہوا نہیں۔ کوئی حرف گرتا ہوا نہیں۔ یہی کیفیت فارسی میں میرزا محمد علی صائب اصفہانی کی ہے۔ اُس کے چند اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے نذر سامعین باتمکین کیے جاتے ہیں۔

اُمید فیض ز نو دولتاں مجو صائب
کہ نو نہال کجا طاقت ثمر دارد

نودولت بے فیض ہوتے ہیں

صائبا خجلت سائل بزمینم در کرد
بے زری کرد بمن آنچہ بقارون زر کرد

سخی کو بے زری سے شرمندگی

عیب پوشی

ہوش چشم خود از عیب دیگراں صائب
اگر چہ می نتوانی برہنہ پوشیدن

دشنام دہی عیب ہے

دہن خویش بدشنام میالا صائب
ایں زر قلب بہر کس کہ دہی باز دہد

مانگنے میں بے آبروئی

دست طمع بہ پیش کسے کردہ دراز
پل بستہ کہ بگذری از آبروئے خویش

تملق دشمن آفت جان

اگر دشمن دوتا گردد بہ تعظیمش مشو غافل
کہ خم کردن صیاد آفت جان مرغان است

حضرات انجمن۔ بزم مشاعرہ میں بڑی خوبی یہ ہے کہ مختلف المراسم اور مختلف المذاہب حضرات یکجا جمع ہوتے ہیں جو بلا خیال ملت و مذہب کے باہم دوستانہ برتاؤ اور برادرانہ اتحاد سے پیش آتے ہیں اور علوم و فنون کی تازگی کے سوا اس سے اتفاق باہمی بھی بڑھتا ہے جس کی ضرورت اس وقت ہم لوگوں کو زیادہ ہے۔ پس ایسے جلسوں کو مغتنمات سے شمار کرنا چاہیے ؎

یہ ہم جلیس یہ جلسے ہیں بزم ہستی تک
لحد میں کوئی کسی کا شریک حال نہیں
خدا نے دی ہے عجب منزلت محبت کو۔
یہ بزم وہ ہے کہ جس میں صف نعال نہیں

طاعون سے بچنے کی تدابیر وغیرہ

تاریخ ۲۴؍ جنوری ۱۹۰۱ء محلہ کوٹھا پارچہ قدیم (فرخ آباد) میں ایک جلسہ، اس غرض سے منعقد ہوا کہ طاعون ملعون کی غارتگری سے جو عوام کو پریشانی اور گھبراہٹ ہو رہی ہے وہ دور کرنے کی کوشش کی جائے اور لوگوں کو تسکین و تشفی دی جائے اور سرکار نے جو تجویزیں رعایا کی تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے اور وبائے طاعون سے بچنے کے لئے پیش کی ہیں اُن کی خوبیاں عوام پر ظاہر کی جائیں۔

مشر ان صاحب نے اس جلسہ میں حسب ذیل تقریر کی ۔

حضرات ۔ میں طبیب نہیں ہوں، نہ طبیب کا شاگرد ہوں، نہ طبیبوں کی صحبت میں بیٹھنے والا ہوں نہ طب کی کتابوں کے پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں کہ طبیبوں کی طرح آپ کے روبرو طاعون کا بیان کروں یا طاعون کا کوئی مجرب نسخہ پیش کروں ۔ یہ کام تو ہمارے میرِ مجلس حکیم پنڈت گوری شنکر صاحب کا ہے مجھ سے تو میرے اہل محلہ نے یہ کہا کہ اس محلہ میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہیں، تم نے دو حرف پڑھے ہیں، اگر تم طاعون کا بیان کرو، تو ممکن ہے کہ کچھ فائدہ عام لوگوں کو پہونچے ۔ بس آپ کے فائدہ کا نام سن کر میں بے تامل آپ کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا ہوں اور اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کوئی مجھ پر ہنسے گا ۔

اس مصیبت کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا ثابت کرتا ہے کہ دونوں قوموں میں محبت ہے اور ایک کو دوسرے کے بغیر چارہ نہیں ہے ۔ بیماری نہ ہندو کو چھوڑتی ہے نہ مسلمان کو، نہ بوڑھے کو نہ جوان کو، نہ مرد کو نہ عورت کو، نہ فقیر کو نہ امیر کو ۔ اس لیے اس مصیبت کے وقت سب کو باہم شریک رہنا چاہیے تاکہ سب کی پریشانی اور گھبراہٹ کم ہو ۔

صاحبو ۔ بیماروں کو دوا دینا، اُن کا علاج کرنا، اُن کی تیمارداری کرنا، اُن کو تسکین و تشفی دینا یہ سب کام ایسے ہیں جو ہر مذہب میں پسند کیے جاتے ہیں ۔ ہم سب لوگ اسی غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اپنے بھائیوں کے لئے، جو دُکھ درد اُٹھا رہے ہیں، کچھ کام کریں اور انھیں مدد دیں ۔ جن طریقوں سے ہوا اور مکانات صاف اور پاک ہو سکتے ہوں وہ طریقے اختیار کریں ۔ جبر سے نہیں، بلکہ سب کی

صلاح ومشورہ اور خوشی سے اور بیماروں کے حق میں شافی مطلق کی درگاہ میں دعائے صحت کریں اور جو عمدہ طریقے خیرات کے ہوں، اُن کے مطابق خیرات کریں۔ گنگا میں جو اس وقت سیکڑوں لاشیں کنارہ پر پڑی ہوئی ہیں، اُن کو ٹھکانے لگائیں۔ مُردوں کی آخری رسمیں جو ہوتی ہیں اُن کو ادا کریں تاکہ مُردوں اور زندوں دونوں کو فائدہ پہونچے اور خود دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب حاصل کریں۔

صاحبو۔ ہمارے محلہ کوٹھا پارچہ کہنہ میں طاعون نہیں ہے لیکن جب ہم اپنے گردوپیش کے محلوں میں بیماری دیکھتے ہیں یا شہر میں سب جگہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بھائی اس میں گرفتار ہیں اور مرتے چلے جاتے ہیں یا بھاگتے چلے جاتے ہیں، تو ہم کو بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ ہم پوری بھوک نہیں کھا سکتے نہ پوری نیند سو سکتے ہیں کیونکہ یہ قدرتی قاعدہ ہے اور انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ دوسروں کو خوش دیکھ کر ہم خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر ملول ہوتے ہیں۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند که در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

جب ایک آدمی گھر میں بیمار ہوتا ہے، تو سارا گھر پریشان ہو جاتا ہے اور مثل بیماروں کے دردمند رہتا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم سیکڑوں بھائیوں کو مرتے ہوئے دیکھیں، ہزاروں کو بھاگتے ہوئے اور گھر چھوڑتے ہوئے دیکھیں اور غمگین نہ ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔

منغص بود عیش آں تندرست کہ باشد بہ پہلوے بیمار سست
نخواہد کہ بیند خرد مند ریش نہ بر عضو مردم نہ بر عضو خویش
یکے را بزندان بری دوستاں کجا ماندش عیش در بوستاں

مگر خالی گھبراہٹ سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم کو مستعدی مضبوطی اور ثابت قدمی اس وقت اختیار کرنا چاہیے اور لازم ہے کہ مناسب تدبیریں عمل میں لائیں تاکہ ہم نقصان سے بچیں۔ میں اپنی تقریر کے کسی حصہ میں بیان کروں گا کہ وہ تدبیریں کیا کیا ہیں۔ اس وقت میں طاعون کے تاریخی حالات آپ کی دلچسپی کے لئے بیان کروں گا تاکہ سب کو معلوم ہو کہ یہ مرض ہندوستان میں نیا نہیں ہے بلکہ یہاں اور تمام دنیا میں سیکڑوں برس سے ہوتا چلا آیا ہے۔ سنیے۔

طاعون عربی لفظ ہے، ہندی میں اس کو مہاماری کہتے ہیں، انگریزی میں پلیگ کہتے ہیں طاعون تین قسم کا ہوتا ہے۔ بیوبونک پلیگ۔ یہ قسم وہ ہے کہ بخار کے ساتھ گلٹ ہوتی ہے جسم کے کسی حصہ پر خصوصاً بغل، گردن یا کنج ران میں۔ یہ گلیٹاں کبھی کبھی شروع ہی سے نکلتی ہیں، لیکن اکثر بخار کے دوسرے تیسرے روز ظاہر ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تحلیل بھی ہوجاتی ہیں، لیکن اکثر پک جاتی ہیں۔ ان گلٹیوں میں درد بشدت ہوتا ہے۔ پہلے یہ گلٹیاں چھوٹی ہوتی ہیں لیکن بعض وقت بڑھ کر کیلے کی چھوٹی پھلی کے برابر ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کا طاعون بکثرت ہوتا ہے۔

دوسری قسم نیومونک پلیگ ہے۔ اس طاعون میں زہر کا اثر پھیپھڑوں پر ہوتا ہے۔ کبھی ایک کبھی دونوں پھیپھڑے ماؤف ہوجاتے ہیں اور ان پر ورم آجاتا ہے۔ جیسے نیومونیا کی بیماری میں۔ یہ قسم اول سے زیادہ تیز اور ہلاک کرنے والی ہے۔ کبھی کبھی اس میں بھی گلیٹاں نکل آتی ہیں لیکن اکثر بغیر گلٹ کے یہ طاعون ہوتا ہے۔ یہ بمقابلہ قسم اول کے کم ہوتا ہے۔

تیسری قسم سیپٹی سی مک پلیگ ہے۔ اس میں بیک زہر کا اثر خون میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہ قسم سب سے زیادہ تیز اور نہایت مہلک ہے۔ اس میں بخار کی نہایت تیزی ہوتی ہے یہاں تک کہ مریض چند گھنٹہ میں مرجاتا ہے۔ گلٹ وغیرہ نکلنے کی مہلت ہی نہیں ہوتی۔ مریض کے بدن پر کالے کالے دھبے پڑجاتے ہیں یہ طاعون بمقابلہ ہر دو اقسام مذکورہ بالا کے کمتر ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ۴۳۰ برس قبل ولادت حضرت عیسیٰ مسیح کے یہ وبا یونان کے شہر ایتھنس میں آئی پھر اسکندریہ میں ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد ۵۴۲ء میں مصر ہوتی ہوئی سلطنت روما کبیر میں داخل ہوئی۔ وہاں سے چل کر شمالی افریقہ اور ملک شام میں آئی۔ پھر وہاں سے فرنگستان میں گئی اور اس وقت سے کم وبیش ایک ہزار سال تک یورپ کے بر اعظم کو تباہ و برباد کرتی رہی اور شہروں اور قصبوں کو خالی کردیا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں یہ وبا کئی دفعہ ظاہر ہوئی اور ۱۳۴۷ء سے ۱۳۴۹ء تک یورپ میں ڈھائی کروڑ آدمیوں کو ہلاک کردیا، جو یورپ کی آبادی کا چوتھا حصہ تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ یورپ میں اولاً یہ وبا شہنشاہ جسٹی نین کے وقت میں رومیہ کبریٰ میں پھوٹ نکلی اور پچاس ساٹھ برس تک غارت گری کرتی رہی۔ پھر چودھویں صدی میں یورپ اور افریقہ میں پھیلی اور کالی وبا یا سیاہ موت کے نام سے مشہور رہی۔ اٹھارھویں صدی میں یورپ کو چھوڑ کر ممالک ترکستان و عرب و مصر و ایران میں

پہونچی۔ خلیفہ عمرؓ کے عہد میں شام و عراق اور بصرہ میں پھیل گئی تھی یوسف مورخ لکھتا ہے کہ ۷۲ء میں شہر یروشلم میں وبا کی آفت نازل ہوئی۔ پھر ۲۶۳ء میں شہر روم کبیر میں اس نے پانچ ہزار جانیں روزانہ تلف کیں۔ پھر ۵۴۴ء میں روم میں پہونچکر ہلاکت کا بازار گرم کیا۔ چھٹی صدی سے بارھویں صدی تک اس کالی وبا نے ممالک فرانسہ و جرمن کو تاخت و تاراج کیا۔ تیرھویں صدی میں جنگ صلیبی کے وقت پھر اس کا منحوس قدم فرنگستان میں آیا۔ ۱۷۲۰ء میں شہر مارسیلس (فرانسہ) میں سات مہینہ میں ساٹھ ہزار آدمی اس کے شکار ہوے۔ اور شہر مسینیا میں ۱۷۴۳ء میں تین مہینہ کے اندر تینتالیس ہزار لقمۂ اجل ہوئے ۱۷۷۱ء میں شہر ماسکو (واقع ملک روس) کی تمام و کمال آبادی کو یک قلم صاف کر دیا۔ ۱۵۳۷ء سے ۱۵۹۹ء تک لندن میں یہ مرض بار بار ہوا، مگر سب سے زیادہ زور وبا کے لندن کا ۱۶۶۴ء اور ۱۶۶۵ء میں ہوا۔ اس وقت صرف شہر لندن میں ستر ہزار موتیں ہوئیں ۱۸۳۴ء سے ۱۸۳۹ء تک یہ مرض ترکستان میں آیا اور ۱۸۴۱ء میں مصر ہوتا ہوا قسطنطنیہ میں آیا۔ ایران و عرب میں یہ مرض ۱۸۱۵ء اور پھر ۱۸۳۲ء میں شہر جدہ میں پھیلا ۱۸۵۳ء میں اس کا زیادہ زور عرب میں ہوا۔ پھر ۱۸۷۴ء میں اور اس کے بعد ۱۸۷۹ء میں دو حملے اس کے عرب پر ہوئے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے یہ مرض گجرات میں شروع ہوا ۱۶۱۱ء سے ۱۶۱۸ء تک اور پھر دوسری مرتبہ ۱۶۸۳ء سے ۱۶۹۳ء تک ملک گجرات کو تاخت و تاراج کرتا رہا ۱۶۱۸ء میں انگریزوں کی سفارت احمد آباد میں آئی تھی۔ یہ وقت جہانگیر بادشاہ کا تھا۔ اس وقت سفارت کے افسر سب مر گئے۔ صرف سفیر بذات واحد بچ رہا۔ پھر اورنگ زیب کے عہد میں ۱۶۸۳ء سے ۱۶۸۹ء تک شہر سورت میں یہ وبا رہی ۱۷۴۷ء میں بہادر شاہ کے وقت پھر یہ وبا پھوٹ نکلی۔ پھر ۱۸۱۲ء سے ۱۸۱۵ء تک جھالاوار اور احمد آباد میں یہ وبا پھیلی پھر راجپوتانہ میں ۱۸۳۶ء میں پہونچی اور ۱۸۳۸ء تک رہی۔ اس وقت سے اس وقت تک علاقہ کمایوں اور گڈھوال میں اس نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔

۱۸۹۶ء ایام بارش میں طاعون شہر بمبئی میں نمودار ہوا۔ اول اول حکام کی توجہ اس طرف نہیں ہوئی، لیکن شبہ ہونے پر گورنمنٹ نے مستعدی کے ساتھ اس کی تحقیقات کرائی۔ ڈاکٹر ہافکن نے اس کی پوری تحقیق کی۔ اور اس مرض وبائی کے ہونے کا یقین سرکار کو ہوا۔ ماہ اکتوبر میں نہایت تیزی سے یہ وبا بمبئی میں پھیل گئی اور ہزاروں آدمی وہاں سے بھاگ نکلے اور کراچی، شولاپور، پونا، ہبلی کی طرف

چلے گئے۔ ان شہروں میں بھی یہ مرض متعدی پھیل گیا۔ رفتہ رفتہ پنجاب اور یو پی میں بھی اس کی کثرت ہوگئی ہے، بلکہ تمام ہندوستان میں اس وقت زور و شور سے عالمگیر ہو رہا ہے۔

صاحبو۔ ہمارے شہر میں جاہل یا مفسد لوگوں نے سرکار کو جھوٹا الزام دینے کے لئے کچھ افواہ مشہور کیے ہیں۔ میں اُن کو اس غرض سے بیان کرتا ہوں کہ آپ آگاہ ہو جائیں اور اُن کو غلط سمجھیں اور ایسے لوگوں سے پرہیز رکھیں۔ وہ غلط خبریں اس قبیل سے ہیں (۱) زہریلی دوائیں ترکاریوں کے کھیتوں میں چھڑکی گئی ہیں تاکہ جو کھائے وہ مرجائے۔ (۲) طاعون گھروں میں چھڑکا جاتا ہے اور جو اُن مکانوں میں رہتے ہیں وہ مرجاتے ہیں (۳) کانپور سے کوئی افسر آیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ فرخ آباد میں کیوں طاعون نہیں پھیلا ہے۔ مثل کانپور کے زیادہ پھیلانا چاہیے (۴) چونکہ آبادی ملک ہندوستان کی بہت زیادہ ہے لہذا سرکار کو منظور ہے کہ آبادی کم ہو جائے (۵) یہ کیونکر انگریزوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آج فلاں محلہ میں طاعون پھیلے گا اور فلاں تاریخ سے فلاں محلہ میں (۶) یہ کیوں نہیں مرتے۔ کچھ تو دال میں کالا ہے

صاحبو۔ میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ ان واہیات افواہوں کی تغلیط فرداً فرداً کروں۔ یہ ایسی بیہودہ اور بے سروپا ہیں کہ خود اپنی تغلیط کرتی ہیں اور کوئی ہوشمند آدمی ان کو باور نہیں کر سکتا۔ ایسی ہی جھوٹی خبریں غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ پیشتر مشہور ہوئی تھیں۔ جو کچھ اُن کا نتیجہ ہوا ہم سب کو معلوم ہے۔ سات برس کا عرصہ ہوا کہ اضلاع شرقی میں درختوں پر مٹی کے چھاپے لگائے گئے تھے۔ یہ کام مفسدہ پردازوں نے کیا تھا۔ اُس وقت بھی طرح طرح کے افواہ مشہور تھے کہ رعایا کی سخت ناراضی کی نشانی ہے، یا آفت ارضی وسماوی کی علامت ہے، مگر وہ سب خبریں غلط نکلیں اور ملک میں امن و امان رہی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ تمام حکام انگریزی اپنے آپ کو ہندوستان کا نمک خوار کہتے ہیں۔ اس بنیاد پر کہ بیت المال سے تنخواہیں پاتے ہیں اور بیت المال کیا ہے؟ ہندوستانیوں کے خراج کا مجموعہ۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کا نمک کھائیں اور ہمیں کو ایسے ظلم سے قتل کریں اور ہمارا ہی گھر اُجاڑیں۔ گویا ہمارے ساتھ نمک حرامی کریں۔ ڈاکوؤں میں قاعدہ ہے کہ جب وہ اتفاقیہ کسی ایسے شخص کے گھر مہمان ہو جاتے ہیں جس کو وہ لوٹا چاہتے ہیں، اُس کا نمک نہیں کھاتے اور کھانا بے نمک کا کھاتے ہیں اور کسی بیماری کا حیلہ کر کے کہتے ہیں کہ ہم کو نمک سے پرہیز ہے۔ ہمیں سے اُن کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اگر نمک کھالیں گے تو اُس کو لوٹ نہ سکیں گے، کیونکہ نمک کھانے کے بعد لوٹنا یا قتل کرنا داخل نمک حرامی ہے۔

پس کیا گورنمنٹ کے افسر ڈاکوؤں سے بھی بدتر ہیں کہ نمک کا پاس و لحاظ بھی نہ کریں گے کہ ہمارا ہی نمک کھائیں اور ہمیں سے ایسی بیوفائی کریں کہ ہم کو قتل کریں اور ہمارا گھر لوٹیں۔ یہ ناممکن ہے۔ چالیس برس کا عرصہ ہوا کہ محکمہ دختر کشی سرکار نے قائم کیا تھا جس سے مراد یہ تھی کہ ٹھاکروں میں جو لڑکیاں مار ڈالنے کا دستور تھا وہ بند کیا جائے اور بیچاری لڑکیوں کی جانیں بچائی جائیں۔ ٹھاکروں کا قاعدہ تھا کہ مدخولہ عورتیں رکھتے تھے اور انہی سے اولاد پیدا ہوتی تھی۔ اب سرکار کے انتظام اور رحمدلی کی بدولت صحیح النسل اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح گورنمنٹ نے ستی کا ہونا بند کیا، کیونکہ اُس کی رائے میں زندہ عورت کا جلانا اور یوں اس کو ہلاک کرنا خلاف قانون اور داخل بے رحمی تھا۔ قریب سو برس کے عرصہ گذرا کہ سرکار نے ممالک متوسط میں محکمہ گیرائی جاری کیا تھا، جس سے غرض یہ تھی کہ ٹھگوں اور ڈاکوؤں کا استیصال کیا جائے۔ اُن غارتگروں نے ملک متوسط کے باشندوں کی جان و مال کو نہایت معرض خطر میں ڈال رکھا تھا اور عامہ رعایا نہایت تنگ تھی کہ سرکار نے بمقتضائے رعایا پروری محکمہ گیرائی قائم کرکے ان بدکرداروں اور مفسدہ پردازوں کو پاداش اعمال دی اور ستم رسیدہ رعایا کو اس مہلکہ سے نجات دی۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس سرکار نے ایسی رعایا پروری اور انصاف گستری کی ہو لاکھوں روپیے خرچ کرکے ہماری جانیں بچائی ہوں اور ہمارے مال کی حفاظت کی ہو وہی ایسی ظالم اور بیوفا ہو جائے کہ خود ڈاکو بن کر ہمارا مال لوٹے اور ہماری جانیں ہلاک کرے۔

ہم کو طاعون سے بچانے کے لیے گورنمنٹ نے کیا انتظام کیا ہے

(۱) تمام شہر میں نالیاں نئے سرے سے بن رہی ہیں کہ گندہ پانی رہنے نہ پائے اور شہر کی صفائی میں ترقی ہو۔ اس میں قریب ایک لاکھ روپیے کے میونسپلٹی کا خرچ ہوگا۔

(۲) تازی کھاد کا کھیتوں میں ڈالنا موقوف کر دیا گیا ہے۔ خشک کھاد ڈالی جاتی ہے تاکہ شہر کے گرد و پیش کی ہوا نہ بگڑے۔

(۳) سرکار کی طرف سے طاعون کے سررشتہ کے ملازم بہ صرف کثیر مقرر ہوئے ہیں کہ رعایا کے مکانات گندگی سے پاک و صاف کرتے رہیں اور دوائیں دافع طاعون چھڑکتے رہیں۔

(۴) پہلے ریل اسٹیشنوں پر بھی مریض دیکھے جاتے تھے اور قرنطینہ کا محکمہ تھا، مگر ہم لوگوں کی

ضد اور بیوقوفی سے وہ انتظام اب موقوف کر دیا گیا۔ مثل اُن والدین کے جو اپنے بچوں کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے، اس وقت بھی گورنمنٹ نے ہم کو نہیں چھوڑ دیا ہے اور انتظامات حال موجود ہیں۔

(۵) تمام ہندوستانی افسر اور انگریزی حکام گلی، کوچوں میں پھرتے ہیں۔ یہاں کے کلکٹر بھی آپ کے حالات معلوم کرنے کے لئے شہر میں اکثر آتے ہیں اور لفٹننٹ گورنر الٰہ آباد اور لفٹننٹ گورنر بنگالہ بغیر کسی جلوس کے تنہا پاؤں گاڑی پر الٰہ آباد اور کلکتہ کی گلیوں میں ہر امیر و غریب کے دروازے پر جا کر پوچھتے پھرتے ہیں۔

طاعون سے بچنے کی تدبیریں بطور حفظ ما تقدم کے

(۱) مکان کی گندگی صاف کرانا چاہیے، کیونکہ تمام حکمائے متقدمین و متاخرین کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ یہ مرض گندی ہوا اور کثیف بخارات ارضی سے پیدا ہوتا ہے۔ برگ نیب، کافور، چونا قلعی، تیزاب نمک، سہاگہ، سنکھیا، گندک، رس کپور ان چیزوں سے مکان دھونا چاہیے اور گوبر میں ادویۂ مذکورہ ملا کر مکان لیپنا چاہیے سرکار نے جو دوائیں بعد تحقیقات کامل تجویز کی ہیں اُن سے مکان دھلوانا بہت مفید ہے۔ اگر اعتقاد نہ ہو تو ادویہ مذکورۂ بالا سے دھلوا کر دیکھیے۔ پاخانوں اور غسل خانوں میں دوائیں دافع عفونت ڈالنا چاہیے۔ مثلاً لکڑی کا تیل، کوئلے کا تیل اور کوئلا اور قلعی ڈلوا دینا چاہیے۔ مکان کو گرم رکھنا چاہیے اور اسی طرح جسم کو بھی گرم رکھنا چاہیے۔

غذا میں کیا کیا کھانا چاہیے اور کس کس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے۔

جلد ہضم ہونے والی غذائیں اور روح بڑھانے والی اور خون صاف کرنے والی غذائیں، کھانا چاہیے اور کثیف غذاؤں اور جلد سڑنے والی غذاؤں سے پرہیز رکھنا چاہیے۔ بقولات بھی آج کل مفید نہیں ہیں۔ اگر سبز ترکاریوں سے شوق ہو تو پہلے اُن کو ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دینا چاہیے پھر پکانا چاہیے۔ سرکہ اور اُس کے مرکبات مثل سکنجبین وغیرہ کے مفید ہیں۔ عرق نعناع، تیزاب شورہ، تیزاب گندک، تیزاب نوسادر، تیزاب نمک مفید ہے کافور، زہر مہرہ، تلسی، پیاز کا کھانا اور سونگھنا مفید ہے اور مکان میں بھی ان کو رکھنا چاہیے۔ ترشی، آلو بخارا، املی اور لیموں کی مفید ہے۔

دُھونیاں

جس کے دھوئیں سے زہریلے کیڑے مرجاتے ہیں اور ہوا صاف ہو جاتی ہے

لوبان، گندک، برادہ صندلین، کافور، گوگل اور برگ نیب کی دھونی مکانوں میں دینا چاہیے عطر، کیوڑہ، گلاب اور خس سونگھنا مفید ہے۔ اگر کوئی شخص طاعون کے بیمار کو چھوئے، تو نیم کے گرم پانی اور کاربولک صابون سے ہاتھ دھو ڈالے۔

اگر طاعون کے مردے کے ساتھ جانے کا موقع ہو، تو گرم پانی سے، جس میں نیم اور نمک پڑا ہو اور کاربالک صابون سے جسم دھونا چاہیے اور کپڑوں کو نیم کے گرم پانی میں اُبالنا چاہیے اور دوسرے نئے دھوئے ہوئے کپڑے پہننا چاہیے۔

صاحبو۔ میں نے تدابیر حفظ ما تقدم کا ذکر اس وجہ سے پہلے کیا کہ اصل میں یہی سب سے اچھا ہے کہ طاعون ہونے ہی نہ پائے اور ہم اُس سے بالکل دور رہیں۔ اب یہ ذکر بھی مختصر کرونگا کہ طاعون میں کوئی مبتلا ہو، تو کیا کرنا چاہیے۔ چونکہ طاعون ملعون ایسا مرض مہلک ہے کہ اس سے مریض نہایت شاذ و نادر نجات پاتا ہے اور کوئی مجرب نسخہ اس کا ایجاد نہیں ہوا ہے لہذا اس قدر کہنا بالفعل کافی ہے کہ جب کوئی شخص اس عارضہ میں مبتلا ہو تو اُس کو چاہیے کہ فوراً کسی اچھے حکیم یا وید یا ڈاکٹر سے رجوع کرے، ہرگز عطاروں یا عطائیوں کی طرف رخ نہ کرے۔ نہ تین دن تک انتظار کرے جیسا کہ معمولی بخار کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ دوا معتبر دوا فروشوں سے لینا چاہیے اور عطاروں وغیرہ کو بڑی احتیاط سے دوا دینا چاہیے۔ اگر ممکن ہو سکے تو تیمار دار اُس مریض کو مکان کے کسی علیحدہ حصہ میں رکھیں اور وہاں کی نشست اور آمد و رفت زیادہ نہ رکھیں، بجز اُس حالت کے کہ ضرورت شدید مقتضی ہو۔ اسی طرح بطور حفظ ما تقدم بہت اچھا ہے کہ شہر کے باہر باغوں یا میدانوں میں چند روز رہنا اختیار کریں، جب تک طاعون کی کثرت رہے۔ ہر شخص تو ایسا نہیں کر سکتا ہے لیکن اکثر اشخاص ایسا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ٹیکا بھی عمدہ چیز ہے اور اب اُس کی خوبیاں ذہن نشین ہوتی جاتی ہیں ممکن ہے کہ سال دو سال میں تجربہ کے بعد مثل چیچک کے ٹیکے کے، یہ بھی مانع اور دافع طاعون ثابت ہو جائے۔

صاحبو۔ میری تقریر نے زیادہ طول کھینچا اور آپ لوگوں نے بہت صبر و تحمل سے سنا جس کا

میں ممنون ہوں - میں نے اپنے بیان میں سرکار کی طرفداری نہیں کی ہے۔ مجھے جھوٹی خوشامد سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ اگر میں کلکٹر صاحب کو قصور وار سمجھتا تو اُن کو اور خود لفٹننٹ گورنر اور ویسرائے کو بھی نہ چھوڑتا اور سب کی خوب دھجیاں اڑاتا، مگر میرا سر نہیں پھرا ہے کہ خواہ مخواہ کسی پر اعتراض کروں۔ جب خدا کوئی عام مصیبت اپنے بندوں پر ڈالتا ہے تو اُس وقت اپنے خاص بندوں کی آزمائش بھی کرتا ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ جو لوگ ظاہر میں اس کا نام لیتے ہیں، وہ مصیبت کے وقت غریبوں کی دستگیری کرتے ہیں یا نہیں، یا جو خدا ترس مشہور ہیں وہ اس وقت ترس کھاتے ہیں یا نہیں اور جو دولتمند ہیں وہ اس وقت خدا کی راہ میں روپیہ خرچ کرتے ہیں یا نہیں۔ یہاں جو لوگ جمع ہیں ان میں دھرماتما اور خدا ترس بھی ہیں۔ آپ میں سے اکثر خیرات کرنے والے، دھرم شالے اور پاٹ شالے بنانے والے اور سدابرت بانٹنے والے ہیں۔ کیا آپ لوگ گوارا کریں گے کہ ہمارے بھائیوں کی لاشیں جو گنگا کنارے پڑی ہیں اور بے گور و کفن طعمہ زاغ و زغن ہو رہی ہیں، وہ اسی طرح خرابی میں پڑی رہیں؟ کیا آپ لوگ، جو گنگا نہانے والے ہیں اور گنگا پوجنے والے ہیں، یہ چاہیں گے کہ گنگا جی کا پانی ایسا گندہ رہے اور پینے کے لائق نہ رہے؟ اگر ہم لوگ ذرا بھی ہمت کریں تو تھوڑے صرف سے لاشوں کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ اس سے مُردوں اور زندوں دونوں کے ساتھ سلوک ہوگا پانی اور ہوا دونوں کی گندگی جاتی رہے گی اور ہم کو دنیا و آخرت دونوں کا ثواب حاصل ہوگا۔

صاحبو- یہاں آج ہم لوگ کچھ کام کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ خالی زبانی داخلہ نہیں ہے۔ جب آپ لوگ اپنے گھر جائیں گے تو آپ کے بھائی اور بہنیں آپ سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے لیے آج کیا کام کیا تو آپ کیا جواب دیں گے؟ شہر کے باشندے جانتے ہیں کہ ہمارے بھائیوں کا ایک گروہ آج فلاں محلہ میں جمع ہوا ہے کہ غریبوں کے فائدے کی تدبیریں سوچے۔ وہ بہت انتظار اور مایوسی کے ساتھ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اُمید لگائے ہوئے ہیں کہ آپ اُن کے حق میں بڑے مفید کام اس وقت کریں گے۔ اُن کو آپ کیا جواب دیں گے؟ آئیے ہم اور آپ سب مل کر کچھ تدبیریں سوچیں اور اُن کو عمل میں لائیں۔ ہم میں سے ہر شخص جو خدمت انجام دے سکتا ہو وہ اپنے ذمہ لے۔ میں دو خدمتیں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ ایک یہ کہ ایک قلیل رقم دس روپیے کی بطور چندہ اس لئے دیتا ہوں کہ لاشوں کے علیحدہ کرنے اور جلانے میں صرف کی جائے۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ

لوگوں کے باہم ایسی رقم چندہ جمع ہو جائے گی، جو ہم کو مُردوں کے فرائض کی انجام دہی سے سبکدوش کر دے۔ دوسری خدمت یہ ہے کہ میں اپنے خرچ سے ایک دھونی خوشبودار دافع عفونت تیار کروں گا، جو اہل محلہ اور گرد و پیش کے باشندوں کو مفت تقسیم کروں گا۔ اُمید ہے کہ اس مجمع میں بیشتر اشخاص ایسے ہوں گے، جو اپنے ہمجنسوں کی کوئی خدمت اپنے ذمہ ضرور لیں گے تاکہ ہمارے مصیبت زدہ بھائیوں کی تکلیفیں کچھ کم ہوں۔

کرم کن کہ دولت نماند ولیک
جزائے عمل ماند و نام نیک

دسہرا

۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء روز دسہرا مشران صاحب نے ریاست گنگول ضلع بہرائچ میں ایک دربار بحیثیت منیجر ریاست مذکور حسب قاعدہ مقرر کیا۔ رانی آتراج کنور صاحبہ تعلقدار گنگول، متھرا میں تشریف فرما تھیں، اس لیے دربار دسہرا حسب دستور مستمرہ بذیر صدارت مشران صاحب منعقد ہوا جس میں ملازمان ریاست کے علاوہ قریب چھ ہزار آدمی کے رعایائے ریاست میں سے موجود تھے جب نذریں گذر چکیں اور معمولی رسمیں ادا ہو چکیں تو موصوف نے ایک اسپیچ دی جو درج ذیل ہے۔

دیوان منشی کالی پرشاد، اہلکاران ریاست اور ٹھیکہ داران علاقہ گنگول ۔

میں حضور رانی صاحبہ معظمہ کی جانب سے، نیز اپنی طرف سے آپ سب حضرات انجمن کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں جنھوں نے آج ہمارے دربار میں شریک ہوکر اس کو رونق بخشی ہے۔ میں جدھر نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں، دوستوں ہی دوستوں کے چہرے نظر آتے ہیں، جن سے مجھ کو محبت دلی ہے۔

آج دسہرا کا دن ہے جو ہم ہندوؤں کے لئے خصوصاً چھتریوں اور برہمنوں کے لئے، بجائے خود نوروز ہے، کیونکہ یہ تیوہار یادگار ہے اُن مشہور بہادروں کی جنھوں نے لشکر جرار سمندر پار لے جاکر راون جیسے زبردست شہنشاہ ہفت اقلیم کو شکست دی، یادگار ہے اُس برگزیدۂ عالم، فخر بنی آدم، بہترین موجودات، بہین مخلوقات یعنی سری رام چندر کی فتح و فیروزی کی، جس کی نسل میں ہونے کا ہم ہندوؤں کو فخر اور امتیاز حاصل ہے۔ یہ تیوہار یادگار ہے اُس سعادتمند فرزند ارجمند کی جس نے محض باپ کے حکم کی تعمیل میں اپنا مذہبی فرض سمجھ کر سلطنت سے دست برداری کی اور بن باس اختیار کیا۔ یہ ترک سلطنت جو کیا گیا، کسی پست فطرتی سے نہیں کیا گیا نہ دون ہمتی سے، بلکہ بلند حوصلگی، عالی ہمتی اور جوانمردی سے ؎

جوانمردوں کی شہرت ہے جہاں میں ترک شاہی سے
قیامت تک رہے گا نام راجہ رام چندر کا

یہ تیوہار یادگار ہے اُن محبت کرنے والے بھائیوں کی جنھوں نے سچی محبت برادرانہ کے جوش میں

بھائی کے بجائے سلطنت کرنا پسند نہیں کیا اور حکومت کا عیش و آرام چھوڑ کر بھائی کی تلاش میں جنگلوں اور بیابانوں میں بھٹکتے پھرے کہ اپنے رام کو ڈھونڈھ لائیں اور اسی کو تخت پر بٹھائیں اور خود اس کی خدمت کریں۔ بھائی کی محبت میں ایسی عزیز چیز کو چھوڑ دیا جس کی نسبت کہا گیا ہے اور حقیقت میں سچ کہا گیا ہے کہ ؎

شربت سلطنت و جاہ چناں شیریں است
کہ شہاں از پئے آں خون برادر ریزند

یہ تیوہار یادگار ہے اُس بانوئے عفت مآب اور اُن خاتونِ عصمت جناب کی جنھوں نے اپنے شوہر کی جدائی میں شاہی محلوں کا عیش و آرام چھوڑ دیا اور جنگلوں اور بیابانوں میں اپنے خاوند کے ساتھ ساتھ ہر وقت سایہ کی طرح رہا کرتی تھیں حالانکہ نہایت ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی۔ باوجودیکہ اُن کے پھول سے رخسارے تھے اور کلائیاں شاخ گل کی مانند نازک تھیں اور کف پا برگ گل سے نازک تر تھی، لیکن شوہر کے ساتھ جنگلوں میں کانٹوں پر اس طرح چلتی تھیں گویا پھولوں کے فرش پر چل رہی ہیں۔ سنسان جنگلوں اور بیابانوں کی اُن اندھیری راتوں میں جبکہ بقول شخصے سایہ بھی انسان سے جدا ہو جاتا ہے، یہ شیر دل، نیک نہاد خاتون شوہر سے جدا نہ ہوتی تھیں، بلکہ اُن کے آگے مردانہ وار چلتی تھیں اور اپنی آنکھوں اور پلکوں سے راہ صاف کرتی چلتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کوئی کانٹا ہمارے پیارے شوہر کے پاؤں میں چبھ جائے۔ شاید انہی مقدس خاتون کی شان میں سعدی نے یہ شعر کہا تھا ؎

چناں گرم رو در طریق خدائے
کہ خار مغیلاں نہ کندے ز پائے

ایسی ہی پاکیزہ نہاد عورتوں کی یادگار انہی عفت پناہ سیتا جی کی ایک بہن ہماری مالک و سرتاج رانی اتراج کنور صاحبہ تعلقدار گنگول ہیں ؎

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ہم سب ملازموں، ٹھیکہ داروں اور عامہ رعایا کی نہایت خوش قسمتی ہے کہ ہم لوگ ایسی قدردان اور مہربان، رعایا پرور اور انصاف گستر رانی کے زیر حکومت ہیں۔ میں نے ہندوستان کی رانیوں کے

تذکرے پڑھے ہیں اور عالی خاندان اور والا دودمان خاتونوں کی خوبیوں سے میں بخوبی واقف ہوں۔ جو عمدہ عادتیں اور پسندیدہ خصلتیں ہماری رانی میں ہیں، بہت کم رانیوں میں پاتا ہوں۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی رانی میں اچھی عادتیں موجود تھیں، تو انتظامی لیاقتوں کی کمی تھی۔ اگر کسی میں انتظامی قابلیت بطور کافی تھی، تو اوراوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ ضرورت سے کم تھے۔ کسی میں فیاضی تھی، تو اس درجہ کہ فضول خرچی میں داخل تھی۔ کسی میں کفایت شعاری اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ بخل کی حد تک پہونچ گئی تھی۔ کسی میں باوجود بہت سی خوبیوں کے، ایک نہ ایک ایسی بُری عادت تھی جس سے اُس کے ہمنشینوں کو نفرت اور کراہت ہوگئی اور ریاست کو نقصان پہونچا۔ غرضکہ وہ سب بعینہٖ اس شعر کی مصداق تھیں ؎

ماہ تو ہمشکل ابرو ہے پر اُس کے رو نہیں
ماہ کامل صورت رو ہے مگر ابرو نہیں

بخلاف اس کے ہماری رانی صاحبہ میں ہر قسم کے جوہر بقدر ضرورت موجود ہیں۔ ان کی پسندیدہ عادتیں، خصلتیں اور انتظامی لیاقتیں، اُن کی رحم دلی اور فیاضی، اُن کی رعایا پروری اور انصاف گستری، اُن کی مردم شناسی اور قدر دانی، اُن کی بردباری اور پرہیزگاری اور اُن کی مذہبی نکوئیاں سب ایسی ہیں جنھوں نے اُن کو تمام علاقہ میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

صاحبو۔ اس وقت بے موقع ہوگا اگر میں اُس حکمت عملی کا بیان کروں جو رانی صاحبہ اور اُن کے نائب نے دربارۂ انتظام ریاست مناسب سمجھی ہے۔

جنابہ رانی صاحبہ معظمہ اور اُن کے نائب ریاست کی حکمت عملی دربارۂ انتظام ریاست

جنابہ رانی صاحبہ اور میں یہ نہیں چاہتے ہیں کہ فقط مالی فائدوں پر نظر رکھی جائے، بلکہ یہ منظور ہے کہ اگر ایک طرف مالی فائدے ہوں، تو دوسری طرف رعایا پروری اور انصاف گستری ہو۔ تیسری طرف داب ریاست اور رعب حکومت بڑھتا جائے۔ چوتھی طرف رعایا کے دلوں میں رانی صاحبہ کی محبت پیدا ہوتی جائے۔ رعایا اور ملازموں اور ٹھیکہ داروں کے مذہب سے ہم کو کوئی سروکار نہیں۔ ہم تعصب مذہبی سے آزاد اور جور و ستم اور جبر و ظلم کے خلاف ہیں ہمارے

یہاں ہندو مسلمان دونوں ملازم ہیں۔ دونوں مذاہب کے اشخاص ٹھیکہ دار ہیں اور اسی طرح عامہ رعایا میں ہر مذہب و ملت کے لوگ اور ہر طبقہ اور زمرہ کے اشخاص ہیں۔ ہماری خواہش اور تمنائے دلی یہ ہے کہ ہماری مختلف العقائد اور مختلف المذاہب رعایا، نہایت خوش حالی اور فارغ البالی اور ریاست کی وفاداری میں ترقی روز افزوں کرے۔ انتظام ریاست میں ہماری رانی صاحبہ کے مشیر خاص وہ شہسوار عرصہ فرزانگی یعنی راجہ صاحب بہادر منکاپور ہیں جو فہم و فراست میں افلاطون اول اور شان و شوکت میں اسکندر ثانی ہیں۔

اہلکاران ریاست

جب میں یہاں آیا تو میں نے اہلکاران کی شکایتیں زیادہ سنیں، لیکن تجربہ نے اُن کو غلط ثابت کر دیا۔ مجھے کسی اہلکار سے کوئی شکایت ایسی نہیں، جو قابل ذکر ہو۔ میں سب پر اعتبار کرتا ہوں اُن کی خاطر اور عزت کرتا ہوں اور میرا برتاؤ اُن کے ساتھ دوستانہ ہے۔ مجھے یہاں چند بڑے مقدمات ریاست میں جو پہلے کے بگاڑے ہوئے تھے کامیابی ہوئی۔ اس کارگزاری میں میرے ماتحتوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ منشی منودت لال مختار، منشی ماتا پرشاد پیشکار، دیوان کالی پرشاد منشی بال گوبند لال داخل باقی نویس وغیرہ اس کارگزاری میں شریک غالب ہیں۔ میں نے بعض اہلکاروں کی تنخواہوں میں ترقی دی، بعضوں کو وقتاً فوقتاً انعام بھی دیا۔ میرا خیال ہے کہ اور بھی چند اہلکاروں کی تنخواہوں میں اضافہ کر دوں گا۔ اُمید کرتا ہوں کہ آئندہ سب اہلکار اور بھی زیادہ اچھا کام کریں گے اور اپنے آپ کو ترقی تنخواہ اور انعام کا مستحق ثابت کریں گے۔

ٹھیکہ داران علاقہ گنگول

ہمارا برتاؤ ٹھیکہ داروں کے ساتھ دوستانہ ہے میں اُن کی خاطر اور عزت کرتا ہوں۔ اُن کو بوقت ضرورت مدد بھی دیتا ہوں۔ بدقسمتی یا اتفاق اور مجبوری سے دو چار ٹھیکہ داروں کے اور ہمارے باہم تعلقات میں کشیدگی آگئی اور نوبت بعدالت پہونچی جس کا افسوس ہم کو بدرجہ غایت ہے۔ باقی تمام ٹھیکہ داران سے ریاست مصالحت رکھتی ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ ٹھیکہ دار جن سے ہم کو

عدالت کرنا پڑی ہے، ان سے بھی ہماری صلح ہو جائے گی اور ہمارے اور اُن کے درمیان پھر رابطہ اتحاد قائم ہو جائے گا۔

جنابہ رانی صاحبہ کا نائب الریاست

رانی صاحبہ نے مجھے اپنا نائب مقرر کیا ہے اور سیاہ و سفید کے اختیارات دیے ہیں۔ وہ مجھ پر بدرجہ غایت مہربان اور میری نہایت قدر دان ہیں۔ میں بھی اُن کا کام نہایت نمک حلالی اور وفاداری سے کرتا ہوں اور جو تھوڑی سی لیاقت مجھ میں ہے، وہ اُن کے کام میں صرف کر دیتا ہوں۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ یہاں کوئی منیجر ٹھہرنے نہیں پاتا ہے۔ اس کی اصلیت جو کچھ ہو، مجھے معلوم نہیں میں پرانے حالات سے واقف نہیں، صرف اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں یہاں رہنے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہیں مروں اور یہیں کی خاک کا پیوند ہو جاؤں میں صلح کل کی حکمت عملی رکھتا ہوں اور میرا مذہب صلح کل ہے، پہلے کسی سے لڑتا نہیں، بلکہ دوسروں کے حملوں کی مدافعت کرتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ سوائے لڑائی کے کوئی چارہ نہیں، تب بموجب اس مقولہ کے کہ "جنگ بہ شمشیر آخر حیلہ است" میدان میں آجاتا ہوں پھر پیچھے نہیں ہٹتا، نہ ڈرتا ہوں۔

جس طرح میں ریاست کے دوستوں اور خیر خواہوں کو انعام دینے کے لیے اور اُن سے عمدہ سلوک کرنے کے لئے ہمیشہ تیار ہوں، اسی طرح ریاست کے دشمنوں اور بدخواہوں کو سزا دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہتا ہوں۔ میرے عہد میں وہی لوگ فائدے اٹھا سکتے ہیں جو ریاست سے مل کر چلیں۔ میرے ایام ملازمت میں کئی مرتبہ میرے مخالفوں نے، جو کمینی عادتیں رکھتے ہیں، رانی صاحبہ اور راجہ صاحب بہادر منکاپور کے کان بھرنا چاہے اور بہت طوفان اٹھایا کہ اُن کو مجھ سے ناخوش کر دیں، مگر شکر ہے کہ دونوں صاحبوں میں انصاف پسندی اور یا بہ شناسی بدرجہ غایت ہے۔ کوئی اُن میں سے چغلخوروں کا قدردان نہیں ہے، بلکہ اُن سے نفرت کرنے والے ہیں۔

میرے دشمنوں کو شکست فاش ہوئی اور اُن کو روسیاہی حاصل ہوئی اور جنابہ رانی صاحبہ معظمہ اور جناب راجہ صاحب بہادر کے عدل و انصاف اور مردم شناسی کی شہرت تمام علاقہ میں ہو گئی۔ مخالفین کا حملہ گویا ایک آندھی کا جھونکا تھا جو خاک اُڑا کر چلا گیا اور پھر مطلع صاف کا صاف۔

ایک مرتبہ یہ معلوم ہوا گویا کوہ آتش فشاں پھٹ گیا اور اس نے بہت خاک اڑائی اور لیوا جھینکا اور پتھر برسائے اور تھوڑی دیر کے لئے سورج بھی اندھیرا چھا گیا، لیکن زمین کی کشش ارضی نے جو نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر رہی تھی، وہ سب خاک اور لیوا اور پتھر آہستگی کے ساتھ بلندی سے اپنی سطح پر اتار دیئے اور آسمان صاف ہوگیا اور آفتاب پھر اپنی پوری روشنی کے ساتھ چمکنے لگا، یہی حال مخالفین کے حملوں اور میری مدافعت کا ہوا۔

ملازمان سرکاری

ہمارے علاقہ میں جو سرکاری ملازم سکونت مستقل رکھتے ہیں یا عارضی طور پر مقیم ہیں یا جو ملازمان گورنمنٹ بتقریب دورہ گاہ گاہ آیا کرتے ہیں یا جن حاکموں سے ہم کو یا ہمارے مختار و وکیل کو مقدمات میں کام پڑتا ہے، اُن سب سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہیں۔ باستثناء زمرۂ پٹواریاں کے، جن کو ہم اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ اس بدقسمت فرقہ کا طریق عمل نہایت ناقص اور قابل اصلاح ہے۔ یہ لوگ نہ صرف اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے میں قاصر رہتے ہیں بلکہ ریاست کو انواع واقسام کے نقصانات پہونچاتے ہیں۔ ٹھیکہ داروں کا گروہ بھی ان سے نالاں ہے اور اہلکاران ریاست کو بھی ان سے بہت شکایتیں ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ وہ وقت قریب آگیا ہے کہ اس فرقہ کی بےاعتدالیاں حکام والا مقام کے سمع مبارک تک پہونچائی جائیں اور حکام کی مداخلت اور توجہ سے اکثر پٹواری اپنے کیفر کردار کو پہنچ کر عامہ خلائق کی عبرت کے باعث اور اپنے ہم پیشہ بھائیوں کے لئے نظیر ہوں۔

آخر میں مکرر آپ صاحبوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ آپ نے آج تشریف لاکر ہمارے دربار کو رونق بخشی ہے۔ بعض صاحبوں کو دور سے آنا پڑا ہے جس کا شکریہ مزید ادا کیا جاتا ہے ہم نے بہت عجلت میں آپ کی مہمانی کا انتظام کیا ہے ممکن ہے کہ ہم سے فروگذاشتیں ہوگئی ہوں، لیکن آپ کی فیاضی سے اُمید ہے کہ آپ ہم کو معذور رکھیں گے۔ میں آپ کو دسہرا کی مبارکباد دیتا ہوں اور حضور رانی صاحبہ کے حق میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اُن کو با اقبال رکھے اور سالہا سال وہ دسہرا کا تیوہار نہایت کامیابی کے ساتھ دیکھا کریں اور ہم لوگ اُن کے سایۂ عاطفت میں نہایت خوشی و خرمی و مرفہ حالی اور خیرخواہی ریاست کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

علمائے اسلام کا شکریہ

نومبر ۱۹۰۸ء میں، مدرسہ مفتی صاحب میں بیرونجات سے بہت سے علمائے دین تشریف لائے اور مختلف موضوعات پر انھوں نے وعظ کہے۔ نہایت لطف کا جلسہ تھا۔ اہل ہنود بھی شریک تھے۔ مشران صاحب بھی مدعو کیے گئے تھے۔ جلسہ کئی روز رہا۔ آخری جلسہ میں احباب کی فرمائش پر مشران صاحب نے تمام ہندو مسلمانوں کی طرف سے علماء کا شکریہ حسب ذیل الفاظ میں ادا کیا۔

حضراتِ علمائے ذوالامجاد اور مسلمانانِ فرخ آباد!

اس وقت میں اپنے احباب کی فرمائش سے، جن میں ہندو مسلم بھائی دونوں شامل ہیں، علمائے دین کا خاص طور پر شکریہ دلی ادا کرتا ہوں جنھوں نے دور و دراز مقامات سے یہاں قدم رنجہ فرماکر اس جلسہ کو رونق بخشی ہے اور ہم کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض فرمایا ہے۔ فرخ آباد کے نہ صرف مسلم بھائی بلکہ ہنود بھی میزبان ہیں اور بیرونجات سے جو حضرات تشریف لائے ہیں وہ ہمارے مہمانان ذیشان ہیں۔

حضرات! یہ علمائے دین جو تشریف رکھتے ہیں مذہبی ہادی ہیں، جو آپ کو خدا پر ایمان رکھنے اور اُس پر مضبوط رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہ اصل میں اُن عالموں کے جانشین ہیں جو عروج اسلام کے وقت دین و دنیا دونوں کے پیشوا تھے، یعنی یہ لوگ آپ کو صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ آپ پر حکومت بھی کرتے تھے۔ یہی قاضی تھے اور یہی مفتی۔ مسلمانوں کو یہ فخر ہمیشہ رہا ہے کہ اُن کے عالموں نے مال و دولت کو کبھی کچھ مال نہیں سمجھا، بلکہ علم اس غرض سے حاصل کیا کہ اپنے دین کو سمجھیں اور اُس پر عمل کرنے کی قوت حاصل کریں۔ علماء کا ایک گروہ کا گروہ ایسا گذرا جو دولتمند نہ تھا۔ ملا شاہ نظام الدین، مُلا کمال، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالحق کو، کب دولت و ثروت حاصل تھی بعض طلبہ نے نہایت افلاس کی حالت میں تحصیل علم کی اور ایک ایک حدیث جاننے کے لیے ہزاروں کوس کا سفر اختیار کیا، بلکہ ایک ایک اعراب کی تحقیق کے واسطے تمام قبائل عرب کے دروازوں پر گئے اور عرب کے بیابانوں کی خاک چھانی۔ میں آپ کی اجازت سے چند بزرگوں کا حال بیان کرونگا جنھوں نے افلاس کی حالت میں تحصیل علم نہایت شوق اور محنت سے کی اور بڑے بڑے سفر اختیار کیے تاکہ آپ کو بھی

اُن کی ریس کرنے کا شوق دامنگیر ہو۔

حافظ الحدیث، حجاج بغدادی نے جب تحصیل علم کے لئے سفر اختیار کیا تو اُن کی ماں نے توشۂ سفر کے طور پر سَو کلچے پکا کر اُن کے حوالہ کیے۔ حجاج نے سالن خود مہیا کر لیا یعنی دریائے دجلہ کا پانی! ایک روٹی روز دجلہ کے پانی میں بھگو کر کھا لیتے تھے اور اُستاد کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر پڑھا کرتے تھے۔ جب روٹیاں ختم ہو گئیں تو افلاس کے باعث چقندر کے پتے کھا کر بسر اوقات کی۔ امام بخاری نے طلب علم میں ایک طویل سفر اختیار کیا اور افلاس نے ایسا مجبور کیا کہ تین روز برابر جنگل کی بوٹیاں کھاتے رہے، مگر اسی ذوقِ علمی کی بدولت امام بخاری کہلائے۔ ان کو سفر موجب ظفر ہوا، جو معمولی آدمیوں کو بصورت سقر دکھائی دیتا ہے ؎

دنیا میں ہے مثل کہ سفر صورت سقر
لیکن ہوا وہ اُن کے لیے موجب ظفر

سچ کہا ہے ؎

سفر مربی مردست و آشیان خطر — سفر خزانہ مال ست و اوستادِ ہنر
بشہر خویش درون بے خطر بود مردم — بہ کان خویش درون بے قدر بود گوہر
درخت اگر متحرک بدے زجائے بجائے — نہ جور ارّہ کشیدے و نے جفائے تبر

ابو حاتم رازی جو فن حدیث کے بڑے عالی مرتبہ امام تھے اپنا حال پُر ملال خود لکھتے ہیں کہ میں زمانہ طالب علمی میں چودہ برس بصرہ میں رہا۔ ایک مرتبہ افلاس کی بدولت کپڑے بھی بیچ کھائے، پھر دو دن بھوکا رہا۔ ایک دوست نے جو اس حال سے واقف ہو گیا تھا اور جس کے پاس صرف ایک اشرفی تھی، اس نے نصف مجھے دیدی۔

شیخ الاسلام ابو العلائے ہمدانی کا حال سنیے۔ اُن کو لوگوں نے بارہا دیکھا کہ مسجد کے چراغ کے نیچے، جو کسی قدر بلندی پر تھا، کھڑے کھڑے کچھ لکھ رہے ہیں۔

حکیم ابو نصر فارابی سے دنیا واقف ہے، جو معلم ثانی کہلایا اور ارسطو کے برابر سمجھا گیا۔ یہ شخص بقول ایک انگریز مورخ کے ہشتر زبانیں جانتا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اس کے افلاس کی یہ حالت تھی کہ چراغ کے لئے تیل نہیں تھا، لہذا پاسبانوں کی قندیلوں سے رات میں کام لیتا تھا۔ آخر میں

جو مرتبہ با یادہ ظاہر ہے۔

ابوالعباس رازی حافظ الحدیث مادرزاد نابینا تھے، مگر اپنے نبیؐ برحق کے اقوال وافعال جاننے کے اس قدر شیفتہ تھے کہ بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر پیادہ پا اختیار کیا۔ جن لوگوں کو خدا نے دو آنکھیں دی ہیں اُن میں سے کتنے ہیں جو ایسی مذہبی دلچسپی رکھتے ہیں۔

صاحبو۔ انتہائی ذوق علمی کی دو ایک مثالیں اور آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ ابوالبرکات جو مشہور و معروف طبیب گذرے، وہ اوائل میں موسوی ملت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے چاہا کہ ابوالحسن طبیب کے حلقہ درس میں داخل ہوں۔ اُن کا یہ عہد تھا کہ مسیح کے منکر کو اپنا شاگرد نہیں بناؤں گا۔ چنانچہ جب ابوالبرکات اُن کے آستانہ پر پہونچے، تو اُنھوں نے پڑھانے سے انکار کر دیا اور وہاں سے ناکام بے نیل مرام واپس آئے۔ گویا زبان حال میں یہ کہہ رہے تھے ؎

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اُن کو ایک تدبیر سوجھی یعنی یہ کہ ابوالحسن کے دربان کی خوشامد کر لی۔ اُس نے دروازہ پر بیٹھنے کی اجازت دیدی جب ابوالحسن شاگردوں کو درس دیتے تھے تو یہ بھی ڈیوڑھی پر بیٹھ کر ان کے درس سے فیض حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ ایک سال کامل دروازہ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ ایک دن، کسی مسئلہ میں، ابوالحسن ایسے اُلجھے کہ وہ عقدہ مالاینحل حل نہ ہوسکا۔ ابوالبرکات اُس کا حل جانتے تھے۔ فوراً دلیری سے اُستاد کے روبرو حاضر ہوکر کہنے لگے کہ اجازت ہوتو میں بھی کچھ اس مسئلہ میں عرض کروں۔ جب اجازت ملی تو اس کو جالینوس کے قول سے حل کر دیا اور کہا کہ حضور ہی نے ایک دن اسی مسئلہ کو اس طرح حل فرمایا تھا۔ ابوالحسن نے حیرت سے پوچھا کہ تم نے میرا بیان کہاں سنا۔ ابوالبرکات نے صورت واقعہ بیان کی۔ اسی وقت اُستاد نے اُن کو اپنے حلقہ درس میں داخل کر لیا، یہ کہہ کر کہ ایسے شیفتہ علم وفن کو علم سے محروم رکھنا حرام ہے۔

ابوبکر بن انبار جو بہت بڑے ادیب گذرے، بغداد میں شہزادوں کے اتالیق تھے۔ ایک دن جب کہ وہ خلیفہ کے ایوان خلافت کی طرف جارہے تھے راستہ میں ایک کنیز کو دیکھا جو بکنے کے لئے نخاس میں آئی تھی اور حسن و جمال میں بےنظیر تھی۔ یہ عالم تھا کہ ؎

بہ ابرو کمان و بہ گیسو کمند　　　　بہ بالا بہ کردار سرو بلند
ہمہ عارضش گل، ہمہ چشم خواب　　　　ہمہ لب پر از مے ببوئے گلاب
دو برگ گلش سوسن مے سرشت　　　　دو شمشاد عنبر فروش از بہشت

یہ اس کو دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ کار منصبی انجام دینا بھی بھول گئے۔ جب وقت معینہ کے بعد ایوان خلافت میں پہونچے تو خلیفہ نے پوچھا کہ آج دیر کا کیا باعث ہوا؟ ابو بکر نے کنیز حور نژاد کا حال بیان کیا۔ خلیفہ نے ابو بکر سے چھپ کر ملازموں کو حکم دیا کہ اُس کنیز کو خرید کر، ابو بکر کے مکان پر پہونچا دو۔ چنانچہ جب ابو بکر گھر واپس آئے تو اُس کنیز کو اپنے یہاں موجود پایا۔ دریافت کرنے پر حقیقت حال معلوم ہو گئی۔ اُس کنیز کو بالاخانہ پر بھیج دیا اور خود ایک علمی مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف ہو گئے مگر حال یہ تھا کہ ع۔　　دل اُس کی طرف نظر کہیں اور
چنانچہ طبیعت بہت مکدر ہوئی اور ملازم سے کہا کہ اس دلفریب عالم کو نخاس میں پہونچا دو میرا دل اس کے مقابلہ میں علم کی طرف زیادہ مائل ہے۔ چنانچہ وہ کنیز نخاس واپس پہونچا دی گئی۔

صاحبو۔ علم و ہنر کچھ نبوت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گئی۔ نہ یہ فلسفہ و حکمت ہے جس کا خاتمہ ارسطو اور فارابی پر سمجھا جائے، بلکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا اکتساب محنت اور جدوجہد سے ہو سکتا ہے ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

حافظ ابو عبد اللہ اصفہانی نے ایک مرتبہ اُن مقامات کے نام بیان کیے، جہاں جہاں وہ حدیث سیکھنے کی غرض سے گئے تھے۔ طوس، نیشاپور، جرجان، سمرقند، بخارا، بلخ، کرمان، ہرات اسی طرح وہ ایکسو بیس[۱] مقامات کے نام لیتے گئے۔

ذرا غور فرمایئے کہ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے ایک سو بیس مقامات گنائے تو ہم سنتے سنتے اکتا جائیں گے اور گھبرا اُٹھیں گے، ہزار آفریں اُس باہمت شخص کو، جو ایک سو بیس مقامات کے سفر کرنے سے نہ اکتایا اور نہ گھبرایا۔ صاحبو اسی طرح سیکڑوں بلکہ ہزاروں عالموں کے حالات ہیں جن کے بیان کرنے کے لئے کئی روز درکار ہیں۔ آخر میں میں آپ حضرات کی تشریف آوری کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تقریر تعزیت

۲۵ / اپریل ۱۹۰۹ء کو پبلک لائبریری فرخ آباد کا ایک جلسہ بمقام لائبریری ہال، اس غرض سے منعقد ہوا کہ آنجہانی رائے بہادر بابو درگا پرشاد کی ناگہانی وفات پر (جنھوں نے بمقام دہرہ دون ہیضہ میں مبتلا رہ کر انتقال فرمایا) رنج و افسوس ظاہر کیا جائے اور اُن کے پسماندگان سے تعزیت کی جائے۔ بشر ان صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل تقریر کی۔

دنیا عجیب مرحلۂ بے ثبات ہے　　ہر ایک ذی حیات کو آخر ممات ہے
یاں چین ایک لحظہ نہ دن ہے نہ رات ہے　　جس کو فنا نہیں ہے وہ بس ایک ذات ہے

خنجر بکف کھڑا ہے وہ جلاد موت کا
بیٹھا ہے سب کی گھات میں صیاد موت کا

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آج ہم لوگ، لائبریری کمیٹی کے ممبر، ہر طبقہ و جماعت کے اشخاص اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ رائے بہادر درگا پرشاد، وائس پریسیڈنٹ لائبریری کمیٹی، کے انتقال پر افسوس ظاہر کریں۔ مرحوم نے دہرہ دون میں قضا کی۔ جس وقت یہ خبر وحشت اثر بذریعہ تار برقی یہاں آئی، تو بجلی کی لہر کی طرح آناً فاناً شہر کے اطراف و جوانب میں دوڑ گئی اور شہر کوچہ و برزن میں لوگ یہ چرچا کرنے لگے کہ شہر کا ایک رکن اعظم کم ہو گیا۔ جس وقت کہ ان کی بیماری کی خبر یہاں پہونچی تھی تو دریافت حال کی غرض سے تاروں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا تھا بلکہ تار بندھ گیا تھا اور ان کے چند خاص احباب عیادت کے لئے فوراً روانہ ہو گئے تھے، جنھوں نے اُن کی علالت میں دوستانہ خدمتیں انجام دے کر دوستی کا آخری فرض ادا کیا۔

کیا بحیثیت ایک رئیس کے اور کیا بطور وائس پریسیڈنٹ پبلک لائبریری اور میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اور کیا باعتبار ایک پرائیوٹ سٹیزن کے، ہمارے مرحوم دوست، ایسا بلند پایہ اور مرتبہ رکھتے تھے، جو اُن کو ہر انجمن اور ہر جماعت میں نہایت ممتاز اور قابل اعزاز ٹھہراتا تھا



رائے بہادر بابو درگا پرشاد

جب سکریٹری صاحب لائبریری کو اس وفات حسرت آیات کی خبر پہونچی، تو ازراہ اعتراف خدمات دفتر لائبریری میں تعطیل کر دی اور اس روز لائبریری کا تمام کام بند رہا۔ اسی طرح آریہ سماج اور میونسپل بورڈ وغیرہ میں، ان کے انتقال کا افسوس کیا گیا۔

گو ہمارے دوست کسی زبان یا کسی علم میں ماہر یا کامل کا درجہ نہیں رکھتے تھے، لیکن مبدٔ فیاض نے اُن کو ایسی عقل سلیم اور طبع مستقیم عطا فرمائی تھی کہ وہ نہ صرف اپنا کاروبار خانگی نہایت خوش انتظامی سے انجام دیتے تھے، بلکہ سرکاری کام بھی ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے تھے جس کا نعم البدل اس شہر میں ان کے بعد موجود نہیں۔ وقت کی قدر اُن کو انگریزوں کی مثل تھی۔ ہر کام کا وقت مقرر تھا اور ایسی خوبی سے تقسیم اوقات کی تھی کہ کوئی کام اپنے وقت کے خلاف نہ ہوتا تھا اور باوجود نہایت کثرت کار کے تفریح کا وقت اور دوستوں سے ملنے جلنے کا وقت بھی نکل آتا تھا۔

اسپیشل مجسٹریٹی کا کام ہمارے دوست نے قابل یادگار انجام دیا۔ بڑے آدمیوں کے دوست دشمن دونوں ہوا ہی کرتے ہیں، اسی طرح رائے بہادر مرحوم کے دشمن بھی ضرور ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ چونتیس برس کے عرصہ میں جبکہ وہ مجسٹریٹ رہے، اُن کے دشمنوں کو بھی اُن کی عدالت سے کام پڑا ہوگا، کوئی بطور مستغیث کے اور کوئی بحیثیت ملزم یا گواہ کے ان کے اجلاس میں آیا ہوگا، لیکن کبھی نہیں سنا گیا کہ اُنھوں نے کسی کے ساتھ عدالتی معاملات میں کوئی زیادتی کی ہو یا اپنے اختیارات مجسٹریٹی کو ناجائز طور پر استعمال کیا ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ جب تک جی چاہا مجسٹریٹی کی اور جب طبیعت اچاٹ ہوئی اُسے چھوڑ دیا اور ثابت کر دیا کہ ایسے بڑے اعزاز سے ہم مستغنی ہیں اور اس کو خود چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ نوبت نہ آنے دی کہ حکام کی طرف سے اشارہ کیا جاتا کہ اب تم سے کام نہیں ہوتا تم کو سبکدوش ہو جانا چاہیے، جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔

ہمارے رائے صاحب بہت عالی ظرف انسان تھے۔ باوجودیکہ خود بااختیار اور ذی اقتدار تھے لیکن کسی معاصر کو عروج حاصل کرتے ہوئے دیکھ کر مثل ابنائے زمانہ کے، رشک و حسد نہ کرتے تھے، بلکہ خوش ہوتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ نہایت سچا اخلاص برتتے تھے۔ اُن کے رنج سے رنج اور اُن کی خوشی سے خوشی ہوتی تھی۔ یہاں میں ایک مثال دوں گا، جس سے دونوں باتیں بخوبی ظاہر ہو جائینگی، یعنی دوستوں کے ساتھ سچا اخلاص اور ہمعصروں کی ترقی و عروج میں خوشی۔

جنوری ۱۸۹۸ء میں جب ہمارے دوست رائے جوالا پرشاد صاحب کو رائے بہادر کا خطاب ملا تو ہمارے دوست مرحوم نے اُن کی مبارکباد کا جلسہ اپنے مکان پر ایسا عالیشان کیا کہ اس شہر میں کبھی ایسا عمدہ جلسہ نظر سے نہیں گذرا۔ اس جلسے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ کی طرف سے مبارکباد کی اسپیچیں دی گئیں۔ ہمارے دوست مرحوم نہایت شوق دلی سے اپنے دوست کا اعزاز بڑھانا چاہتے تھے اور اسی لیے ان کا ایما تھا کہ کوئی فرقہ اور کوئی جماعت ایسی رہ نہ جائے جس کی طرف سے اظہار مسرت و مبارکباد نہ کیا جائے۔ اس کشادہ دلی اور عالی ظرفی کی قدر و منزلت ہمارے دلوں میں اور بڑھ جاتی ہے جبکہ یہ خیال آتا ہے کہ جب ۱۸۹۲ء میں خود ہمارے دوست مرحوم کو رائے بہادر کا خطاب ملا تھا، اُس وقت اُن کے معاصرین میں سے کسی نے خوشی و مبارکباد کا جلسہ نہ کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ صحیح وجہ اس کی کیا تھی، لیکن میرا خیال بمنزلہ علم الیقین ہے کہ ایک تو اُس وقت ایسے جلسہ کرنے کی رسم کم تھی، دوسرے یہ کہ اُس وقت جو ہمارے دوست مرحوم کے نامور ہمعصر تھے وہ اس قدر فیاض طبع اور کشادہ دل نہ تھے، جیسے کہ ہمارے رائے بہادر مغفور تھے حالانکہ اُس وقت عوام الناس کو ایسی ہی مسرت ہوئی تھی جیسی کہ رائے بہادر جوالا پرشاد صاحب کے جلسۂ مبارکباد کے وقت۔ ایسی صورت میں ایک معمولی آدمی قدرتی طور پر یہ خیال کرتا کہ جب میرے لیے کسی دوست نے جلسہ نہ کیا تو میں کسی دوست کے لئے جلسہ کیوں کروں اور عوام کی نظر میں اس کا وقار اپنے مقابلہ میں کیوں زیادہ بڑھا دوں؟ لیکن حاشا کہ ہمارے دوست مرحوم میں یہ تنگ دلی و تنگ ظرفی ہو۔ انھوں نے نہایت اخلاص اور شوق باطنی سے اپنے دوست رائے بہادر جوالا پرشاد صاحب کے لیے مبارکباد کا جلسہ منعقد کر کے اپنی عالی ظرفی اور دریا دلی کی بےمثل نظیر اس شہر میں قائم کر دی۔

ہماری لائبریری بھی رائے بہادر مرحوم کی مہربانیوں کی ممنون ہے اور ہماری کمیٹی ان کی موت پر بہت افسوس کرتی ہے۔ جب کبھی اُردو یا فارسی کی کتابیں لائبریری کے لئے خریدنے کی ضرورت ہوئی، تو ہمارے دوست نے مطبع نولکشور سے نصف قیمت پر اپنے ذریعہ سے اُن کو منگا دیا جس سے لائبریری کو فائدہ پہونچا اور کبھی کبھی خود اپنے کتب خانہ میں سے کتابیں لائبریری کو عطا فرما دیں۔

حضرات! ہمارے دوست میں اور بھی اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ تھے۔ مثلاً یہ کہ جھوٹ پسند نہ کرتے تھے، مبالغہ اُن کی گفتگو میں کم ہوتا تھا، پابند وضع تھے، شہر میں سیکڑوں آدمیوں سے

اُن کی رسم تھی اور جس کے ساتھ جو برتاؤ تھا، اس میں کبھی کمی نہیں آنے دیتے تھے اور اس رسم کے خلاف برتاؤ نہ کرتے تھے۔ سستی اور بیکاری کو کبھی پسند نہ کرتے تھے، اُن کے مزاج اور لباس میں نہایت سادگی ہمیشہ دیکھی گئی اور جو شروع سے دیکھی گئی وہ مرتے دم تک بدستور دیکھنے میں آئی۔ شہر میں کوئی جلسہ جو عامہ رعایا سے متعلق ہو، جب کبھی کیا جاتا تھا، تو راے صاحب ضرور بشوق دلی اس میں شریک ہوتے تھے۔ خواہ وہ جلسہ لائبریری کا ہو یا میونسپل بورڈ کا یا ڈسٹرکٹ بورڈ کا۔ یہی وجہ ہے کہ خاص و عام کو اُن کی وفات کا افسوس ہے۔

صاحبان والا شان۔ حیات و ممات دونوں، اُس واجب الوجود کے ہاتھ میں ہیں جس کی مشیت میں ہم کو چون و چرا کی مجال نہیں۔ پس موت و زیست دونوں میں سے کسی پر بھی ہم اختیار و قابو رکھیں، محض محال بلکہ لاطائل خیال ہے ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

صد افسوس کہ یہ دنیائے فانی گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔ اس کا بخیر انجام نہیں اور سوائے ذات باری تعالےٰ کے کسی کو قیام علی الدوام نہیں۔ پس انسان کو چاہیے کہ اُسی سے لو لگائے اور مکروہات دنیا سے، جو بظاہر دلکش و دلفریب ہیں، دل ہٹائے ؎

جہاں اے برادر نماند بکس
دل اندر جہاں آفریں بند و بس

حضرات! چونکہ ہمارے دوست کی ناگہانی وفات سے اُن کے خاندان کو صدمہ عظیم پہونچا ہے، لہذا بمنشاء ہمدردی، تعزیت کا رزولیوشن آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جو آپ کی منظوری کے بعد راے بہادر مغفور کے عزیزوں کے پاس بھیجا جائے گا، تاکہ اُن کو اپنے رنج و الم میں کسی قدر تسکین و تشفی ہو۔

ایڈورڈ ہفتم کی وفات

ماہ مئی سنہ ۱۹۱۰ء میں، قیصر ہند ایڈورڈ ہفتم کی وفات حسرت آیات پر ایک جلسہ ماتمی بمقام ٹاؤن ہال، زیر صدارت کلکٹر ضلع منعقد کیا گیا جس میں متعدد ماتمی تقریروں کے بعد شران صاحب نے حسب ذیل تقریر کی۔

یہ کیا الم ہے کہ ہے چاک چاک جیب سحر — یہ کیا الم ہے کہ خورشید ہے برہنہ سر
سیاہ پوش ہوا ہے الم سے چرخ کبود — بزنگ داغ دل ماہ ہے ہر ایک اختر
دفور غم سے تعجب نہیں، اگر مریخ — اب اپنے قتل کو مانگے ہلال سے خنجر
بنا ہے چاند کا ہالہ بھی حلقۂ ماتم — ہے برج آبی گردوں بشکل دیدۂ تر

دفور آتش غم سے ہر ایک دل ہے تنور
ہے آفتاب قیامت ہر ایک داغ جگر

میر مجلس اور حاضرین جلسہ!

ہمارے شہنشاہ قیصر ہند ایڈورڈ ہفتم کا انتقال پر ملال ناگہاں اور بے وقت ہوا اور اس حادثہ پر جس قدر صدمہ تمام رعایائے جاں نثار کو ہونا چاہیے تھا اُس سے بہت زیادہ ہوا۔ برہما سے بلوچستان تک اور کشمیر سے راس کماری تک ایک سی صدائے واحسرتا بلند ہے، بلکہ اطراف دنیا اور اکناف عالم میں جہاں جہاں رعایائے برطانیہ ہے، سب جگہ ہمارے شہنشاہ ہر دلعزیز کی ماتمداری اور سوگواری کی جا رہی ہے۔ گو اُن کی روح پاک عرصہ ہوا خدا کے جوار رحمت میں جا چکی ہے، مگر جسد مبارک آج سپرد خاک کیا گیا ہے۔ جس وقت مرحوم کے طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، ماتمی گھنٹے کی گونج نے تمام شہر لندن میں ایک قیامت برپا کر دی اور ہر شخص اس سانحۂ عظیم سے آگاہ ہو کر گھبرا گیا اور تار برقی نے چشم زدن میں، تمام پرانی اور نئی دنیا کو خبر کر دی کہ سب سے بڑا شہنشاہ روئے زمین، جس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جو رعایا کی دلی محبت اور سچے شکریہ کا مستحق تھا، دنیا سے اُٹھ گیا اور اپنا نام نیک مثل نوشیروان عادل کے ہمیشہ کے لئے

زندہ چھوڑ گیا۔ اس وقت تمام دنیا کے سلاطین اور رعایا کی طرف سے تعزیت اور ہمدردی کے تار لگا تار آنے لگے۔

آج ہمارے بادشاہ کے جنازہ کے ساتھ بیں شہزادے اور تاجدار بادشاہ ہیں اور امراؤ عوام کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ یہ شان و شکوہ کا نظارہ، اصل میں نہایت عبرت خیز ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجل شہنشاہِ روئے زمین کو بھی نہیں چھوڑتی۔ اگر ایک سلطنت بھی ایک لمحہ زندگی کے معاوضہ میں دیدی جائے تب بھی اجل مہلت نہ دے گی سچ کہا ہے ؎

سکندر کہ بر عالمے حکم داشت　　دراں دم کہ بگذشت و عالم گذاشت
میسّر نبودش کزو عالمے　　ستانند و فرصت دہندش دمے

ایک اردو شاعر (شمیم امروہوی) نے موت سے نجات نہ ملنے کے مضمون کو کس خوبی سے منطقیانہ انداز میں نظم کیا ہے ؎

ممکن نہیں انساں کو مفر مرگ وقضا سے　　موت آئے تو ٹلتی ہے دوا سے نہ دعا سے
بچتے جو دوا سے تو امیر ایک نہ مرتا　　جیتے جو دعا سے تو فقیر ایک نہ مرتا

میں اپنی تقریر کی ابتدا میں عرض کرچکا ہوں کہ یہ موت ناگہاں اور بے وقت ہوئی۔ ناگہاں یوں ہوئی کہ ہم کو ۷ رمئی کے اخبار پانیر سے جو حالات علالت معلوم ہوئے، کچھ زیادہ اندیشناک نہ تھے۔ دوسرے دن یکایک موت کی خبر وحشت اثر آئی جس کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ پہلے روز جب کہ ہم شہنشاہ کی بیماری کی خبر پڑھ رہے تھے، وہ چار پہر پہلے مرچکے تھے۔ اُن کے گلے میں ورم آگیا تھا اور مقام بیرٹز میں، سفر کر رہے تھے کہ وہاں کی سردی نے یہ نقصان پہونچایا۔ ہم کو اخباروں سے واضح ہوا کہ ایک مہینہ سے کم وبیش شکایت بادشاہ کو تھی، گو کہ درمیان میں چند دن کے لئے رفع بھی ہوگئی تھی۔ یہ خبر علالت عوام سے چھپائی گئی، کیونکہ سیاسی حالت جو اس وقت ہے، وہ اسی کی مقتضی تھی۔ باوجود سخت تکلیف کے ہمارے بادشاہ کو جب افاقہ ہوتا تھا تو وہ فوراً اپنے سکریٹری سے کام پیش کرنے کے واسطے اصرار فرماتے تھے، یہاں تک کہ سلطنت کا کام ہی کرتے کرتے مرگئے۔ "بے وقت وفات" کا جملہ ایک طور پر معمولی ہوا کرتا ہے۔ مگر نہیں۔ ہمارے شہنشاہ کی وفات اس وقت ضرور بے وقت ہوئی۔ یہ ہم ہی نہیں کہتے بلکہ تمام برطانیہ یہی کہتا ہے۔ آج کل برطانوی دارالعوام

(ہاؤس آف کامنز) اور دارالامرا (ہاؤس آف لارڈس) میں نزاع ہے اور یہ گتھی پڑی ہوئی ہے، جس کو مرحوم اپنے ناخن تدبیر سے سلجھا سکتے تھے۔ یہ جھگڑے کئی مہینے سے چلے آتے ہیں۔ مرحوم نے کئی بار وزرا کو بلا بلا کر، اس بارے میں ہدایتیں فرمائیں، گویا کہ پنچ بن کر انھوں نے یہ قضیہ ختم کرنا چاہا۔ یہی وجہ ہے کہ عامہ رعایا کے ہر طبقہ کے لوگ اُن سے دلی محبت رکھتے ہیں۔

تھوڑا عرصہ ہوا جبکہ ہمارے بادشاہ مرحوم ولیعہد تھے، سلطنت روس اور سلطنت برطانیہ کے تعلقات میں زیادہ کشیدگی آ گئی تھی، یہاں تک کہ لڑائی کا اندیشہ تھا۔ دونوں سلطنتوں کے وزرائے خارجہ باہم نامہ و پیام کر رہے تھے، مگر گیسوئے اتحاد کچھ اس طرح بکھر گئے تھے کہ کسی کے شانۂ تدبیر سے جن کا سلجھنا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ بالآخر ہماری ملکہ مرحومہ نے پرنس آف ویلز (یعنی شہنشاہ مرحوم) کو زار روس کی ملاقات کے لیے بھیجا اور موصوف نے چند گفت وشنید کے بعد اپنے حسن تدبیر سے یہ عقدہ لاینحل حل کر دیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ انگلستان واپس آئے۔ اُس وقت کے اخبار میں نے پڑھے۔ لکھا تھا کہ جو کام محکمہ خارجہ نے بہت دنوں میں طے نہیں کیا، وہ پرنس نے ذرا دیر کی ملاقات میں بخیر و خوبی انجام دیدیا۔ اسی طرح فرانس، جو انگلستان کا بہت پرانا دشمن تھا، ہمارے بادشاہ مرحوم کے وقت میں اُس سے غایت درجہ دوستی رہی۔ چند مرتبہ ہمارے بادشاہ وہاں کے پریسیڈنٹ سے ملے اور چند مرتبہ فرانس کے پریسیڈنٹ انگلستان آئے۔ اس کے علاوہ جتنے سرحدی اور ملکی مناقشے فرانس اور برطانیہ کے مابین مدتوں سے چلے آتے تھے، وہ سب دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ نے باہم مصالحت کے ساتھ ہمیشہ کے واسطے طے کر لیے۔ جن جن زمینوں پر برطانیہ کو دعویٰ تھا اور وہ فرانس کے زیادہ بکار آمد نہ تھیں، وہ فرانس نے برطانیہ کو دیدیں اور اسی طرح جو قطعاتِ ارضی انگلستان کے زیادہ بکار آمد نہ تھے اور فرانس اُن پر دعوے کرتا تھا، وہ فرانس کو برطانیہ نے دیدیے اور اس طرح سیکڑوں برس کی عداوت ہمیشہ کی محبت کے ساتھ بدل گئی۔ اسی طرح ملک آئرلینڈ جو خود برطانیہ اعظم کا جزو لاینفک ہے مدتوں سے ناراض چلا آتا ہے، لیکن شہنشاہ مرحوم نے اس کی بھی ایسی تالیف قلوب کی کہ اُس ملک کی رعایا کو بھی اس موقع پر نہایت افسوس ہوا۔ جس جس ملک سے کسی قسم کی رنجش یا عداوت تھی، وہ سب ہمارے بادشاہ کے برتاؤ سے محبت و ارتباط کے ساتھ بدل گئی۔

ہمارے شہنشاہ مرحوم نے اس طریقہ کو زیادہ رواج دیا کہ تاجداران یورپ سے زیادہ ربطہ اتحاد

بذریعہ ذاتی ملاقات کے بڑھایا جائے اور اس غرض سے آنجہانی نے بار ہا یورپ کا سفر کیا اور شاہان روس و آسٹریا و اٹلی و جرمنی وغیرہ سے بارہا ملاقاتیں کیں۔ اس طرز عمل سے نہ صرف یورپ میں امن و امان رہی، بلکہ تمام دنیا کی فلاح و بہبود پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے شہنشاہ معظم یورپ کے پیس میکر یعنی صلح کن کہلاتے تھے۔ موجودہ شہنشاہ روس کے باپ نے جو صلح کے شہزادے کہلاتے تھے، چاہا کہ یورپ کے پیس میکر کہلائیں، مگر کاتب تقدیر نے یہ لقب مبارک ہمارے شہنشاہ کے مقدر میں لکھا تھا۔

انگلستان کے آئین حکومت کا ایک پرانا اصول ہے کہ "بادشاہ وقت ہر قسم کی غلطی یا قصور سے منزہ ہے"۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بادشاہ معصوم اور بےگناہ ہوتا ہے اور اس سے غلطی سرزد ہونے کا امکان نہیں، مگر اصل مفہوم اس جملے کا یہ ہے، جو کہ آئین حکومت نے مراد لیا ہے کہ بادشاہ کے اختیارات اس قدر محدود ہوتے ہیں اور وزرا کے اختیارات اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ اگر کوئی غلطی یا قصور انتظام سلطنت میں ہو جائے تو مشیران سلطنت کی طرف منسوب ہوگا، نہ کہ بادشاہ کی طرف۔ لیکن ہمارے بادشاہ مرحوم کی بےعیب زندگی پر نظر ڈالتے وقت اگر اس جملے کے پہلے معنی بھی مراد لے لیے جائیں، جب بھی وہ مرحوم پر صادق آتے ہیں اور یہ آپ کا امتیازی وصف ہے، جو تاریخ عالم میں بہت کم سلاطین کو نصیب ہوا۔

ہمارے بادشاہ مرحوم نے اپنی تخت نشینی کے وقت جو فرمان جاری فرمایا تھا، اس کے خاص خاص جملے آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، جن کو فرمان مذکور کی روح کہنا چاہیے۔ ان سے مرحوم کی رعایا پروری کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ محتشم الیہ فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے اپنے فرمان عظیم الشان میں اہل ہند سے وعدہ کیا تھا کہ "ہندوستان کے کارخانوں کو تقویت پہنچائی جائے گی اور جو کام رفاہ عام کے ہیں اُن کو ترقی دی جائے گی اور تمام رعایائے ہند کے فائدے مدنظر رکھے جائیں گے"۔ مرحومہ کے اس فرمان میں جو تجاویز منضبط ہیں اور اُن پر عملدرآمد اس غرض سے ہوا ہے کہ آپ کی آسائش اور مرفہ حالی میں ترقی ہو، وہ تجویزیں ایسے اعلیٰ پیمانہ پر اور ایسی جرأت و ہمت کے ساتھ عمل میں لائی گئی ہیں کہ اُن کی نظیر پائی نہیں جاتی۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "ہندوستان کی رفاہ و فلاح ملکہ معظمہ مرحومہ کو دل سے نہایت درجہ عزیز تھی۔ ہم بھی

اسی پر عامل ہیں چنانچہ ۱۸۷۵ء سے جب کہ ہم نے بحیثیت پرنس آف ویلز ہندوستان کا دورہ کیا تھا ہم کو ہندوستان کے والیان ریاست اور عامہ رعایا کی بہبود ایسے دلی اخلاص کے ساتھ مدنظر رہی ہے کہ اس میں امتداد زمانہ کے باعث کمی نہیں آسکتی۔ ہمارا فرزند شہزادہ ویلز (جو اس وقت جارج پنجم ہیں) مع شہزادی ویلز کے، ہندوستان کی سیاحت سے واپس آیا ہے اور اس کا دل ملک ہند اور اس کی رعایا کے فائدوں کی طرف سچے اخلاص کے ساتھ مائل ہے۔ ہمارا خاندان شاہی، اہل ہند کے حق میں جو ہمدردی کے خیالات رکھتا ہے، وہ تمام اہل برطانیہ کے متفقہ ارادے اور نیت اور ہمدردی کا پرتو ہیں۔"

مرحوم کی ہر دلعزیزی اور دلجوئی کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ فرنچ اور روس جو کہ کچھ دن پہلے برطانیہ کے دشمن تھے، ان کو محتشم الیہ نے اپنے مخلصانہ برتاؤ سے ایسا اپنا لیا کہ آج ان کی وفات کے بعد فرنچ قوم بہت افسوس کے ساتھ کہتی ہے کہ:۔

"فرنچ کا سب سے بڑا دوست اور بہی خواہ مر گیا۔"

اسی طرح جس وقت زار روس کے روبرو وہ کاغذ دستخط کے واسطے پیش کیا گیا جس میں مرحوم کی ماتمداری کی میعاد ۳۰ یوم قرار دی گئی تھی، تو زار روس نے الفاظ "۳۰ یوم" قلمزد کر دیے اور بجائے ان کے الفاظ "تین ماہ" لکھ دیے، جو روس کے دستور کے مطابق صرف سلاطین روس یا سلطان کے کسی عزیز خاص کے سوگ کی میعاد مانی جاتی ہے۔

حضرات! ایسے مجموعۂ خوبی اور دلدادۂ محبوبی فرمانروا کا غم، وہ غم نہیں جس میں قدرشناس رعایا آسانی کے ساتھ صبر کر لے، مگر سوائے صبر کے چارہ ہی کیا ہے۔ یہی سوچ کر دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ دنیا آنی جانی ہے، ایک آتا ہے تو ایک جاتا ہے موت کی دستبرد سے نہ بادشاہ بچتے ہیں نہ فقیر۔

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمد مرسل نہ رہے، کون رہے گا

ایمبولینس ایسوسی ایشن پر ایک نظر

۱۰ر اگست سنہ ۱۹۱۱ء کو ایک جلسہ عام بمقام ٹون ہال فرخ آباد زیر صدارت مسٹر میک نیر کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع اس غرض سے کیا گیا کہ سنٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن کی ایک شاخ اس شہر میں قائم کی جائے مشر ان صاحب کچھ عرصہ پیشتر سے حسب تحریک تحصیلدار صدر تحصیل مولوی محمد وزیر خاں صاحب اور نیز حسب ایمائے کلکٹر صاحب اس ایسوسی ایشن کے حالات سے واقفیت حاصل کر رہے تھے، بالآخر اس جلسہ میں (جب کہ ایسوسی ایشن قائم ہو گیا) مشر ان صاحب نے حسب تحریک کلکٹر صاحب (صدر انجمن) حسب ذیل تقریر کی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آج ہم سب لوگ ہر قوم و ملت اور ہر گروہ اور زمرہ کے قائم مقام ایک بڑے مبارک کام کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اس ضلع میں سنٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن کی ایک شاخ قائم کریں جس طرح اس ملک کے اکثر اضلاع میں وہ قائم ہو چکی ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسی جماعت قائم کریں جو زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کی تیمارداری اور ناگہانی چوٹ کھائے ہوؤں اور پانی میں ڈوبے ہوؤں کا علاج ایسے موقعوں پر کر سکے جہاں حکیموں اور ڈاکٹروں کی مدد جلد یا کافی طور پر بہم نہیں پہونچ سکتی ہے۔ ہم یہ بات چاہتے ہیں کہ ایسے سہل طریقوں سے نرسنگ (Nursing) یعنی بیماروں کی تیمارداری کے بکار آمد اصول سکھائیں کہ سیکھنے والے بہت تھوڑے عرصہ میں اور بہت تھوڑی محنت سے اپنے خاندان کے لئے اپنے پڑوسیوں، محلہ والوں، دوستوں اور نیز عام لوگوں کے لئے نہایت بکار آمد ہو سکیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ بلا خیال ذات، مذہب، قوم یا جنس کے اُن بیچارے زخمیوں کو مدد پہونچائیں جو لڑائی کے میدان میں گھائل ہوتے ہیں اور جن کو جنگ کی کشمکش میں ہماری گورنمنٹ اپنے تنخواہ دار عملہ اور ہمراہی شفاخانوں سے پوری مدد نہیں پہونچا سکتی ہے۔

صاحبو۔ اب میں آپ کی خدمت میں بیان کروں گا کہ یہ ایمبولینس ایسوسی ایشن کیا چیز ہے اور اس کا کیا تعلق ہماری گورنمنٹ کے ساتھ ہے اور اس سے کیا غرض اور کیا مطلب ہے، اور نیز یہ کہ ایمبولینس

کی تعلیم کن طریقوں سے دیجاتی ہے ۔

(۱) ایمبولینس کی تاریخ

سنٹ جان کا طبقہ تو آٹھ سو برس سے چلا آتا ہے یعنی زمانہ متوسط سے جب کہ یورپ کے بادشاہوں نے فلسطین پر چڑھائی کی تھی ۔ اُس وقت سے اس کام کی ابتدا پڑی ہے کہ لڑائی کے وقت یا امن وامان کی حالت میں زخمیوں اور بیماروں کی مدد کی جائے ۔ اس طبقہ کے لوگوں میں تین وصف ہوتے ہیں یعنی سپاہی ، پوجاری اور طبیب ۔ یہ طبقہ پہلے یروشلم میں قائم ہوا تھا پھر انگلستان میں قائم ہوگیا اور برطانیہ اعظم اور آئرلینڈ میں اس کو بہت زور پہونچا جب یہ طبقہ یروشلم میں تھا اُس وقت یورپ کے اکثر بادشاہوں نے اس کی مدد روپیہ سے کی اور بڑے بڑے امیر لوگ اس جماعت میں داخل ہوے ۔ بادشاہ ہنری ہشتم اور ملکہ ایلی زبتھ کے عہد میں اس طبقہ کا فروغ جاتا رہا لیکن ۱۸۳۱ء میں پھر یہ طبقہ از سر نو تازہ کیا گیا ۔ یہ تو فقط طبقہ سینٹ جان کا ذکر کیا گیا ۔ اب سینٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن کا حال سنیے ۔

۱۸۵۹ء میں جب کہ فرانس اور آسٹریا میں (اٹلی کے پیچھے) لڑائی ہوئی تو سوئزرلینڈ کا ایک شخص لڑائی کے میدان میں اتفاقیہ پھنس گیا اُس نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک لڑائی میں چودہ ہزار آدمی دونوں طرف سے مارے گئے اور دوسری لڑائی میں ... ۳۸ اڑتیس ہزار آدمی کھیت رہے ۔ اُس نے یہ دیکھا کہ باوجودیکہ ایسی زبردست اور شایستہ سلطنتیں بڑے بڑے شفاخانوں کے ذریعہ انتظام معقول کرتی تھیں تاہم اُن زخمیوں کی نگہداشت اور اُن کا علاج اور زخمیوں کی امداد قابل اطمینان نہ تھی ۔ نہ تو ڈاکٹر کافی تھے نہ اوزار نہ ڈولیاں وغیرہ نہ خوراک ، نہ پانی کا انتظام معقول تھا ۔ ہزاروں زخمی تڑپ رہے تھے اور آہ وزاری کر رہے تھے ۔ ہزاروں لاشیں بے گور وکفن طعمۂ زاغ وزغن ہورہی تھیں ۔ اُس بندہ خدا کو بہت رحم آیا اور اُس کی کوشش سے یورپ میں ریڈ کراس Red Cross سوسائٹیاں قائم ہوگئیں ۔ جب کہ ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی میں لڑائی ہوئی تو اُس وقت سینٹ جان کے طبقہ کے بہت اشخاص Red Cross Societies میں مل کر دونوں طرف کے زخمیوں کو مدد دینے لگے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۷ء میں سینٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن کا ظہور ہوا اور یہ جماعت عالم وجود

میں آگئی — ہندوستان میں اس کام کی چھیڑ چھاڑ ۱۸۸۸ء میں بذریعہ سرجن جنرل مین لی (Manley) کے ہوئی اور بمبئی مرکز قرار پایا۔ پھر مقام بنگلور میں اُسی وقت میں ایک سنٹر (Centre) قائم ہوا لیکن مستقل بنیاد پر اس ایسوسی ایشن کا قائم ہونا ۱۹۱۰ء میں ظہور میں آیا جب کہ لفٹننٹ کرنل C. J. yate نے، جو ہندوستان کے Organizing Commissioner مقرر ہوئے تھے اس ایسوسی ایشن کو پھیلانے اور قائم کرنے کی تجویزیں گورنمنٹ ہند کی خدمت میں پیش کر کے انڈیا آفس سے منظوری حاصل کی۔ کرنل yate نے نو برس کے عرصہ میں ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس ایسوسی ایشن کے مرکز قائم کر دیے جو بہت اچھی طرح چل رہے ہیں اور ہندوستان میں بلا لحاظ ملت و مذہب و قومیت وغیرہ کے نہایت اچھے کام انسانی ہمدردی کے کر رہے ہیں اور ولایت میں یہ ایسوسی ایشن ۳۰ برس سے بہت ترقی کر رہا ہے جب سے کہ ملکہ معظمہ مرحومہ نے اور اُن کے بعد ایڈورڈ ہفتم جنت آشیاں نے اس کی سرپرستی کی۔ حضرت جارج پنجم اس رحمدلی اور ہمدردی کے کام کو اپنی سلطنت کے ہر گوشہ میں جاری کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) ایمبولینس ایسوسی ایشن کے ساتھ جو تعلقات گورنمنٹ اور بادشاہ وقت کے ہیں اُن کا بیان

۱۸۸۸ء میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ نے، فرمان شاہی جاری کر کے اس ایسوسی ایشن کو قائم کر دیا۔ ہماری موجودہ شہنشاہ بیگم نے مع چند عزیزان خاندان کے ایمبولینس کے امتحان پاس کیے ہیں اور تکلیف زدہ اور مصیبت زدہ بندگان خدا کے ساتھ ہمدردی کی غرض سے اس ایسوسی ایشن کے کام میں بڑا ذوق رکھتی ہیں۔ ہمارے شہنشاہ مرحوم ایڈورڈ ہفتم اس طبقہ کے مربی تھے اور ہمارے شہنشاہ جارج پنجم اُس وقت جب کہ شہزادہ ویلز تھے اس طبقہ عالیہ کے گرانڈ پرائر Grand Prior تھے اور اب بعد وفات ایڈورڈ ہفتم کے اس کے مربی ہوئے۔ تمام خاندان شاہی اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر ایسا فخر کرتا ہے کہ جب اپنی تصویر کھنچواتے ہیں تو اکثر سنٹ جان کے تمغے پہن کر کھچواتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ ہماری ملکہ معظمہ کس قدر رحم دل اور رعایا پرور ہیں کہ خود تکلیف اٹھا کر اس ایسوسی ایشن کے امتحانات پاس کیے اور اسی طرح شہنشاہ قیصر ہند بھی جو اس جماعت کے مربی ہیں۔

ہندوستان میں حضور ویسرائے صاحب بہادر اس جماعت کے پریسیڈنٹ ہیں اور اس جماعت کا

مرکز جو ہندوستان میں ہے اس کی مربی (دیسرائے کی بیگم) کونٹس آف منٹو Countess of Minto ہیں اور کمیٹی کے چیرمین حضور کمانڈر انچیف بہادر ہیں اور ہمارے صوبہ اور صوبہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر بہادر اس کے نائب میر مجلس ہیں اور مہاراجگان میسور، گوالیار، جے پور، بڑودہ بھی نائب میر مجلس ہیں۔ اسی طرح ملکی اور فوجی ڈاکٹروں کی جماعت اور تمام حکام والامقام اور بڑے بڑے تعلقہ دار، نواب اور مہاراجہ اور روساء عظام اس کے ممبر اور حامی و مددگار ہیں۔

(۳) اغراض و مقاصد تعلیم ایمبولینس

انسان کی زندگی میں دو واقعے ایسے ہوتے ہیں جن کا حال کبھی پہلے سے معلوم نہیں ہوتا، لیکن پیش آنے پر فوراً مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو حادثے جیسے سانپ کا کاٹنا، جل جانا، چوٹ کھانا، زخم لگ جانا، پانی میں ڈوبنا۔ دوسرے یکایک بیمار ہو جانا جیسے کسی درد کا اٹھنا، مرگی آنا غشی ہونا وغیرہ۔ اگر ایسے وقت کے لئے پہلے سے انتظام نہ رکھا جائے تو جب تک ڈاکٹر آئے آئے تب تک مریض کو سخت تکلیف ہوگی اور بعض حالتوں میں وہ مر بھی جائے گا۔ وہ پہلے سے انتظام کرنا کیا ہے؟ ایمبولینس کی تعلیم لوگوں کو دینا۔ یہ لوگ ایسے موقعوں پر کام دے سکتے ہیں جہاں کہ ڈاکٹروں کی مدد کافی طور پر یا جلد بہم نہیں پہونچ سکتی ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ اس تعلیم کے ذریعہ طالب علم کو ڈاکٹر یا نرس بنایا جائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یا ڈاکٹروں کا رقیب یا مقابل کا فرقہ پیدا کیا جائے نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹروں کو ان کے کام میں مدد پہونچانے کے واسطے ایک جماعت قائم کی جائے۔ مثال کے طور پر چند صورتیں بتائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ اچھے سے اچھے اوزار اپنے کام کے وقت استعمال کرے لیکن ایمبولینس کی تعلیم پایا ہوا یہ کرے کہ نکٹائی یا رومال جو اس کے پاس ہے اس کو پٹی کی طرح استعمال کر سکے یا پگڑی یا پیٹی کو لپیٹنے کے لئے کام میں لائے یا کسی چھتری یا تکیہ یا لپیٹے ہوئے اخبار کو بطور کھپچی کے کام میں لا سکے، یا دو لاٹھیوں اور دو کوٹوں سے ایک چارپائی بنائے تاکہ مریض کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچا سکے۔ غرضکہ جو چیز اس کے پاس اتفاقیہ اس وقت موجود ہو اسی کو فوراً کام میں لا سکے۔ آج کل موٹر کار کی سواری سے شہروں میں عام طور سے چوٹ لگنا معمولی بات ہے۔ ایسے موقعوں پر ایمبولینس کے طالب علم کو ایک خاص

قسم کا دباؤ ڈالنا سکھایا جاتا ہے جس سے فوراً فائدہ پہونچے اور جان بچ جائے۔ اکثر معمولی زخموں میں ناواقف لوگ مکڑی کا جالا لگا دیتے ہیں جس سے خون میں زہر پھیل جاتا ہے۔ اس ایسوسی ایشن کا طالبعلم ڈریسنگ کر سکے زخم اچھا کرلے گا۔ اسی طرح مرگی یا غشی کی حالت میں یا ڈوبنے میں جو پانی بھر جاتا ہے ان صورتوں میں ایمبولینس کا طالب علم بہت بکار آمد ہوگا۔ پولیس والوں کو اور ریل کے ملازموں کو یہ تعلیم بہت مفید ہے کیونکہ ان لوگوں کو بیماروں اور مضروبوں اور زخمیوں سے روز کام پڑتا ہے۔ اسی طرح یہ تعلیم اُن لوگوں کو مفید ہے جن کا کام کسی قسم کے خطرہ سے تعلق رکھتا ہے مثلاً مل والے یا فیکٹری والے۔ خلاصہ یہ کہ سینٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن سے جو غرض اور مطلب ہیں وہ حسب ذیل پانچ ہیں۔

(۱) حادثوں اور ناگہانی بیماریوں کی حالت میں ابتدائی مدد پہونچانا لوگوں کو سکھایا جائے اور نیز یہ کہ بیماروں اور زخمیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کیونکر پہونچایا جائے۔

(۲) لوگوں کو تعلیم دے کر تیمارداری کے ابتدائی اصول اور ان کا عمل درآمد سکھایا جائے اور نیز یہ کہ مکانوں کی صفائی اور اُن میں ہوا کے آنے کا انتظام کیونکر کیا جائے خصوصاً بیماروں کے کمرہ میں۔

(۳) ایمبولینس کا سامان بنانا اور بذریعہ فروخت یا ہدیہ کے اُس کو جابجا پہونچانا اور کانوں اور کارخانوں اور تجارت کے موقعوں پر ایمبولینس کے سامان کی دوکانیں اور ذخیرے قائم کرنا۔

(۴) ایسی فوجی جماعتیں بنانا جو ایسوسی ایشن کی گاڑیاں چلائیں، اپاہجوں اور زخمیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائیں اور بیماروں کی تیمارداری کریں۔

(۵) ایمبولینس کی تعلیم کو عام طور پر ترقی دینا اور اُس کی اشاعت کرنا اور بیماروں اور زخمیوں کو بلالحاظ قوم ملت مذہب کے مدد اور آرام پہونچانا۔

(۴) ایمبولینس کی تعلیم کے طریقوں کا بیان

پانچ کورس تعلیمی ہیں۔ ایک کورس جو ابتدائی ہے وہ اُن لڑکوں کے لئے ہے جن کی عمر سولہ برس سے کم ہے یا جو ناخواندہ آدمی ہیں۔ ہر کورس پر سوائے ہوم ہائجین Home Hygiene کے سوا پانچ لکچر ہوں گے اور دو دو گھنٹے کا ایک لکچر ہوگا اور لکچر ہفتہ وار ہوں گے۔ منجملہ پانچ لکچروں کے

چار میں حاضری طالب علم کی ضروری ہے اور دس لکچروں میں سے آٹھ میں حاضری درکار ہے۔ آخری گھنٹہ میں اس قسم کے کام سکھائے جائیں گے کہ پٹی کس طرح باندھی جائے اور پچکی کا استعمال کیونکر کیا جائے خون کا بند کرنا، پولٹس کا بنانا، مریض کو چارپائی سے اٹھانا وغیرہ۔ امتحان میں تحریری جواب ہوں گے اور زبانی بھی سوال کیے جائیں گے اور جو جو کام سکھائے گئے ہیں وہ کام بھی لیے جائیں گے۔ لکچر دینے والے وہ ڈاکٹر ہوں گے جنھوں نے ولایت یا ہندوستان میں امتحان پاس کرکے ڈگری پائی ہے اور ہر طرح سے قاعدہ کے روسے قابلیت رکھتے ہوں گے۔ اسی طرح جو ڈاکٹر امتحان لیں گے وہ سب سند یافتہ ہونگے چاہے وہ بڑے یا چھوٹے درجے کے ہوں۔ جو لکچر دینے والے ڈاکٹر ہیں وہ اپنے درجوں کا امتحان لینے کے مجاز نہ ہوں گے جن کو وہ پڑھایا کرتے ہیں۔ سارٹیفکٹ اور تمغے بھی ملا کریں گے جن کے لئے قواعد مقرر ہیں اور انعام بھی مقابلہ کے امتحانوں میں دیے جایا کریں گے۔ جو کوئی جان بچائے یا کوئی دوسری خدمت خاص قسم کی ازراہ ہمدردی انسانی کرے اس کو چاندی پیتل وغیرہ کے تمغے بھی دیے جائیں گے اور یہ تمغے چھ چھ مہینے کے بعد تقسیم ہوا کریں گے اور ان کو سول یا فوج کی وردی پر پہننے کی اجازت ہوگی۔

(۵) ممبر دو قسم کے ہوں گے

ایک تو وہ جو اپنی زندگی بھر ممبر رہیں گے ان کو پچاس روپیہ یکمشت دینا پڑیں گے اور دوسرے وہ جو کم ازکم دو روپیہ سالانہ ادا کیا کریں گے۔ یہ چندے خواہ وہ یکمشت رقم ہو یا سالانہ اس طور پر خرچ ہوں گے کہ ۴۸ فی صدی تو اسی جگہ خرچ ہوگا جہاں چندہ ہوا ہے اور ۳۲ فیصدی آئی ڈویژن یا اسی صوبہ کی کمیٹی کو بھیجا جائے گا اور ۲۰ فیصدی صدر مقام بمبئی کے مرکز کو ادا کیے جائیں گے۔

صاحبو۔ میں نے آپ کی خدمت میں سینٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن کے وہ حالات عرض کر دیے جو آپ کے جاننے کے لائق تھے اور اس جلسہ کی غرض بھی اچھی طرح آپ پر ظاہر ہو چکی ہے۔ اب میں آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ آپ مہربانی کرکے اس طرف متوجہ ہوں اور ہم کو وہ مدد دیں جو آپ کے اختیار اور قدرت میں ہے۔ میں اُن زخمیوں اور مضروبوں اور بیماروں کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جو بیچارے سخت تکلیف محض اس وجہ سے اٹھاتے ہیں کہ اُن کے پاس

ڈاکٹروں اور حکیموں کی مدد جلد یا کافی طور پر نہیں پہنچ سکتی۔ میں آپ لوگوں کی خدمت میں، جو گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے خیر خواہ ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ ایمبولینس کی جماعت کو قائم کر کے گورنمنٹ کے فوجی شفاخانوں کو مدد پہونچایئے جس سے رعایا کے حق میں بڑی برکت ہوگی۔ میں اُن رحم دل خدا کے بندوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جنھوں نے محض انسانی ہمدردی کو کام میں لاکر یورپ اور ہندوستان میں سیکڑوں شاخیں اس ایسوسی ایشن کی قائم کر دی ہیں اور اپنے اوپر ہر طرح کی تکلیف دوسروں کی خاطر گوارا کی ہے، اُن لوگوں کا دل اور ہمت بڑھانے کے لئے اس نیک کام میں شریک ہو جیے۔ آفریں ہے کرنل ییٹ Sahib پر جنھوں نے ہمارے ملک ہندوستان میں اس کی شاخیں لگائی ہیں

سچ پوچھیے تو یہ بھی عجب کام ہو گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام ہو گیا

شکر ہے کہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے ہمارے مہربان پریسیڈنٹ صاحب (صاحب کلکٹر بہادر) کے ہاتھ سے ایک شاخ اس ایسوسی ایشن کی قائم کی جاتی ہے جس سے ہم لوگ فائدہ اُٹھائیں گے۔ ہم کو یہ موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیے اور نہایت خوشی اور شوق سے شریک ہونا چاہیے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو نیک کام میں مدد دیتے اور دوسروں کے فائدہ کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ مبارک ہیں آپ لوگ جو اس وقت اس نیک کام کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تکالیف اور ان کے دفعیہ کی تدابیر

نومبر ۱۹۱۳ء میں بابو پرشوتم نراین صاحب آنریری مجسٹریٹ کے مکان پر ایک جلسہ عام بدیں غرض منعقد کیا گیا کہ جنوبی افریقہ میں جو ہندوستانیوں کو تکلیفیں ہیں، اُن کو ظاہر کیا جائے اور ان کے دور کرنے کی تدبیریں عمل میں لائی جائیں ہجراں صاحب نے احباب کی فرمائش سے اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ درج ذیل ہے ۔

عجب دردیست جانم را اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

جناب صدر اور حضرات انجمن!

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان اور عیسائی یہاں اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ ہمارے بھائی اور ہماری بہنیں اور ہمارے بچے جو جنوبی افریقہ میں تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھا رہے ہیں، ان کا حال ہم سب معلوم کریں اور معلوم کرنے کے بعد ان کی چارہ جوئی کریں اور جو کچھ ہموطنی اور انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے، اُس کے مطابق ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر درپے قدرت سختے ان کی مدد کریں ۔ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بھائی اور بہنیں جو جنوبی افریقہ کے قوانین کے بموجب شہریت citizenship کے حقوق نہیں رکھتے ہیں اور بجز غلامی کے دوسری طرح زندگی بسر نہیں کر سکتے ہیں اُن کو حقوق انسانی دلانے کے لیے اپنی گورنمنٹ سے عرض کریں اور اپنے شہنشاہ معظم کی بارگاہ میں اپیل کریں ۔ ہم لوگ یہ بات چاہتے ہیں کہ ہمارے ہزاروں غریب بھائی جو بیچارے جیل خانوں میں پڑے ہوئے ہیں اور گونگے ہیں کہ اپنی فریاد خود نہیں کر سکتے ہیں، ان کی طرف سے ہم وکیل بن کر بلند آواز سے فریاد کریں کہ گورنمنٹ ہند کے کانوں تک صدا پہونچ جائے ۔ بلکہ سمندر پار اُس پارلیمنٹ ہاؤس تک آواز گونج اٹھے جو انصاف کا گھر ہے اور جس نے لاکھوں غلاموں کو ایک دم سے آزادی کا محضر دے دیا تھا، اُس وقت کہ جب مہذب دنیا میں غلامی جاری تھی ۔ جس نے یہ حکم دیا تھا کہ کسی قوم و ملت کا آدمی ہو جس وقت کہ برٹش عملداری میں قدم رکھے

فوراً غلامی سے آزاد ہو جائے۔ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان بہادروں کی جماعت کا ہاتھ بٹائیں اور دل بڑھائیں جس کا سرگروہ مہاتما گاندھی ہیں، جو ہزاروں غریبوں کی مدد کرنے میں خود جیل خانہ بھیج دیے گئے ہیں۔ افریقہ وہ گرم ملک ہے جہاں زمین تابش آفتاب سے بھاڑ کی طرح بھنتی رہتی ہے۔ لیکن ہمارے غریب بھائیوں کا یہ حال ہے کہ دن کو ان کے سروں پر آفتاب اپنا چتر زریں لگائے رہتا ہے اور رات کو آسمان اپنا نیلا زرنگار شامیانہ اُن پر تانے رہتا ہے۔

پہلے جب کہ ہزاروں غریب قلی ہمارے ملک سے افریقہ گئے تو ان کی خاطر و مدارات کی گئی اور اُن کو بہت کچھ حقوق دیئے گئے۔ کیونکہ ان کی محنت و مشقت سے مالکوں نے بہت فائدے اٹھائے۔ کانیں کھودنے میں اور طرح طرح کی محنت میں وہ لگا دیے گئے۔ لیکن جب وہ لوگ اکثریت میں ہو گئے تو وہاں کی گورنمنٹ نے سخت قوانین نافذ کیے، اُن پر ٹیکس لگائے، ان کو آزادی کے ساتھ تجارت کرنے کا حق نہیں دیا گیا، پرانے حقوق ان کے لے لیے گئے، آواز لگا کر میوہ بیچنا جرم قرار دیا گیا، کوئی جائداد خریدنے اور حاصل کرنے سے محروم کر دیے گئے۔ شادی کا قانون نہایت سخت جاری ہوا، بیویوں کا حق زوجگی تسلیم نہیں کیا گیا یعنی وہ عورتیں گویا مدخولہ ہیں اور اُن کی اولاد صحیح النسب اولاد نہیں مانی جاتی۔ ان سے جگہ جگہ رجسٹریشن سرٹیفکٹ مانگا جاتا ہے، اُن سے شناخت کی غرض سے انگوٹھے کا نشان بنوایا جاتا ہے۔ اگر سارٹیفکیٹ فوراً نہ دکھائیں تو گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جو قلی بوجہ جائز کام کرنے سے انکار کریں اُن کو فوراً جیل خانہ بھیج دیا جاتا ہے۔

صاحبو۔ کیا آپ ہزاروں بھائیوں کو اور مسٹر گاندھی اور ان کی بہادر جماعت کو جیل خانہ میں پڑا رکھیں گے، اور ہزاروں ہموطنوں اور دوستوں کو فاقہ کشی کرتے ہوئے دیکھیں گے اور ان کی مدد نہ کریں گے، جو قانوناً آپ کے امکان میں ہے ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست ۔۔۔ در پریشاں حالی و درماندگی

کیا آپ ان بہادروں کو مصیبت میں چھوڑ دیں گے جو خود اپنی مدد کر رہے ہیں اور جو ایسے خویشتن دار ہیں کہ ذلت کی زندگی بسر کرنے کے مقابلہ میں جان دینا پسند کرتے ہیں۔ جن کا

مقولہ گویا یہ ہے ؎

بنام بلند ار بغلطی بجوں   بہ از زندگانی بہ ننگ اندروں

ہماری ملکہ وکٹوریہ مرحومہ نے جو ہم کو بعد غدر "میگنا چارٹا" دیا ہے اس میں یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ رعایا کے حقوق میں گورے اور کالے رنگ کا امتیاز نہ کیا جائے گا۔ پس کیا وجہ ہے کہ دوسرے ملک میں جانے سے ہمارے انسانی حقوق زائل ہو جائیں؟ کیا افریقہ کی گورنمنٹ کی یہی مہانداری ہے کہ جن لوگوں کو بلایا تھا اُن کو یوں تکلیف دے۔ اُن کو بے قصور قید میں ڈال دے۔ میں کہوں گا کہ ان کی بے آبروی تو کیا ہو سکتی ہے بلکہ ان جیل خانوں کی زیب و زینت اور رونق و آرائش ہو گئی ہے، جہاں ایسے معزز مہمان رکھے گئے ہیں جیسے مسٹر گاندھی اور ان کی بہادر جماعت۔

مکیں سے ہر مکاں کی زیب ہے گو قید خانہ ہو   نصیبہ کھل گیا تھا حضرت یوسف کے زنداں کا

صاحبو۔ یہ حال ہے کہ مسٹر فشر وزیر نے ایک مرتبہ یہ کہا کہ اگر گورنمنٹ ہند اپنا کوئی افسر یہاں بھیجے گی کہ معاملات کی حالت درست کرنے میں دخل دے تو ہم دخل بیجا سمجھیں گے اور کوئی حق ہم ہندوستانی رعایا کو نہ دیں گے اور ہم برا مانیں گے اگر گورنمنٹ ہند دخل دے گی اور اگر ہندوستانیوں نے کچھ زیادہ شورش و احتجاج کیا تو ہم اُن کے معاملات کو اور بھی زیادہ بگاڑ دیں گے۔ گویا یہ دھمکی گورنمنٹ ہند کو دی کہ وہ دخل نہ دے سکے۔ جنوبی افریقہ نے شاید جرمنی کی نقل کی کہ جرمن پارلیمنٹ میں قانون بنایا گیا، جس سے ہندوستانیوں کی حق تلفی تھی، جو کسی جرمن کالونی میں آباد تھے۔ جب مخالف فریق میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ ایسا قانون نہ ہونا چاہیے ورنہ برٹش قوم بُرا مانے گی کہ اُس کی رعایا کی حق تلفی کی گئی اور اندیشہ ہے کہ کوئی پیچیدگی نہ پڑ جائے تو اس کا جواب یہ ملا کہ خود برٹش کالونی میں ہندوستانیوں کے بہتر حقوق نہیں ہیں، اس لیے جرمنی پر اعتراض نہیں ہو سکتا اور برٹش قوم معترض نہ ہوگی۔ اور سنیے پورچوگیز افریقہ میں حال میں قانون بنا ہے کہ ہندوستانی جو وہاں ہیں وہ سال اول آٹھ پونڈ ٹیکس دیں۔ پھر آیندہ سال ایک پونڈ دیں، اور یہ کہ اُن کی رجسٹری ہو اور فوٹو لیا جائے اور دسوں انگلیوں کے نشانات لیے جائیں تاکہ شناخت ہو سکے۔ کیا گورنمنٹ برطانیہ اور گورنمنٹ ہند باوجود اس عظمت و اقتدار کے جو اُس کو تمام دنیا کی نظر میں حاصل ہے اپنی رعایا کی یہ ذلت گوارا کریگی،

جس میں اُس کی پوری پوری مکسر شان ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں ۔

ہم گورنمنٹ ہند سے عرض کرتے ہیں کہ ہم کو ہمارے میگنا چارٹا کا حق دیا جائے یعنی وہ افریکن گورنمنٹ سے دریافت کریں کہ کیوں برٹش رعایا کے ساتھ یہ جبر وظلم کیا جاتا ہے ۔ ہم وزیر ہند اور سکرٹیری مقبوضات ماوراالبحر سے عرض کرتے ہیں کہ اس موقع پر وہ دخل دیں اور یہ دھبہ جو برٹش حکومت اور برٹش قوم پر ہے اُس کو مٹا کر ہمارے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کریں ۔ برٹش قوم کا وہ اقتدار ورعب دنیا میں ہے کہ اُس کی رعایا کا کوئی شخص دنیا کے پردہ پر کسی جگہ جائے اُس کے لیے دروازہ کھلا رہنا چاہیے ۔ اُس کے حقوق میں کبھی خلل نہ پڑنا چاہیے ۔ صرف برطانیہ کا نام اُس کے حقوق کا ضامن ہونا چاہیے ۔ برٹش قوم کا عدل وانصاف اور رحمدلی مشہور نزدیک ودور ہے ۔ اُس کے انصاف کی حالت بعینہ یہ ہے جو ایک لائق وفائق کانگریس کے پیشوا کا قول ہے ۔

If you are making your appeal to the great English nation with firmness, courage and moderation, they would assuredly respond to your prayers, for as the harp responds to the harper's touch, so does the great deep heart of England respond to every prayer for justice and freedom.

صاحبان ذیشان ۔ ایسی صورت میں کہ افریقہ کی گورنمنٹ کا جبر وظلم حد سے گذر گیا ہے اور ہماری گورنمنٹ ہند کی مداخلت کو اپنے معاملات ملکی میں وہ پسند نہیں کرتے تو ہم لوگ یہ اپیل کریں گے کہ اول ہماری گورنمنٹ جنوبی افریقہ کے لوگوں کا آنا ہندوستان میں بند کردے دوسرے ان میں سے جو سول سروس میں یہاں آئیں اُن کو یہاں مقرر نہ کرے کیونکہ بوجہ جور وستم وہ لوگ اس لائق نہیں ہیں کہ ہم پر مجسٹریٹ اور جج بنائے جائیں ۔ تیسرے یہ کہ جنوبی افریقہ کے قلی یہاں کی ریلوے وغیرہ کے واسطے ہندوستان کے اندر آنے نہ پائیں ۔ چوتھے ہم اپنے شہنشاہ معظم سے عرض کریں گے کہ جو قانون Immigration regulation Act :-

اس وقت بن رہا ہے اُس کو ہمارے قیصر ہند نامنظور کر دیں تاکہ وہ پاس نہ ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اگر ہم برابر سعی و کوشش کرتے رہیں گے تو کسی وقت ضرور پوری کامیابی ہو جائے گی اور ضرور آئندہ پورے حقوق ہمارے بھائیوں کو مل جائیں گے اور اس وقت بھی ہم کچھ نہ کچھ اُن مصیبت زدہ لوگوں کی تکلیف کم کر سکتے ہیں۔ قومی اور ملکی اصلاحیں جلد نہیں ہوتیں، بلکہ اُن میں دیر لگتی ہے۔ پس ہم کو اپنی کوشش میں صبر و انتظار کی ضرورت ہے۔ کیونکہ رفتہ رفتہ بتدریج ہوں گی ؎

یکایک کب ملے عشرت جو لکھی ہو مقدر میں
کہ خم سے شیشہ میں شیشہ سے مے آتی ہے ساغر میں

صاحبان ذیشان۔ یہاں تک تو میں نے حضور ویسرائے اور شہنشاہ معظم کی خدمت میں مودبانہ اپیل کی۔ اب میں آپ کی خدمت میں آخری اپیل کروں گا کہ اپنے بھائیوں بہنوں کی کچھ مدد کیجیے۔ وہ بھوکے مر رہے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ جو مدد ہمارے ہاتھ میں ہے یعنی روپیہ دینا اور اُن کو فاقہ کشی سے بچانا، اس فرض سے تو ہم کو سبکدوش ہونا چاہیے۔ میں ان غریب بیکسوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جو قید و بند اور فاقہ کی تکلیفیں اور سختیاں اٹھا رہے ہیں لیکن اپنی عزّت و آبرو و مردانہ وار اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ اور ہماری طرف بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں کہ دیکھیں ہمارے ہندوستانی بھائی ہمارے واسطے کیا کرتے ہیں۔ مجھے یہاں لارڈ نیلسن کے الفاظ یاد آتے ہیں:۔

England Expects every man to do his duty.

میں اس میں صرف ایک لفظ بدل لوں گا اور عرض کروں گا:۔

India Expects every man to do his duty

میں اُن محبان وطن اور بہادروں کی جماعت کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جن کے سرگروہ مسٹر گاندھی ہیں اور اس وقت جیل خانہ کی قدر و منزلت بڑھا رہے ہیں۔ اُن بہادروں کا دل بڑھانے کے لیے اس وقت کوشش میں کچھ اٹھا نہ رکھیے جنھوں نے آپ کی قومی عظمت قائم رکھنے کے واسطے بہت بڑی Sacrifice کی ہے۔

ہندو یونیورسٹی کے لئے چندہ کی اپیل

۱۸ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء بمقام مظفرگڑھ، ہندو کالج کمیٹی کا ایک جلسہ عام اس غرض سے منعقد کیا گیا کہ کالج کے اغراض و مقاصد عوام پر ظاہر کیے جائیں اور اس کے واسطے چندہ جمع کر کے صدر مقام (بنارس) بھیجا جائے۔ مشران صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل تقریر کی۔

جناب صدر اور حضرات انجمن!

آج ہم لوگ ایسے مبارک کام کے لئے جمع ہوئے ہیں، جو ہمارے ملک و قوم کے داخلی و خارجی فائدوں پر مشتمل ہے۔ اس سے زیادہ مبارک کام کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، جس سے بیس۲۰ کروڑ ہندوؤں کو اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی فائدے پہونچیں گے اور ان کے مذہب کی عظمت قائم ہوگی یعنی یہ کہ بنارس جیسے متبرک مقام میں، جہاں بڑے بڑے محبان وطن پروفیسروں نے اعلیٰ درجہ کا ایثار قابل یادگار کر کے سنٹرل ہندو کالج قائم کیا ہے، وہاں ہندو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس وقت جبکہ ہمارے مسلمان بھائی مسلم یونیورسٹی کا کام انجام کے قریب پہونچا چکے ہیں ہم ہندو جو مال و دولت میں ان سے بہت زیادہ ہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہندو یونیورسٹی کا کام جلد اختتام کو پہونچائیں اور اس کے مراتب ابتدائی کا انجام، اس قدر جلد کریں کہ ہمارے شہنشاہ معظم، جارج پنجم، جو ہندوستان تشریف لانے والے ہیں بنفس نفیس ہم کو یونیورسٹی کا چارٹر (فرمان) عطا کریں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی قائم کر کے اپنی قومی تعلیم اپنے ہاتھ میں لے لیں، تاکہ ہماری تعلیم میں جو کچھ سقم ہوں، وہ یکقلم دور ہو جائیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ عمدہ تعلیم نہ ہونے سے، جو ہندوؤں کے مذہبی خیالات میں لغزش پیدا ہو گئی ہے، وہ جاتی رہے اور ہماری تعلیم و تربیت کا قصر عالیشان ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم ہو، جن کو انقلاب کا بے پناہ سیلاب بھی نہ ہلا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ویسے ہی ماہر اور کامل لوگ پیدا ہو جائیں، جیسے یورپ میں پیدا ہوئے، جن سے انگلستان، فرانس، اور جرمنی وغیرہ کا نام آفتاب و ماہتاب کی مثل روشن ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہزاروں طلبہ، جو افلاس کے باعث زیادہ نہیں پڑھ سکتے، ان کی وظیفوں کے ذریعہ، معاونت کریں اور مثل یورپ کے، فیلوشپ کے وظیفے جاری کر کے اپنے

ملک میں ذرائع تعلیم کو توسیع دیں تاکہ ہم کو بھی ایجاد و اختراع پر قدرت حاصل ہو اور ہماری قوم، دنیا کی متمدن قوموں میں شمار ہونے لگے۔ ہندو کالج یہ چاہتا ہے کہ سنسکرت اور ہندو مذہب و اخلاق کی تعلیم لازمی سمجھی جائے، جس سے اس وقت ہندو اپنی بدقسمتی سے محروم ہو گئے ہیں، تاکہ ہندوؤں کی قوم ہندو رہ کر ترقی اور عروج حاصل کرے اور ان کے دلوں میں پرانے بزرگوں، رشیوں اور مرتاضوں کی عظمت قائم ہو جائے اور پرانے علوم روحانیہ اُن کے دلوں اور دماغوں میں جاگزیں ہو جائیں اور اُن کو اپنے برگزیدہ اسلاف کے پسندیدہ کارناموں کی ریس کرنے کا شوق دامنگیر ہو۔ ہندو کالج یہ چاہتا ہے کہ مغربی اور مشرقی علوم پہلو بہ پہلو چلیں اور ہر ہندو جبکہ وہ علوم مادی میں طاق ہو تو اپنے مذہب و اخلاق اور پاکیزہ خیالات میں بھی شہرۂ آفاق ہو۔ ہندو کالج کا منشا یہ ہے کہ نہ صرف مذہبی و اخلاقی تعلیم ہی دی جائے بلکہ یہ نگرانی بھی کی جائے کہ ہر ہندو طالب علم اپنے اصول مذہبی و اخلاقی پر روزمرہ کی زندگی میں عملدرآمد کرے اور جبکہ اُس کو دنیوی معاش بکثرت میسر آئے تو اُسی کے ساتھ وہ عقبیٰ کی نعمتوں سے بھی محروم نہ رہے۔ بالفاظ دیگر کالج یہ چاہتا ہے کہ حاکم وقت اور خدا دونوں کی نگاہ میں ہندوؤں کی قوم وقعت و عظمت حاصل کرے اور جبکہ وہ کاروبار دنیوی میں اور نظم و نسق ملکی میں بہرہ کافی و وافی حاصل کریں اور تجارت بین الاقوامی اور علوم و فنون کی دولت سے بہرہ مند ہوں، تو اسی کے ساتھ ساتھ علوم روحانیہ اور دولت عقبیٰ سے بھی مالامال ہو جائیں۔ غرضکہ ہندوؤں میں وہ اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ پیدا ہو جائیں جو قدیم آریوں کے لیے باعث افتخار تھے۔

یونیورسٹی کیا چیز ہے ــــ؟ اس کی ضرورت ہمارے ملک میں کس قدر ہے ــــ؟ اور ہندو یونیورسٹی کے قیام سے کیا کیا فوائد ہوں گے ــــ؟

صاحبان ذی شان۔ یونیورسٹی ایک جماعت علما کا نام ہے، جو تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہے۔ اور اُس کے قواعد و ضوابط منضبط کرتی ہے اور تعلیم حاصل کرنے والوں کو ڈگریاں یعنی سندیں دیتی ہے یونیورسٹی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو امتحان لینے والی (یعنی ممتحنوں کی جماعت) جیسے لندن یونیورسٹی اور دوسری وہ جو علاوہ امتحان لینے کے تعلیم و تربیت بھی دے۔ جیسے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی۔ لندن یونیورسٹی میں بورڈنگ (یعنی دارالاقامہ) نہیں ہے اس لیے اس کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم و تربیت سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں انجیل پڑھائی جاتی ہے اور ایک دوسری

کتاب جو مذہب عیسوی کے ثبوت میں ہے وہ بھی کورس یعنی نصاب میں داخل ہے۔ لندن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے گریجویٹ کے سامنے شرماتے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹ کالج الحاق رکھتے ہیں اور تین ہزار طالب علم ہیں۔ اُس کی آمدنی ہمارا جہ گوالیار سے زیادہ ہے۔ گورنمنٹ اُس کے انتظام میں کچھ دخل نہیں دیتی۔ یونیورسٹی کے فیلو، ہوتے ہیں، جن کو تین ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا ہے، اُن سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی، بلکہ بطور پنشن یہ رقم اس غرض سے دیجاتی ہے کہ وہ لوگ فراغت اور اطمینان سے کسی علم یا فن میں خاص طور پر لیاقت اعلیٰ حاصل کریں اور عمدہ اور بکار آمد کتابیں تصنیف و تالیف کرتے رہیں۔

یہ باتیں ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں کہاں ہیں۔ یہ سب یونیورسٹیاں گورنمنٹ کی طرف سے قائم ہوئی ہیں اور وہی اُن کی منتظم ہے۔ یہ سب یونیورسٹیاں لندن یونیورسٹی کے نمونہ پر ہیں یعنی ممتحنوں کی جماعت ہیں۔ تربیت اور اخلاقی تعلیم ان میں نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں انگریزی تعلیم یافتگان کی جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جس کو اپنے مذہبی علم ادب اور آبائی تہذیب و شائستگی اور اپنے ملک و قوم کے رسم و رواج سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ لہذا ہمارا مقصود ایسے انگریزی خوانوں سے پورا نہیں ہوتا۔ جب ہماری خود مختار یونیورسٹی ہوگی تو وہ بھی مثل کیمبرج یونیورسٹی کے کام کرے گی۔ تعلیم کے کورس یعنی نصاب بنائے گی۔ گورنمنٹ کو اُس کے اندرونی انتظام میں دخل نہ ہوگا۔ ہم مذہبی فلسفہ کی تعلیم دے سکیں گے۔ ہمارے قومی علم و ادب کو ترقی ہوگی اور ہمارے یہاں بھی مثل کیمبرج کے فیلو ہوا کرینگے جو وظیفوں کی امداد سے مختلف علوم و فنون میں دستگاہ کامل حاصل کرکے عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف و تالیف کیا کرینگے۔ پھر ہماری قوم دنیا کی مہذب اور شائستہ قوموں میں داخل ہو جائیگی اور دنیا و عقبیٰ دونوں میں بہبود و فلاح کے سامان ہم جمع کرسکینگے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم قومی عزت و ترقی کا اصلی ذریعہ ہے اور کوئی قوم عزت نہیں پاسکتی، جب تک اعلیٰ تعلیم اس قوم میں ایک حد مناسب تک شایع نہ ہوگئی ہو۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حد مناسب کی تعریف کیا ہے اور اُس کا اندازہ کیونکر کیا جائے؟ حد مناسب سے مراد یہ ہے کہ (۱) ضروری ہے کہ اس قوم میں ایک گروہ جس کو آبادی کے فی صدی اوسط کے لحاظ سے معقول اور مناسب تعداد کہا جاسکے، ایسا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کہ جو مختلف علوم و فنون میں ماہر اور کامل ہو

اور جس کی عقل و علم اور سعی و کوشش سے علم و فن کو روز بروز ترقی گوناگون ہو اور جس کا نام قومی عزت کا ذریعہ قرار پائے (۲) اس گروہ کے علاوہ ایک بہت بڑی جماعت متوسط درجہ کی تعلیم یافتہ اس قوم میں پائی جائے، جو عالی مرتبہ مصنفوں کی علمی تصنیفات کو نہایت عمدگی سے جانتی ہو اور دقیق نکات اور اصول سے بخوبی واقف ہو اور علمی تصنیفات کا ترجمہ اپنی زبان میں کر سکے۔ یہ گروہ مردم شماری کے لحاظ سے قوم کے افراد کے ساتھ ایک معتدبہ مناسبت رکھتا ہو۔ (۳) اس کے بعد ادنیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ نہایت کثرت سے ہونا ضروری ہیں، جو اپنے دینی اور دنیوی کاموں کو بخوبی تمام انجام دے سکتے ہوں۔ جو ترقیاں علوم و فنون کی ہوتی رہتی ہیں، اُن سے فائدے اُٹھا سکتے ہوں، آسان کتابیں اور چھوٹے چھوٹے آسان اخبار پڑھ سکتے ہوں اور معمولی نوشت و خواند اور حساب کتاب جانتے ہوں۔

اب دیکھنا چاہیے کہ اول درجہ کے ماہرین و کاملین جن کا بیان ہو چکا ہے، وہ ہم میں کتنے ہیں۔ میں کہوں گا کہ وہ مطلق نہیں ہیں۔ کتنے ہیں ہندوستان کے گریجویٹ، جو ماہر اور کامل کا درجہ رکھتے ہیں؟ علوم طبعیات، علم حیوانات، علم نباتات، علم طبقات الارض میں کتنوں کو عبور حاصل ہے؟ اتنے نامی وگرامی وکلا ہندوستان میں ہیں، اُن میں کتنے ہیں جو مستقل قانون بنا کر پیش کر سکتے ہیں؟ اسی طرح دوسرے اور تیسرے درجہ کے لوگ ہیں اگر یہ کسی قدر تعداد میں پہلے گروہ سے زیادہ ہیں مگر پھر بھی اتنے کم ہیں کہ مردم شماری کے لحاظ سے اُن کو قوم کی افراد سے کوئی معقول مناسبت نہیں۔ جب یونیورسٹی قائم ہو جائے گی تو یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ یعنی تینوں درجوں کے اشخاص کثیر تعداد میں ہمارے یہاں ہونے لگیں گے اور ہماری قوم دنیا کی مہذب قوموں میں داخل ہو جائے گی۔

اعلیٰ تعلیم کے فوائد

صاحبان ذی شان۔ ملک و قوم کی عظمت و ترقی صرف اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہے کیا معاش، کیا معاد، کیا دنیوی جاہ و حشم، کیا عقبیٰ کا بخیر انجام، یہ سب اعلیٰ تعلیم کی برکات عظیمہ ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم ملک و قوم کی دولت و عزت کی بنیاد ہے۔ قوم کو پستی ذلت سے اُبھارنے کے واسطے اعلیٰ تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔ تعلیم سے حواس باطنی و ظاہری بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس بیداری سے اچھائی اور برائی، اور نیکی اور بدی کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ اس تمیز سے اچھی باتوں کی طرف میلان اور رجحان ہوتا ہے۔ اس

میلان اور رجحان سے مستعدی اور محنت کا خیال پیدا ہوتا ہے محنت و مستعدی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اور اسی کامیابی سے قومی عزت اور دولت و حشمت کو ترقی ہوتی ہے۔ اگر سوال کیا جائے کہ ہماری موجودہ بری خصلتیں اور عادتیں کیونکر دور ہوسکتی ہیں ؟ تو جواب یہ ہوگا کہ اعلےٰ تعلیم و تربیت کے شایع کرنے سے۔ اگر پوچھا جائے کہ قوم میں عزت اور حمیت کیونکر پیدا کی جائے اور اس کو پستی ذلت سے اُبھار کر اوج کمال پر کیونکر پہونچایا جائے ؟ تو جواب یہ ملے گا کہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت دینے سے۔ اگر آپ پوچھیں کہ موجودہ رشک و حسد اور نفاق کے دور کرنے کا کیا علاج ہے ؟ تو میں جواب دوں گا کہ اعلیٰ تعلیم۔ اگر سوال کیا جائے کہ ہندوؤں کو اپنے قدیم آبا و اجداد کی لائق اولاد بنانے کے لئے کیا کرنا چاہیے ؟ تو جواب یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی اشاعت۔ قوم کو ترقی کے مدارج پر پہونچانے کے لیے عمدہ تدبیر یہ ہے کہ بچوں کو باقاعدہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم دی جائے تاکہ اُن کی نبیاد درست ہو۔ طلبہ کو بذریعہ وظائف تقویت پہونچائی جائے اور اُن کے واسطے عمدہ تعلیمی سامان فراہم کیے جائیں تاکہ وہ فارغ التحصیل ہوکر ہندی قوم تیار کرنے کے اہل ہوں۔ ان پر بے دریغ روپیہ خرچ کیجیے، کیونکہ انہی پر ملک کا بھروسا ہے۔ انہی سے قوم کا آسرا ہے۔ ہم لوگ کھیت جوتنا نہیں جانتے، نہ تخم ریزی و آبیاری کرنا چاہتے ہیں لیکن حاصل کے وقت خرمن جمع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ ع۔

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

حضرات۔ یاد رکھیے کہ ہر زمانہ میں عظمت و بزرگی کا ایک مقیاس ہوتا ہے، جس سے آپ بزرگی کا تخمینہ کرسکتے ہیں۔ پہلے ہندوستان میں کوئی وقت تھا، جس کو Heroic age کہتے ہیں یعنی وہ زمانہ جبکہ بہادری و شجاعت ہر شخص کے لیے بزرگی و عظمت کا باعث تھی۔ مگر اب جس طرح یورپ میں قاعدہ ہے ہندوستان میں بھی ہے، کہ شخصی عظمت اور قومی عزت دولت پر موقوف ہے۔ اب وہ وقت بہادری کا ہندوستان میں نہیں رہا جو روم میں کبری میں تھا، جبکہ Cincinnatus نے آلاتِ زراعت چھوڑ کر آلات حرب اُٹھا لیے تھے اور شیوہ طعن و ضرب اختیار کر لیا تھا بلکہ اب صلح اور امن و امان کا زمانہ ہے جس میں دولت بڑی چیز سمجھی جاتی ہے اور وہی قومیں دنیا میں مہذب اور زبردست سمجھی جاتی ہیں جو زیادہ دولتمند ہیں۔ اب بحث پیدا ہوتی ہے کہ دولت کس طرح پیدا کی جائے ؟

اس کا جواب سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ علوم و فنون کی اشاعت سے قوم کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنایا جائے جس طرح یورپ میں دولت حاصل کرنے کے طریقے اختیار کیے گئے ہیں، وہی ہم کو بھی اختیار کرنا پڑیں گے، ورنہ ہرگز ہرگز قوم مرفہ الحال نہیں ہو سکتی۔

صاحبو۔ ہم لوگوں کی عادت ہے کہ ہر معاملہ میں گورنمنٹ کی آس لگائے رہتے ہیں۔ سلف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرو) کے مسئلہ پر عمل نہیں کرتے اور اپنی سعی و کوشش پر بھروسا نہیں کرتے۔ ہم کو جاننا چاہیے کہ ہماری گورنمنٹ Government of negative ہے یعنی وہ ہم کو بُرے کاموں کے ارتکاب سے منع کرتی ہے۔ اُس کا فرض یہ نہیں ہے کہ ہم کو اچھے کاموں کی طرف ہر وقت رغبت و تحریص دیا کرے۔ اصل میں گورنمنٹ میں یہ کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ بڑا وصف ہے جس کا شکر گذار ہم کو ہونا چاہیے۔ اگر ہم سب کام گورنمنٹ کی تحریک سے کیا کریں گے، تو قوم ہمیشہ دوسروں کی محتاج بنی رہے گی اور اپنے بھروسے پر کوئی کام نہ کر سکے گی۔ ہندو کیا نہیں کر سکتے۔ تمام ملک کی دولت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اُن کی فیاضی مشہور ہے۔ یونیورسٹی کے واسطے دس لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ ہزاروں ہندو اس ملک میں ایسے ہیں، جن میں سے ایک ایک اس ضرورت کو رفع کر سکتا ہے۔ دیکھیے مسٹر ٹاٹا نے تیس لاکھ روپیہ یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے دیدیے۔ کتنا بڑا کام کیا، جو ہمیشہ یادگار رہیگا اور آئندہ نسلیں فائدہ کثیر اٹھائینگی۔

حضرات۔ اس وقت اگر ہندو قوم پر نظر ڈالیے، تو ہرگز باور نہ ہوگا کہ موجودہ قوم انہی بہادر آریوں اور قدیم مرتاضوں کی نسل میں ہے، جنھوں نے حکمت و فلسفہ اور علوم و فنون مختلفہ کی روشنی چہار دانگ عالم میں پھیلائی تھی، جن کے علوم روحانی اور محاسن اخلاق اور بہادری اور شجاعت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے، جن کی سچائی، راستبازی اور پارسائی اطراف عالم اور اکناف دنیا میں معروف و مشہور تھی۔ فقط ہم راماین کے زمانہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسے قول کے سچے اور بات کے پکے لوگ تھے کہ چاہے جان جاتی رہے، اپنے سعادتمند بیٹے سے دائمی مفارقت ہو جائے مگر "قول مرداں جاں دارد" کی ساکھ میں فرق نہ آنے پائے۔ قول جان کے ساتھ تھا۔ بیٹے بھی کیسے والدین کے فرمانبردار تھے کہ سوتیلی ماں کے حکم کی تعمیل میں سلطنت جیسی عزیز چیز سے دست بردار ہو کر ہر قسم کی سختیاں جلاوطنی کی نہایت خوشی سے فرض مذہبی سمجھ کر گوارا کیں۔ خاتونیں کس قدر فرمانبردار

اور شوہر پرست ہوتی تھیں کہ شوہر کے ساتھ جلا وطنی میں اپنی خوشی سے رہ کر جنگلوں اور بیابانوں میں کانٹوں پر اس طرح چلیں، گویا پھولوں کے فرش پر چل رہی ہیں۔ بھائی کس قدر جاں نثار اور نشۂ محبت میں سرشار تھے کہ سوتیلے بھائی کی جدائی میں سلطنت کرنا پسند نہ کیا، مگر اس وقت ہندوؤں میں یہ اوصاف پسندیدہ نام کو نہیں پائے جاتے۔ سچائی سے نفرت ہے، باپ بیٹوں میں جنگ وجدل ہونا اور بھائی کا بھائی سے دشمنی کرنا معمولی بات ہے۔ برادر حقیقی دشمن مادر زاد بن جاتا ہے۔ ملک و قوم کے فائدے کا کام کوئی نہیں کرتا۔ اگر بظاہر کوئی کام کرتے بھی ہیں تو اپنا ذاتی فائدہ دیکھ لیتے ہیں۔ خودغرضی ہر شخص کی طبیعت میں داخل ہو گئی ہے۔ اکثر جھوٹے پیٹریٹ Patriot پیدا ہو گئے ہیں، جو گورنمنٹ سے خطاب لینے کی خاطر جمہور کے ساتھ بلکہ اپنے خاص عزیزوں اور بھائیوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ عوام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہالت و بے علمی کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ قدیم مذہب اور قدیم اخلاق عنقا ہو گیا ہے۔ ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

ہمارے یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ اور گریجویٹ حضرات کی حالت ناگفتنی ہے۔ جن سے کوئی اُمید فلاح و بہبود کی قوم کو نہیں ہو سکتی۔ یونیورسٹی کے منتظموں کی رائے یہ ہے کہ ملک میں گریجویٹ لوگوں کی جماعت ایسا نیم تعلیم یافتہ گروہ ہے، جن کا علم بالائی ہے، یعنی پایۂ علم وسیع نہیں ہے، جن میں خود بینی بے حد ہے۔ وہ تقریر میں لسان ہیں، لیکن اُن کو الفاظ و فقرات کے معنی بھی معلوم نہیں، جن کو وہ دم تقریر و تحریر استعمال کرتے ہیں اور دُہراتے ہیں اور سوائے معاش حاصل کرنے کے کوئی دوسرا فائدہ تعلیم و تربیت سے نہیں سمجھتے ہیں اور معاش بھی سوائے ملازمت سرکاری کے کسی اور جگہ تلاش نہیں کرتے۔

افسوس کہ وہ وقت نہیں رہا کہ بھاسکراچارج نے سر اسحاق نیوٹن سے ڈیڑھ سو برس پہلے نظام شمسی ہندوستان میں قائم کیا، جس کے انکشاف کا فخر سر اسحاق کو کئی سو برس بعد یورپ میں حاصل ہوا۔ صد حیف کہ وہ زمانہ نہیں رہا کہ حکیم فیثا غورث یونانی نے یہاں آ کر نظام شمسی سیکھا اور پھر نظام بطلیموسی کو باطل کیا۔ انہی عالموں فاضلوں کی اولاد اس وقت نیم وحشی کہلاتی ہے۔ کہاں تک ہم وطنوں اور محسنوں کے عیب بیان کروں ؂

نخواہم دریں باب زیں بیش گفت
کہ عیبت بود سیرت خویش گفت

حضرات اگو ہندوؤں میں قدیم آباؤ اجداد کے اوصاف حمیدہ مفقود ہیں لیکن ان کا مذہب صرف ایسا باقی رہ گیا ہے جو قوم کا شیرازہ باندھے ہوئے ہے، وہی ان کا بیڑا پار لگائے گا۔ اے اپنے دھرم کا پالن کرنے والے بھائیو! میں سنتا ہوں کہ مسز بیسنٹ Mrs. Besant دس لاکھ روپیوں کے واسطے جن کی ضرورت ہم کو ہندو یونیورسٹی کے لیے ہے، یورپ میں اپیل کرنے والی ہیں کتنی شرم کی بات ہے کہ چوبیس کرور ہندو اپنے ہونہار بچوں اور اپنے مذہب قدیم کی خاطر دس لاکھ روپیہ نہ دے سکیں اور قوم نصاریٰ کی خیرات لینا پسند کریں۔ اگر یہ اپیل کی گئی تو یاد رکھیے گا کہ ہندوؤں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہمیشہ کے لیے لگ جائیگا اور آیندہ کے مورخین لکھیں گے کہ ہندوؤں سے عیسائی قوم بہت زیادہ نکوکار اور مخیر ہے جس نے باوصف اختلاف مذہب اور اختلاف قوم و ملک کے ہزاروں کوس پر ہندوؤں کے ساتھ سلوک کیا اور ہندوؤں سے باوجود اتحاد مذہب اور اتحاد قوم و ملک کے اپنے بھائیوں اور اپنے بچوں کا فرض انجام نہ دیا گیا۔ میں کہوں گا کہ ایک کالج اور ایک یونیورسٹی کیا! ایسے بڑے ملک میں تو جیسا کہ ملک ہند ہے، سیکڑوں کالج اور بیسیوں یونیورسٹیاں قائم کرنے کی ضرورت شدید ہے۔ ہم لوگ انواع و اقسام کی اصلاحیں کرنا چاہتے ہیں، مگر اصل بنیاد کو نہیں دیکھتے کسی اصلاح کی کوشش نہ کیجیے، صرف علوم و فنون کی اشاعت کیجیے۔ قوم خود مہذب بن کر اصلاحات کرے گی اور جو مشکلات اب پیش آرہی ہیں، ہرگز کوئی پیش نہ آئیگی۔ اگر ہم اپنی اور اپنی قوم کی خوش قسمتی سے ہندوستان کا ویسرائے ہو جاتا، تو کم از کم تیس کرور روپیہ بیت المال کا صرف تعلیم و تربیت پر صرف کر دیتا۔ دیکھیے! برطانیہ اعظم و آئرلینڈ میں ساڑھے تین کرور کی آبادی ہے اور پانچ کرور روپیہ صرف تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تیس کرور کی آبادی ہے اور تعلیم پر صرف ایک کرور روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ع۔ تفاوت ہے زمین و آسماں کا

قوم کی عظمت و شان بڑھانا آسان کام نہیں۔ دولت خرچ کی جاتی ہے، ہزاروں لاکھوں جانیں ضایع کی جاتی ہیں اور خون آب باراں کی طرح بہایا جاتا ہے، جب کچھ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ آپ کو شکر کرنا چاہیے کہ آپ لوگوں کو اور کوئی تکلیف گوارا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف تعلیم و تربیت پر

خرچ کیجیے۔ ہر قسم کی قومی عزت اور قومی بزرگی و ترقی آپ کو حاصل ہوگی۔ مسٹر ٹاٹا کو دیکھیے جنھوں نے تیس لاکھ روپیہ یونیورسٹی قائم کرنے کے واسطے دیدیا۔ کیا ٹاٹا سے زیادہ کوئی دولتمند نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ "تونگری بدل ست نہ بمال"۔ ایسے بھی بندگان خدا ہیں کہ "نہ برند و نہ نہند و نخورند و نہ دہند" اور ایسے بھی خاصان خدا ہیں، جیسے مسٹر ٹاٹا کہ "صلائے کرم در دادہ و خوان نعمت نہادہ طالب نامندد مغفرت و صاحب دنیا و آخرت"۔

صاحبو! میں جو کچھ عرض کرسکتا تھا کرچکا۔ اب میں آخر میں آپ کی خدمت مبارک میں ہندو مذہب کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جس کی بنیاد مغربی علوم نے ہلا دی ہے اسی بنیاد کے مضبوط کرنے کے لیے یہ یونیورسٹی قائم کی جا رہی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں ان طلبہ کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جو وہاں تعلیم پاکر ایسی قوم ہندی تیار کرینگے، جو اپنے برگزیدہ اسلاف کی یادگار ثابت ہوگی۔ میں آپ کی خدمت میں ۲۴ کرور ہندوؤں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جو بحیثیت ایک قوم کے یونیورسٹی سے فائدے اٹھائینگے۔ میں ان غریب طلبہ کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جو بیچارے بوجہ افلاس کے زیادہ تعلیم پانے سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد وظیفوں کی امداد سے تعلیمی فوائد سے مستفید ہوسکیں گے۔ میں ان خیر خواہان ملک و قوم کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جنھوں نے اپنی زندگی ہندو کالج کا کام کرنے کے لئے وقف کردی ہے اور سوائے قوم کے خشک شکریہ کے کوئی صلہ کوئی معاوضہ انھوں نے اپنے لیے نہیں رکھا، ان محبان وطن کی خاطر اور ان کا دل بڑھانے کے لیے آپ اس کار خیر میں شریک ہوں۔ میں آپ کی خدمت میں ان قدیم رشیوں، بزرگوں اور آریوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جن کا نام بہت بڑا ہے، جن کے نام سے ہم اب تک بکتے چلے آئے ہیں، جن کا نام نامی اب معرض خطر میں ہے اور عنقریب مٹ جائیگا، اگر ہم اس کو نہ بچائیں گے۔ دیکھیے ان لوگوں کی ہمت کو جنھوں نے ہندو مذہب کے علمی دیوتا کی پوجا کے لیے ایک عالی شان مندر بنوانا چاہا ہے۔ آئیے ہم اور آپ سب مل کر اس عالیشان مندر، اس قومی درس گاہ کے بنانے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ ہم میں سے بعض مٹی ڈھو ڈھو کر بہم پہنچائیں، بعض اینٹیں اٹھاکر دیں اور بعض اس میں معماری، انجینیری اور سنگ تراشی کا کام انجام دیں، تاکہ وہ عظیم الشان علم و ادب کا قومی شوالہ بن کر تیار ہو جائے، جس میں ہندوؤں کے عوام بلکہ ہندو مذہب پناہ لینے والا ہے۔

میں آپ کی خدمت میں اُن بنیر بان طلبہ کی طرف سے اپیل کروں گا، جو اپنی فریاد آپ کے کان تک نہیں پہونچا سکتے، جو اپنی تعلیمی ضرورتوں کو آپ پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ میرا کام ہے کہ اُن کی طرف سے وکالت کروں اور بلند آواز سے شور مچا کر آپ سے عرض کروں کہ آپ چونک پڑیں اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں اور جان لیں کہ قوم کے ہونہار بچے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہالت اور بے علمی میں مبتلا ہیں۔ یاد رکھیے کہ جو زبان اس وقت اُن بیکسوں کے منہ میں خاموش اور بےحس وحرکت معلوم ہو رہی ہے وہی زبان اُس وقت جبکہ ہم اور وہ خدا کے سامنے حاضر ہونگے، تلوار کی طرح چلتی معلوم ہوگی اور ہم کو ملزم قرار دے گی، کیونکہ ہم نے اپنا قومی فرض ادا نہیں کیا اور اُن غریبوں اور بےزبانوں کے واسطے کوئی قومی درس گاہ بنوانے کا انتظام نہیں کیا۔

میں آپ صاحبوں کی خدمت میں فطرت انسانی کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جس کا اصل خاصہ ہمدردی ہے کہ آپ یہ عظیم الشان تعلیم گاہ قائم کرکے اپنا نام نیک یادگار چھوڑیں۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو دوسروں کے فائدہ کے لیے خود تکلیفیں اُٹھاتے ہیں! مبارک ہیں وہ لوگ، جو گری ہوئی قوم کو اُبھارنے کی سعی و کوشش کرتے ہیں! مبارک ہیں وہ لوگ، جنھوں نے ہندو کالج کی بنیاد ڈالی اور مبارک ہیں آپ لوگ، جو یہاں تشریف رکھتے ہیں اور ہندو یونیورسٹی کے حامی و مددگار رہیں!



مسٹر گوکھلے

گوکھلے کا غم

مارچ ۱۵ء کے شروع میں بمقام سرتی بھون ایک جلسہ ماتمی، مسٹر گوکھلے کے انتقال پر ملال پر رنج و افسوس ظاہر کرنے کی غرض سے منعقد کیا گیا۔ مشران صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل ماتمی تقریر کی:

میر مجلس اور حضرات انجمن!

خزاں رسید و گلستاں بآں جمال نماند   نوائے بلبل شوریدہ رفت و حال نماند
نشان لالہ ایں باغ اذکہ می پرسی   بروکہ انچہ تو دیدی بجز خیال نماند

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان، ہر جماعت و گروہ کے اشخاص اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اپنے نہایت عزیز ہموطن اور ملک و قوم کے پیشوا مسٹر گوکھلے کی بے وقت وفات حسرت آیات پر اشک ماتم بہائیں، جن کے مرنے کا نہ صرف ہندوستان کے باشندوں کو افسوس ہے، بلکہ برطانیہ نے بھی اپنا مشیر اور خیر اندیش سمجھ کر رنج و غم ظاہر کیا ہے۔ مرحوم کے مرنے سے ہمارا ایک پولیٹیکل رشی اٹھ گیا اور گورنمنٹ برطانیہ اور گورنمنٹ ہند کا ایک خیر خواہ رکن سلطنت ہمیشہ کے لیے جاتا رہا۔ اس عظیم الشان اور ہر دلعزیز حبیب وطن کے کارنامے بیان کرنے کے لیے ایک طولانی تقریر کی ضرورت ہے۔ جو اس ماتمی جلسہ میں زیادہ موزوں نہیں ہوسکتی، لیکن چونکہ یہ ایک رسم ہے کہ جس کا نوحہ یا مرثیہ پڑھا جائے اُس کی خوبیاں کچھ نہ کچھ بیان کی جائیں، اس لئے مختصر طور پر اس بے نظیر محب وطن کے عدیم المثال کارنامے معرض بیان میں لاتا ہوں۔

ہمارے دوست مرحوم جب فرگسن کالج میں پڑھتے تھے، اُس وقت سے اُن کے پروفیسروں کو اُن کی اعلیٰ درجہ کی قابلیت کا احساس ہونے لگا تھا اور پیشین گوئی کی جاتی تھی کہ یہ شخص بڑا ہونہار ہوگا۔ پڑھ لکھ کر فارغ ہوئے، تو فرگسن کالج ہی میں پروفیسر کی حیثیت سے ۲۰ سال تک درس و تدریس کی خدمتیں انجام دیں۔ گذارے کے لیے کالج سے صرف پچھتر روپیہ ماہوار لیتے تھے۔ یہ ایثار کالج میں اب تک یادگار ہے اور آئندہ بھی یادگار رہے گا۔ ۱۸۸۹ء میں جبکہ وہ ۲۲ برس کے سن میں بمبئی پراونشل کانفرنس میں شریک ہوئے تو مسٹر ڈھولکر نے پیشین گوئی کی کہ یہ شخص کسی دن کانگریس کا صدر ہوگا۔

یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور آپ کانگریس کے صدر ہو کر بے تاج کے بادشاہ کہلائے۔

مسٹر گوکھلے عالم، فاضل، سوشل رفارمر یعنی مصلح اخلاق اور مصلح قوم و ملک تھے اور خاصکر ابتدائی تعلیم کے بہت بڑے حامی تھے۔ پست اقوام کے بہت بڑے مربی اور سرپرست تھے جن کو اونچی قوم کے ہندو چھونا بھی پسند نہیں کرتے۔ اچھوت ذاتوں کو وہ اونچی سطح پر لاکر اپنے برابر کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے۔ اُن غریبوں اور بیکسوں کی خاطر صرف محنت و کوشش ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی قسمت کے ساتھ مرحوم نے اپنی تقدیر کو وابستہ کر دیا تھا اور اُن کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں شریک ہو کر اُن کا ساتھ دیتے تھے۔

ہمارے دوست مرحوم "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" ایسی قائم کر گئے ہیں، جو اُن کا نام نامی آیندہ نسلوں میں احسانمندی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ اس کے ممبر بھی اپنے مرشد اور گرو کی طرح زر و مال کو کچھ مال نہیں سمجھتے اور ہمارے ملک و قوم کی خدمت الواع و اقسام طریق پر کر رہے ہیں۔ عورتوں کو پڑھانا لکھانا، بیواؤں کی تکلیفیں کم کرنا اور اُن کی حالت درست کرنا، اچھوت ذاتوں کو اونچی سطح پر لانا، صفائی اور حفظان صحت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا خیال عام لوگوں میں پھیلانا، کوآپریٹو سوسائٹی کے ذریعہ غریبوں اور بیکسوں کو سود کھانے والوں کے پنجۂ ظلم سے نجات دینا، یہ سب اعلیٰ درجہ کی بیش بہا خدمات ہیں جن سے ہمارا ملک مستفید ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ فوائد اُس مرحوم کی بدولت ہیں۔

مسٹر گوکھلے نے سات مرتبہ ولایت کا سفر ہم لوگوں کی خاطر کیا۔ پہلا سفر سنہ ۱۸۹۷ء میں اس غرض سے کیا تھا کہ رائل کمیشن کے روبرو ہندوستان کے ملکی مصارف کے متعلق شہادت دیں۔ وہاں جاکر ہمارے دوست نے اس موضوع پر اس کے جزئیات و کلیات کی نسبت ایسی واقفیت ظاہر کی کہ لوگ عش عش کر گئے۔ دوسرا سفر سنہ ۱۹۰۵ء میں ہوا، جس میں ہندوستان کے متعلق اونچاس ۴۹ دن میں اُنھوں نے ۴۵ پینتالیس سپیچیں دیں۔ تیسرا سفر بنارس کانگریس کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ چوتھا سنہ ۱۹۰۸ء میں اور پھر سنہ ۱۲-۱۳-۱۴ء میں تین سفر ہوئے۔ ان سب سفروں میں مرحوم نے جو ملکی خدمات انجام دیں ان کو چھوڑ کر صرف سنہ ۱۹۰۸ کے ایک سفر کو لے لیجیے کیونکہ اس سفر میں اُنھوں نے جو کام کیا صرف وہی ایسا ہے جو اُن کی بزرگی و عظمت ملک و قوم کے نزدیک قائم کرنے کے لیے اور یادگار ہونے کے لیے کافی ہے۔ وہ کام یہ ہے کہ آپ نے لارڈ مورلے سے کئی مرتبہ گفتگو کرکے وائسرائے کی کونسل میں توسیع

اور اصلاح کرادی جس کی بدولت چھ سات برس سے ہم لوگ کثرت سے کونسلوں میں شریک ہونے کی غرض سے منتخب ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح ابھی حال میں جنوبی افریقہ جاکر وہاں کے وزیروں سے (مثل بوتھا اور اسمٹس وغیرہ کے) مل کر ہندوستانیوں کی تکلیفیں دور کیں اور جو مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی اُس پر پانی ڈال دیا۔

مسٹر گوکھلے وہ شخص تھے، جو قوم کے فدائی تھے اور زندگی فقط ملک و قوم کے واسطے بسر کرتے تھے۔ طبیعت میں وہ انکسار تھا کہ سال گذشتہ جب گورنمنٹ نے کے سی، آئی، ای، کا خطاب دیا، تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمارا کام کرنے میں اس قدر محو تھے کہ اپنے کام اور اپنی ذات کی پرواہ اُن کو مطلق نہ تھی۔ وہ صرف ہمارے کام میں ہمہ تن مصروف و مشغول رہا کرتے تھے۔ گویا ان کا عمل اس مقولہ پر تھا ؎

وہ محو ہیں کہ ذرا غم نہیں ملال نہیں
ترا خیال ہے اپنا ہمیں خیال نہیں

انگریزی جملہ جو کہا جاتا ہے He died in harness وہ ہمارے دوست پر صادق آتا تھا کہ ہمارا کام کرتے کرتے جان دیدی۔ مرحوم نے زر و دولت کو خاک کی برابر سمجھا اور مثل رومن سینٹرس (Senators) کے ہمیشہ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ افلاس میں زندگی بسر کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سوشل ریفارم (یعنی معاشرتی و تمدنی اصلاح) کو بھی ویسا ہی ضروری سمجھا جیسا کہ اصلاح ملکی کو۔ اُن کا قول تھا:- "Institutions are made by men and not men by institutions."

حضور وائسرائے نے اپنی کونسل میں فرمایا کہ "مسٹر گوکھلے نے صیغہ مال، صیغہ تعلیم اور امور انتظامی پر بحث کرتے میں نہایت قابلیت ظاہر کی اور جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسئلہ کو، جو ہندوستانیوں سے متعلق تھا، نہایت مدبری اور خوبی سے سلجھایا، جو بظاہر عقدہ لاانحل تھا" اور یہ بھی فرمایا کہ "وہ نہ صرف کونسل کے بیش بہا ممبر تھے بلکہ ہمارے دوست بھی تھے"۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسٹر گوکھلے کو جو واقفیت مال کے صیغہ سے تھی وہ بیس برس ادھر سے کسی سکریٹری محکمہ مال یا کسی ممبر صیغہ مال کو حاصل نہیں ہوئی۔ ہمارے لفٹننٹ گورنر بہادر سر جیمس مسٹن جو پہلے فنانشل سکریٹری گورنمنٹ ہند تھے، وہ مسٹر گوکھلے کو مسٹر گلیڈسٹن سے تشبیہ دیتے تھے۔

مسٹر گوکھلے کو گورنمنٹ اور حکام اس وجہ سے زیادہ پسند کرتے تھے کہ اُن میں خود غرضی سخن پروری اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ بخلاف اس کے انکسار، سچائی اور معقول پسندی تھی۔ دنیا کے معاملات میں دو باتوں کی بڑی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ خوش تدبیری اور ایمانداری سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سخن پروری اور ضد نہ کی جائے، بلکہ ہمیشہ سمجھوتا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست
بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عملی سیاست میں ہر موقع پر برابری اور آزادی کا دعویٰ کرنا اور حقوق انسانی پر لڑنا ٹھیک نہیں ہے بعض وقت اس اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

یہ سب باتیں مسٹر گوکھلے میں نمایاں طور پر تھیں، جن کے باعث اُن کو سوشل اور پولیٹیکل معاملات میں کامیابی ہوا کرتی تھی۔ ایسے نازک وقت میں جیسا کہ اب ہے، عامہ رعایا اور نیز گورنمنٹ کو ایسے شخص کی بڑی ضرورت ہے کہ جس میں مثل مسٹر گوکھلے کی خوبیاں اور لیاقتیں ہوں، اس لیے اُن کی وفات سے جو نقصان پہونچا وہ ایسا قومی اور ملکی نقصان ہے جو ملک اور قوم کی بدقسمتی پر دلیل قاطع ہے۔ اصل میں مسٹر گوکھلے کے طور وطریق، اُن کی عقلمندی، فرزانگی، خوش تدبیری، سچائی اور ایمانداری اس بات کی روشن مثال ہے کہ مفتوحہ ملک وقوم کا ایک لائق فرزند اپنی قوم و ملک کو پستی نذلت سے اُبھار کر کس طرح بلند سطح پر لا سکتا ہے اور رعایا اور گورنمنٹ دونوں کا معتمد علیہ بن سکتا ہے۔

جب مسٹر گوکھلے کا جنازہ اُٹھا، تو بیس ہزار آدمی ماتم کرنے والے اُس کے ساتھ تھے ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں ماتم کیا اور وائسرائے اور گورنر بمبئی اور حضرت جارج پنجم اور آغا خان کے تار ہمدردی اور رنج وغم کے اظہار میں آئے سرکاری اور غیر سرکاری دفتر سب بند ہوگئے۔ الہ آباد میں، جہاں اُن کے پھول جمنا گنگا کے سنگم میں ڈالے گئے عام طور سے تعطیل ہوئی۔ پھولوں کے ساتھ جو جلوس تھا، اُس میں بڑے بڑے عمائدین کے دوش بدوش گورنمنٹ کی طرف سے کلکٹر ضلع نے بھی شرکت کی اور الہ آباد میں جو جلسہ ماتمی ہوا اس میں حکام ہائی کورٹ، کمشنر اور کلکٹر اور تمام نامی گرامی ہندو مسلمان شریک ہوئے۔

لارڈ ہارڈنگ ہی نے اُن کی لیاقتوں اور خوبیوں کی داد نہیں دی بلکہ اُن کی زندگی میں ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو نے بھی، جب اُن کی تقریر بجٹ پر سنی، تو فرمایا کہ " یہ سب سے اچھی اور ایسی تقریر ہے کہ انگلستان میں بھی بہت کم لوگ ایسی تقریر کر سکتے ہیں"۔ اسی طرح سر ایڈورڈ بیکر نے فرمایا کہ "میری خواہش سب سے بڑی یہ ہے کہ میرے بعد فنانشل ممبر اس کونسل کے مسٹر گوکھلے مقرر ہوں"

مسٹر گوکھلے نے ہمیشہ اپنے آپ کو ماتحت کارکن یعنی ایک چھوٹا کام کرنے والا اور اپنے مقابلہ میں رانا ڈے، سر فیروز شاہ مہتا اور دادا بھائی نوروجی وغیرہ کو ترجیح دی۔ دنیا میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جو کوئی بڑوں کو مقدم سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اُن کا چھوٹا اور پیرو خیال کرتا ہے، وہ آخر میں خود بڑا مانا جاتا ہے اور جو دوسروں کا نام قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کا نام خود بھی دنیا میں قائم اور برقرار رہا کرتا ہے۔ چنانچہ اسی فلسفیانہ جذبہ کے باعث آج مسٹر گوکھلے کے نام کا قلمرو ہند میں ڈنکا بج رہا ہے۔

مسٹر گوکھلے کی تعریف سب سے بڑھکر یہ ہے کہ انھوں نے پولیٹیکل معاملات میں اعتدال کا خیال زیادہ رکھا۔ مسٹر تلک نے مسٹر گوکھلے کی وفات کے وقت تک یہ اعتراض کیا کہ وہ Extremists اور Moderates میں اتحاد پیدا نہ کرا سکے اور دونوں کی شرکت سے متحدہ کانگریس وجود میں نہ لا سکے، لیکن جب جنازہ گھاٹ پر پہونچا، تو مرحوم کے مخالف مسٹر تلک نے خود Funeral Oration دیا اور ہزاروں آدمیوں کو جو وہاں موجود تھے ہدایت کی کہ مرحوم کے طور و طریق اختیار کرو اور اُن پر پورا عمل کرو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خود مسٹر تلک نے بھی مرحوم کا ڈھنگ اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

صاحبان والا شان! الہ آباد جیسے متبرک مقام میں، جہاں گنگا جمنا کا سنگم ہے، جہاں اس شہید ملکی کے پھول ڈالے گئے ہیں، ایک یادگار بنائی چاہیے تاکہ لاکھوں جاتری، جو وہاں جاتے ہیں، اس فدائے قوم و ملک کی یادگار کے درشن کیا کریں اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی اُس کی یاد پر نچھاور کیا کریں۔ ہم سب کو مسٹر گوکھلے کے کارہائے نمایاں سے یہ سبق ملتا ہے کہ خود غرضی چھوڑ کر ملک کے بھائیوں کی خدمت سچائی اور ایمانداری سے کریں اور جو کچھ مرنے والا کر گیا ہے اُس کو سعی و کوشش سے بحال و برقرار رکھیں، تاکہ ہمارے کام بھی آیندہ نسلوں کے لیے دنیا میں یادگار رہ جائیں ؎

عمل کن کہ فردا نماند ولیک
جزائے عمل ماند و نام نیک

پنڈت بشن نراین در کا ماتم

پنڈت بشن نراین در بیرسٹر کی وفات حسرت آیات کے غم میں ایک جلسہ عام بمقام سرستی بھون فرخ آباد اس غرض سے کیا گیا کہ مرحوم کے انتقال پر ملال پر رنج و افسوس ظاہر کیا جائے اور اُن کے کارنامے اور اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ منظر عام پر لائے جائیں۔ مشر ان صاحب نے جو تقریر اس موقع پر کی وہ درج ذیل ہے۔

کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی　　کہاں ہیں وہ گردان زابلستانی
گئے پیشدادی کہاں اور کیانی　　مٹاکر رہی سب کو دنیائے فانی

لگاؤ کوئی کھوج کلدانیوں کے
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کے

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان عیسائی ہر گروہ اور جماعت کے اشخاص، اس ماتمکدے میں اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ پیشوائے قوم اور فدائے ملک، پنڈت بشن نراین در کے انتقال پر ملال پر اشک ماتم بہائیں اور اُن کا نوحہ اور مرثیہ پڑھیں۔

صاحبو! ہمارے پنڈت صاحب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کی مشہور تعلیم گاہ کیننگ کالج میں پائی۔ لیکن بی، اے کی ڈگری حاصل نہ کر پائے تھے کہ ولایت جانے کا شوق دامنگیر ہوا۔ لڑکپن ہی سے ذہانت کے آثار بشرہ سے نمایاں تھے اور نہایت درجہ ہونہاری ٹپکتی تھی تحصیل علم کی طرف رحجان خدا داد تھا اور ذہن سلیم اور طبع مستقیم قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئے تھے۔ آپ کشمیری پنڈتوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے ولایت جاکر مذہبی قیود کی زنجیریں توڑ دیں۔ کشمیری کلب لکھنؤ کے سکرٹیری تھے، مگر اسی وقت مردم شناس اشخاص کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا آسمان شہرت پر آفتاب کی طرح چمکے گا، چنانچہ ولایت جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور وہاں کے اعلیٰ درجہ کے عالم اور فلسفی پروفیسر میکس میولر اور پروفیسر ہکسلی وغیرہ کی صحبت باسعادت



پنڈت بشن نراین در

سے مستفید ہوکر اپنے دل و دماغ کو روشن کیا اور اپنے بھائیوں کے واسطے چراغ ہدایت بن گئے۔
اُن کی واپسی پر ہندوستان میں اُن کی قوم میں جھگڑا ہوا اور دو فریق بن گئے۔ ایک فریق اُن کا طرفدار تھا جو نیشن سبھا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا فریق مخالف دھرم سبھا کہلایا۔

ولایت سے واپس آکر آپ نے ملک و قوم کی خدمت پر کمر ہمت چُست باندھی۔ اُسی سال مدراس کانگریس میں شریک ہوئے اور ایسی اسپیچ دی جو اعلیٰ درجہ کی تقریروں میں شمار کی جاتی ہے ہیوم صاحب نے اس اسپیچ کی داد دی۔ پنڈت جی مرحوم انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے حامی و مددگار تھے اور کانگریس پلیٹ فارم پر آن کی تقریریں خوش بیانی اور فصیح الکلامی کا اعلیٰ نمونہ ہوتی تھیں اخبار ایڈوکیٹ لکھنؤ کے سب سے پہلے ایڈیٹر تھے اور پھر اُس کے مشہور نامہ نگار رہے۔ اخبار لیڈر الہ آباد میں بہت قابل قدر مضامین درج کیا کرتے تھے۔ آن کی تصنیف سے ایک پمفلٹ ہے جس کا نام signs of the times ہے جو نہایت قابل قدر ہے۔

پنڈت صاحب لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ممبر عرصہ تک رہے اور وایسرائے کی کونسل میں بھی شریک ہوئے۔ ایک دفعہ پراونشل کانگریس کے پریسیڈنٹ اور ایک دفعہ کانگریس کے ممبر مجلس منتخب کیے گئے۔ ظاہر ہے وہ درجہ جو کانگریس کے پریسیڈنٹ کا ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں جب کانگریس ہونے والی تھی تو اُس کی استقبالی کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے مگر اشتداد علالت کے باعث استعفا دیدیا۔

پنڈت صاحب اُردو اور فارسی کے فن انشاء کے ماہر تھے اور انگریزی زبان کے بڑے ادیب تھے اور اس پر خوب عبور رکھتے تھے۔ اُن کے انگریزی مضامین نہ صرف ہندوستان میں بلکہ انگلستان میں بہت قابل قدر سمجھے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ زبان غیر پر عبور ہونا مشکل ہے میں کہتا ہوں کہ اپنی مادری زبان پر قدرت حاصل کرنا کیا آسان کام ہے۔ وہ اُردو کے بڑے خوش فکر شاعر تھے اور اُن کی شاعری نئے خیالات سے بھری ہوئی تھی اور نہایت قدر و منزلت کے لائق سمجھی جاتی تھی۔

پنڈت صاحب نے چودہ برس سل کے عارضہ سے سخت تکلیف پائی لیکن باوجود اس تکلیف کے کبھی ملک و قوم کا کام کرنے سے غافل نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمیشہ زندہ دلی اور مستعدی سے ہمارے

کام میں محو رہے اور اپنی تکلیف کا خیال کبھی نہیں کیا اور یہی سمجھا کیے کہ میں دوسروں کے واسطے زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ ہنستے ہی ہنستے خندہ پیشانی کے ساتھ جان دیدی اور سب کو روتا چھوڑ گئے گویا اُن کا قول یہ تھا کہ ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خندہ بُدند و تو گریاں
تو چناں زی کہ بعد مردن تو
ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

انگریزی میں جو کہا جاتا ہے کہ He died in harness یہ جملہ ان پر صادق ہے۔ واقعی اُنھوں نے کام کرتے ہی کرتے جان دیدی۔ ہمیشہ اُن کے مزاج میں قناعت رہی قابلِ عزت افلاس میں بسر اوقات کی، لیکن مرتے وقت نیک کاموں کی دولت کثیر اپنے ساتھ لے گئے جس پہ بڑے بڑے مالداروں کو رشک ہونا چاہیے۔ اُن کی آزاد خیالی، راستبازی مستقل مزاجی اور کسر نفسی کے متعلق ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے بہت ٹھیک لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"He was a man of courage and courage was based on the solid foundation of selflessness firm as steel and pure as gold."

صاحبو! ان کی زندگی اس بات کا نمونہ تھی کہ کیونکر انسان جسمانی تکلیفوں کو ہمت کے ساتھ برداشت کرسکتا ہے اور زندہ دلی کے ساتھ اپنے محسنوں کا کام بخوبی تمام انجام دے سکتا ہے اور کیونکر تکلیف اور افلاس کی حالت میں بھی قناعت اور دیانت اور آزاد خیالی پہ مستقل مزاجی سے قائم رہ سکتا ہے اور صرف باتوں سے نہیں بلکہ عمل کے ذریعہ جوانوں اور بوڑھوں کا پیشوا بن سکتا ہے۔

ہم کو پنڈت صاحب مرحوم کی زندگی سے سبق سیکھنا چاہیے کیونکہ فقط عمل یعنی نیک کام ہی ہمارے ساتھ جائیں گے اور کچھ نہیں ؎

عمل کن کہ فردا نماند و لیک
جزائے عمل ماند و نام نیک

صاحبو! ہمارا رنج و غم اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم خیال کرتے ہیں کہ ہماری بدقسمتی بلکہ تمام ملک کی بدنصیبی سے ہمارے چند پیشوا اور حبیب وطن مثل کرشنا سوامی آئیر، مسٹر گوکھلے، مسٹر گنگا پرشاد ورما، مسٹر شبرا آئیر اور سر فیروز شاہ مہتا کے، اس تین برس کے عرصہ میں یکے بعد دیگرے اٹھ گئے اور اُن کے بعد ہمارے دوست مسٹر در بھی ہم کو داغ مفارقت دے گئے۔ یہ سب ایسے اشخاص تھے کہ زمانہ ہاتھ ملتا رہے گا کہ افسوس میں نے ایسے بے نظیر آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔ اہل لکھنؤ ہم سے بھی زیادہ افسوس کر رہے ہیں کیونکہ وہاں سے تین پیشوایان قوم یعنی بابو گنگا پرشاد ورما، پنڈت بشن نراین در اور پنڈت اقبال نراین مسلدان رخصت ہو گئے

جنگ عظیم پر پہلا لکچر

(زبانی)

جنوری ۱۹۱۵ء میں مشران صاحب، گریسی صاحب بہادر کلکٹر ضلع کی طرف سے جنگ عظیم پر لکچر دینے کے لئے وار لکچرر مقرر ہوئے۔ پہلا لکچر ۲۱ر مارچ ۱۹۱۵ء کو بمقام سرستی بھون واقع فرخ آباد زیر صدارت گریسی صاحب موصوف دیا گیا۔ لکچر تحریری تھا۔ اس کو پڑھنے سے پہلے مشران صاحب نے جو تقریر زبانی کی وہ درج ذیل ہے۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

میں آپ کی خدمت میں جنگ یورپ پر لکچر دینے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ تجویز یہ ہے کہ یہ لکچر ماہ بماہ ہوا کریں گے، تاکہ خواص و عوام کو جنگ کی صحیح اور تازہ خبریں معلوم ہوتی رہیں اور جو غلط مشہور ہوتی ہیں اُن کی تردید ہوتی رہے۔ بہت سی بیہودہ خبریں مشہور ہو جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ شہنشاہ جرمن قلعہ فتحگڑھ میں آ گئے اور حضرت جارج پنجم قیصر ہند قلعہ دہلی میں تشریف لے آئے۔ یہ خبریں اپنی تردید خود ہی کر دیتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان لکچروں کا سلسلہ پبلک کے لیے دلچسپ ہوگا اور جس طرح ملکہ شہر زاد نے الف لیلیٰ کے قصے تھوڑے تھوڑے بیان کیے تھے اور ہر رات قصہ کا باقی ماندہ حصہ سننے کے واسطے بادشاہ کے دل میں شوق باقی رہتا تھا، اسی طرح ممکن ہے کہ اس لڑائی کے حالات سننے کے لیے عوام کے دلوں میں ہر مہینہ ذوق و شوق باقی رہا کرے گا۔

اس لڑائی میں جو مہابھارت سے بہت بڑھ گئی ہے ڈیڑھ کروڑ فوج شریک ہے، حالانکہ مہابھارت میں فقط چالیس لاکھ فوج تھی۔ اس وقت تک فقط جرمنی کے تینس۳۰ لاکھ سپاہی مقتول و مجروح ہو چکے ہیں۔ جنگاہ میں کشتوں کے پشتے لگ گئے ہیں۔ میدان ہڈیوں سے سفید نظر آ رہے ہیں۔ تمام دشت و بیابان خون سے لالہ زار ہو رہے ہیں اور لاکھوں لاشیں بے گور و کفن طعمۂ زاغ و زغن ہو رہی ہیں۔ برطانیہ نے کمزور قوموں کی حفاظت کی غرض سے، بلکہ حقوق انسانی کو بحال و برقرار رکھنے کے واسطے تلوار میان سے نکالی ہے اس اصول پر کہ "جنگ بہ شمشیر آخر حیلہ ہاست" ؎

چو دست از ہمہ حیلتے در گسست — حلال ست بردن بہ شمشیر دست

ایسے بادشاہ کو جیسے جارج پنجم ہیں، اپنے زبردست دشمنوں سے بھی اندیشہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اُن کی تمام رعایا اُن کے لئے جان و مال سے حاضر ہے ؎

با رعیت صلح کن و ز جنگ خصم ایمن نشیں
زانکہ شاہنشاہ عادل را رعیت لشکر است

برٹش اور ہندوستانی فوج نے جو تعداد میں جرمن سے چوتھائی کبھی پانچواں حصہ کبھی چھٹا حصہ تھی مگر "مارل فورس"[1] Moral force میں بڑھی چڑھی تھی، جرمن کے دانت کھٹے کر دیے، اُس کے چھکے چھڑا دیے اور اُس کا قافیہ تنگ کر دیا۔ ہندوستانی فوج کی قوت برداشت اور عزم و استقلال حیرت انگیز ثابت ہوئے۔ ایسے جاڑے میں کہ جب پارہ مقیاس الحرارت صفر سے ۲۰ ڈگری نیچے چلا گیا تھا اور شعلہ بھی سردی سے کانپتا تھا اور آگ بھی ٹھنڈی ہوئی جاتی تھی، جبکہ آسمان پر ہر وقت کہرا چھایا رہتا تھا اور کرہ نار بھی کرہ زمہریر بن گیا تھا اور بقول نظامی کے سردی اس قدر تھی کہ ؎

دمہ دم فرو گیر چوں چشم گرگ
شدہ کارگر کینہ دوزاں بزرگ

ایسے موقعوں پر ہماری فوج نے مہینوں گزارا کیا اور وہ دادِ شجاعت دی اور وہ ہنگامہ کارزار گرم کیا جو جنگ رستم و اسفندیار کی مانند صفحۂ روزگار پر ہمیشہ یادگار رہے گا ؎

رستم رہا زمین پہ نہ سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

کبھی ہمارا سکھ سپاہی جرمن سپاہی سے لپٹ گیا۔ ایک نے سنگین ماری تو دوسرے نے تلوار کا وار کیا۔ دونوں کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے، لیکن ایسے گتھے ہوئے تھے کہ گویا دو اصیل مرغ باہم لڑ رہے ہیں جو باوجود سخت زخمی ہونے کے مُنہ نہیں پھیرتے اور زخم پر زخم کھا رہے ہیں ؎

تو گوئی خروسان شاطر بہ جنگ
ہم در فتادہ بمنقار و چنگ

چونکہ سکھ بمقابلہ جرمن کے جسمانی طاقت میں فائق تھا، اُس نے جرمن کو اٹھا کے دے ٹپکا

---

[1] یعنی حب وطن رکھکر پوری اطاعت کے ساتھ ملک و قوم کی خاطر جاں نثاری کا خیال ۱۲

اور ہلاک کر دیا لیکن خود بھی ایسا زخمی تھا کہ اُٹھ نہ سکا اور جاں بحق ہو گیا۔ اس طرح دونوں جانبازوں نے اپنے اپنے بادشاہوں کا حق نمک ادا کر دیا۔

صاحبو اس جنگ عظیم کا فوری سبب تو ظاہر ہے کہ ولی عہد آسٹریا اور اُس کی بیگم کا قتل ہونا تھا لیکن اصلی سبب آسٹریا کی زیادتیاں تھیں اور سب کی تہ میں جرمنی تھا جس کے بھروسے پر آسٹریا نے فوج کشی کی تھی۔ مسٹر بالفور نے جو اسپیچ برسٹل میں دی ہے، اُس میں لڑائی کا سبب بیان کرتے ہوئے بہت عمدہ الفاظ میں German Militarism کا حال بیان فرمایا۔ وہ کہتے ہیں۔

Unhappily for herself, unhappily for mankind, Germany had apparently felt that it was not sufficient to be great, honoured, wealthy and secure, but no nation worthy of the name, having domination within its grasp should fail by all means, fair or foul, to secure domination until it was secured.

یعنی اپنی بدقسمتی اور بنی آدم کی بدنصیبی سے جرمن نے بظاہر یہ سمجھ لیا تھا کہ ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم فقط ایک بڑی اور معزز قوم کہلائیں یا مال و دولت میں ممتاز یا دوسروں کے حملوں سے بے خطر رہیں، بلکہ ہماری ایسی قوم کو جس کا نام بڑا ہو اور جو دوسروں پر آسانی سے غالب آسکتی ہو یہ چاہیے کہ جائز ناجائز وسیلوں کی پرواہ نہ کرے اور دنیا پر اپنا اقتدار جمانے اور سکہ بٹھانے کی کوشش کرتی رہے یہاں تک کہ کامیاب ہو جائے۔ پس ظاہر ہے کہ جرمنی کی ملٹری پالیسی نے یورپ میں یہ آگ لگائی اور جس قدر کہ خون ناحق بندگان خدا کا آب باراں کی طرح بہایا جا رہا ہے اُس میں نہ سرویا کا قصور ہے نہ آسٹریا کا، نہ حلیفوں میں سے کسی کا، بلکہ قیامت تک یہ خون ناحق خسرو جرمن کی گردن پر رہے گا، نہ کسی اور کی گردن پر۔

برطانیہ نے جو اس جنگ عظیم میں شرکت کی ہے وہ حفاظت خوداختیاری کے اصول پر کی ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ جرمنی کے جور و جفا سے انسانی تمدّن اور آزادی دنیا کو نقصان پہونچنے والا ہے اور صلح کے نامہ و پیام کا کوئی اثر نہیں ہوا، تب اُس نے سن سی نیٹس (Cincinnatus) کی طرح تلوار میان سے نکال لی۔ جو اُس وقت تک میان میں نہ جائے گی جب تک دشمنوں کا خون نہ چاٹ لے اور اُن کو تلوار کے گھاٹ نہ اُتار دے۔ برطانیہ اور اُس کے حلیفوں کی طرف سے یہ لڑائی حق بجانب ہے۔ کیونکہ خویشتن دار قوموں کے نزدیک ایسی لڑائی بعض وقت ضروری ہوتی ہے اور تمام دنیا کے صلح جو اور جنگجو، دونوں فریق کی رائے اس پر متفق ہے جو حسب ذیل ہے۔

Both the pacifists and militarists are agreed that without doubt to defend one's right at peril of death is a most generous dead, without doubt the communities unwilling to do so soon fall into the lowest state of degradation, war is the one method of deciding international question. Said the Moscow Gazette in 1894, "that gross evils require gross remedies and great crises violent solutions, that in the long run certain evils become intolerable that an end must be made of those evils at all costs and that an end cannot be made of them except by war."

یعنی یہ کہ صلح جو اور جنگجو دونوں فریق کی رائے ہے کہ اپنے حقوق کے استحفاظ میں لڑنا اور جان کو خطرہ میں ڈالنا نہایت عمدہ کام ہے اور جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ جلد نہایت ذلت کے

درجہ کو پہونچ جاتی ہیں۔ جنگ صرف ایک ایسا ذریعہ ہے کہ جس سے معاملات بین الاقوام کا تصفیہ ہوجاتا ہے۔ ماسکو گزٹ سنہ ۱۸۹۶ء کا مقولہ ہے۔ "جب بیماری سخت ہوتی ہے تو علاج بھی سخت ہوتا ہے اور جب کوئی بڑی سخت خرابی پڑجاتی ہے تو اُس کے دور کرنے میں بہت سختی عمل میں لانا پڑتی ہے۔ بعض برائیاں اور خرابیاں اگر زیادہ مدت تک رہیں، تو قابل برداشت نہیں ہوتیں اور لازم آتا ہے کہ اُن کو دور کیا جائے۔ چاہے کچھ اپنے اوپر گذر جائے اور وہ بیخ و بن سے نہیں اکھڑ سکتیں مگر صرف جنگ کے ذریعہ"۔

گو دنیا میں مدبروں اور صلح جو لوگوں کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ جنگ کر کے خون ناحق نہ بہایا جائے، مگر وہ افتاد کو روک نہ سکے اور کبھی خویشتن داری کے جذبات، کبھی بہادری کے جوش اور ملک و دولت حاصل کرنے کی خواہشات، کبھی کمزوروں اور غریبوں کو مدد دینے کے شریفانہ خیالات قوموں کو باز نہ رکھ سکے۔ اور گو پہلے کے عہد و پیمان اکثر جنگ کو منع کرتے تھے، مگر لڑنے والوں کے ہاتھ کوئی نہ کوئی عذر و حیلہ ایسا آجاتا تھا کہ وہ صلح نامے سب کاغذ بادی ہوجاتے تھے۔ ع۔

ڈھونڈ لیتے ہیں بہانہ کوئی لڑنے والے

آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ روس اور پیرس کے مدبران سلطنت نے یہ اوسط نکالے ہیں کہ سنہ ۱۴۹۶ء قبل مسیح سے سنہ ۱۸۶۱ء تک یعنی ۳۳۵۸ برسوں میں صرف ۲۲۷ سال صلح کے گذرے باقی ۳۱۳۱ سال برابر لڑائی رہی جس کا اوسط یہ ہے کہ ایک سال صلح اور تین برس جنگ۔ یورپ میں آخر میں تین سو برس کے اندر ۲۶۶ لڑائیاں ہوئیں۔ اسی طرح مسٹر ڈیلرٹ (Vallement) لکھتا ہے کہ سنہ ۱۵۰۰ء قبل مسیح سے سنہ ۱۸۶۰ء تک یعنی ۳۳۶۰ برسوں میں آٹھ ہزار صلح کے عہدنامے ہوئے، اس غرض سے کہ اُن کا نفاذ ہمیشہ رہے گا، مگر اوسط یہ رہا کہ دو برس سے زیادہ کوئی صلحنامہ قائم نہ رہا۔

صاحبو۔ اس جنگ میں باوجودیکہ برطانیہ ۵ کروڑ روپیہ یومیہ خرچ کر رہا ہے، مگر اُس کی مالی حالت ایسی عمدہ ہے کہ بلجیم اور سرویا کو اُس نے قرضہ دیا ہے اور پانچ برس تک لڑائی اگر قائم رہی تو برطانیہ کو روپیہ کی کمی نہیں ہوسکتی اور اُس کا اعتبار اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ احمد آباد میں جو جرمن نظر بند ہیں انھوں نے سرکاری سیونگ بینک میں اپنا اپنا حساب کھولا ہے اور وہاں اپنا روپیہ جمع کر رہے ہیں۔ نیز برطانیہ کو رسد اور سامان جنگ کی بھی کمی کسی طرح نہیں ہے۔ اُس کے لئے سب راستے کھلے ہوئے ہیں۔ جرمنی میں تانبے کا قحط ہے اور وہ چلّا رہا ہے کہ راستے بند ہوجانے سے ساڑھے سات کروڑ جرمن رعایا کو غلّہ کے

فقدان سے تکلیف اُٹھانے کا بہت بڑا اندیشہ ہے ع۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

صاحبو۔ جنگ کے شروع میں مسٹر Redmond نے پارلیمنٹ میں کہا کہ آئرلینڈ اپنی حفاظت خود کرے گا۔ اُس کی حفاظت کے واسطے برٹش فوج کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہیں ہے اور وہ بھی خود اپنی حفاظت کرے گا کیونکہ گورنمنٹ کا برتاؤ ایسا عدل و انصاف اور رعایا پروری کا ہے کہ جس قدر رعایا ہے وہ گویا بجائے فوج کے ہے، جو بوقت ضرورت دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

جنگ بری و بحری و ہوائی میں برٹش کی فتح

ہماری گورنمنٹ نے بمقابلہ جرمنی کے جنگ بحری میں بہت بڑی فتح حاصل کی یعنی Falkland Island پر جنرل اور امیر البحر Sturdia نے، جو اپنے وقت کا نیلسن Nelson سمجھا جاتا ہے، نمایاں فتح پائی اور خشکی کی لڑائی میں حال کی فتح نیوشپل کی جنگ سخت میں حاصل کی، جو ۱۰ مارچ ۱۹۱۵ء کو ہوئی۔ جس میں ۱۸ ہزار جرمن مارے گئے اور ایک ہزار قید ہوئے۔ اُس لڑائی میں ہندوستانی فوج شریک تھی۔ سر جان فرنیچ نے، جو برٹش افواج کے قائد اعظم ہیں حضور وائسرائے کو فوج ہندی کی کارگزاری کی تعریف لکھی ہے۔ اس لڑائی میں برٹش توپوں نے بڑے عمدہ نشانے لگائے جس سے سخت نقصان دشمنوں کو پہونچا اور برٹش کا نقصان بہت کم ہوا۔ اس کی تصدیق قیدیوں کے بیان سے ہوتی ہے۔ اس جنگ میں توپیں سر ہوئیں، گراب چھوٹے اور گولے پھٹے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ گیا ہے اور زمین زلزلہ میں آگئی ہے اور بجلیاں گر رہی ہیں اور بادل گرج رہے ہیں۔ نیو مونٹ کی گولہ باری کے بعد دھاوا کیا گیا، تو جرمن ایسے بھاگے کہ سوائے ایک جگہ کے کہیں مقابلہ نہ کیا اور اُن کے سب مورچے اُڑا دیے گئے اور کشتوں کے پشتے لگ گئے ؎

رہی جب نہ زنہار تاب ستیز ۔۔۔ تو لی واں سے جرمن نے راہ گریز
سپاہ مخالف گریزاں ہوئی ۔۔۔ بیاباں میں یکسر پریشاں ہوئی
ہوئے کشتہ بس جرمنی یاں تلک ۔۔۔ کہ کشتوں کے پشتے لگے تا فلک

کیا ایسا برٹش نے جرمن کو تنگ — کہ ہرگز رہا پھر نہ یارائے جنگ
ہوا جمع توپوں کا ایسا دھواں
بنا آسماں اک نیا آسماں۔

۲۴ / فروری سنہ ۱۵ء کو ایک ہوائی جنگ ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی طرح ہوا پر بھی برٹش کا قبضہ ہو جائے گا۔ ۳۴ برٹش طیاروں نے Ostend Zealbrugge اور Blankenburg مقامات پر حملہ کیا اور جرمن کو سخت نقصان پہونچایا۔ جس وقت برٹش جہاز سمندر سے ہوا میں اُٹھتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سطح دریا سے بڑی بڑی چڑیوں کے جھنڈ ہوا میں اُٹھتے چلے آتے ہیں۔

صاحبان! چھوٹے چھوٹے افسروں اور کمسن لڑکوں کی بہادری سنیے۔ کیمرج یونیورسٹی کا ایک انڈر گریجویٹ، جو کمسن تھا، برٹش فوج کے ہمراہ تین ہفتے گذرے فرانس میں آیا۔ اُس کا عہدہ فوج میں subaltern تھا۔ اس کو حکم دیا گیا کہ جرمن کے فلاں فلاں مورچے فتح کرو۔ اس نوجوان نے سات مرتبہ متواتر حملے کیے۔ بالآخر سب مورچے فتح کر لیے اور فوج جرمن کو وہاں سے نکال دیا۔ اُس کی عقل اُس کی عمر سے بہت زیادہ تھی۔ فتح کرنے کے بعد مورچوں سے سو گز ہٹ کر اُس نے قیام کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب مورچے سُرنگ سے اُڑا دیے گئے۔ وہ افسر اور اُس کی ساری فوج صاف کوری بچ گئی۔ غور کیجیے کہ کس قدر دور اندیشی کا کام تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرمن کی فوج برٹش کے مقابلہ میں تعداد میں بہت زیادہ ہے، لہذا اُس کا فتح کرنا اور اُس کے مقابلہ میں سر بر ہونا برٹش کے لئے مشکل ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ واضح ہو کہ لڑائی میں، میدان جنگ میں Brute force یعنی گاؤزوری کام نہیں دیتی بلکہ جس میں moral force زیادہ ہوتا ہے، وہ کامیاب ہوتا ہے۔ پلاسی کی لڑائی میں تین ہزار برٹش اور ہندوستانی فوج نے سراج الدولہ کی اسّی ہزار فوج کو شکست فاش دی۔ جنگ اسائی میں پانچ ہزار برٹش فوج نے پچاس ہزار فوج کو بھگا دیا۔ ایک مقام پر چار ہزار برٹش فوج نے تیس ہزار فوج دشمن کو ہلاک کر دیا۔ غدر میں چالیس ہزار برٹش فوج نے دو لاکھ باغیوں کی قواعد داں اور بہادر فوج کو فتح کر لیا۔ اس جنگ میں جو درپیش ہے برٹش کے مقابلہ میں دشمن کی فوج چوگنی، پچ گنی، چھ گنی تک آجاتی ہے، مگر برٹش فوج کی

"اخلاقی قوت" کے سامنے اس کی ایک نہیں چلنے پاتی۔ اسی طرح ۱۷۹۶ء میں نپولین کی ۳۶ ہزار فوج نے آسٹریا اور سرڈینیا کی ۸۰ ہزار کو فتح کر لیا تھا اور ۶۰ ہزار فوج سے ایک لاکھ فوج جرار کو اس نے Austerlitz کے مقام پر شکست دی تھی۔ جب نپولین پانچ لاکھ فوج لے کر ماسکو کی مہم پر گیا تو شکست فاش کھائی۔ یہی حال افسروں کا ہے۔ ڈیوک ویلنگٹن moral force کام میں لاتا تھا اور ہمیشہ کامیاب ہوتا تھا۔ اس مارل فورس کا اثر جو لیس سیزر سے لے کر لارڈ نیپیر، Magdala تک ہر بڑے جنرل نے تسلیم کیا ہے اور یہ مارل فورس لشکر انگریزی اور اس کے افسروں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور جرمن فوج میں اس کی کمی بہت زیادہ ہے۔ اس لئے برٹش کی فتح یقینی ہے۔

وار فنڈ اور رنگروٹ

صاحبان والاشان۔ ہم لوگ کاندھے پر بندوق رکھ کر نہیں لڑ سکتے لیکن روپیہ سے مدد کر سکتے ہیں۔ ع

گر زر داری بزور محتاج نہ

ایسے نازک وقت میں ہم کو لازم ہے کہ ہم وار فنڈ میں شریک ہو کر اپنے حکام انگریزی اور برٹش گورنمنٹ پر پورا بھروسا کریں، جو ہماری جان و مال اور بال بچوں کی پوری محافظ ہے۔ یہ صرف برٹش گورنمنٹ کی بدولت ہے کہ ہم لوگ آرام کی نیند سوتے ہیں۔ ورنہ بلجیم کی ایسی حالت یہاں بھی ہو سکتی ہے کہ آج جو امیر ہے وہ کل فقیر نظر آئے۔ پس ہمکو اپنے ملک کو بچانے کے واسطے اور اپنی جان و مال و آبرو کو محفوظ رکھنے کے لئے گورنمنٹ کی مدد روپیہ اور رنگروٹوں سے کرنی چاہیے۔ تاکہ اس جنگ کے خاتمہ پر، جو جلد فتح کے ساتھ ہونے والا ہے، ہم ان نعمتوں اور برکتوں میں شریک ہوں جو ملنے والی ہیں۔ سو برس کا عرصہ ہوا کہ برطانیہ نے یورپ کو نپولین کے حملوں سے بچایا اور اس وقت بھی برطانیہ نے جرمن کو ایک محدود رقبہ کے اندر رکھا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم روپیہ اور رنگروٹوں سے گورنمنٹ کو مدد دے کر اپنی جاں نثاری اور شکر گزاری کا ثبوت دیں، تاکہ اس جنگ عظیم کا خاتمہ برطانیہ کی فتح پر ہو اور ہم جلد ان نعمتوں میں شریک ہوں جو مستقل صلح سے ہم کو حاصل ہونے والی ہیں۔

جنگ عظیم پر پہلا لکچر

(تحریری)

جنگ عظیم کے اصلی اور ظاہری اسباب و متحاربین کے باہمی تعلقات قدیم و جدید

یہ عالمگیر لڑائی جو جرمنی آسٹریا اور ٹرکی بمقابلہ روس، برطانیہ اور فرانس کے لڑ رہے ہیں بدترین یورپ کی رائے میں ناگزیر تھی جس کے واقع ہونے کا اندیشہ بیس برس سے تھا۔ جس طرح گھنگور گھٹا چھائی ہو، بجلی چمک رہی ہو اور بادل گرج رہے ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مینہ برسنے والا ہے اسی طرح یورپ کے بادشاہوں کا اپنی اپنی فوجیں بڑھانا اور لڑائی کا سامان جمع کرنا بتا رہا تھا کہ یقیناً کسی وقت یورپ میں لڑائی کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ جنگ سے دو مہینے بیشتر امید کی جاتی تھی کہ لڑائی یکایک نہ ہوگی، کیونکہ بلقان میں جو لڑائی کا گھر تھا صلح ہو چکی تھی اور سر ایڈورڈ گرے کی یہ کوشش کہ بلقان کے معاملات پر یورپ کے بادشاہوں میں لڑائی نہ چھڑ جائے، بظاہر کامیاب ہو گئی تھی لیکن صلح پسند لوگوں کی یہ کوششیں اور امیدیں سب بیکار گئیں، جبکہ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ ولی عہد آسٹریا مع اپنی بیگم کے بوسینیا کے دار السلطنت سراجو میں قتل کیے گئے۔ یہ خون ناحق بغیر بدلہ لیے کیونکر مان سکتا تھا، بلکہ پکار پکار کر اپنا خون بہا چاہتا تھا اور زبان حال سے یہ کہتا تھا ؎

قریب آتا ہے روز محشر چھپے گا احوال قتل کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر تو خوں پکارے گا آستیں کا

قاتل ایک نوجوان طالب علم بوسینیا کا رہنے والا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قتل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو سرویا میں ہو رہی تھی۔ آسٹریا کی گورنمنٹ کو سرویا سے بہت ملال ہوا اور اس نے ۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء کو ایک الٹی میٹم (پیام جنگ) سرویا کو بھیجا۔ جس میں چند مطالبات کیے جو اس قسم کے تھے کہ سرویا میں جو سازشیں آسٹریا کے خلاف ہوا کرتی ہیں وہ بند کی جائیں اور سازش

کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں (وغیرہ) اور تمام مطالبات کی تعمیل چند گھنٹوں کے اندر بلا عذر وحیلہ چاہی اور کوئی موقع غور اور مشورہ وغیرہ کا سرویا کو نہیں دیا۔ یہ مطالبات ایسے تھے کہ کوئی معزز اور خوددار قوم ان کو گوارا نہ کرے گی۔ سرویا نے اکثر شرطیں منظور کیں لیکن بعض کے منظور کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا نے ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو سرویا کے مقابل میں اعلان جنگ کر دیا۔ اصل میں آسٹریا نے اپنے مطالبات کی شرطیں اس غرض سے نہایت سخت رکھی تھیں کہ سرویا ان کو قبول نہ کرے اور لڑائی چھڑ جائے۔ وہی ہوا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جرمنی مجھ کو مدد دے گا اور روس و برطانیہ اور فرانس ایسی حالت میں ہیں کہ دخل نہ دیں گے۔ برٹش قوم آئرلینڈ کے معاملات سے خانہ جنگی کا اندیشہ کر رہی تھی۔ فرانس خود اقبال کر چکا تھا کہ ہماری فوج لڑائی کے لئے تیار نہیں ہے اور روس میں جہاز بنانے والے کاریگروں کی ایسی ہڑتال ہو رہی تھی کہ اس سے اندیشہ ہوتا تھا کہ مبادا ملک میں کوئی انقلاب ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ جاپان سے شکست کھانے کے بعد روس نے پورا سنبھالا بھی نہیں لیا تھا ایسے موقع آسٹریا نے خوب مناسب سمجھا کہ بلقان کے معاملات اپنی دلی خواہش کے مطابق طے کرنے اور اپنے ولیعہد کے قتل کو جس کے باعث تمام یورپ آسٹریا کا ہمدرد بن گیا تھا، لڑائی کی ایک معقول وجہ قرار دے۔

جرمنی پہلے کہہ چکا تھا کہ میں کسی بادشاہ کو آسٹریا کے معاملات میں دخل نہ دینے دوں گا مگر باوجود اس کے ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کو روس نے اپنی فوجوں کو جمع کیا۔ یہ دیکھ کر جرمنی نے ۳۱ جولائی کو روس کو الٹی میٹم یعنی پیام جنگ بھیجا اور یکم اگست ۱۹۱۴ء کو اشتہار جنگ روس کے مقابلہ میں دیدیا۔ اسی طرح جرمنی نے فرانس کو بھی ایک پیام جنگ بھیجا اور جواب کا انتظار نہ کر کے پہلی اگست کو بغیر اعلان جنگ کے فرانس پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے اس اثنا میں صلح قائم رکھنے کی سخت کوشش کی مگر بیکار گئی۔ البتہ اس کوشش سے یہ نتیجہ ہوا کہ اٹلی لڑائی میں شامل نہیں ہوا اور ہر فریق سے علیحدہ رہا۔ برطانیہ کی دوستی فرانس سے تھی اور جب جرمنی نے دھمکی دی اور قانون بین الاقوام کی پابندی سے منہ موڑا تو برطانیہ کو بیلجیم کے بارے میں اندیشہ ہوا۔ تب برطانیہ نے فرانس اور جرمنی سے پوچھا کہ بیلجیم کی غیر جانبداری اور عدم شرکت قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ فرانس نے

جواب دیا کہ ہاں، مگر جرمنی نے ٹال دیا اور یہ کہا کہ اس سوال کا جواب دینے میں ہمارا بھید کھلتا ہے
بلجیم چونکہ جرمنی کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتا تھا اس نے اپنے آپ کو بچانے کے واسطے برطانیہ
سے مدد کی درخواست کی اور یہی مناسب بھی تھا ؎

بلا سے امن اگر چاہے کوئی پیدا حمایت کر
ہوا گل کر نہیں سکتی چراغ زیر دامن کو

برطانیہ جو ہمیشہ سے انصاف اور آزادی کا حامی اور وعدہ کا سچا رہا ہے مدد پر تیار ہو گیا اور اس نے جرمنی کو الٹی میٹم بھیجا اور ۴ر اگست کو لڑائی کا اعلان کر دیا اور اسی دن یعنی ۴ر اگست کو جرمن فوج بلجیم میں داخل ہو گئی، گو بلجیم دہائی دیتا رہا۔

اب ہر شخص کے دل میں یہ سوالات پیدا ہوں گے کہ:۔

(۱) آسٹریا نے جو سرویا پر حملہ کیا اس کے اصلی اور صحیح سبب کیا ہیں۔
(۲) روس نے سرویا کو کیوں مدد دی۔
(۳) جرمنی نے کیوں دخل دیا اور آسٹریا کو مدد کیوں دی۔
(۴) فرانس کیوں روس کا شریک ہوا۔
(۵) اٹلی لڑائی سے کیوں الگ رہا۔
(۶) برطانیہ نے کیوں فرانس کے ساتھ دوستی کی۔
(۷) برطانیہ نے کیوں بلجیم پر حملہ کرنے کو لڑائی کی وجہ قرار دیا۔

ان سب کا جواب مختصر دینے کے لئے ضرور ہے کہ ان سب ملکوں کے تاریخی حالات اس جنگ عظیم سے پہلے کے بیان کیے جائیں۔

۳۰۰ء میں سلطنت روما کی حدود یورپ میں دریائے Rhine اور دریائے ڈینیوب Danube تھیں۔ Rhine کے پورب اور دریائے ڈینیوب کے اُتر میں جرمن یا ٹیوٹونک Teutonic فرقے کثرت سے بسے ہوئے تھے۔ جن میں سے بعض فرقے سلطنت روما سے لڑتے رہتے تھے۔ اُن جرمن فرقوں کے پورب میں اس نسل کے لوگ رہتے تھے جن کو ہم آج کل سلیو یا سلیوونک (Slavon Slavonik) کہتے ہیں۔ بس

جرمن دونوں فریق یعنی رومن یا سلیو کے درمیان جگہ گھیرے ہوئے تھے۔ چوتھی اور پانچویں صدیوں میں ان جرمن فرقوں نے سلطنت روما کے مغربی حصّہ میں اُس کی حکومت اور تہذیب کو برباد کردیا۔ جب سے جرمن پچھم کی طرف بڑھتے گئے، بعض سلیو فرقوں نے جرمن کے چھوڑے ہوئے مقامات پر وسط یورپ میں قبضہ کرلیا۔ یہ سلیو فرقے جنوبی مشرقی حصہ یورپ میں بھی آئے اور جزیرہ نمائے بلقان کے بڑے حصّہ پر قابض ہوگئے۔ یورپ کی تاریخ اگر نسلوں کے اعتبار سے پچھلے بارہ سو برس کی دیکھی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیٹن فرقے Romanised celts جرمن کو پیچھے ہٹاتے گئے اور جرمن فرقے سلیو فرقوں کو وسط یورپ میں فتح کرتے گئے۔ اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُسی پرانی لڑائی نے اب اس موجودہ جنگ عظیم کی شکل اختیار کرلی ہے، جس میں لیٹن اور سلیو ونک فرقے Latin and Slavonik اپنے یکساں دشمن یعنی جرمن کے مقابلہ میں لڑ رہے ہیں اور برطانیہ اعظم کو جس کو نصف ٹیوٹونک یعنی Semi Teutonic طاقت کہنا چاہیے کئی وجہ سے جو بیان کی جائیں گی، جرمن کے دوستوں سے لڑ رہا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں شارلمین بادشاہ فرینکس Franks نے مغربی یورپ کے اکثر حصّوں کو جو سلطنت روما میں شامل تھے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ لیکن یہ سلطنت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی اور ۸۴۳ء میں اُس کے تین حصّے ہوگئے۔ ایک حصّہ جو فرانس کہلایا شارلمین کے ایک پوتے کو ملا اور دوسرا حصّہ دریائے راین کے پورب کی طرف جس کو ہم جرمنی کہہ سکتے ہیں دوسرے پوتے نے پایا۔ اور تیسرا حصّہ درمیانی جو دریائے جرمن سے میڈی ٹرینین (Mediterranean) تک چلا گیا ہے اور اسے لاسپیل اور روما کو شامل ہے سب سے بڑے پوتے کے حصّہ میں آیا۔ پہلا اور تیسرا حصّہ تو ہم جنس تھا لیکن درمیانی حصہ کچھ جنسیت نہ رکھتا تھا۔ یہ درمیانی سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اٹلی، برگنڈی اور تھرنجیا جو اپنے حاکم لوتھر Luthor کے نام سے موسوم ہوا۔ جو مقام لورین کہلاتا ہے اسی پرانے تھرنجیا Thuringia کا Lorraine پہلے ایک چھوٹا حصہ تھا۔ پس یہ کہنا چاہیے کہ ایک ہزار سال گذشتہ سے جو لڑائیاں ان دونوں بیرونی سلطنتوں یعنی جرمن اور فرانس میں ہو رہی ہیں وہ اسی غرض سے ہو رہی ہیں کہ اس درمیانی حصّہ کے مقامات فتح کریں اور خصوصاً Thuringia تھرنجیا پر قبضہ حاصل کریں۔

زمانہ متوسط میں فرانس رفتہ رفتہ اتفاق کے باعث زیادہ طاقتور ہو گیا اور جرمنی کئی وجہوں سے اتفاق نہ رکھ سکا اور کمزور ہو گیا۔ پھر جرمنی کچھ عرصہ کے لئے جیت گیا اور اُس نے کل درمیانی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن فرانس نے اپنی حکومت بڑھاتے بڑھاتے اس درمیانی سلطنت میں جس قدر فرنچ بولنے والی قومیں تھیں سب کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور جرمنی سے اٹلی نکل گیا۔ جرمنی زمانہ متوسط کی پہلی صدیوں میں پورب کی طرف بڑھا اور سلیو (Slav) فرقوں کو اُس نے فتح کر لیا۔ آسٹریا اور برین ڈن برگ Brandinburg جس کو اس وقت پروشیا Prussia کہتے ہیں اور زمانہ حال کی سلطنت سیکسنی Saxony یہ سب اُسی سرزمین میں تھے جو جرمنی نے سلیو Slav فرقوں سے چھین لی اور اب جرمنی حکومت اور دباؤ بالٹک سمندر کے کنارے فن لینڈ تک پھیل گیا۔ جب پولینڈ اور بوہیما Bohamia کی سلیو سلطنتوں نے زور پکڑا تو پورب کی طرف جرمنی کا بڑھنا رک گیا، لیکن سلیو قوم کو دوسری طرف نقصان پہونچا۔ کیونکہ وسط ایشیا کی ایک قوم میگیرز Magyars یا ہنگیرین Hangarians نے نکل کر اُن کو فتح کر لیا اور وسط یورپ کے میدانی حصوں پر قریب ۹۰۰ء کے قابض ہو گئے۔

جزیرہ نمائے بلقان میں کچھ مدت کے بعد دو سلیو سلطنتوں کی بنیاد پڑ گئی یعنی سرویا اور بلغاریہ کی۔ ان دونوں سلطنتوں نے مع روس کے قسطنطنیہ کے ذریعہ مذہب عیسوی اختیار کیا۔ گریک چرچ یعنی یونانی طریقہ مذہب کے پابند ہوئے اور رومن چرچ یعنی رومیوں کے طریق مذہب کے پیرو نہ بنے۔ ان میں سے کبھی ایک نے کبھی دوسرے نے سلطنت روما کے پوربی حصہ کو دبا لیا، لیکن جس طرح اس وقت ایک دوسرے کے دشمن ہیں اسی طرح اُس وقت بھی اُن کے باہم نا اتفاقی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں نے چودھویں صدی میں اُن کو فتح کر لیا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ترکوں نے اُتر کی طرف قدم بڑھایا۔ اور سولھویں صدی میں ہنگری کا بہت سا حصہ فتح کر کے اکثر سلیو (Slav) فرقوں کو اپنی رعایا بنا لیا۔

زمانہ حال میں یورپ میں فرانس اور جرمنی کی دشمنی نے کچھ دوسرا پہلو اختیار کیا ہے جب سے کہ آٹھویں چارلس بادشاہ فرانس نے ۱۴۹۴ء میں اٹلی پر حملہ کیا۔ یہ ایسی مہم تھی کہ جس نے فرانس کو اسپین سے لڑا دیا جو اس وقت سسلی پر قابض تھا۔ اٹلی پر حملہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور سلطنت

ہیپسبرگ (Hapsburg) کے باہم ڈھائی سو برس لڑائی چھڑی رہی۔ آسٹریا کے آرچ ڈیوک کچھ مدت تک جرمنی یا یوں کہنا چاہیے کہ سلطنت روما کے شہنشاہ منتخب ہوتے رہے اور پھر اُن کی شادیاں ایسے شاہی خاندانوں میں ہوئیں کہ ان تعلقات سے نیدرلینڈز Netherland نیپلس Naples بوہیمیا Bohamia اور وہ حصّہ ہنگری کا جو ترکوں کے قبضہ سے بچا ہوا تھا، یہ سب اُن کے قبضہ میں آگئے۔ فرانس اٹلی پر قابض نہ رہ سکا اور لمبارڈی پر خاندان ہیپسبرگ Hapsburg کا قبضہ ہوگیا جو ساڑھے تین سو برس تک قائم رہا۔ چارلس پنجم Charles جو خاندان Hapsburg میں سب سے بڑا بادشاہ گذرا ہے، چارلس دی بولڈ the bold ڈیوک آف برگنڈی Duke of Burgandy کا پرپوتا تھا اور اس کو نیدرلینڈز netherland ورثہ میں ملا اور جو پُرانی لڑائی ڈیوکس آف برگنڈی Dukes of Burgandy اور شاہان فرانس میں چلی آتی تھی وہ بھی گویا اُس کی وراثت میں آئی۔ ۱۵۵۶ء میں جب چارلس پنجم تخت سے دست بردار ہوا تو اس خاندان کے جرمنی علاقے اُس کے بھائی فرڈی نینڈ Ferdinand کو ملے اور ان کے ساتھ شہنشاہ کا خطاب بھی۔ باقی سلطنت اس کے بیٹے فلپ دوم شاہ اسپین کے قبضہ میں آئی، لیکن اس خاندان Hapsburg کی دونوں شاخیں ملی جُلی رہیں اور فرانس اور اسپین میں جو لڑائیاں سولھویں اور سترھویں صدیوں میں ہوئیں وہ اصل میں اسی پُرانی دشمنی کا پہلو لیے ہوئے تھیں، جو فرانس اور جرمنی میں چلی آتی تھی۔

یہاں پر سمجھ لینا چاہیے کہ ملکہ الیزبیتھ Elizabeth کے وقت میں انگلستان اور اسپین کے باہم جو سخت لڑائیاں ہوئیں اُن کا سبب یہی تھا کہ اسپین کے قبضہ میں نیدرلینڈز Netherlands تھا جس کو زمانہ حال میں ہالینڈ اور بلجیم کہتے ہیں۔ انگلستان نیدرلینڈز سے بہت کچھ واسطہ رکھتا تھا۔ اور خاص کر فلینڈرز Flanders سے جو نیدر اینٹ ورپ Antwerp کو شامل ہے، تجارت کی غرض سے انگلستان اور فلینڈرز کے بڑے بڑے شہروں میں ہمیشہ دوستی رہتی تھی۔ چودھویں صدی میں تیسرے ایڈورڈ نے فرانس کے خلاف Flemish شہروں سے دوستی کے عہدنامے لیے اور پندرھویں صدی کے آخر میں چوتھے ایڈورڈ نے چارلس دی بولڈ Charles the Bold کو جس کے قبضہ میں Flanders

تھا گیارھویں لوئی شہنشاہ فرانس کے مقابلہ میں مدد دی۔ نپولین بوناپارٹ کا قول تھا کہ اگر کسی بحری طاقت رکھنے والے بادشاہ کے قبضہ میں اینٹ ورپ (Antwerp) ہو تو گویا انگلستان کے سر پہ ایک بھرا ہوا پستول ہے۔ اس لئے ضرور تھا کہ جب برطانیہ اور اسپین میں جنگ ہو تو برطانیہ یہ پسند کرے کہ نیدرلینڈز میں بغاوت ہو اور ڈچ قوم کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے یہی عمل انگلستان کی طرف سے ہوا تھا۔ تب ہی اسپین کے Invincible Armada نے انگلستان پر حملہ کیا تھا۔ جب اسپین کی قوت گھٹ گئی تو برطانیہ نے بھی اپنی پالیسی بدل دی۔ اس وقت فرانس کی طاقت ایسی بڑھ گئی تھی کہ خطرناک ہو گیا تھا۔ پس برطانیہ اور فرانس کے باہم جو سخت لڑائیاں سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے آخر میں ہوئیں وہ زیادہ تر اسی غرض سے ہوئی تھیں کہ نیدرلینڈز فرانس کے قبضہ میں نہ آجائے۔

سولھویں اور سترھویں صدیوں میں فرانس نے باوجودیکہ وہ رومن کیتھولک تھا، پروٹسٹنٹ مذہب کا طرفدار ہو کر جرمنی کی مذہبی لڑائیوں میں دخل دیا اور وہ درمیانی سلطنت جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس کا کچھ اور حصہ حاصل کر لیا۔ بعض مقامات تو فرنچ زبان بولنے والے تھے باقی سب خصوصاً آلسس (Alsace) خالص جرمنی تھے۔ چودھویں لوئی نے سترھویں صدی کے نصف آخر میں بہت مضبوط ارادہ کر لیا تھا کہ جو حدود قدیم گال کی تھیں وہی نئی سلطنت فرانس کی حدود قائم کرے اور اغلباً وہ دریائے رائن (Rhine) کو فرانس کی سرحد قرار دینے میں کامیاب بھی ہو جاتا بشرطیکہ ولیم آف آرنیج اور برطانیہ نے اس کو روکا نہ ہوتا۔ چودھویں لوئی کو اس کوشش میں ناکامی ہوئی اور اسپین کی تخت نشینی کی جنگ جو پیش آئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کے جو جو علاقے اٹلی میں تھے اور نیز نیدرلینڈز یہ سب اسپین سے نکل کر آسٹریا کے قبضہ میں چلے گئے۔ اس وقت اسپین کا بوربن بادشاہ تھا جو اسی چودھویں لوئی کا پوتا تھا۔ اسی تاریخ سے آسٹریا کا اقتدار اٹلی میں کامل طور پر ہو گیا اور بلجیم کی طرف سے جس کو اب آسٹرین نیدرلینڈز Austrian Netherlands کہنا چاہیے، کچھ عرصہ کے لئے برطانیہ کو اطمینان ہو گیا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں آسٹریا نے ترکوں کو ہنگری سے باہر نکال کر دریائے ڈینیوب کے پار ان کو ہٹا دیا۔ ایک طرف ان نئی فتوحات کے ذریعہ اور دوسری طرف اٹھارھویں صدی کے آخر میں پولینڈ

(Poland) کے تقسیم ہونے سے جو حصہ آسٹریا میں شامل ہوا، ان دونوں وجہوں سے سلیو، سلیو ونک Slav or Slavonik نسل کی رعایا کا بہت بڑا حصہ آسٹریا کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ اس وقت میں پرشیا (Prussia) کی طاقت کو فروغ ہوا اور فریڈرک اعظم کے عہد میں آسٹریا کا اقتدار جرمنی میں کم ہوگیا اور صوبہ سلیشیا (Silisia) آسٹریا کے ہاتھ سے نکل گیا۔

فرانس کے انقلاب کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں فرانس نے تھوڑے عرصہ کے واسطے وہ بات حاصل کرلی جو چودھویں لوئی کے منصوبہ میں رہتی تھی یعنی بلجیم، ہالینڈ اور دریائے (Rhine) کا بایاں کنارہ فتح کرلیا۔ جب یہ برطانیہ نے دیکھا کہ فرانس اپنی سلطنت میں بلجیم ہالینڈ کو ملانے والا ہے تو وہ جنگ پر آمادہ ہوگیا۔ نپولین کے زوال کے بعد وائنا کانگریس کے فیصلہ سے یورپ کا نقشہ بدل گیا اور حسب ذیل چار تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔

(الف) پروشیا نے بڑے بڑے جرمن مقبوضات پائے۔ جن میں دریائے (Rhine) کے صوبے شامل تھے۔

(ب) بلجیم آسٹریا سے چھڑا کر سلطنت نیدر لینڈز میں ہالینڈ سے ملا دیا گیا تاکہ فرانس کا مقابلہ کرسکے۔

(ج) آسٹریا کو لمبارڈی وینیشیا (Venitia) اسٹریا (Istria) اور ڈالمیشیا (Dalmatia) مل گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن نسل کی رعایا آسٹریا سے کم ہوگئی۔ اور اٹیلین اور سلیوونک (Italian & Slovonik) فرقے پہلے سے بہت زیادہ اُس میں بڑھ گئے۔

(د) جرمنی ۳۸ صوبوں یا ریاستوں کا مجموعہ قرار دیا گیا۔ نپولین نے بلا علم و ارادہ جرمنی کے حق میں بڑا فائدہ پہونچایا۔ ۱۸۰۳ء میں اُس کی حمایت میں ڈھائی سو سے زیادہ چھوٹی چھوٹی جرمن ریاستیں نیست و نابود ہوگئیں۔ اس طرح کہ چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں کو ملاکر ایک بڑی سلطنت بنادی گئی۔ جو شہر آزادی کے حقوق رکھتے تھے وہ بڑی ریاستوں سے ملحق کردیے گئے اور جن ریاستوں کا تعلق مذہبی جماعتوں سے تھا وہ اُن سے نکال کر عامہ رعایا سے متعلق کردی گئیں اور آس پاس کے صوبوں میں شامل کردی گئیں۔ یہ کام جو نپولین نے کیا تھا اُس کو وائنا کانگریس نے بلاتغیر ویسا ہی رہنے دیا اور اس

مجموعی طاقت نے جب زور پکڑا تو متحد سلطنت جرمنی قائم ہوگئی۔

سلطنت نیدر لینڈز کے متعلق وائنا کانگریس نے جو انتظام کیا تھا وہ اچھی طرح چل نہ سکا اور ۱۸۳۰ء میں اہل بلجیم نے بغاوت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے بادشاہان یورپ نے بیچ میں پڑکر بلجیم کی خود مختاری کی اور آزادی کو تسلیم کرلیا۔ بلجیم کا لبرل فرقہ تو یہ پسند کر لیتا کہ بلجیم کو فرانس میں شامل کردیا جائے، مگر اس میں پھر لڑائی کی آگ یورپ میں بھڑک اٹھتی۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ بلجیم ایک بادشاہ کی حکومت میں رہے اور پانچ بڑے بڑے بادشاہان یورپ ذمہ دار ہیں کہ یہ ریاست خود مختار اور لڑائی کے وقت سب سے علٰحدہ اور بے تعلق رہے گی اور فرانس اور برطانیہ کی فوج بری اور بحری نے ہالینڈ پر دباؤ ڈال کر یہ فیصلہ تسلیم کرالیا۔ بلجیم کی یہ حالت آخر جولائی ۱۹۱۴ء تک بدستور قائم رہی جب ۱۹۱۴ء میں فرانس اور جرمنی میں لڑائی چھڑی تو دونوں فریق نے برطانیہ کو یقین دلایا کہ اس لڑائی میں بلجیم سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ رہے گا۔ اور یہ وعدہ پورا کیا گیا۔ اس وقت سے یہ اندیشہ کیا جاتا تھا کہ اگر دوبارہ جنگ ہوئی تو جرمنی کو اس وعدہ پر عمل کرنا دشوار ہوجائے گا چنانچہ اس موجودہ لڑائی میں وہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔

انیسویں صدی کے وسط میں آسٹریا اور پرشیا (Prussia) میں دشمنی بڑھ گئی۔ ۱۸۵۹ء میں آسٹریا کو بہت بڑا صدمہ پہونچا۔ اٹلی نے آسٹریا کی حکومت سے بغاوت کی جس کا سرگروہ بادشاہ سرڈینیا (Sardinia) تھا۔ وکٹر ایمانیول بادشاہ سرڈینیا اور کونٹ کیوُر (Cavour) اٹلی کے مدبر اعظم نے نپولین سوم شہنشاہ فرانس سے مدد حاصل کرلی اور ۱۸۵۹ء میں آسٹریا کو شکست دے کر لمبارڈی چھین لیا۔ اس شکست کے ہوتے ہی جس قدر چھوٹے چھوٹے والیان ریاست جزیرہ نمائے اٹلی میں آسٹریا کے بھروسے پر حکومت کرتے تھے، بے اختیار کردیے گئے اور اٹلی کی سلطنت موجودہ عالم وجود میں آگئی۔ اس مدد کے صلہ میں فرانس کو دو صوبے سیوا سے اور نیس (Savoy & Nice) ہاتھ آئے جو اسی مذکورہ بالا سلطنت وسطی کا حصہ تھے۔

اسی زمانہ میں پرشیا (Prussia) میں ۱۹ صدی کا ایک نہایت مشہور و معروف وزیر باتدبیر بسمارک نام آسمان شہرت پر آفتاب کی طرح چمکا۔ یہ وہ فرزانہ یورپ تھا جس نے شاندار سلطنت جرمنی بنائی۔ یہ وزیر کبیر بے نظیر کنزرویٹیو (Conservative) تھا اور لبرل

خیالات اور حکومت دستوری کا سخت دشمن تھا۔ صرف دو خیال اُس کے ذہن میں رہتے تھے۔ ایک یہ کہ سلطنت شخصی کا اقتدار برقرار رہے اور پروشیا (Prussia) کا جاہ و جلال بڑھتا رہے۔ اس کا ارادہ نہایت مضبوط اور ہمت نہایت بلند تھی عقل کا نہایت تیز اور تدبیر کا بڑا گاڑھا تھا لیکن اپنی تدبیروں پر عمل کرنے میں جائز یا ناجائز وسیلوں کی زیادہ پرواہ نہ کرتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ جرمنی میں آسٹریا اور پروشیا (Prussia) دونوں کے لئے کافی جگہ نہیں ہے۔ ع۔

بہ ملکے نہ گنجند دو بادشاہ

پس درمیان سے آسٹریا کو ہٹا دینا چاہیے۔ آسٹریا کو دبانے کے واسطے فوج کی ضرورت تھی اور ایسی فوج مہیا کرنے کے لئے ضرور ہوا کہ پروشیا کی پارلیمنٹ کی مرضی کے خلاف عمل کیا جائے۔ ہر چند کہ مخالفت بہت ہوئی مگر بسمارک نے اپنے مطلب میں کامیابی حاصل کر لی۔ ڈنمارک کے قبضہ میں دو ڈچی تھیں یعنی Schlesswig & Holstein ان دونوں کو پروشیا کے واسطے لینے کا خواہشمند بسمارک بہت زیادہ تھا۔ اس معاملہ پر جرمنی میں اُس وقت لوگوں کو بہت سرگرمی تھی۔ بسمارک نے آسٹریا کو ترغیب دی کہ شریک ہوکر دونوں ڈنمارک پر حملہ کریں۔ چنانچہ یہ حملہ ہوا اور یہ دونوں مقامات ڈنمارک سے جدا کر لیے گئے۔ اب نہایت چالاکی سے بسمارک نے فتح کیے ہوئے مقامات کی بٹائی پر آسٹریا سے جھگڑا کیا۔ اس وقت پروشیا کی فوج تیار رکھی اور اُس کے پاس برج لوڈ بندوقیں تھیں اور مشہور جنرل مولٹکی (Moltke) فوج کا سردار تھا۔ گو اکثر جرمن ریاستیں اس موقع پر آسٹریا سے مل گئیں لیکن پروشیا سے سر بر نہ ہو سکیں اور ۱۸۶۶ء میں سات ہفتہ کے عرصہ میں آسٹریا کو پناہ مانگنا پڑی۔ آسٹریا کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا گیا۔ وینیشیا (Venitia) اٹلی کو دلا دیا گیا کیونکہ وہ پروشیا کا دوست تھا اور جرمنی کے حدود سے باہر نکال دیا گیا۔ لیکن جو اس کے مقبوضات جرمنی میں تھے وہ چھینے نہیں گئے۔ اب پروشیا نے ذیل کے مقامات شامل کر کے جرمنی کی مجموعی طاقت کو خوب مضبوط کر لیا:۔

Schlesswig, Holstein,
Hanover, Hisse-Cassel, Hisse-nassau & Frankfort.

اور دوسرے سال یعنی ۱۸۶۷ء میں جنوبی جرمن ریاستوں سے دوستی کے عہد و پیمان کیے جن میں آسٹریا سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اب آسٹریا کو کوئی چارہ نہ رہا۔ بجز اس کے کہ وہ مشرقی یورپ کی طرف توجہ کرے۔

اب فرانس کی خبر لینے کی باری آئی۔ بسمارک نے لوئی نپولین شہنشاہ فرانس کو پورا بیوقوف بنایا۔ اُس نے دیکھا کہ فرانس کو پروشیا کا طرفدار بنانے میں پروشیا کا فائدہ ہے اور خود شہنشاہ فرانس سے ملاقاتیں کر کے اس کو اپنا مددگار بنالیا۔ نپولین کیا سمجھا کہ پروشیا کی طاقت جس قدر بڑھے گی، اُسی قدر آسٹریا کا مقابل ہو کر اُس کو کمزور کر دے گا۔ اس کے سوا بسمارک نے اس کو امیدیں دلائیں اور وعدے کیے کہ پروشیا اور آسٹریا کی لڑائی میں اگر فرانس دخل نہ دے تو اُس کو معاوضہ میں نیا ملک ملے گا۔ جب پروشیا اور آسٹریا میں جنگ چھڑ گئی تو فرانس خاموش رہا۔ شہنشاہ فرانس نے یہ اُمید باندھی کہ جب آسٹریا اور پروشیا لڑتے لڑتے تھک جائیں گے تب میں بیچ میں پڑوں گا اور معاوضہ میں دریائے راین (Rhine) کا بایاں کنارہ لے لوں گا۔ فرانس کی بدقسمتی سے آسٹریا اور پروشیا کی جنگ جلد ختم ہو گئی۔ جب تک صلح نہیں ہوئی فرانس اپنا مطالبہ نہ کر سکا۔ جب اُس نے اپنے معاوضہ کا مطالبہ کیا تو بسمارک نے یہ درخواست نہایت حقارت سے نامنظور کی۔ پہلے شہنشاہ فرانس نے دریائے (Rhine) کے بائیں کنارہ کا کچھ حصہ چاہا۔ جب یہ نامنظور ہوا تب بلجیم مانگا اور آخر میں لکسمبرگ کے خریدنے کی اجازت چاہی، لیکن کوئی درخواست منظور نہ ہوئی۔ نپولین نے بیوقوفی سے اپنی یہ درخواستیں اور تجویزیں لکھ کر دیدی تھیں۔ بسمارک نے جنوبی جرمن ریاستوں کو اُن تجویزوں سے اطلاع دے کر اُن سے دوستی کے عہد و پیمان کر لیے اور جب فرانس اور جرمنی میں ۱۸۷۰ء میں جنگ ہوئی تو نپولین کی تحریری درخواست بلجیم لینے کی مشتہر کر کے برطانیہ کو فرانس کے خلاف کر دیا۔

۱۸۷۰ء میں جو لڑائی فرانس اور جرمنی میں ہوئی وہ اصل میں اُسی لڑائی کا قدرتی نتیجہ تھی جو ۱۸۶۶ء میں آسٹریا اور پروشیا میں ہو چکی تھی۔ پروشیا نے جب آسٹریا پر فتح پائی تو اُس کی طاقت بڑھنے لگی اور فرانس کو یہ دیکھ کر خوف پیدا ہوا۔ گو نپولین خود لڑنا نہیں چاہتا تھا، مگر اُس کے دوستوں میں ایک فریق تھا جو یہ خیال کرتا تھا کہ اگر فرانس کو فتح حاصل ہوئی تو نپولین کے خاندان کی زیادہ مضبوطی ہو جائے گی یعنی اُس کی اولاد کے واسطے فرانس کا تخت محفوظ ہو جائے گا۔ بسمارک خود لڑائی چاہتا تھا تاکہ شمالی جرمن صوبوں کا جو مجموعہ بنا ہے وہ زیادہ مضبوط ہو جائے اور جنوبی جرمن ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے ہیں وہ جنگ میں مددگار ہوں۔ نپولین نے آسٹریا اور اٹلی سے

جو پروشیا پر حملہ کرنا چاہتے تھے، دوستانہ عہد و پیمان کیے تاکہ پروشیا پہ حملہ کرنے میں مدد دیں، لیکن بسمارک نے کہا "تو ڈال ڈال میں پات پات" اور جیسے ہی فوج کو تیار پایا، دن سے لڑائی چھیڑ دی۔ اُس نے وہ ڈھنگ اختیار کیا کہ سبھوں نے یہ سمجھا کہ فرانس سینگ کر کے لڑتا ہے۔ بسمارک نے ایک سازش کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ہوہن زولرن Hohenzollern شہزادہ اسپین کے تخت پہ بیٹھے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ بات فرانس کو ناگوار گذرے گی۔ اس سازش کا نتیجہ اُس کی اُمید کے خلاف ہوا یعنی اُس شہزادے نے اُمیدوار بننے سے دست برداری کی، لیکن فرانس نے یہ چاہا کہ شاہ پروشیا ضمانت کرے کہ دوبارہ وہ شہزادہ تخت اسپین کا امیدوار نہ بنے گا۔ بسمارک جو لڑائی مول لینا چاہتا تھا یہ سمجھ کے کہ شکار جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا دوبارہ خود بخود پھنس گیا، اُس نے یہ سوچا کہ شاید اب بھی لڑائی ٹل جائے اس لیے ایسی تدبیر کرنا چاہیے کہ لڑائی یقینی ہو جائے۔ فرنچ سفیر نے جو گفتگو شاہ پروشیا سے بوقت ملاقات ضمانت کے بارہ میں کی تھی، اُس ملاقات کے حالات بسمارک نے نون مرچ لگا کر مشہور کیے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ پروشیا سمجھا کہ سفیر نے ہمارے بادشاہ کی توہین کی اور فرانس نے یہ خیال کیا کہ بادشاہ نے ہمارے سفیر کی تحقیر کی۔ دونوں فریق لڑائی پر تل گئے۔ زمانہ حال میں جب موجودہ قیصر جرمنی اور بسمارک کے باہم رنجش ہوئی اور بسمارک کو وزارت چھوڑنا پڑی تو بسمارک فخریہ کہا کرتا تھا کہ میں نہ ہوتا تو فرانس سے جنگ نہ ہوتی۔ جب لڑائی چھڑی تو جنوبی جرمن ریاستیں Baden, wartemberg, Bavaria وغیرہ سب شمالی جرمن ریاستوں سے مل کر لڑائی میں پروشیا کی مددگار ہو گئیں اور فرانس کو شکست فاحش نصیب ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کی سلطنت کو زوال پہونچا اور نئی متحد سلطنت جرمنی وجود میں آئی اور بادشاہ پروشیا اُس کا شہنشاہ کہلایا۔ فرانس کو تین ارب روپیہ تاوان جنگ ادا کرنا پڑا اور صوبجات آلسس و لورین Alsace-Lorraine اُس سے چھن گئے۔ آلسس کے باشندے جرمن نسل سے ہیں۔ لیکن دونوں صوبے پہلے سے فرنچ کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ اور گو ۴۳ برس سے فرانس سے جدا ہو کر جرمنی کے قبضہ میں رہے لیکن بدستور فرانس کے ہمدرد ہیں جس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروشیا کا طریقہ حکومت اُن کو پسند نہیں ہے۔ یہ دونوں صوبے جرمنی نے فوجی اغراض کے لئے اپنے قبضہ میں لیے تھے۔ لیکن بموجب اس مقولہ کے کہ "ہنوز چشمش نگرانست کہ

ملکش یادگر السنت"۔ جب قوم سامنے دیکھ رہی ہے کہ ہمارا ملک ہمارا دشمن دبائے بیٹھا ہے، کیونکر اُس کے دل میں ملال نہ ہوگا اور غصہ کی آگ نہ بھڑکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ۴۳ برس سے اب تک فرانس اور جرمن میں سخت عداوت چلی آتی ہے اور اسی باعث فرانس اور جرمنی نے ۱۹ صدی کے آخر میں اپنی اپنی فوجیں بہت بڑھا دیں اور سامان بھی بہت جمع کیا۔ جرمنی کی اُمید کے خلاف فرانس نے شکست کے بعد بہت جلد سنبھالا لیا۔ ۱۸۷۵ء میں جرمنی پھر فرانس کو دھمکیاں دینے لگا۔ اس وقت ایسا نازک موقع تھا کہ وکٹوریہ ملکہ انگلستان اور شہنشاہ روس دونوں کو دخل دینا پڑا۔ چونکہ فرانس کمزور تھا اُس کو یہ خواہش ہوئی کہ کسی زبردست بادشاہ سے دوستی و امداد کا عہد و پیمان کرے جو ضرورت کے وقت پناہ کا کام دے۔

چنانچہ جب ۱۸۹۱ء میں روس نے جرمنی کے مقابلہ میں دوستانہ امداد کا معاہدہ فرانس سے کرنا چاہا تو فرانس کو بے حد خوشی ہوئی۔

اب یہاں سے یورپ کے جنوب مشرق کا حال لکھا جاتا ہے جہاں کہ ٹرکی کے مقابلہ میں ہرزِگوینا (Herzigovina) نے بغاوت کر کے مشرقی مسئلہ کو پھر تازہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو سرویا اور ٹرکی میں لڑائی ہوئی اور پھر ۱۸۷۷ء میں روم و روس میں جنگ ظہور میں آئی۔ ٹرکی کو شکست ہوئی اور Sanstafano کے عہدنامہ کے ذریعہ روس اور ٹرکی میں صلح ہوگئی۔ تب برطانیہ نے دخل دیا اور روس کو مجبور کیا کہ بادشاہوں کی پنچایت میں یہ عہدنامہ پیش کرے۔ یہ پنچایت برلن میں ۱۸۷۸ء میں ہوئی، جس کا سرپنچ پرنس بسمارک تھا۔ اس پنچایت کا یہ فیصلہ ہوا کہ سرویا، مانٹی نیگرو، رومانیہ آزاد اور خودمختار سلطنتیں کر دی گئیں اور بلغاریہ کو سیلف گورنمنٹ کا حق دے دیا گیا۔ آسٹریا نے چونکہ کسی کی طرفداری نہیں کی تھی اس لئے اُس کو یہ بدل ملا کہ بوسینیا اور ہرزگوینا پر قبضہ رکھ کر ان ریاستوں کا انتظام کرے اور سنجاق پر جو سرویا اور مانٹی نیگرو کے درمیان پرانے سرویا کا ایک ٹکڑا ہے، قابض ہو جائے۔ اب آسٹریا کو ضرور ہوا کہ دو لاکھ فوج رکھ کر اپنے نئے مقبوضات کا انتظام کرے جس کی رعایا زیادہ تر نسل کے اعتبار سے سرویین تھی۔

برلن کانگریس یعنی برلن کی پنچایت کے بعد آسٹریا اور روس میں دشمنی ہو چلی۔ اس وقت تک بسمارک کے تعلقات جو غیر ملکوں کے ساتھ تھے، وہ اس اصول پر تھے کہ آسٹریا اور روس دونوں سے

دوستی رکھی جائے۔ اب اُس کو یہ لازم آیا کہ اُن میں سے ایک سے دوستی رکھے۔ چنانچہ اُس نے آسٹریا سے یہ معاہدہ کیا ۱۸۷۹ء میں کہ اگر روس آسٹریا پر حملہ کرے تو جرمنی آسٹریا کا مددگار ہوگا۔ ۱۸۸۲ء میں اٹلی بھی آسٹریا کا شریک ہوگیا اور یوں اتحادِ ثلاثہ قائم ہوگیا۔ بظاہر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی اپنے دشمن آسٹریا کا شریک ہو جائے، لیکن اس وقت اُس کو اپنے دوست فرانس کی طرف سے شبہ اور رنج تھا، کیونکہ فرانس نے ٹیونس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس معاہدہ میں جو آسٹریا اور اٹلی کے درمیان ہوا تھا کمزوری تھی، کیونکہ جو بعض مقامات آسٹریا کے ایسے تھے کہ جہاں اٹیلین زبان بولی جاتی تھی، اُن کی طرف اٹلی بہت لالچ کی نظر ڈالتا تھا۔ اسی طرح جزیرہ نمائے بلقان میں بحر ایڈریاٹک (Adriatic) کے کناروں پر آسٹریا اور اٹلی کے تعلقات ایک دوسرے کے خلاف ہیں، اس وجہ سے کچھ تعجب نہیں کہ اٹلی نے موجودہ لڑائی میں یہ سمجھا ہو کہ آسٹریا کا حملہ سرویا پر چونکہ محض زبردستی سے ہے اس لئے میری علیحدگی اس لڑائی سے میری بدنامی کا باعث نہیں ہوسکتی۔ بسمارک یہ چاہتا تھا کہ اگر آسٹریا روس پر حملہ کرے تو شہنشاہ روس فرانس سے مدد نہ مانگے، اس لئے باوجودیکہ اتحادِ ثلاثہ قائم تھا، بسمارک نے روس سے ایک خفیہ معاہدہ ۱۸۸۷ء میں کیا کہ آسٹریا کے حملہ کے وقت جرمنی روس کا مددگار ہوگا۔

۱۸۸۸ء میں موجودہ شہنشاہ ولیم جرمنی کے تخت پر بیٹھے۔ گو یہ بسمارک کے شاگرد تھے اور اس کی اعلیٰ لیاقتوں کو سراہتے تھے، لیکن سب پر جلد روشن ہوگیا کہ دو شخص جو ایسے ضدی ہوں وہ ساتھ ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ ۱۸۹۰ء میں اس وزیر اعظم کو استعفا دینا پڑا اور جب وہ اپنے گھر بیٹھا تو اپنی گورنمنٹ کی کارروائیوں پر سخت اعتراض کیا کرتا تھا۔ شہنشاہ ولیم کی پالیسی غیر ملکوں کے معاملات میں بسمارک کی ایسی نہ تھی۔ اس لیے اُس نے خفیہ عہد نامہ کو جو روس اور جرمنی کے باہم ہوا تھا تازہ نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور روس آپس میں مل گئے اور اُنھوں نے اتحادِ ثلاثہ کے مقابل میں "اتحادِ اثنین" ۱۸۹۵ء میں قائم کیا۔ جاپان کی لڑائی کے بعد جب روس تھک کر کمزور ہوگیا تو جرمنی نے فرانس کی طرف غصہ اور حقارت کی نگاہ ڈالنا شروع کی۔ اُس وقت فرانس کو روس کی دوستی کی قدر معلوم ہوئی۔ پس یہ اُنھی عہدناموں کی وجہ سے ہے کہ موجودہ جنگِ عظیم میں جرمنی نے آسٹریا کی طرفداری کی اور فرانس نے روس کا ساتھ دیا۔

۱۸۷۸ء میں جو فیصلے اور انتظام برلن کی پنچایت کے ذریعہ ہوئے تھے وہ تیس برس تک قائم رہے۔ ۱۹۰۸ء میں جب ٹرکی میں حکومت دستوری قائم ہوئی تو آسٹریا اور بلغاریہ کو اندیشہ ہوا کہ اگر ٹرکی کے انتظام حکومت میں اصلاح ہوگئی تو ترک اپنے دور افتادہ صوبوں کو پھر اپنے قابو میں لانا چاہیں گے۔ اس لئے آسٹریا نے بوسینیا اور ہرزگوینا کو اپنی قلمرو میں ملالیا اور بلغاریہ نے اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ آسٹریا کے اس عمل سے سرویا کو نہایت غصہ آیا کیونکہ بوسینیا کی رعایا سروین قوم کی تھی اور سرویا کی جو آرزو تھی کہ کسی وقت وہ سب قوم سرویا کو ملاکر ایک بڑا سرویا بنائے گا وہ ہمیشہ کے لئے خواب وخیال ہوگئی۔ ایسے وقت میں روس نے سرویا کی طرفداری کی۔ لیکن جب جرمنی آسٹریا کی مدد پر جھکا تو روس کو ہٹ جانا پڑا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک جاپان کی جنگ کے صدمے جھیل رہا تھا۔ سرویا نے اپنی سلطنت بڑھانے کے واسطے اپیل کی اور چاہا کہ سنجاق حاصل ہوجائے تاکہ سرویا کی سرحد مانٹی نیگرو سے مل جائے۔ لیکن یہ بات آسٹریا کو نہایت ناگوار تھی۔ اس لئے اس نے سنجاق ٹرکی کو دیدیا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان ہوئی تو سرویا نے سنجاق فتح کرلیا بلکہ کچھ اور زیادہ ملک لے لیا اور یہی کامیابی جو سرویا کو حاصل ہوئی یورپ کی اس جنگ عظیم کی بنیاد ہے۔

اب اس سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے کہ کیوں آسٹریا نے سرویا سے لڑائی ٹھانی۔ آسٹریا ہنگری، سرویا کی طاقت توڑنا چاہتا ہے۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ آسٹریا ہنگری میں ڈھائی کرور رعایا یعنی آدھی مردم شماری سے زیادہ سلیو (Slavs) قوم ہے اور ان میں پچاس لاکھ سے زیادہ سروین ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہم سرویا کی حکومت میں آجائیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرویا ہمیشہ آسٹریا کی رعایا کو اپنا ہمدرد بنانے اور آسٹریا سے مخالفت کرانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یہ سازشیں برابر جاری رہا کرتی ہیں۔ آسٹریا انہی سازشوں کو بند کرنا چاہتا ہے۔ دوسری وجہ آسٹریا کے حملہ کی یہ ہے کہ جرمنی کی پالیسی مشرقی معاملات میں جو کچھ بسمارک کے وقت میں تھی اس سے بالکل بدل گئی ہے اور اب وہ ٹرکی کے ایشیائی علاقے لینے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس غرض سے سلطان روم سے دوستی بڑھانے کے لئے جرمنی بہت سرگرمی سے کوشش کرتا ہے اور اسی باعث ایشیائے کوچک اور وادی فرات میں بغداد ریلوے وغیرہ میں جرمنی کا روپیہ لگانے کے لئے سلطان روم کو بہت آسانیاں حاصل ہوئی ہیں۔ چونکہ جزیرہ نمائے بلقان میں ہوکر راستہ ہے اس لئے سرویا کی

طاقت بڑھ جانے سے اندیشہ ہے کہ وہ راستہ جرمن کو نہ ملے گا۔ اس لئے جرمنی اور آسٹریا نے آپس میں اتفاق کرکے یہ تجویز کیا ہے کہ یہ راستہ کھلا رہنا چاہیے اور یہ غرض حاصل کرنے کے لئے سرویا کی طاقت توڑکر اس کو اپنا ماتحت بنا لینا چاہتا ہے۔

یہ ناممکن تھا کہ روس خاموشی سے سرویا کو پامال کرا دیتا۔ روس یہ نہیں کہہ سکتا کہ بڑے آدمیوں کو قتل کرانے کے واسطے سازشیں کرائے یا سازش کرنے والوں کو مدد دے۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ ولیعہد آسٹریا کے قتل سے آسٹریا کو ایک حصہ ملتا ہے کہ سرویا پر حملہ کرے اور اس کی خودمختاری مٹادے تو اس سے پھر رہا نہ گیا اور اس نے سرویا کی طرفداری کی۔ اول تو روس کے تعلقات جزیرہ نمائے بلقان سے ہیں۔ علاوہ اس کے روسی اور سروین قوم دونوں ایک نسل سے ہیں اور دونوں کا مذہب ایک ہے۔ ان وجہوں سے روس اپنے کمزور بھائیوں کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔ روس ہی نے پہلے سرویا کو سلف گورنمنٹ کا حق دلایا تھا اور بعد میں خودمختاری اور اگر روس ١٩٠٨ء میں کمزور نہ ہوتا تو اس وقت بھی سرویا کو بغیر مدد دیے نہ رہتا۔ آسٹریا اور جرمنی نے اگر یہ سمجھا کہ پہلے کی طرح روس اب بھی کمزور ہے اور ہم کو سرویا پر حملہ کرنے دے گا یا ہماری گیدڑ بھبکی میں آکر ہٹ جائے گا تو سخت غلطی کی۔

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کے تعلقات جو فرانس اور جرمنی سے تیس سال گذشتہ سے رہے ہیں مختصر طور پر بیان کیے جائیں۔ اس مدت میں پہلے پندرہ برس تک فرانس اور برطانیہ میں پورے طور پر دوستی نہ تھی۔ برٹش کا قبضہ مصر پر رہنے سے فرانس کو رنج تھا اور چند نو آبادیوں کے تعلقات کے سبب فرانس اور برٹش میں جنگ کا اندیشہ رہا کرتا تھا۔ ١٨٩٨ء میں جبکہ Major Marchand نے فشوڈا پر جو دریائے نیل کے اوپر کے حصہ میں واقع ہے قبضہ کیا تھا تو اس وقت برٹش کے ساتھ لڑائی ٹھن جانے کا اندیشہ بہت زیادہ تھا کیونکہ انگریز فشوڈا کو اپنی حد اختیار کے اندر سمجھتے تھے۔ اس وقت لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی مگر برٹش اور فرنچ میں دشمنی زیادہ بڑھ گئی۔ شہنشاہ جنت آشیاں Edward the peace maker کی دوربینی و مصلحت اندیشی کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے، جنھوں نے فرانس اور برطانیہ میں دوستی پیدا کرکے مدتوں کی دشمنی کی بنیاد مٹا دی جس کا بہت بڑا فائدہ آج دونوں قوموں کو پہنچ رہا ہے۔ ١٩٠٣ء میں شہنشاہ ایڈورڈ فرانس تشریف لے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ١٩٠٤ء میں دونوں قوموں میں

سمجھوتا ہوگیا اور جو بنیاد فساد چلی آتی تھی اُس کا تصفیہ ہوگیا۔ اُس وقت سے فرانس اور برطانیہ میں دوستی
شروع ہوئی جس کا نتیجہ دوسرے ہی سال دکھائی دیا۔ یعنی فرانس نے برطانیہ کا قبضہ مصر پر تسلیم کر لیا
اور برطانیہ نے اُس کے بدلہ میں فرانس کو مراکو کے معاملات میں پورے اختیارات دیدیے۔
اس موقع پر شہنشاہ جرمنی نے دخل دیا اور ۱۹۰۵ء میں مقام ٹانجیر (Tangier)
میں جاکر وہاں کے سلطان کی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ چونکہ جرمنی کے تعلقات تھے اس
وجہ سے لازم آیا کہ یورپ کی قوموں کی ایک کانفرنس یعنی پنچایت بیٹھے جو اس معاملے کو سلجھا دے۔ چنانچہ
۱۹۰۶ء میں بمقام Algeirs یہ پنچایت ہوئی اور اس وقت برطانیہ نے فرانس کی
طرفداری کی اور آسٹریا نے جرمنی کو مدد دی اور برٹش اور فرنچ میں دوستی زیادہ بڑھ گئی۔ اس سال جبکہ
سر چارلس ہارڈنگ (جو لارڈ ہارڈنگ ہوکر اب ہمارے ویسرائے ہیں) سینٹ پیٹرس برگ میں سفیر
تھے، اس وقت روس اور برطانیہ میں عہدنامہ کی غرض سے نامہ و پیام ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء
میں شہنشاہ ایڈورڈ کی صلح جوئی اور دور اندیشی اور برٹش سفیر کی مدبری سے اس عہدنامہ پر دستخط ہو گئے
جو Anglo-Russian Convention کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت سے روس اور
برطانیہ میں دوستی کا رشتہ مضبوط ہوگیا۔ ۱۹۱۱ء میں جب مراکو کے معاملات پھر تازہ ہوئے اُس وقت
جرمنی جنگی جہاز پینتھر (Panther) نامی ساحل مراقش پر یکایک پہونچ گیا اُس وقت برطانیہ نے
فرانس کی مدد کی اور اپنی فوج بحری تیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی اور فرانس میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی
برطانیہ نے جو دوستی فرانس سے پیدا کی اُس کا کچھ تو سبب اور کچھ نتیجہ یہ تھا کہ جرمنی کے
ساتھ برطانیہ کے تعلقات میں فرق آگیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں جب فرانس اور جرمنی کے باہم جنگ ہوئی
برطانیہ میں اکثر اشخاص جرمنی کے طرفدار تھے۔ گو بعضے بسمارک کی جنگ و جدل کی حکمت عملی کو ناپسند
کرتے تھے۔ جب فتح کے بعد جرمنی کی سلطنت مضبوط ہوگئی تو برطانیہ کو ہمدردی تھی اور برسوں برطانیہ
نے جرمنی کی دوستی کا پورا خیال رکھا۔ لیکن ۱۸۸۴ء میں جرمنی نے غیر ملکوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں
تو اُس وقت انگلستان کو بسمارک کی حکمت عملی ناپسند آئی اور کسی قدر دشمنی پیدا ہوئی۔ پھر بھی برطانیہ
نے یہ خیال کیا کہ اگر جرمنی نوآبادیاں قائم کرنا چاہتا ہے تو یہ خیال بیجا نہیں ہے اس لئے جو جھگڑے فساد
تھے اُن کا فیصلہ دوستانہ ہوگیا اور برطانیہ نے جرمنی کو افریقہ اور جنوبی سمندروں میں نوآبادیاں قائم

کرنے سے نہیں روکا گو وہ اپنی زبردست فوج بحری سے روک سکتا تھا۔ جو لوگ جرمنی کو پہچانتے تھے، خوب واقف تھے کہ انگلستان کی سلطنت بحری کو جرمنی نہایت حسد کی نظر سے دیکھتا ہے اور خاصکر یہ سمجھتا ہے کہ جنوبی افریقہ میں ٹرانسوال اور انگلستان کے باہم دشمنی ہونے سے جرمنی کی طاقت وہاں قائم ہو جائے گی۔ جب ڈاکٹر جیمس کی مہم کو ناکامی ہوئی اور شہنشاہ جرمنی نے پریسیڈنٹ کروگر کو مبارکباد کا تار جنوری سنہ ۱۹۰۶ء میں بھیجا تو جاننے والوں کو کچھ تعجب نہیں ہوا۔ البتہ نہ جاننے والوں کو حیرت ہوئی۔ اسی وقت سے جرمنی کی طرف سے برطانیہ کھٹک گیا اور برطانیہ کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جرمنی کا دلی ارادہ کچھ اور ہے اور وہ ہرگز انگلستان کا دوست نہیں ہے۔

اگر کروگر کو کسی غیر ملک سے مدد ملنے کا بھروسا نہ ہوتا تو جنگ ٹرانسوال شاید پیش نہ آتی۔ اگر اس وقت جرمنی دشمنی سے کام لینا چاہتا تو ممکن نہ تھا کیونکہ اس کی بحری طاقت کم تھی۔ اس وقت سے جرمنی نے اپنی فوج بحری کو بڑھایا اور اگر برطانیہ بھی اپنی فوج بحری جرمنی کے مقابل نہ بڑھاتا تو جرمنی کی بحری طاقت تمام دنیا میں سب سے زبردست ہو گئی ہوتی۔ جب برطانیہ نے دیکھا کہ جرمنی میں یہ تیاریاں ہو رہی ہیں تو وہ سوچا کہ ایسی زبردست فوج بحری کی ضرورت جرمنی کو کیوں ہے۔ برطانیہ چونکہ خود ٹاپو ہے اور اس کی سلطنت اور تجارت ملکوں ملکوں پھیلی ہوئی ہے اس لئے اس کو بہت زیادہ جہاز اور فوج بحری رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اپنی حفاظت کرے۔ جرمنی نے چونکہ تجارتی جہازوں کا بیڑا بنایا تھا اور غیر ملکوں میں کہیں کہیں نوآبادیاں بھی قائم کر لی تھیں اس لئے اس کو بھی یہ خواہش ہونا چاہیئے تھی کہ سمندر پر میری طاقت مضبوط رہے۔ لیکن جس بڑی تعداد سے وہ جہاز اور فوج بحری بڑھا رہا تھا اس سے اور کوئی غرض نہیں پائی جاتی تھی بجز اس کے کہ برطانیہ کی طرح میں بھی سمندر کا مالک بن جاؤں اور جس طرح خشکی پر میرا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا ویسے ہی سمندر پر بھی میرا سامنا کوئی نہ کر سکے اور تمام دنیا میرے اشاروں پر چلے۔ جرمنی کی اس دشمنی سے فرانس اور برطانیہ میں اور بھی زیادہ دوستی ہو گئی اور برطانیہ نے اپنی فوج بحری بڑھائی اور فرانس اور برطانیہ کے باہم یہ معاہدہ ہوا کہ اگر فرانس اپنے جہاز دریائے Mediterranean میں رکھے تو برطانیہ اپنے جہاز جرمن کے سمندر میں رکھے گا۔ تین برس گذرے جب جرمنی نے مراقش (مراکو) کے معاملہ میں فرانس کو دھمکی دی تھی تو اسی معاہدہ کے سبب برطانیہ نے جرمنی پر ظاہر کر دیا تھا کہ فرانس کے بحری

کناروں اور فرینچ نوآبادیوں کی حفاظت، برطانیہ بمقابلہ جرمنی کے کرے گا۔

اب جرمنی کے مقابل میں جو برطانیہ نے اعلان جنگ کیا ہے وہ دو سبب سے ہے۔ اوّل تو یہ کہ انگلستان یہ معاہدہ فرانس سے کر چکا تھا کہ جرمن کے مقابل میں اُس کو مدد دے گا۔ برطانیہ کی عزّت اس میں قائم رہتی تھی اور ذاتی فائدہ بھی اسی میں تھا کہ وہ فرانس کی مدد پر کھڑا ہو جائے تاکہ فرانس کا بازو نہ ٹوٹ جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر برطانیہ مدد کا وعدہ فرانس سے نہ کر چکا ہوتا تب بھی اُس کا فرض تھا کہ بلجیم کی سلطنت کو ٹوٹنے نہ دے، نہ اُس کو کسی لڑائی سے سروکار اور واسطہ رکھنے دے، کیونکہ برطانیہ ان باتوں کا ضامن ہو چکا تھا۔ اس کے سوا جب جرمنی نے بلا وجہ بلجیم سے لڑائی ٹھانی اور بلجیم نے مدد کے لئے برطانیہ سے اپیل کی تو برطانیہ کے لئے شرم کی بات تھی، اگر اُس اپیل کو منظور نہ کرتا۔ جب جرمنی نے اپنا عہد توڑا یعنی بلجیم کو لڑائی میں پھنسایا تو اُس نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم اپنا آدھا وعدہ پورا کریں گے یعنی بلجیم کی سلطنت کو مسلم رکھیں گے اور اُس کو ٹوٹنے نہ دیں گے، لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں، وہ سمجھ گئے کہ جرمنی کا مطلب کیا ہے اور نیز یہ کہ اُس کے وعدں کا اعتبار کچھ نہیں ہے ؎

اُس کے اقرار میں انکار ہے اور ہاں میں نہیں
عہد میں عہد یہ پیماں کسی پیماں میں نہیں

اس میں شک نہیں کہ یہ جنگ عظیم نہایت افسوس کے لائق ہے اور جو تکلیفیں اور مصیبتیں اس کے باعث لوگوں پر پڑ رہی ہیں اور پڑیں گی وہ بے شمار ہیں، تب بھی بعض موقعوں پر بے عزتی کی صلح سے جنگ بہتر ہوتی ہے اور یہ موقع برٹش سلطنت کی تاریخ میں اسی قسم کا ہے۔ برطانیہ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُس کا معاملہ سچا ہے اور اسی سچائی کا یقین کر کے اُس نے انصاف اور آزادی کی حمایت میں تلوار میان سے کھینچی ہے جو یقیناً اُس وقت میان میں جائے گی جبکہ وہ دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دے گا اور انسانی تہذیب و تمدن کا پشت پناہ بن کر اُسے جرمنی کے وحشیانہ ظلم و ستم سے بچائے گا اور کمزور قوموں اور ملکوں کو اپنی اصلی حالت پر بحال کرا دے گا۔

برطانیہ کی طرف سے و نیز تمام اتحادی قوموں کی طرف سے یہ جنگ حق بجانب ہے، کیونکہ خوشتن دار قوموں کے نزدیک ایسی لڑائی بعض اوقات ضروری ہوتی ہے اور تمام دنیا کے صلح جو

اور جنگجو، ہر دو فریق متفق ہیں کہ اپنے حقوق کے استحقاق میں لڑنا اور جان کو خطرے میں ڈالنا نہایت فیاضی کا کام ہے اور جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ جلد نہایت ذلت کے درجے کو پہونچ جاتی ہیں۔

ٹرکی کی شرکت

اکتوبر ۱۹۱۴ء کے آخر میں یعنی جبکہ جنگ شروع ہوئے تین مہینے گذر چکے تھے، ٹرکی جرمنی کے دباؤ سے اور اُس کی مدد کے بھروسے پر اس لڑائی میں شریک ہو گیا، جس سے برطانیہ کو سخت افسوس ہوا۔ یورپ میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں ہے جس کا دانت قسطنطنیہ پر نہ ہو۔ صرف برطانیہ ایسا ہے جو ٹرکی کی سلطنت کو صحیح و سالم رکھنا چاہتا ہے اور ہمیشہ اُس کا دوست اور خیر خواہ رہا ہے اور کئی مرتبہ اُس کو دوسرے بادشاہوں کے حملہ سے بچا چکا ہے۔ مثلاً جب ۱۷۹۸ء میں نپولین نے ملک شام اور ایشیائے کوچک پر قبضہ کرنا چاہا تو برطانیہ نے اپنی فوج بحری سے اُس کو روک دیا، اسی طرح ۱۸۵۴ء میں برٹش نے ٹرکی کا طرفدار ہو کر روس کے مقابلہ میں Crimean war میں حصہ لیا تھا، جس میں محاصرہ سیباسٹوپول Sebastopol بہت مشہور ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ روس کے مقابلہ میں ٹرکی کی محافظت کر دی گئی تھی۔ علاوہ اس کے تمام دنیا میں جس قدر آبادی مسلمانوں کی ہے یعنی اٹھارہ کرور اسّی لاکھ اُس کے نصف سے زیادہ یعنی ۹ کرور باسٹھ لاکھ برطانیہ کی حکومت کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی مردم شماری ہے، تو سمجھنا چاہیے کہ برطانیہ اسلام اور اسلامیوں کا حامی و مددگار دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اُس سے چھیڑ کرنا اور اُس سے دشمنی مول لینا ٹرکی کو مناسب نہ تھا کیونکہ اُس کی دشمنی سے بہت بڑے نقصان ہو سکتے ہیں اور فرانس سے لڑنے میں ٹرکی اپنے ہاتھ سے ایسی قوم کی ہمدردی کھو بیٹھا جو ٹرکی کی مالی حالت درست کر دیتی اور برطانیہ سے جو عداوت برتی تو گویا ایسی قوم سے مخالفت کی جو ٹرکی کو ہمیشہ آزاد اور خود مختار اور زبردست سلطنت دیکھنا پسند کرتی ہے اور اسلام اور اسلامیوں کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ جرمنی کا ساتھی ہو کر ٹرکی نے گویا ایسی قوم کی شرکت کی ہے جو اُس کی ایشیائی سلطنت اور قسطنطنیہ میں اپنا زور اور دباؤ قائم کرنا چاہتی ہے۔

جرمنی نے جو بغداد ریلوے بنائی ہے وہ اسی غرض سے ہے کہ عراق، عرب اور ایشیائے کوچک سے

خلیج فارس تک ریل کی راہ پر جگہ جگہ اپنی نو آبادیاں قائم کر دے اور اپنا قبضہ جما دے۔ اسی ریل کا ایک آخری حصہ ہے جو ۱۹۱۶ء میں ختم ہو جائے گا اور بغداد سے خلیج فارس تک چلا گیا ہے۔ یہ ریل بن گئی تو ایک زبردست فوجی طاقت رکھنے والی قوم، یعنی جرمنی کے قبضہ میں ایسا راستہ آجائے گا جو ہندوستان کی طرف سیدھا چلا آیا ہے۔ یعنی وہی راستہ جس طرف سے سکندر اعظم نے دریائے اٹک تک حملہ کیا تھا۔

حضرت سلطان المعظم اور اُن کی عزیز رعایائے جاں نثار نہیں چاہتی تھی کہ برطانیہ سے لڑے۔ مگر افسوس کہ وہ سب مجبور و معذور رہیں۔ کیونکہ آج کل تمام طاقت اور اختیارات فوج کے ہاتھ میں ہیں یا ینگ ٹرکس (Young Turks) کی جماعت کے ہاتھ میں، جن میں ایسے ارکان و عہدہ دار ہیں جنہوں نے یورپ میں اور خصوصاً جرمنی میں تعلیم پائی ہے اور اس وجہ سے جرمن کے طور و طریق اور جرمنی کے طریقہ جنگ و حرب اور شیوہ طعن و ضرب کو پسند کرتے ہیں اور جرمن کی صحبت اور اُن سے خلا ملا رکھنے کا اثر ہے کہ ترکوں نے جرمنی سے اتفاق کیا جس کے باعث جرمنی کی طرح ٹرکی میں بھی لڑائی کی آگ بھڑک اُٹھی ؎

کون کہتا ہے نہیں گرمی صحبت میں اثر
جل اُٹھا پنبہ شرر سے جو ہم آغوش ہوا

ٹرکی میں ایک فریق ایسا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ غیر ملکوں کے ساتھ ٹرکی کی صلح اور ملک کے اندر امن و امان رہے اور رعایا میں ناراضی نہ پھیلے اور برطانیہ سے پھر نئے سرے سے دوستی ہو جائے۔ اس فریق کے سرگروہ کامل پاشا تھے اور حضرت امیر المسلمین محمد خاں پنجم بھی اسی فریق میں ہیں۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ یہ سب بندگان خدا جو اصل میں نہایت دور اندیشی اور عقلمندی کی راہ پر ہیں، کچھ کر نہیں سکتے، کیونکہ فوج اور اُس کے سردار انور پاشا سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ اگر ٹرکی کی پالیسی اب بھی بدل جائے اور برطانیہ کے خلاف نہ ہو تو ممکن ہے کہ برطانیہ ٹرکی کے ایشیائی مقبوضات کی حفاظت کر دے اور قسطنطنیہ کوئی نہ لے سکے اور ٹرکی کی تمام سلطنت مسلم اور برقرار رہ جائے۔ برطانیہ اس وقت جو کچھ کر رہا ہے، خوشی سے نہیں بلکہ نہایت افسوس اور مجبوری سے حفاظت خود اختیاری کے اصول پر کر رہا ہے اور اُس کا یہ عمل اس لئے نہیں ہے

کہ اسلام اور اسلامیوں کو نقصان پہونچائے بلکہ اس لئے کہ جرمنی کا اختیار اور قابو قسطنطنیہ پر نہ جمنے پائے جو اس وقت ظاہر میں تو مددگار رہے مگر وہی مسلمانوں اور اسلام کو سخت نقصان پہونچانیوالا ہے۔ اس لڑائی کی حالت میں بھی برطانیہ نے عرب اور عراق کے تمام متبرک مقامات اور نیز بندر جدّہ کو حملہ سے محفوظ رکھا اور حضور ویسرائے بہادر نے اپنی نہایت خیر خواہ مسلم رعایا کی خاطر اعلان کر دیا ہے کہ عرب کے تمام متبرک مقام اور نیز بندر جدہ پر کوئی حملہ نہ کیا جائے اور ہندوستان کے حاجیوں کو جو اُن مقامات کو جائیں کوئی تکلیف نہ پہونچائی جائے اور برٹش گورنمنٹ کی سفارش سے فرانس اور روس نے بھی یہی وعدے کیے ہیں۔

حال میں جب ٹرکی اور اٹلی کے باہم جنگ تھی یا جب بلقان کی لڑائی میں ٹرکی مبتلا تھا تو ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں نے نہایت فیاضی سے اپنے بھائیوں کی یعنی ترکوں کی مدد کی تھی۔ یہ بات نہایت پسندیدہ تھی کیونکہ اُن لڑائیوں میں اصل میں اسلام کو خطرہ تھا۔ اسی طرح اس وقت مسلمانانِ ہند نے نہایت احسانمندی اور ایمانداری ثابت کی کہ گورنمنٹ برطانیہ کا ساتھ دیا اور جان و مال سے خدمت کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ کیونکہ گورنمنٹ برطانیہ نے اُن کو آزادی (مذہبی اور ہر قسم کی) اور اعلیٰ تربیت و تعلیم اور اعلیٰ درجہ کے حقوق ملکی دے رکھے ہیں جو دنیا میں کسی بادشاہ کی حکومت میں مسلمانوں کو حاصل نہیں ہیں۔ روس کی سلطنت میں جو ترکمان اور تاتاری مسلمان آباد ہیں جن کی تعداد (۱۲۱۵۰۰۰۰) ایک کروڑ اکیس لاکھ پچاس ہزار ہے، اُنھوں نے روس کا ساتھ دیا ہے اور فرانس کی سلطنت میں جو الجزائر و ٹیونس وغیرہ کی مسلمان رعایا ہے جس کی تعداد ایک کروڑ اٹھائیس لاکھ ہے، اُس نے فرانس کے ساتھ خیر خواہی اور جاں نثاری کا اظہار کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قوم ایسی ہے جو اپنے حاکم وقت کی فرمانبردار و اطاعت شعار اور وفادار و جاں نثار ہے۔ ہندوستان کے تمام مسلمان ٹرکی وزیروں کی غلطی پر افسوس کیا کرتے ہیں جنھوں نے ٹرکی کو جنگ میں شریک کرا دیا اور نہایت اخلاص و سچائی سے اُن کو آگاہ کرتے ہیں کہ ؎ ز مہر دشمن پیمان دوست بشکستی

بہ بیں کہ از کہ بریدی و باکہ پیوستی

حضور ویسرائے کے پاس جو سیکڑوں تار مسلمانوں کی پبلک جماعتوں نے بھیج کر اپنی خیر خواہی

اور وفاداری کا یقین دلایا ہے اُن سے ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں کی قوم گورنمنٹ کی کیسی خیر خواہ ہے۔ گورنمنٹ کو ایسی قوم سے کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا جن کے یہاں فقط "ایک لفظ" ایمان کا ایسا ہے جو احسانمندی، فرض، دیانتداری اور عقیدہ چاروں کو شامل ہے، اور یہ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ ایمان ہر مسلمان کے پاس ہے اور ہونا چاہیے۔

مختلف الاقوام رعایا کی طرف سے

برطانیہ کی وسیع سلطنت کی خیر خواہی اور امداد

اس لڑائی میں جو دنیا کی سب سے بڑی لڑائی ہے، جس میں ڈیڑھ کرور فوج ہے، سلطنت انگلشیہ کی تمام رعایا انتہا درجہ کی خیر خواہی اور جاں نثاری کر رہی ہے۔ ہندوستان سے جنوبی افریقہ سے، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے بلکہ دنیا کے اُس گوشہ سے جہاں بظاہر زمین کا سرا معلوم ہوتا ہے یعنی کینیڈا (Canada) سے فوجوں پر فوجیں چلی آتی ہیں، جو میدان جنگ میں برطانیہ پر اپنی جانیں نثار کر رہی ہیں۔ سلطنت برطانیہ جس میں آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا، اُس کے تمام حصے آپس میں مل گئے ہیں۔ گویا جان ایک ہے اور قالب جدا جدا ہیں۔ ہندوستان کی تمام رعایا جو ۳۳ کرور کے قریب ہے یک دل اور یک جان ہو رہی ہے۔ راجاؤں اور نوابوں اور رعایا کے ہر فرقہ و جماعت نے ملک کے عام جلسوں میں یہ ظاہر کیا ہے بلکہ گورنمنٹ کو درخواستیں دی ہیں کہ ہماری جان اور مال گورنمنٹ کے لئے حاضر ہے۔ آسٹریلیا نے دس ہزار فوج دوبارہ دی ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ ہر مہینہ چار ہزار فوج سے مدد دے گا۔ کینیڈا کا وزیر اعظم سر رابرٹ بورڈن کہتا ہے کہ علاوہ اس تیس ہزار فوج کے جو ہم بھیج چکے ہیں، دس ہزار فوج روانگی کے واسطے اور تیار ہے اور پچاس ہزار جو نئی بھرتی کی گئی ہے وہ بھی ضرورت کے وقت بھیج دی جائے گی اور پھر بھی کنیڈا اور مدد دے گا جیسی ضرورت ہوگی۔ ہندوستان کے سب راجا، مہاراجا اور نواب جن کی تعداد قریب سات سو کے ہے، یک دل ہو کر سلطنت برطانیہ کے بچانے کے لیے ذاتی خدمتیں کرنے کے لئے اور اپنے ملک کی آمدنی دینے کے واسطے حاضر ہیں۔ میدان میں جانے کے لیے

حضور وئیسرائے بہادر نے حسب ذیل والیان ریاست منتخب کیے ہیں۔ راجگان جودھپور، بیکانیر، کشن گڑھ، جام نگر، کولھاپور، رتلام، سچین (Sachin) پٹیالہ، سر پرتاب سنگھ، ریاست بھوپال کے ولی عہد، مہاراجہ کوچ بہار کے بھائی اور چند شہزادے مدرسہ جنگی کے طالب علم ان میں سے اکثر اپنی اپنی فوجیں لے کر گئے ہیں اور Imperial Service troops بھی گئی ہیں۔ پنجاب اور بلوچستان کے بعض رئیسوں نے اور مہاراجہ بیکانیر نے ستر سواروں کے رسالے دیے ہیں۔ بعض والیان ملک نے درخواست کی ہے کہ ہم نئی فوج بھرتی کر کے دیں گے جو میدان جنگ میں جائے۔ مہاراجہ ریوا نے اپنا خزانہ، اپنی فوج اور جواہرات سب دینے کا وعدہ کیا ہے اور مہاراجہ میسور نے پچاس لاکھ روپیہ گورنمنٹ کو دیا ہے کہ فوج کے خرچ کے کام آئے۔ مہاراجہ گوالیار نے بہت بڑی رقم گورنمنٹ کے پاس جمع کرانے کا وعدہ کیا ہے اور کئی ہزار گھوڑے گھوڑ چڑھی فوج کے واسطے دینے کا اقرار کیا ہے۔ مہاراجہ ہلکر، نظام حیدرآباد اور راجہ جام نگر نے اپنی ریاستوں کے سب گھوڑے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ دربار نیپال نے اپنی ریاست کی تمام فوج گورنمنٹ کو دیدی ہے اور تین لاکھ روپیہ اس غرض سے دیا ہے کہ گورکھوں اور برٹش کے واسطے مشین گنیں خریدی جائیں۔ تبت کے ڈلائی لیما (Dalai Lama) نے ایک ہزار تبت کی فوج گورنمنٹ کو دی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی تمام جماعتیں، مذہبی، پولیٹیکل، سوشل اور ہندو مسلمان، سکھ، بوہرے، خوجے، پارسی، عیسائی ان سب کی بے شمار جماعتوں نے حضور وئیسرائے اور لوکل گورنمنٹوں کو تاروں اور خطوں کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ ہم ہر قسم کی خدمت کرنے کو روپیہ سے اور اپنی ذات سے تیار ہیں۔ مہاراجہ گوالیار اور بیگم صاحبہ بھوپال کو Hospital Ship کا خیال سب سے پہلے پیدا ہوا۔ دہلی میڈیکل ایسوسی ایشن نے فیلڈ ہاسپٹل جو بلقان کی جنگ میں بھیجا تھا وہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور کلکتہ کے بہت سے ڈاکٹروں کی جماعتوں نے میدان جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمت اپنے ذمہ لی ہے اور اپنا مطب چھوڑ کے اہل کمیشن ہو کر گورنمنٹ کی طرف سے میدان جنگ میں گئے ہیں، اس طرح ۲۷ بڑی ریاستوں نے جہاں جہاں Imperial Service troops تھیں سبھوں نے وہ فوجیں دینا چاہی ہیں لیکن حضور وئیسرائے بہادر نے بارہ ریاستوں سے ایسی فوج کی مدد لی جس میں سوار اور پیدل سب تھے اور وہ یورپ کو روانہ ہو گئی۔

گنگوار، بڑودہ اور مہاراجہ بھرت پور جو یورپ میں تھے اور ہندوستانی جماعت جو انگلستان میں تھی سبھوں نے خدمت گذاری اور خیر خواہی کا اظہار کیا ہے۔

ہندوستان میں وار ریلیف فنڈ کے نام سے بہت بڑا سرمایہ جمع ہوا ہے جس میں تمام ملک سے چندہ کیا گیا ہے۔ اس کی تعداد ۲ مارچ سنہ رواں تک ۷۸۰۹۸۷۶ روپیہ ہے۔ اس کے علاوہ سوا چودہ لاکھ روپیہ اور ہے جو پراونشل کمیٹیوں کے ہاتھ میں ہے۔ تکلیف زدہ لوگوں کی مقامی امداد کے لیے جو روپیہ مختلف صوبوں اور ریاستوں کی ایجنسیوں میں جمع ہو چکا ہے اُس کی تعداد ایک کرور پچاس لاکھ روپیہ ہے۔ یہ ریلیف فنڈ ہندوستانی سپاہیوں کے خاندان اور مقتولین کے یتیم بچوں اور بیواؤں کی پرورش کے لیے ہے۔ اس کے سوا انگلستان میں بہت سے فنڈ کھلے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

Prince of wales fund, Queen Alexandra's fund, Lord Robert's Indian Soldiers' fund, Miss Mary's fund, Indian army provision fund.

ان کے ذریعہ ہندوستانی اور برٹش سپاہیوں کو ہر قسم کے تحفے اور آسائش کی چیزیں جاڑے کے لیے بکارآمد پہونچتی رہتی ہیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور مقتولوں کی بیواؤں اور بچوں کی پرورش ہوتی ہے تحفوں کے بھیجنے کا سلسلہ برابر جاری ہے اور سپاہیوں کی ذاتی آسایش و آرام اور اُن کی بیویوں اور بچوں کو مدد پہونچانے کی تدبیریں نہایت وسیع پیمانہ پر ہو رہی ہیں۔ انگلستان میں چھ سو اسپتال ہندوستانی زخمیوں کے علاج کی غرض سے کھولے گئے ہیں۔ ان اسپتالوں کے علاوہ لیڈی ہارڈنگ صاحبہ کا اسپتال خاص طور پر زخمیوں کی خدمت کر رہا ہے۔ خود حضرت جارج پنجم اور اُن کی ملکہ معظمہ میری اور ان کی مادر مہربان جا جا کر زخمیوں کو دیکھتی ہیں اور اُن سے دلاسے کی گفتگو کرتی ہیں اور اُن کی بہادری کی داد دیتی ہیں اور اُن سے پوچھتی ہیں کہ تم کو کوئی چیز اپنے بال بچوں کے واسطے بھیجنا ہو تو بتاؤ اور اُن کی فرمائش اسی وقت پوری کی جاتی ہے۔ ماں باپ اس سے زیادہ محبت اپنے بچوں سے نہیں کر سکتے جو خود ہمارے بادشاہ اور اُن کی ملکہ اور اُن کی مادر مہربان ہمارے ہندوستانی بہادر سپاہیوں کے ساتھ کر رہے ہیں سہ

پدر بجائے پسر ایں ہمہ کرم نہ کند
کہ دست جود تو با خاندان آدم کرد

خداوند تعالےٰ ایسے بادشاہ کا سایہ ہمارے سروں پر سالہا سال قائم رکھے۔

جرمنی کے ظلم و ستم
اور بیلجیم کی تباہی و بربادی

جرمنی کے جور و ظلم جو بیلجیم میں ہوئے ہیں انھوں نے تمام دنیا میں ہل چل ڈال دی ہے اور تمام بادشاہوں کو جرمنی کے خلاف کر دیا ہے اور اُس سے نفرت پیدا کرادی ہے۔ جس طرح Vandals اور Goths وغیرہ وحشی اور جنگلی قوموں نے قدیم زمانہ میں سلطنت روما کو غارت و تباہ کیا تھا اُسی طرح جرمنوں نے لوٹ مار قتل و زنا اور آتش زدگی سے بیلجیم کی سلطنت کو، جو صنعت و حرفت اور تہذیب و شائستگی کا اعلیٰ نمونہ تھی، برباد و تباہ کر دیا۔ لووین Louvain کا کتب خانہ جلا یا گیا۔ ریمس کا گرجا جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا، مسمار کیا گیا۔ عام رعایا جو لڑنے والی نہ تھی اُن کے گھر جلائے گئے اور مکانات مسمار کیے گئے۔ اُن کو پھانسیاں دی گئیں۔ اُن کا مال و اسباب لوٹا گیا۔ عورتوں اور بچوں پر سخت ظلم کیے گئے۔ لڑکیوں کی پردہ دری کی گئی۔ رعایا پر کروروں روپیہ کے ٹیکس لگائے گئے۔ جن جہازوں پر زخمیوں کی مدد کا سامان تھا اُن کو تارپیڈو سے اڑایا گیا۔ جو شہر اور قصبے غیر محفوظ حالت میں تھے اُن پر گولے برسائے گئے۔ غرضکہ سب ایسے کام کیے جن کی اجازت حالت جنگ میں قانون بین الاقوام نہیں دیتا۔ اس پر طرہ یہ کہ بیلجیم کی رعایا کو پکڑ لے گئے اور اُن کو وطن اور بچوں سے چھڑا کے جرمنی بھیج دیا تاکہ وہاں کھیتوں میں کام کریں اور فصل کاٹیں۔ اُن خانہ بدوش جلا وطن لوگوں کی تکلیفوں پر ذرا غور کرنا چاہیے جو اپنی بیویوں، بچوں سے بچھڑے ہوئے بیگانہ ملک میں، جہاں اُن کے دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں، بے یار و مددگار، وطن سے دور، دوستوں اور عزیزوں سے مہجور مصیبت اُٹھا رہے ہیں ؎

مکیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا ۔۔۔ زمیں اُلٹ گئی بس منقلب زمانہ ہوا

بلجیم نے جرمن کے ظلم وستم کی تحقیقات کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس میں بڑے لائق وزیر اور بڑے قابل جج اور بڑے قانون داں اشخاص شامل تھے۔ اس کمیشن کی رپورٹ سے، جو آخر اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی، معلوم ہوا کہ جرمن کی فوج ایک گاؤں میں جس کا نام Linsmeau ہے ۱۰ اگست کی شام کو داخل ہوئی۔ وہاں کے سب مزدوروں کو بلا کر سب کے ہتھیار چھین لیے حالانکہ وہاں کسی نے مقابلہ نہیں کیا تھا۔ گیارہ کسانوں کو ایک خندق میں اتار دیا، وہاں سب مردہ پائے گئے۔ ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ اگست ۱۹۱۴ء کو ایک گاؤں میں جس کا نام Orsmeal ہے، ایک بوڑھے آدمی کے بازو پر تین زخم لگائے۔ پھر اس کو الٹا لٹکا کر پھانسی دیدی اور جلا دیا۔ کمسن عورتوں کی بے آبروئی کی اور چھوٹے بچوں پر بدعت کی۔ بہت آدمیوں کے ہاتھ پاؤں ناک کان کاٹ ڈالے، جن کا بیان کرتے کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ایک زخمی سپاہی بلجیم کا وہاں ملا جو بیچارہ قید میں تھا۔ بجائے اس کے کہ اس زخمی اور قیدی پر رحم کرتے اور اس کی مرہم پٹی کرتے اس کو پھانسی دیدی۔ ایک دوسرا سپاہی جو اس بیچارہ قیدی کی مرہم پٹی کر رہا تھا اس کو پکڑ کر تار کے کھمبے سے باندھ دیا اور گولی ماردی۔ نامور میں دو ہزار مرد، عورتیں، بچے قتل کیے گئے۔ بعض حصوں میں مردوں کی آدھی آبادی نیست و نابود کر دی گئی۔

آپ نے وہ تصویریں دیکھی ہوں گی جو کبھی کبھی باتصویر اخباروں میں چھپتی ہیں کہ جرمن کی فوج کی آمد کی خبر سن کر لوگ اپنا اپنا مال واسباب لے کر اور عورتوں اور بچوں کو گاڑی اور ٹھیلے پر لادے ہوئے بھاگے جاتے ہیں کسی کا مال واسباب چھوٹ گیا۔ کسی کا کوئی بچہ رہ گیا۔ گھبراہٹ میں نہ مال کا خیال ہے نہ سب کو ساتھ لینے ہی کی مجال ہے۔ کوئی مال واسباب چھوٹ جانے سے نالاں ہے کوئی اپنے بچے کے بچھڑ جانے سے پریشان ہے۔ عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو گود میں لیے بھاگ رہی ہیں، وہ چیختے چلاتے ہیں۔ گھبراہٹ میں ان کو دم دلاسا بھی نہیں دے سکتیں۔ زیادہ بوڑھوں کی سخت مشکل ہے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" بیچاروں کی پیٹھ جھکی ہوئی ہے، سواری میسر نہیں ہے تو پیدل جا رہے ہیں۔ جوان آدمی ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں گویا عصائے پیری بنے ہوئے ہیں بعض جوان آدمی بوڑھوں کو پیٹھ پر لادے ہوئے ہیں۔ شاباش ایسے جوانوں کو جو بوڑھوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دس لاکھ آدمی

بلجیم کے، جو کل ملک کی آبادی کا چھٹا حصہ ہیں، وطن سے آوارہ ہو کر چلے گئے ہیں، جن میں سے پانچ لاکھ آدمی تو ہالینڈ میں ہیں اور پانچ لاکھ فرانس اور انگلستان آ گئے ہیں، جہاں اُن کی خبر گیری اچھی طرح ہوتی ہے ؎

ظلم جرمن کا لکھا حال ہے یہ تھوڑا سا — جس پہ اس دیو نے اپنا کبھی سایہ ڈالا
دشت غربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا — دوست بھی چھوٹ گئے ملک بھی اپنا چھوٹا
اپنے ہر خویش و بیگانہ سے وہ مہجور ہوا
کون سا شیشہ دل ہے کہ نہ جو چور ہوا

یہ وہی شہنشاہ جرمن ہیں جنھوں نے جولائی سنہ ۱۹۰۰ع میں جب اپنی فوج چین کی مہم پر بھیجی تھی کہ باکسر فرقہ کی بغاوت دور کرے، تب فوج سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ کہے تھے۔

Whoever falls into your hands is forfiet to you, just as 1000 years ago the huns under King Attila made a name for themselves which is still in tradition and story.

یعنی جو کوئی تمھارے ہاتھ پڑے وہ تمھارا ہو چکا۔ ایک ہزار برس گذرے جس طرح بادشاہ اٹلا نے اپنی فوج ہن سے قتل و غارت گری کی تھی اور نام پیدا کیا تھا جو اب تک روایتوں میں مشہور چلا آتا ہے اسی طرح تم بھی نام پیدا کرو۔ حال میں اسی لڑائی کے چھڑنے پر اسی شہنشاہ نے اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ اگر جرمنی کو زمین پر جگہ نہ ملی تو آفتاب میں اُس کو رہنے کے لئے جگہ مل جائے گی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو قوم یہ بلند پروازی کرتی تھی کہ آفتاب میں جگہ ڈھونڈ رہی تھی اور عرش کے تارے توڑ رہی تھی، اُس کو یہ نیچا دیکھنا پڑا کہ سلطنت بڑھانا تو ایک طرف، جس قدر اُس کے مقبوضات غیر ملکوں میں تھے (جن کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل، یعنی ہندوستان کے رقبہ سے ڈیوڑھے کے قریب تھا) وہ سب گرہ سے کھو بیٹھی ؎

مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا
آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا

یورپ کی جنگ عظیم پر دوسرا لکچر

زبانی

۹ مئی ۱۹۱۵ء کو بمقام سرستی بھون جب مشران صاحب کا دوسرا لکچر (جنگ یورپ پر) زیر صدارت گریسی صاحب بہادر کلکٹر ضلع جلسہ عام میں ہوا تو تحریری لکچر پڑھنے سے پہلے موصوف نے زبانی حالات جنگ مختصراً سنائے، جو ۲۱ مارچ ۱۹۱۵ء سے ۹ مئی ۱۹۱۵ء تک (یعنی پہلے لکچر سے دوسرے لکچر تک) ظہور میں آئے تھے، جو درج ذیل ہیں:—

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آج میرا دوسرا لکچر جنگ یورپ پر ہے۔ جس شوق و ذوق اور قدر دانی سے آپ صاحبوں نے میرا پہلا لکچر سنا، اُس سے میرے دل کو بڑی تقویت پہونچی ہے اور میں نے اور بھی زیادہ محنت اور توجہ کی ہے کہ آپ کو تازہ بتازہ نو بہ نو دلچسپ واقعات جنگ سناؤں۔ میں انشاءاللہ اسی طرح بہت دنوں تک سنایا کروں گا۔ کیونکہ میرے پاس دلچسپ واقعات کا ذخیرہ بہت ہے۔ ؎

بگوش از سروشم بسے مژدہ ہاست
دلم گنج گوہر، زباں اژدہاست

لیکن جس قدر زیادہ، میں آپ کی تفریح طبع کا خیال رکھتا ہوں اسی قدر یہ لحاظ بھی رکھتا ہوں کہ صحیح اور سچے حالات سناؤں۔ میرا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو دھوکے میں رکھوں۔ بلکہ جو واقعات گذر چکے ہیں یا گذر رہے ہیں بلے کم و کاست بیان کروں ؎

راست می گویم و یزداں نہ پسند جز راست
حرف ناراست سرودن روش اہرمن ست

اتحادی فوجوں کی کامیابیاں

صاحبو! حال میں اتحادی فوجوں نے بہت نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اُنھوں نے مقام Orzemgst کو بمقابلہ آسٹریا کے چھ مہینے کی لڑائی کے بعد فتح کر لیا۔ یہاں کے قلعہ

کی فوج ایک لاکھ ستر ہزار تھی جس میں چالیس ہزار سپاہی مارے گئے اور جو فوج آسٹریا کی گرفتار ہوئی اُس کی تفصیل یہ ہے ۔ ۹ جنرل ۔ ۹۳، اسٹاف افسر ۔ پچیس سو فوجی افسر اور سوا لاکھ سے زیادہ سپاہی ۔ ایک ہزار سے زیادہ توپیں اور سامان رسد اور سامان جنگ وغیرہ ۔ گذشتہ ہفتہ میں سخت لڑائی Wyzask pass میں روسیوں اور آسٹرین لشکروں کے باہم ہوئی ۔ جس میں ۴۵ ہزار آسٹرین ہلاک اور زخمی ہوئے اور ۲۱ ہزار گرفتار ہوئے ۔

برٹش کامیابی نیوشپیل اور Hill 60 پر

نیوشپیل کی لڑائی میں جو برٹش نقصان تین دن کے اندر ہوا اُس کی تفصیل یہ ہے ۔

مارے گئے	زخمی ہوئے	گم ہوئے
۲۳ افسر اور ۱۷۲۸ سپاہی	۳۵۹ افسر اور ۴۸۱۷ سپاہی	۱۹۰ افسر اور ۷۲۳۲ سپاہی

مسٹر لائیڈ جارج کا مقولہ ہے کہ نیوشپیل کی جنگ میں جس قدر گولا بارود خرچ ہوا اُس قدر تمام جنگ ٹرانسوال میں ہوا تھا ۔ دشمن کا نقصان ، جو نیوشپیل کی لڑائی میں ہوا ، اس کی تفصیل یہ ہے :-

ہلاک ہوئے	زخمی ہوئے	گرفتار ہوئے
۱۸ ہزار	بارہ ہزار	۳۰ افسر اور ۱۲۵۷ سپاہی

نیوشپیل کی لڑائی میں ہندوستانی فوج نے بہت بڑی شجاعت ظاہر کی ۔ سر جان فرینچ ، برٹش قائد اعظم نے بہت بڑی تعریف لکھی ہے ۔

جنرل فرینچ کی کامیابی

جنرل فرینچ کو بمقابلہ جرمن کے السس میں کامیابی ہوئی ۔ جرمن کو اس شکست میں بڑا نقصان ہوا ۔ جرمنوں نے تین مرتبہ جنرل فرینچ پر حملے کیے مگر ناکام و بے نیل مرام واپس گئے ۔ اسی طرح برٹش اور فرینچ قوموں کو درہ دانیال پر کامیابی ہوئی ۔ دونوں طرف فوجیں بہت اچھی حالت میں اتر گئیں ۔ متحدہ فوجیں گیلی پولی جزیرہ نما میں اُتر پڑی ہیں اور چند مقامات اُنھوں نے فتح کر لیے ہیں ۔

برٹش اور جرمن کی فوجوں میں کتنے ہلاک او رزخمی ہوئے ہیں

۱۵/اپریل ۱۹۱۵ء تک برٹش فوج میں چالیس فی صد آدمی ہلاک اور لڑائی کے لئے ناکارہ ہوئے ہیں اور ساٹھ فی صدی انہی زخمیوں میں سے پھر لڑائی کے قابل ہو گئے۔ جرمن فوج میں بہت زیادہ ہلاک اور بیکار ہو گئے۔ سرکاری طور پر معلوم ہوا ہے کہ جرمن کا نقصان ۱۵/مارچ ۱۹۱۵ء تک یہ ہوا کہ ۳۱۲۷۵ افسر ہلاک اور زخمی ہوئے منجملہ اُن کے ۵۹۴۵ افسر ہلاک ہوئے جن میں ۳۴ جنرل ہیں۔ اُن کے سوا جرمن کے بیمار اور زخمی زیادہ تر اچھے نہیں ہوئے اور جرمن نے اُن کی پرواہ زیادہ نہ کی۔ بخلاف اس کے برٹش ڈاکٹروں نے اور تیمار داری کرنے والی عورتوں نے بہت سعی و کوشش کی اور زیادہ بیمار اچھے کیے کسی دوسری مہم میں اس قدر بیمار چنگے نہیں ہوئے تھے۔

جرمن کا راستہ بند کیا جانا

German Blockade

۴/اپریل ۱۹۱۵ء کو جو ہفتہ ختم ہوتا ہے اُس میں صرف دو جہاز جرمن نے غرق کیے۔ حالانکہ ۳۲۴ جہاز برطانیہ کے آئے اور گئے۔ جو ہفتہ ۲۸/اپریل تک ختم ہوتا ہے، اُس میں جرمن نے ایک جہاز تجارتی اور چار مچھلی پکڑنے والے جہاز ڈبوئے اور گرفتار کیے۔ حالانکہ اُس ہفتہ میں ۱۴۴ جہاز برطانیہ کے آئے اور گئے۔ جب تک کہ جرمن Blockade کو چھ ہفتے گذرے تھے اُس وقت تک جرمن نے صرف ۲۷ جہاز غرق کیے تھے۔ حالانکہ اُن چھ ہفتوں میں ۳۹۶۱ جہاز برطانیہ سے آئے اور گئے۔

برٹش نے جرمن کی آمد و رفت کا راستہ جو بند کیا ہے اُس کا اثر یہ ہے کہ جرمن گویا ایک خاص رقبہ کے اندر بند ہو گیا ہے۔ کہیں سے اُس کو رسد یا سامان جنگ نہیں پہونچ سکتا ہے۔ امریکہ سے رسد اور سامان جنگ برطانیہ اور اُس کے حلیفوں کو پہونچتا ہے۔ جرمن کہتا ہے کہ تم ہم کو رسد کیوں نہیں دیتے۔ امریکہ جواب دیتا ہے کہ ہم تم کو بھی رسد اور سامان جنگ دینے کو موجود ہیں تم Delivery کیوں نہیں لیتے۔ برٹش کی طرح تم بھی سمندروں پر قبضہ کرو۔ ہم تم کو

سب کچھ دینے کو تیار رہیں۔

جرمنوں کا عمل قانون بین الاقوام کے خلاف

جرمن نے ابھی حال میں دو زیادتیاں اور کیں۔ یعنی جو کچھ ظلم و ستم کرتا آتا ہے اُس پر اور اضافہ کیا۔ ایک تو یہ کہ زہردار گیس اپنے مورچوں، گولوں اور گولیوں میں رکھی جس سے برٹش قوم کو نقصان پہونچا۔ وہ گیس آنکھوں کو بہت نقصان پہونچاتی ہے اور پھیپھڑے کو بھی۔ کنیڈا کی فوج کو بہت نقصان پہونچا۔ لیکن اب برٹش نے بھی اُس کی تدبیر کر لی ہے کہ منہ اور ناک ایک نقاب سے بند کر لیتے ہیں اور کچھ دوا بھی استعمال کرتے ہیں جس سے گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ سچ پوچھیے تو یہ کمزوری کی علامت ہے کہ جرمن ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ یہ قانون حرب کے خلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھسیانا ہو گیا ہے۔ جیسے کوئی پہلوان پچھڑ جائے اور اُس سے کچھ بن نہ پڑے، تو کاٹ کھاتا ہے۔ حالانکہ جانتا ہے کہ کاٹنے سے کچھ نہ ہوگا اور یہ آداب کشتی کے بھی خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اس غلط خیال پر کہ جرمن قیدیوں کے ساتھ برٹش برا سلوک کر رہے ہیں، چالیس برٹش افسروں کو پکڑ رکھا ہے اور اُن کو قید میں ڈال رکھا ہے اور اُن سے بہت برا سلوک کرتا ہے، حالانکہ برٹش کا سلوک جرمن قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا ہے۔ اُن کو اچھا کھانا کپڑا دیا جاتا ہے، اُن کو کھیل تماشے اور تفریح کے واسطے وقت دیا جاتا ہے اور جرمن زبان کی کتابیں پڑھنے کی غرض سے دی جاتی ہیں اور کوئی محنت اُن سے نہیں لی جاتی ہے اور یہ سلوک اُس حالت میں کیا جاتا ہے کہ برٹش فوج بحری کا ایک سپاہی بھی جرمن نے آج تک نہیں بچایا ہے۔ حالانکہ برٹش نے ایک ہزار سے زیادہ ڈوبتے ہوئے جرمنوں کو ایسے موقعوں پر بچایا ہے کہ اپنے آپ کو بڑے خطروں میں ڈال دیا اور برٹش کا یہ سلوک اُن جرمن سپاہیوں کے ساتھ ہے، جنھوں نے اپنے بادشاہ یا اپنے سرداروں کے حکم سے بہت کام قانون جنگ کے خلاف کیے ہیں۔ پس ایسی صورت میں برٹش افسروں سے برا سلوک کرنا اور اُن کو قید میں رکھنا نہایت بیجا ہے۔

صاحبو۔ میں یہ کہوں گا کہ جن بارکوں میں برٹش افسروں کو قید کیا ہے اُن کی زیب و زینت اور رونق و آرائش ہو گئی ہے، کیونکہ جن مکانوں میں ایسے معزز مہمان رکھے جائیں، جیسے کہ برٹش

فوجی افسر ہیں، اُس مکان کی زہے قسمت، اُس مکان کے خوش النصیب!

صاحبو۔ کل اخبار میں دیکھنے میں آیا کہ روس کے قیدیوں کے ساتھ جرمن بہت برا سلوک کر رہا ہے۔ روس نے بھی دھمکی دی ہے کہ ہم بھی تمھارے قیدیوں سے ویسا ہی برا سلوک کریں گے جیسا تم ہمارے قیدیوں کے ساتھ کر رہے ہو۔ سچ پوچھیے تو روس اگر ایسا کرے، تو اُس کو حق پہونچتا ہے اور بدلہ لینے پر اُس کو کوئی الزام نہیں دے سکتا ہے ؎

ظلم اہل ظلم پر کچھ ظلم میں شامل نہیں
کون غارتگر ہے مجرم خانۂ زنبور کا

شکر ہے کہ امریکہ کے سفیر کی کوشش سے اب جرمن کی طرف سے برٹش افسروں پر سختیاں کم ہوگئی ہیں۔

رب نواز خاں رسالدار (سفارت اصفہان) کی چٹھی

" جرمن نے جس طرح ترکی کو دھوکا دیا، اُسی طرح ایران کی رعایا کو بھی دھوکا دینا چاہتا تھا، مگر ناکام رہا۔ ایک شخص ڈاکٹر پیوگن Dr. Pugmingi نامی قالینوں اور رنگوں کی تجارت اصفہان میں کرتا تھا وہ جرمن کانسل مقرر ہوگیا۔ اُس نے لکچر دینا شروع کیے کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں اور شہنشاہ جرمنی مع تمام رعایا کے مسلمان شیعہ ہوگیا ہے۔ یہ ڈاکٹر اپنے بازو پر تعویذ باندھتا تھا جس پر کلمہ شہادت لکھا ہوا تھا۔ کئی جگہ لوگوں نے بہت شوق سے اُس کا استقبال کرنا چاہا، مگر وہ شخص کچھ خوف اور کچھ جھجک سے وقت پر نہ پہونچا۔ آخر اُس کا بھید کھل گیا اور ایران کے عالموں اور مجتہدوں نے اعلان کر دیا کہ یہ شخص فریب دیتا ہے۔ کوئی اس کی باتوں میں نہ آئے۔ ایران کے مسلمان شیعہ سب برٹش کے خیر خواہ ہیں، کیونکہ برٹش کی بدولت قاچار خاندان کے بادشاہ تخت ایران پر حکمراں ہیں "

صاحبان ذی شان۔ میں نے اس چٹھی کا مضمون اس غرض سے عرض کیا کہ اگر یہاں بھی کسی وقت جرمن وغیرہ کا کوئی جاسوس آئے، تو ہمارے مسلمان بھائیوں کو خبردار رہنا ضروری ہے۔ یہاں کے مسلمان ہوشیار اور عقلمند ہیں۔ کسی فریب میں نہ آئینگے اور جس طرح ہندوؤں کی خیرخواہی اور جاں نثاری کا کامل یقین گورنمنٹ کو ہے، اُسی طرح مسلمانوں کی خیر خواہی کا نقش گورنمنٹ کے

دل پر رہے گا۔

صلح کی گفتگو

صاحبان والا شان ۔ مہینہ ڈیڑھ مہینے سے صلح کی خبر کسی نہ کسی اخبار میں پڑھنے میں آتی ہے گو وہ اعتبار کے لائق نہیں ہے، تاہم ۔ ع

تا نہ باشد چیزکے مردم نگوید چیزہا

کچھ تو ہے محض غلط بھی نہیں کہہ سکتے۔

کبھی یہ خبر ہوتی ہے کہ ٹرکی اتحادی قوموں سے علیحدہ صلح کرنا چاہتا ہے۔ کبھی یہ کہ ہنگری آسٹریا سے الگ ہوکر اتحادی سلاطین سے صلح کا خواہشمند ہے۔ کبھی جرمن کی طرف سے خبر ہوتی ہے کہ اگر بیلجیم واپس دیدیں، تو اہل بیلجیم لڑائی میں شریک نہ ہوں گے۔ یہ گفتگو غیر بادشاہوں کے سفیروں کی معرفت ہوتی رہی۔ لیکن اتحادی سلاطین کا ارادہ صاف ظاہر ہوچکا ہے کہ وہ مستقل صلح چاہتے ہیں یعنی جب تک جرمن کی فوجی طاقت German militarism کو پامال نہ کر دیں گے، اُس وقت تک مستقل صلح کی اُمید کسی طرح نہیں کر سکتے۔

سامان جنگ

صاحبو۔ جو سامان جنگ ستمبر ۱۹۱۴ء میں برٹش فوج میں تھا اُس کے مقابلہ میں اب اُنیس گنا زیادہ ہے اور برطانیہ اپنے حلیفوں کو یعنی فرانس اور روس کو سامان جنگ سے بڑی مدد پہونچا رہا ہے۔ پہلے برٹش امدادی فوج صرف چھ ڈویژن سمجھی جاتی تھی۔ اب اُس سے چھ گنا زیادہ میدان جنگ میں ہے۔

جنگ عظیم پر دوسرا لکچر

(تحریری)

بلجیم پر جرمنی کا حملہ

۲۱ مارچ سنہ ۱۵ء سے ۹ مئی سنہ ۱۵ء تک یورپ کے جو بھارت معرکے ہیں، جو جنگ عظیم یا Great War کے نام سے موسوم ہے، جو خاص خاص اور اہم واقعات وحالات رونما ہوئے ان کو زبانی تقریر میں بیان کرنے کے بعد، مشران صاحب نے حسب ذیل تحریری لکچر پڑھکر سنایا۔ ناظرین اگر گذشتہ ہرسہ لکچروں کے ساتھ اس لکچر کو ملاحظہ فرمائیں تو جنگ عظیم کی مکمل تاریخ اور ممالک متحاربین کی سیاست ملکی پر عبور حاصل ہوسکتا ہے۔

جب جرمنی نے فرانس کے مقابلہ میں اعلان جنگ کیا تو اُس کے لئے فرانس پر حملہ کرنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو وہ تھا جدھر فرانس کے بہت قلعے سرحد کی حفاظت کی غرض سے بنے ہوئے تھے۔ دوسرا وہ راستہ تھا جدھر سے جانا جرمن قوم کے لئے معاہدہ کے خلاف تھا یعنی بلجیم کی طرف سے۔ لیکن جرمنی نے اپنے عہد کو توڑا اور جو کچھ ضمانت کی تھی اُس کا بھی کچھ لحاظ نہ کیا اور اس دوسرے راستہ سے اپنی فوجیں لے گیا۔ جرمن نے جب کبھی فرانس پر حملہ کیا ہے تو یکایک اور بہت تیزی سے اور بہت بڑی سے بڑی فوج سے کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہی کیا کہ پیرس کی جانب لاکھوں فوج بھیجی اور فرانس کو کچھ وقت نہ دیا کہ وہ اپنی فوج جمع کرتا یا یہ کہ اپنی حفاظت کی کوئی تدبیر کرتا۔ فرانس پر حملہ کرنے کی غرض سے Alsace Lorraine اور لکسمبرگ کی سرحد کی طرف جرمنی پہلے سے ہر قسم کا سامان سال بسال جمع کرتا رہا تھا۔ رسد کا سامان، گھوڑوں کی گھاس، اسپتال میں مرہم پٹی کا سامان اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار زخمیوں اور بیماروں کے واسطے بستر، یہ سب کچھ جنگ سے چھ ہفتے پہلے سرحد پر تیار رکھا تھا۔ غرضکہ جرمنی ہر طرح سے جنگ کے

واسطے تیار تھا۔ السس لورین Alsace Lorraine کی سرحد کی طرف ایسے مضبوط قلعے اور مورچے فرانس نے بنا رکھے تھے کہ جب تک ہفتوں بلکہ مہینوں تک اُن کا محاصرہ باقاعدہ نہ کیا جائے جرمن اُن کو فتح نہیں کر سکتا تھا اور اُس کو انہی مشکلات کا سامنا تھا جو جاپانیوں کو پورٹ آرتھر فتح کرنے میں پیش آئیں۔ دوسرا راستہ فرانس پر حملہ کرنے کا لکسمبرگ اور بیلجیم کی طرف سے تھا۔ لیکن جرمنی نے کئی مرتبہ اس بات کی ضمانت کی تھی کہ کسی لڑائی میں ان دونوں ملکوں سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ رکھے گا۔

لکسمبرگ کے مختصر تاریخی حالات

لکسمبرگ ایک چھوٹی سی ریاست ہے جو فرانس، جرمنی اور بیلجیم کے درمیان واقع ہے۔ اُس کا رقبہ ایک ہزار مربع میل سے کم اور آبادی ڈھائی لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ اُس کا رقبہ Northampton County سے کچھ کم اور آبادی Bradford کی مردم شماری سے بہت کم ہے۔ قدیم زمانہ میں اس مقام پر Spanish آسٹرین، فرنچ اور ڈچ کا قبضہ، وقتاً فوقتاً رہا اور پہاڑوں کو تراش کر اس کثرت سے قلعے فصیلیں بنائی گئی تھیں اور قلعوں پر توپیں چڑھا کر اُن کو ایسا مضبوط کیا گیا تھا کہ ۱۹ صدی کے وسط میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ جبل الطارق یعنی جبرالٹر (Gibralter) کے سوا دوسرا کوئی مقام ایسا مضبوط نہیں ہے جس کا فتح کرنا سخت مشکل ہو۔ چونکہ یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ کسی وقت جرمنی کی طاقت ایسی بڑھ جائے گی کہ وہ تمام یورپ کو دھمکی دے گا اور اپنے عہد و پیمان کے خلاف عمل کر کے لکسمبرگ پر حملہ کرے گا، اس لئے عہدنامہ لندن کے مطابق جو ۱۸۶۷ء میں ہوا اس شہر کے مضبوط قلعے اور شہر پناہ اور فصیلیں سب توڑ ڈاکر گرا دی گئیں اور اُن کی جگہ پر نہایت خوشنما باغ لگا دیے گئے جو انواع و اقسام کے پھول دار پودوں اور میوہ دار درختوں سے لہلہا رہے تھے اور کوثر و تسنیم کی طرح باغوں میں نہریں جاری تھیں اور وہ مقام تمامتر بہشت کا نمونہ بنا ہوا تھا جہاں صبح شام ہزاروں آدمیوں کا اژدحام رہا کرتا تھا جن میں اہل جرمنی بھی نہایت کثرت سے شامل تھے جو سیر و تفریح کی غرض سے وہاں جاتے اور سبزہ گلشن کا نظارہ کرتے اور آسمان پر شفق کی بہار دیکھا کرتے تھے عجیب پر کیف منظر تھا۔

ٹھنڈی ہوا میں سبزہ کوہی کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے
وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پہ بہار — وہ بارور درخت وہ گلشن وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار — پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار
نافے کھلے ہوئے تھے گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

یہ ریاست بہت عرصہ سے صلح اور امن کی حالت میں رہی ہے اور یورپ کا نہایت سرسبز خطہ ہے۔ اس ریاست کی حاکم گرانڈ ڈچز بذریعہ پارلیمنٹ جس میں عوام کے قائم مقام اور نیز امرا دونوں شامل تھے نہایت عمدگی سے آئین و قوانین کی پابندی کے ساتھ حکومت کرتی تھی۔ مدرسوں میں نہایت عمدہ تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ باشندے نہایت مرفہ حال تھے۔ جا بجا عدالتیں قائم تھیں، حکام انتظام کے لئے مقرر تھے اور ہائی کورٹ بھی تھا۔ البتہ ایسی فوج نہ تھی جو دشمن کے حملہ کو روک سکے۔ لکسمبرگ صدیوں تک یورپ کی جنگاہ و رزمگاہ رہا۔ اس کی سرحد پر حملوں پر حملے ہوتے رہے۔ ۱۸۶۷ء میں جب کہ اس کے پیچھے فرانس اور پروشیا Prussia میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی، اس وقت بادشاہان یورپ نے اس کی حفاظت کر کے اس کو بچا لیا۔ ایک عہد نامہ اس وقت لکھا گیا جس کی ضمانت برطانیہ، فرانس، پروشیا نے کی جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ لکسمبرگ سے کسی کو کوئی واسطہ نہ رہے گا اور شاہان یورپ نے یہ ذمہ لیا کہ بوقت جنگ وہ کسی کی جانبدار نہ ہو گی۔

بلجیم کے مختصر تاریخی حالات

جرمنی کو بلجیم کی راہ سے بھی حملہ کرنے میں وہی مشکلیں تھیں۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے جہاں صدیوں سے جھگڑے اور قضیئے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ سرزمین مرغوں کی پالی سمجھی جاتی ہے

اور اس کے لئے وجہ معقول ہے ۔ یہاں مذہبی اور قومی لڑائیاں کثرت سے ہوتی رہیں ۔کیتھولک اسپین اور پروٹسٹنٹ ہالینڈ کی مذہبی لڑائیاں بھی ہوئیں ۔یہیں نپولین نے واٹرلو میں شکست کھائی ۔ یہیں پہلے چرچل برٹش جنرل نے بمقابلہ فرانس کے جنگ Blenheim وغیرہ میں فتح حاصل کر کے ڈیوک آف مارل برا کا خطاب حاصل کیا ۔جب نپولین کے مقابلہ میں لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا تب یورپ کے بادشاہوں نے چاہا کہ بلجیم میں امن و امان ہو ۔ ایک عہد نامہ ۱۸۳۱ء میں لکھا گیا جس کی رو سے اس ملک کی خودمختاری قائم ہوئی ۔ اسی عہد نامہ کی تجدید ۱۸۳۵ء میں ہوئی اور برطانیہ فرانس اور پروشیا اس کے فریق ہوئے اور یہ قرار پایا کہ کوئی بادشاہ بلجیم پر حملہ نہ کرے ۔ نہ کوئی اس کے مقابل میں مہم بھیجے اور کوئی بادشاہ اپنی فوج اس ملک کے راستہ سے نہ نکالے ۔ اس ضمانت اور ذمہ داری کی تجدید بادشاہوں کی طرف سے کئی مرتبہ ہوتی رہی ۔

جب بادشاہوں کی طرف سے بلجیم میں امن و امان رکھنے کی یوں ذمہ داری ہوئی تو ملک میں نہایت ترقی اور مرفہ حالی ہوئی ۔ نئے نئے کارخانے جاری ہوئے اور بڑے بڑے شہر مثل اینٹورپ (Antwerp) اور لیج کے جہاں تجارت و صنعت کے کارخانے قائم ہوئے عالم وجود میں آ گئے ۔ بندر (Antwerp) اینٹورپ دنیا میں بہت بڑی تجارت گاہ ہو گیا ۔ قصبوں اور شہروں میں آبادیاں بڑھنے لگیں ۔ برسلس Brussels جو دارالسلطنت تھا وہ پیرس کا نمونہ یعنی فردوس کا نمونہ بن گیا اور اس کی سیرگاہوں اور خوشنما منظروں اور صنعت کے کارخانوں نے ہزاروں سیاح چاروں طرف سے کھینچ لیے ۔ لووین (Lovain) گویا آکسفورڈ کا مقابل تھا جہاں علم و ہنر کا مرکز تھا ۔ یورپ کے بادشاہوں کی پناہ میں بلجیم کے باشندے وہ مصیبتیں بھول گئے جو ان پر گذر چکی تھیں ۔کہیں کہیں قصبوں اور گاؤں میں اگلے ظلم و ستم کی نشانیاں لوگوں کو کبھی دکھائی دیجاتی تھیں ۔جیسے بعض آلات حرب جو نپولین کی فوج چھوڑ گئی تھی ۔ پرانے پستول جو سپاہیوں کی لوٹ مار کے وقت لوگ اپنی حفاظت کی غرض سے استعمال کرتے تھے ۔لیکن اب یہ چیزیں صرف تاریخی یادگاریں اور پرانی نادر چیزیں سمجھی جاتی تھیں ۔ بلجیم کے باشندے دوست نواز محبت کرنیوالے اور کفایت شعار تھے اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے ۔ ان کی کاشت میں ترقی تھی اور زراعت کا سامان کثرت سے تھا اور گھروں میں اناج کے ذخیرے بھرے ہوئے تھے ۔ ان کے بال بچے

بہت بیخوفی کی حالت میں پرورش پاتے تھے۔ سب لوگ بھول گئے تھے کہ ہمارے ماں باپ کو کبھی حملہ آور فوج نے قتل کیا تھا یا ہماری عورتوں کی پردہ دری کی تھی۔ تمام دنیا کے سیاح آتے تھے اور اُن کے ملک کے سمندر کے کنارے Belgium لکسمبرگ اور وادی میوس Muse وغیرہ میں سیر و سیاحت کر کے لطف اُٹھاتے تھے۔

شہنشاہ جرمن نے اپنے عہد و پیمان کے خلاف لکسمبرگ اور بیلجیم پر حملہ کر دیا، کیونکہ اس راستہ سے فرانس پر فوج بھیجنے میں آسانی تھی۔ کوئی شخص خیال نہیں کر سکتا تھا کہ بیلجیم جرمن کا مقابلہ کر سکے گا۔ بیلجیم کا رقبہ جرمنی کے آٹھویں حصہ سے بھی کم ہے۔ اُس کی فوج کمزور تھی اور اس قدر بھی نہ تھی کہ تین بڑے شہر اینٹورپ، لیج اور نامور کی حفاظت اچھی طرح کر سکے۔ ان حالات پر نظر ڈالتے ہوئے جرمن کے فوجی افسر بلکہ یورپ کے مدبّران سلطنت خواب میں بھی کبھی خیال نہیں کرتے تھے کہ بیلجیم جرمنی کا مقابلہ کر سکے گا۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ سے بیلجیم میں جرمنی کا اثر بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ اینٹورپ کے تجارتی معاملات سب جرمنی کے ہاتھ میں تھے۔ مالی معاملات میں، کارخانوں میں، تجارتی اسباب ملک سے باہر بھیجنے میں جرمن کا اثر نہایت غالب تھا۔ جرمنی میں جو لوگ بہت زیادہ سپاہیانہ جوش اور ملکی محبت رکھنے والے تھے وہ اُس وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ کب بیلجیم خود بخود جرمنی کی سلطنت میں آجائے گا، جیسے درخت سے میوہ پک کر زمین کے دامن میں گر پڑتا ہے۔ بعضوں نے یورپ کے نقشے بنائے تھے اور اُن میں بیلجیم کا سُرخ رنگ مثل جرمنی کے رکھا تھا گویا بیلجیم سلطنت جرمن میں شامل ہو گیا۔

۲ اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی نے چھ لاکھ فوج فرانس اور لکسمبرگ کی طرف بڑھائی اور ارادہ کیا کہ نہایت تیزی اور سختی سے ایسا حملہ کیا جائے جس کا مقابلہ کرنا مشکل ہو بلکہ ناممکن۔ ۲ اگست سنہ مذکور کو صبح کے وقت جرمن فوج کے کئی دستے لکسمبرگ میں داخل ہو گئے۔ کچھ فوج ریل سے، کچھ موٹروں کے ذریعہ سڑک کی راہ پہونچ گئی اور ریلوے، تار برقی، ٹیلی فون اور ریل وغیرہ، جس قدر ذریعے آمد و رفت کے تھے سب پر قبضہ کر لیا۔ یہ تجویزیں سب پہلے سے سوچ لی گئی تھیں اور ان پر عمل کرنے والے وہ اشخاص تھے جو لکسمبرگ کے کارخانوں اور گوداموں میں محرر اور گماشتے رہ چکے تھے اور اس وقت وردی پہنے ہوئے جرمن فوج میں افسر تھے۔ ان افسروں نے اُن

باشندوں کا پتہ نشان دیدیا جو جرمن کی فوجی خدمت کے لائق تھے جیسے السس (Alsace) کے باشندے جو جلا وطن کر دیے گئے تھے اور جنھوں نے جرمنی کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ یہ سب گرفتار کر لیے گئے۔

جب جرمن فوج، جو ایک میجر (Major) کی کمان میں تھی Adolpovs کے پل کے پار پہونچی تو ایک وزیر Myochen نام موٹر پر سوار سڑک پر راہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں اس عہد نامہ کی نقل تھی، جس کے روسے لکسمبرگ کی آزادی اور خود مختاری کی ضمانت بادشاہان یورپ نے کی تھی۔ یہ نقل اُس وزیر نے جرمن کے سردار فوج کو دکھائی جس نے یہ جواب دیا کہ ہم کو اس عہد نامہ کا حال معلوم ہے لیکن ہم کو جو حکم ملا ہے، ہم اُس کی تعمیل کر رہے ہیں اور کریں گے۔ خود گرانڈ ڈچیز یعنی ملکہ لکسمبرگ موٹر پر سوار اس موقع پر پہونچ گئیں اور سردار فوج سے کہا کہ ہمارے اور آپ کے باہم جو عہد و پیمان ہوا ہے اُس کے خلاف آپ کی طرف سے نہ ہونا چاہیے ؎

دست وفا در کمر عہد کن
تا نہ شوی عہد شکن جہد کن

لیکن اُس میجر نے جواب دیا کہ آپ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر جائیے۔ اُسی شام کو جرمن سفیر نے لکسمبرگ کے وزیر سلطنت کو ایک تار دکھایا جو جرمن کے وزیر اعظم کی طرف سے تھا جس میں یہ تحریر تھا کہ ہماری فوج لکسمبرگ میں جو کچھ کر رہی ہے وہ دشمن کے طور پر نہیں کر رہی ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ریلوں کا سلسلہ جو جرمن ریلوں سے ملا ہوا ہے اُس کی محافظت کرے تاکہ فرانس حملہ نہ کرنے پائے۔ ذرا دیر میں جرمن فوج تمام شہر میں پھیل گئی۔ جا بجا سرحدوں پر فوج کے دستے متعین کر دیے گئے اور گھروں، کھیتوں، میدانوں اور جنگلوں میں جرمن ہی جرمن نظر آنے لگے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ کھیت اُجاڑ دیے گئے۔ مکانات مسمار کر دیے گئے۔ جھاڑیاں جنگل سب کاٹ ڈالے گئے۔ جا بجا مورچے بنائے گئے اور کسی نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ غرضکہ فوج کا قبضہ کیا تھا گویا دیووں کا قبضہ پرستان پر تھا، جن کے سایہ سے سب لوگ بھاگتے تھے اور جنھوں نے ایک دم میں لاکھ کا گھر خاک کر دیا۔

دوسرے دن یعنی تین اگست بروز دوشنبہ جرمن سفیر نے بیلجیم کو ایک الٹی میٹم (یعنی پیام آخری) بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ بیلجیم اپنے ملک میں جرمنی افواج کو مرور کا راستہ دے جس کے بدلہ میں بیلجیم اور اُس کے مقبوضات یعنی سب علاقے بحال اور برقرار رہیں گے ورنہ انکار کی حالت میں بیلجیم کے ساتھ دشمن کے طور پر برتاؤ کیا جائے گا۔ اس الٹی میٹم کا جواب بارہ گھنٹہ کے اندر مانگا گیا۔ بادشاہ بیلجیم نے شاہ برطانیہ سے اپیل کی کہ بیلجیم کی آزادی کو برقرار رکھنے میں مدد کیجیے۔ جس کے جواب میں برطانیہ نے جرمن کو اطلاع دی کہ بیلجیم سے جو ہمارا عہد و پیمان ہے اس کو پورا کرنے کے لئے ہم تیار ہیں اور اُس کی مدد کرنے میں اگر تلوار کا کام پڑے گا تو دریغ نہ کریں گے۔ جب بارہ گھنٹے گذر گئے اور شاہ بیلجیم نے جرمن کے مطالبات کو قبول نہ کیا تب جرمن کی فوج بیلجیم کی سرحد کے اندر گھس پڑی۔ تب سر ایڈورڈ گاسچین Sir Edward Goschen برٹش سفیر نے Herr von Jagow جرمن کے وزیر خارجہ سے دریافت کیا کہ آیا جرمن گورنمنٹ بیلجیم کی Neutrality کا خیال رکھے گی؟ جس کا جواب یہ ملا کہ "نہیں۔ ہماری فوج سرحد کے پار جا چکی ہے اور مجبوراً ہم کو بیلجیم کے راستہ سے جانا پڑا کیونکہ سب سے آسان اور قریب کا راستہ فرانس جانے کے واسطے چاہتے ہیں تاکہ وہاں پہونچتے ہی دن میں حملہ کر دیں اور فرانس کے مقابلہ میں کوئی نمایاں فتح حاصل کریں" جرمن کو اندیشہ تھا کہ اگر دور کے راستہ سے فوج فرانس پر جائے گی تو دیر کے سبب روس کو موقع ملے گا کہ اپنی بے شمار فوج جرمنی کی سرحد تک پہونچا دے۔ پس نہایت تیزی سے کام کرنا چاہیے جس کے مشاق جرمن بہت زیادہ ہیں۔ برطانیہ کے سفیر نے سمجھایا کہ بیلجیم پر حملہ کرنے کے نتیجے بہت افسوس کے قابل ہوں گے اور اب بھی باز آنا چاہیے۔ لیکن جرمنی کے وزیر خارجہ نے جواب دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ناچار برٹش سفیر اُسی شام جرمنی کے محکمہ خارجہ میں گیا تاکہ الٹی میٹم پیش کرے۔ اُس کا مضمون یہ تھا کہ رات کے بارہ بجے کے اندر جرمن کی طرف سے یہ ضمانت ہونا چاہیے کہ فوج اب آگے نہ بڑھے گی اور بیلجیم پر حملہ کرنے سے باز رہے گی ورنہ برٹش گورنمنٹ تیار ہے کہ اپنا وعدہ پورا کرے اور خود جرمنی نے کہا ہے کہ بیلجیم کی سلطنت کو بحال اور خود مختار رکھیں گے۔

جرمن وزیر نے جواب دیا کہ ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ ہماری فوج بلجیم سے گذر جائے۔
برٹش سفیر نے سمجھایا کہ اس کے نتیجے بہت افسوس کے لائق ہوں گے۔ ع۔

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

مگر جتنا اصرار برطانیہ کی طرف سے ہوتا گیا جرمن کی طرف سے جواب میں انکار تھا۔ ناچار برٹش سفیر نے جرمن کے وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ اس نے ایک داستان چھیڑ دی کہ ایک ذرا سے کاغذ کے پرزے کے پیچھے برطانیہ ایک ہمجنس قوم یعنی جرمن سے لڑنا چاہتا ہے اور ہم برطانیہ سے دوستی کے سوا کوئی اور برتاؤ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ برطانیہ گویا اس وقت یہ کر رہا ہے کہ ایک شخص کو جو دو حملہ آوروں میں گھرا ہوا ہے پیچھے سے آکر مارنا چاہتا ہے۔ اس لیے برطانیہ ان سب نتیجوں کا ذمہ دار ہے جو آئندہ ظہور میں آئیں گے۔ برٹش سفیر نے جواب دیا کہ برطانیہ کی یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں اور بلجیم کی خود مختاری قائم رکھنے کے واسطے انتہائی کوشش کریں ورنہ آئندہ برطانیہ کا اعتبار جاتا ہے اور کوئی اس کے وعدہ کو معتبر نہ سمجھے گا۔ غرض کہ جب برٹش سفیر نے دیکھا کہ بحث کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آگ پر تیل ڈالا جائے تو اس نے خاموشی اختیار کی اور اپنے واسطے پروانہ راہداری طلب کیا۔

دوسرے دن جرمن فوج کو، جو موٹر کاروں پر سوار حکم کا انتظار کر رہی تھی، حکم ملا کہ ایک دم سے آگے بڑھ کر بلجیم کی ریلوں اور پلوں پر قبضہ کر لو اور ملک کے اندر گھستے ہوئے فرانس کی جانب بڑھو۔ فوج یہ سمجھتی تھی کہ سخت مقابلہ پیش نہ آئے گا کیونکہ اس کے افسروں نے یقین دلایا تھا کہ بلجیم کے باشندے دوستانہ طریق پر ہمارا استقبال کرینگے لیکن وہ اس کے برخلاف فوراً مقابلہ پر تیار ہو گئے۔ اور پیشتر اس کے کہ جرمن موٹر کاریں جن کی تعداد تین ہزار کہی جاتی ہے، آگے بڑھیں، اہل بلجیم نے دریائے میوس (Meuse) کے سب پل توڑ دیے اور ہر گاؤں اور ہر قصبہ کی طرف سے سخت مقابلہ جرمن کو پیش آیا۔ بلجیم کے سب باشندے ایسے باہم متفق ہو گئے کہ گویا جان ایک ہے اور قالب جدا جدا۔ آپس میں جس قدر نااتفاقیاں تھیں سب بھول گئے اور امیر سے فقیر تک یک دل و یک جان ہو کر جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ عورتوں نے مردوں سے بھی زیادہ قومی جوش اور ہمت ظاہر کی۔

پہلے شہر لیج بیچ میں پڑا جدھر سے جرمن کا لشکر جا رہا تھا اور ضرور ہوا کہ یا تو وہ شہر لا ہیج دے کر لے لیا جائے یا فتح کیا جائے۔ یہ مقام بلجیم کا برمنگھم Birmingham سمجھا جاتا ہے اور بہت مشہور اور پُرفضا شہر ہے جس میں نہایت دلکش اور دلچسپ منظر ہیں اور ایک تاریخی مقام بھی ہے۔ باشندے نہایت آزاد مزاج ہیں۔ صنعت و حرفت کا مرکز ہے جہاں صرف توپوں کے ڈھالنے والے چالیس ہزار کاریگر ہیں۔ یہاں سے رائفل بن کر اکثر ملکوں میں جاتے ہیں اور بڑی توپیں بلجیم کے واسطے ڈھالی جاتی ہیں۔ لوہے کے کارخانوں میں ریل کے انجن اور موٹر کار وغیرہ بنتے ہیں۔ عمدہ اور نفیس سرکاری عمارتیں، گرجے اور مدرسے ہیں جو ایسی خوش اسلوبی سے بنے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والے عش عش کرتے ہیں۔ انٹورپ (Antwerp) سے دوسرے درجہ پر لیج نہایت مضبوط اور محفوظ مقام ہے۔ شہر کے گرد اکتیس[۳۱] میل کے محیط میں بارہ قلعے نہایت مضبوط ہیں جو دریائے میوس کے داہنے اور بائیں کنارے پر واقع ہیں اور ان پر توپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ پہلے اس مقام کو ۱۴۶۸ء میں چارلس دی بولڈ ڈیوک آف برگنڈی (Charles the Bold, Duke of Burgundy) نے فتح کیا تھا۔ اُس وقت سے ۱۹ صدی کے شروع تک اُس کا حال دہلی کی طرح رہا۔ مختلف قوموں نے کم سے کم دس دفعہ اُس کو فتح کیا اور ہر دفعہ باشندے قتل کیے گئے اور مال و اسباب لوٹا گیا اور عمارتیں گرائی گئیں۔ جنرل لیمن (Leman) یہاں کے بارھوں قلعوں کا محافظ تھا جس نے، فوج کثیر جمع کر کے ان کو خوب مضبوط کر لیا تھا۔ یہ شخص یورپ میں بطور عالم ریاضیات کے نزدیک و دور معروف و مشہور تھا اور فوجی مدرسہ میں پروفیسر اور ممتحن تھا۔ شہنشاہ جرمن کا خیال تھا کہ یہ شخص سپہ سالاری کے لئے موزوں نہ ہوگا، مگر اس عجیب و غریب شخص نے ثابت کر دیا کہ کتابوں کا پڑھنے والا میدان جنگ میں بھی اعلیٰ درجہ کا جنرل ہو سکتا ہے۔

۴ اگست منگل کے دن جرمن فوج لیج کی طرف بڑھی۔ اس وقت عجیب بارونق اور عالیشان منظر نظر کے سامنے تھا۔ جرمن فوج آہستہ آہستہ دریائے میوس (Meuse) کی طرف بڑھتی چلی آتی تھی اور بے شمار توپوں اور موٹر گاڑیوں کو ساتھ لیے آتی تھی۔ سب سپاہی سبز، دھانی زرق برق وردیاں پہنے ہوئے تھے جو سب نئی تہ درزا اور عمدہ فیشن کی تھیں۔ ہر سپاہی کے ہتھیار

برق دم چمک رہے تھے اور ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک فتحمند فوج بڑے جلوس کے ساتھ مارچ کرتی ہوئی آرہی ہے۔ ایک انگریزی لڑکی نے اُس فوج کو دیکھ کر ٹھیک کہا تھا They looked like soldiers on the stage یعنی یہ لوگ تھیٹر کے سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔

قصبہ وسی (Visé) چونکہ بیچ میں پڑتا تھا اس لئے جرمن نے پہلے اُس پر قبضہ کرنا چاہا۔ بلجیم اور جرمن سواروں میں مڈبھیڑ ہوئی لیکن بلجیم سواروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر چار سو پیدل بلجیم کی فوج کے جرمن کی فوج کثیر کے مقابلہ میں آ گئے اور ریل کے پل کی دو محرابیں توڑ دیں اور قصبہ وسی کو بچانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ گو نہایت بہادری سے مقابلہ کیا لیکن قسمت نے مدد کی اور ان کو لیج کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا ؎

تجربت بے فائدہ است آں راکہ کج گردید بخت

حملہ آوردن چہ سود آں راکہ برگردید زیں

جرمن نے اس کا بدلہ بہت سخت لیا یعنی برگوماسٹر کو دیوار کے برابر کھڑا کر کے گولی مار دی۔ بہت آدمی جو سپاہی نہ تھے نہ وردی پہنے ہوئے تھے مگر ان کے پاس ہتھیار دکھائی دیئے یا ہتھیار ہونے کا شبہ تھا وہ سب قتل کر دیے گئے۔ قصبہ وسی جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ جب جرمن فوج پہلے وسی میں داخل ہوئی تھی اُس وقت قصبہ وسی بہت ہرا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ چند گھنٹوں میں راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ جو امیر تھے وہ فقیر ہو گئے۔ بچے اپنے ماں باپ کے لئے چلاتے پھرتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو ڈھونڈھتی پھرتی تھیں۔ یتیم بچے ہالینڈ کی سرحد کی طرف چلے گئے کہ وہاں جا کر پناہ لیں اور وہاں کے باشندوں کی رحمدلی پر بھروسا کر کے گذارا کریں۔

بلجیم کی فوج پھر لیج کی طرف ہٹ آئی اور راہ میں جو چیز سامنے آئی اُس کو برباد کر دیا، مثلاً پل، سرنگ، ریل کی سڑکیں اور ریل کی گاڑیاں وغیرہ تاکہ وہ دشمن کے ہاتھ نہ آئیں گاؤں کے گاؤں جلا دیے تاکہ وہاں جرمن کو پناہ نہ ملے۔ جب جرمن کی فوج آئی تو امید کے خلاف انھوں نے دیکھا کہ ہم سے سخت نفرت رعایائے بلجیم کو ہے اور قدم قدم پر ہمارا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تب جرمن نے مکانات جلانا شروع کیے اور لوگوں کو گولیاں ماریں اور ہر طرح کی

وحشیانہ حرکتیں کیں۔ ان لڑائیوں میں جرمن کا نقصان بمقابلہ بلجیم بہت زیادہ ہوا، لیکن جرمنی کی فوج ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ اگر کئی سو اس میں سے مارے بھی گئے تو کیا کمی ہو سکتی تھی۔ انھوں نے دریائے میوس کے پار اترنا چاہا اور بیبیوں کا پل باندھا۔ اِدھر سے بلجیم کے قلعوں سے فیر ہونے شروع ہو گئے اور آگ برسنے لگی۔ گولہ انداز ایسے ٹھیک شست باندھ کر نشانے لگاتے تھے کہ ہر گراب تیر قضا کی طرح اپنا کام کرتا تھا۔ ایسے قدر انداز تھے کہ جس جگہ سیدھ باندھ کر نشانہ لگاتے تھے وہیں لگتا تھا اور کبھی خطا نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ پل جو جرمن نے باندھا تھا اس کے ٹکڑے اڑا دیے، لیکن تب بھی جرمن نے کچھ پروا نہ کی اور پل کو چھوڑ کر دریائے میوس میں کشتیاں ڈال دیں اور آناً فاناً دریا کو کشتیوں میں عبور کر کے جرمن نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ لیج پر گرداوری کی اور رات کے وقت لیج کی طرف بڑھتے ہوئے قلعوں کے قریب کھلے میدانوں میں پہونچ گئے کہ یکایک بھق سے روشنی ہو گئی جس سے تمام میدان جگمگا اٹھا اور تمام فوج جرمن پر گویا بجلی چمک گئی۔ قلعوں پر سے توپوں کی باڑھ پڑنے لگی اور گراب کا مینہ برسنے لگا۔ توپوں کی وہ گرج تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ گیا ہے اور زمین زلزلہ میں آ گئی ہے۔ فوج جرمن اس روشنی کے باعث، جو بجلی کی طرح ان پر گری، چکاچوند میں آ گئی اور یہ دیکھ کر کہ بھاگنے کی راہ ہے نہ مقابلہ کی طاقت، ہکی بکی ہو گئی اور جس طرح جانور ذبح خانوں میں جا کر گھبرا جاتے ہیں اسی طرح فوج جرمن گھبرا گئی اور جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ نکلا۔ ہزاروں جرمن ہلاک اور زخمی ہوئے۔ تمام میدان میں لاشیں بچھ گئیں اور کشتوں کے پشتے لگ گئے اور زمین خون سے رنگین ہو گئی۔ اس دستہ فوج میں سے ایک جرمن بھی اپنے لشکر کو واپس نہ جا سکا۔ چند سپاہی جو زندہ بچے وہ قید کر لیے گئے۔

نظم

ہوئے دونوں لشکر جو سرگرم کیں — گیا شور تا آسمان بریں
یکو... نکر کھوں میں کہ بیکار تھی — قیامت وہاں اک نمودار تھی
ہوئے کشتۂ جنگ آوراں بے شمار — زمیں ان کے خوں سے ہوئی لالہ زار
ہوا جمع توپوں کا ایسا دھواں — بنا آسماں اک تہ آسماں
رہی جب نہ تاب سکون و قرار — کیا فوجِ جرمن نے رن سے فرار

سپاہی گریزاں ہوئیں اس طرح — کہ آندھی میں برگ خزاں جس طرح
کیا بیلجیم نے مخالف کو پست — ہوئی جرمنی کو مکمل شکست

دوسرے دن یعنی ۵ اگست کو جرمن کی فوج نے قلعوں پر گولے برسائے۔ نشانے بہت ٹھیک تھے لیکن چھوٹی توپوں کے باعث اثر بہت کم ہوا۔ تب جرمن بہت بڑا لشکر لے کر آگے بڑھے اور چاہا کہ قلعوں پر دھاوا کریں لیکن بیلجیم کی بڑی توپوں نے گراب کا مینہ برسایا۔ جرمن اور آگے بڑھے تب مشین گنوں سے اُن پر فیر کیے گئے۔ اس پر بھی جرمن نہ رکے اور مورچوں کی طرف بڑھتے چلے گئے جو قلعوں کے درمیان تھے۔ ادھر ان کا آنا تھا کہ بیلجیم کی پیدل فوج سنگینیں ہاتھ میں لے کر مورچوں سے باہر کو دوڑی اور ٹھنڈے لوہے کا مزہ بھی دشمن کو چکھا دیا۔ موت کا بازار گرم ہونے لگا۔ جرمن فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے اور نہایت ابتری کی حالت میں پیچھے ہٹے۔ جرمن کے سردار فوج نے ۲۴ گھنٹے کی مہلت مانگی کہ اپنے مردے دفن کریں۔ لیکن بیلجیم کے جنرل نے یہ سوچ کر کہ مہلت لینے میں دشمن کا فائدہ ہے اور زیادہ بھاری توپیں لانے کے واسطے فرصت چاہتا ہے مہلت کی درخواست نامنظور کی۔ تب جرمن سواروں کی ایک چھوٹی جماعت، جن میں دو افسر اور چھ سپاہی تھے، انگریزوں کے بھیس میں اس ارادہ سے نکلے کہ جنرل لیمین (Leman) کو ہلاک کریں اور انگریزی زبان میں لوگوں کو سلام کرتے ہوئے بیلجیم کے صدر مقام پر پہونچ کر کہنے لگے کہ ہم برٹش افسر ہیں جو بیلجیم کو بچانے کے واسطے آئے ہیں اور جنرل لیمین (Leman) سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن مارچینڈ (Marchand) نے اُن پر شبہ کر کے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ جرمن سوار بھاگ کھڑے ہوئے لیکن بیلجیم کے فوجی افسروں نے اُن کا پیچھا کیا اور بندوقیں سر کر کے اُن سب کو ہلاک کر دیا۔

۶ اگست کو جرمن کی فوج کثیر نے پیپوں کا پل باندھ کر دریائے میوس Meuse کو عبور کر لیا۔ پل ایسے موقع پر باندھا گیا جو ہالینڈ کی سرحد سے قریب تھا اور وہاں تک بیلجیم کے قلعوں کے گولے پہونچ نہیں سکتے تھے۔ جرمن اب اپنی بڑی توپیں، جو محاصرہ کے کام کی تھیں، لے آئے۔ اُن کے ہوائی جہازوں نے بیلجیم کے ہوائی جہازوں پر غلبہ حاصل کر لیا

اور بلجیم قلعوں کے آہنی گنبدوں پر بم کے گولے گرانے لگے اور فوج جرمن نے دھاووں پر دھاوے کرنے شروع کیے۔ گو بلجیم کی توپیں آگ برسا رہی تھیں اور حملہ آوروں کو بھاڑ کی طرح بھونے ڈالتی تھیں لیکن جرمن کچھ پروا نہ کرتے تھے اور آگے بڑھتے چلے آتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے ؎

تا سر ندہم پا نہ کشم از سر کو بیت
نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

بعض موقعوں پر جرمن فوجوں نے وہی کیا جو جاپانیوں نے Leaoyoung پر حملہ کے وقت کیا تھا۔ یعنی یہ کہ اپنے سپاہیوں کی لاشوں کے پشتے لگا دیے اور اس کو فصیل قرار دے کر اُس کے پیچھے ذرا دم لے لیا اور پھر آگے بڑھے۔

لیج کے باشندوں نے یہ چاہا کہ اُن کے شہر کی عمدہ عمارتیں اور خوشنما سڑکیں سب مسمار نہ ہو جائیں۔ اُنھوں نے اپنے جنرل لیمین Leman سے درخواست کی کہ جرمن کو یہ ترغیب دو کہ شہر کو مسمار نہ کریں۔ اہل بلجیم کی ایک کانفرنس بیٹھی جس میں بلجیم کے سول حکام اور فوجی افسر اور جرمن کا ایک قائم مقام سب شریک تھے۔ جرمن کا مطالبہ بہت سادہ لفظوں میں تھا یعنی یہ کہ شہر مع قلعوں کے ہم کو فوراً دیدو۔ جنرل لیمین نے سول حکام کے دباؤ سے جرمن کو اجازت دیدی کہ شہر لیج پر قبضہ کر لو اور اُس پر گولے نہ برساؤ۔ اب رہے قلعے، وہ سب صحیح و سالم تھے، اس لئے جنرل لیمین نے ارادہ کیا کہ قلعوں کو آخر وقت تک بچانا چاہیے۔ لیکن جرمن نے جواب دیا کہ ہمارے سب مطالبے منظور کرو ورنہ کچھ بھی نہ مانو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ انکار کی حالت میں شہر پر گولا برسایا جائے گا۔ اُسی رات آٹھ بجے سے شہر لیج پر گولا برسنے لگا۔ بلجیم کی فوج نے اپنے افسروں کے حکم کے مطابق ہتھیار رکھ دیے اور شہر کی رعایا میں سے جس کے پاس ہتھیار تھے سب کو حکم دیا کہ ہتھیار حوالے کر دو، چنانچہ جب جرمنی کی فوج شہر میں آئی تو کسی نے مقابلہ نہ کیا۔

جرمنی میں اس فتح کی بڑی خوشی منائی گئی۔ قیصر جرمن نے اپنی رعایا میں اس فتح کی خبر کو مشتہر کر دیا۔ شہر لیج تو حوالے کر دیا گیا لیکن قلعے اب تک سخت مقابلہ کرتے رہے۔ جرمن نے شہر کے نامی آدمیوں میں سے سترہ اشخاص بطور ضامن کے گرفتار کر لیے جن میں شہر لیج کا لاٹ پادری بھی تھا اور اُن سے کہا کہ اگر ہماری فوج کو کسی نے کچھ نقصان پہونچایا تو تم ذمہ دار ہو۔

اس کے بعد اہل جرمن نے اپنی حفاظت کا انتظام کیا۔ ہر عمدہ موقع پر توپیں لگا دیں۔ مورچے بنائے گئے۔ ناکہ بندی کر دی گئی۔ فوج پر فوج جرمن کی آ گئی اور لوگوں کے گھروں میں گھستی گئی۔ جو اسباب چاہا وہ لے لیا۔ اگر کسی نے مقابلہ کیا تو اُس کا گھر فوراً جلا دیا اور اُس کو قتل کر دیا۔

لیج حوالے کر دینے کے بعد قلعے سخت مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن تجربہ کار جنرل لیمین خوب سمجھتا تھا کہ بغیر میدانی فوج کے قلعے کب تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جرمن بڑے Howitzer لائے جن کا گولا اتنی دور سے نشانہ مارتا تھا کہ وہاں تک قلعوں کے گولے پہونچ نہیں سکتے تھے۔ ایسے Howitzer جاپانیوں نے روس کے مقابلہ میں استعمال کیے تھے اور بڑی کامیابی کے ساتھ۔ جرمنی نے جاپان کی لڑائی کے بعد کرپ (Krupp) کے کارخانہ میں بڑے زبردست Howitzer خفیہ طور پر تیار کرائے تھے جن کا قطر ۱۷ انچ کا تھا۔ اِدھر تو ان توپوں کی مار پڑی اُدھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ بم کے گولے قلعوں پر برسائے گئے۔ اس کے سوا گولوں کا دھواں ایسا سخت تیز اور تلخ تھا کہ اہل قلعہ اُس سے بے ہوش ہوئے جاتے تھے، اس پر طرہ یہ کہ رسد اور سامان جنگ کی بھی کمی تھی۔ ان وجہوں سے اہل قلعہ عاجز آ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کے بعد ایک قلعہ فتح ہو گیا۔ پہلے سمجھا گیا تھا کہ بلجیم کے قلعے ایک دن سے زیادہ مقابلہ نہ کر سکیں گے لیکن قلعوں کے بہادروں نے پندرہ دن تک وہ سخت مقابلہ کیا کہ جرمن کے دانت کھٹے کر دیے اور ہزاروں آدمی ہلاک کر دیے جس سے دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور گو اہل جرمنی نے فتح پائی لیکن یہ ویسی ہی فتح تھی جو (Xerxes) کیخسرو نے لاکھوں فوج سے بمقابلہ لیونی داس (LioniDas) کے یونان میں حاصل کی تھی جس کے ماتحت صرف تین سو بہادروں کی جماعت درہ تھرماپولی میں تھی کہ جب فتح کے بعد فوج کا نقصان شمار کیا تو ایک آہ سرد دل پُر درد سے کھینچ کر کہنے لگا کہ (One such victory more & I am undone) یعنی یہ کہ اگر مجھے ایک ایسی فتح اور حاصل ہو تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔

جنرل لیمین کا حال ایک جرمن افسر نے خود چشم دید لکھا ہے یعنی یہ کہ جب قلعہ کا میگزین جرمن فوج نے اڑا دیا تو قلعہ میں جرمن سپاہی داخل ہوئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ جنرل لیمین اینٹوں پتھروں کے ڈھیر میں پڑا ہوا ہے۔ اُس کا چہرہ کالا پڑ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے نائب نے

کہا کہ اس جنرل کی عزت کر دیہ مرگیا ہے۔ اصل میں جنرل لیمین مرا نہ تھا بلکہ بیہوش تھا۔ جب اُس کو ہوش آیا تب اُس نے اُس جرمن افسر کے سامنے تلوار پیش کی لیکن جرمن افسر نے قبول کرنے سے انکار کیا اور کہنے لگا۔ Military honour has not been violated by your sword, keep it یعنی یہ کہ آپ کی تلوار نے سپاہیانہ اعزاز میں کچھ فرق نہیں آنے دیا اسے اپنے پاس رکھیے اُس وقت تک جنرل لیمین کو ضبط رہا تھا لیکن ان الفاظ کو سن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فرانس کے پریسیڈنٹ نے شہر لیج کو بہادری کے صلہ میں Legion of Honour کی عزت بخشی جو اس سے پہلے صرف ایک اور شہر کو حاصل ہوئی تھی۔

برٹش افواج کی روانگی اور بولون میں فرودگاہ

اب برطانیہ کی امدادی فوج کا حال لکھا جاتا ہے جو انگلستان سے روانہ ہوکر بندر بولون میں اُتری۔ وہیں فرنیچ نے اُس کا استقبال کیا اور وہیں سے فوج میدان جنگ کو روانہ ہوئی۔ جب بولون میں داخل ہوگئی تب برٹش پبلک کو اس کی خبر ہوئی۔ خود فوج کو معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں جاتے ہیں۔ جب ریل پر سوار ہوئی تو انجن چلانے والوں کو آگہی نہ تھی کہ آخری منزل کہاں ہوگی اور جب Southampton سے جہاز پر سوار ہوئی تو اُس وقت یہ گمان ہوا کہ فرانس کو جا رہے ہیں۔ تاہم یہ ٹھیک خبر نہ تھی کہ کس مقام پر اتریں گے۔ روانگی کے وقت کسی انگریزی یا فرنچ اخبار نے ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا اور سبھوں نے مصلحۃً خاموشی اختیار کی تھی۔ بولون میں پہونچ کر یہ ممکن نہ تھا کہ فوج کے استقبال کے لئے جو انتظام ہوئے تھے وہ پوشیدہ رہتے جب فوج فرانس میں آگئی تب بھید چھپانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

یہ فوج Highlanders کی تھی جس کے دیکھنے کے لئے دوکانوں اور گھاٹوں سے دوڑ دوڑ کر لوگ آگئے تھے اور سڑکوں پر پرے باندھے ہوئے کھڑے تھے اور اُن کو دیکھ کر نعرہ خوشی بلند کرتے تھے۔ ہر سپاہی نہایت کڑیل جوان معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص کے چہرہ پر دھوپ کا اثر تھا کیونکہ اسکاٹ لینڈ میں بہت زیادہ چلنا پڑا تھا۔ دلوں میں خوشی اور چہروں پر مسکراہٹ تھی

اور داہنے بائیں تعجب سے اُن مچھلی پکڑنے والے مردوں اور عورتوں کو دیکھتے جاتے تھے جو بولون کے گھاٹ پر جمع تھے اور کنارہ پر پانی کی موجوں اور جہازوں پر نہایت خوشی سے نظر ڈالتے تھے۔ جہاں فوج کا کیمپ تھا وہ ایک نہایت پُرفضا مقام تفرج گاہ خاص و عام تھا میدانوں میں خیمے لگائے گئے تھے جہاں سے پہاڑیوں کا نہایت خوشنما منظر دکھائی دیتا تھا۔ جن پر سبز گھاس کا فرش زمردیں بچھا ہوا تھا اور آسمان نیلگوں شامیانہ تانے ہوئے تھا۔ سمندر کی طرف سے صاف اور ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اور پہاڑیوں کے آبشاروں کی آوازیں دور کے نغموں کی طرح خوش آیند معلوم ہوتی تھیں ؎

کشیدہ بر سر ہر کوہسارے — زمردگوں بساطے مرغزارے
ہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ — رُخ خوباں بہ پیشش خط کشیدہ
غبارش آب و رنگ چہرہ گُل — گیاہش دلربائے زلف سنبل

یہ معلوم ہوتا تھا کہ فوج میدان جنگ کو نہیں جا رہی ہے بلکہ کوئی بڑی خوشی کا جلسہ ہے جس میں شریک ہونے کے واسطے لوگ قصبوں اور شہروں سے اُمڈ پڑے ہیں اور اس شاندار اور دلچسپ مقام میں جمع ہو گئے ہیں۔ تمام شہر بولون خوشنما جھنڈیوں سے آراستہ تھا اور جا بجا برطانیہ، فرانس اور بلجیم کے نشان اور جھنڈے لہرا رہے تھے۔ فرنچ فوج جب بلجیم کے میدان میں جانے کے لئے تیار ہوئی تو سپاہیوں کی بہنیں، مائیں اور بیویاں آئیں جن کی آنکھوں میں فخریہ جوش اور جدائی کے سبب آنسو بھرے ہوئے تھے اور سپاہیوں کے بوسے لیتی تھیں گویا اُن کو رخصت کرتی تھیں برٹش فوج مع فرنچ فوج کے ۱۳ اگست کو بلجیم کی طرف روانہ ہوئی اور دس روز تک یہ فوجیں اسی طرح روانہ ہوتی رہیں۔ لوگ ان کو دیکھ کر یہ کہتے تھے کہ ایسے گرانڈیل، خوبصورت چست و چالاک، تنومند اور مضبوط جوان لڑائی پر جا رہے ہیں، اس کو فال نیک سمجھنا چاہیے۔ جس وقت فوج برطانیہ سے روانہ ہوئی تو حضرت جارج پنجم کا فرمان شاہی Southampton میں سنایا گیا جو حسب ذیل تھا۔

"You are leaving home for the safety and honour of my Empire. Belgium, which

country we are pledged to defend, has been attacked, and France is about to be invaded by the same powerful foe. I have implicit confidence in you, my soldiers. Duty is your watchword and I know your duty will be nobly done. I shall follow your every movement with the deepest interest, and mark with eager satisfaction your daily progress. Indeed, your welfare will never be absent from my thoughts. I pray God to bless you and guard you and bring you back victorious."

یعنی تم میری سلطنت کی حفاظت کی غرض سے اور اُس کی عزت قائم رکھنے کی غرض سے اپنے ملک اور وطن سے باہر جا رہے ہو۔ بلجیم جس کی حفاظت کا ذمہ ہم نے لیا ہے اُس پر دشمن نے حملہ کیا ہے اور وہی زبردست دشمن فرانس پر بھی چڑھائی کرنے والا ہے۔ میرے سپاہیو میں تم پر پورا بھروسا کرتا ہوں۔ فرض کی انجام دہی تمہارا اصل اصول ہونا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنا فرض نہایت خوبی اور شرافت سے انجام دو گے۔ میں نہایت شوق سے تمہاری نقل و حرکت معلوم کرتا رہوں گا اور جو ترقی کا قدم تم آگے بڑھاؤ گے مجھے اُس کا حال دریافت کر کے نہایت اطمینان ہوگا۔ ہر وقت میرا دھیان تمہاری خیر و عافیت کی طرف لگا رہے گا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تم کو برکت دے اور تم کو اپنی حفاظت میں لے اور پوری فتحمندی کے ساتھ وطن مالوف کو واپس کرے۔ اسی طرح لارڈ کچنر نے، جو وزیر جنگ ہیں اور اس وقت برطانیہ کے سب سے بڑے سپاہی اور جنگ آزما سمجھے جاتے ہیں، فوج کو نہایت عمدہ اور مناسب ہدایتیں کیں کہ غیر ملک میں جا کر فرینچ قوم کے ساتھ اُن کا برتاؤ کیسا ہونا چاہیے۔ اُن ہدایتوں نے

فوج کا دل بڑھایا اور اُس میں قومی جوش کی آگ بھڑکا دی۔

بلجیم میں امدادی فوج کے دیر میں پہونچنے پر اعتراض اور جواب

اہل بلجیم اور اکثر ان کے دوست انگریز وغیرہ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں برطانیہ اور فرانس نے اپنی فوجیں پہلے بلجیم میں نہ بھیج دیں کہ وہ دریائے میوس پر جرمن کو روکیں اور اُن کو عبور نہ کرنے دیں اور بلجیم کی تباہی جو امدادی فوجیں پہونچنے سے پہلے ہوئی وہ نہ ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرانس میں بڑے بڑے فوجی سرداروں کو یقین تھا کہ اگر بلجیم کی سرحد کو جنگ کا صدر مقام بنایا جائے گا تو بلجیم اور فرانس ہمیشہ کے لئے پامال ہو جائیں گے جرمن کا مقصود تو یہ تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے پیرس میں پہونچ جائے اور فرانس کی طاقت بالکل توڑ دے، پیشتر اس کے کہ روس اپنے دوست فرانس کو مدد دے سکے اور فرانس کا ارادہ یہ تھا کہ جرمن کے حملہ کو روکے اور پھر جواب میں جرمن کے علاقوں پر حملہ کرے۔ سنہ ۱۸۷۰ء سے فرانس نے دو خیال اپنے ذہن میں نقش کر رکھے تھے۔ ایک یہ کہ آلسس لورین (Alsace Lorraine) کو دوبارہ فتح کرے جو اُس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اسی وجہ سے فرانس نے اپنی فوجیں پوربی سرحد پر جمع کیں یعنی بیلفورٹ (Belfort) سے لانجوی (Langvey) تک اور دوسرا خیال یہ تھا کہ کسی حال میں اپنی فوجیں جا بجا تقسیم نہ ہونے دے بلکہ ایک جگہ جمع رکھے تاکہ طاقت کم نہ ہو جائے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں جو شکستیں فرانس نے بمقابلہ جرمن کے کھائیں وہ اس وجہ سے تھیں کہ فوج کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ موقعوں پر تھے جرمن نے ہر فوج پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اگر فرانس کی کوشش یہ ہوتی کہ بلجیم اور فرانس کے سب علاقوں کو حملہ سے محفوظ رکھے تو اُس کو ضروری تھا کہ بیلفورٹ (Belfort) سے نامور تک اور نامور سے دریائے میوس کے کنارے کنارے لیج تک اپنی فوجیں قائم کرتا۔ اگر اس لین کو وہ اپنے قبضہ میں رکھتا تو جرمن کے لئے ناممکن ہو جاتا کہ وہ بلجیم پر حملہ کرے لیکن یہ طریق اختیار کرنے میں فرانس کی فوجیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتیں جن میں سے ہر ایک حصہ پر جرمن جب چاہتا غلبہ کر لیتا۔ فرانس نے جو یہ تجویز سوچی تھی کہ اپنی فوجیں تقسیم نہ ہونے دے یہ بھی اعلیٰ درجہ کے نقصان سے خالی نہ تھی۔ سب سے پہلے تو یہ نقصان تھا کہ بلجیم میں جرمن بہت کثرت سے بھر جاتے۔

دوسرا نقصان یہ تھا کہ اگر جرمنی اپنی فوجیں سمندر کے کنارے تک لے آئے تو وہاں سے پھر شمالی فرانس کے اُن حلقوں میں جہاں صنعت و حرفت کے کارخانے ہیں یا جہاں کانیں کھودی جاتی ہیں گھس پڑے یا جب چاہے اُن کو غارت کرے۔ فرینچ جنرلوں کو یہ سب معلوم تھا لیکن وہ مجبور تھے کہ فوجوں کو دو طرف تقسیم نہیں کر سکتے تھے اور اس بات کی سخت ضرورت تھی۔ فرانس یہ خوب سمجھتا تھا کہ جتنے عرصہ تک جرمن فوج کو روکے رہے گا اور اپنی فوجوں کو جا بجا تقسیم نہ ہونے دیگا اُسی قدر اچھا ہے۔ کیونکہ برطانیہ نے سمندر کی طرف جرمنی کی راہ روک دی تھی اور فرانس کو بہم روانہ کر دی تھی کہ خشکی کی لڑائی میں مدد دے ادھر یورپ کی طرف سے روس اپنا ٹڈی دل لشکر جرمنی کے مقابل لا رہا تھا، جو ایسے ساز و سامان سے آ رہا تھا کہ جرمنی کو اُس کا مقابلہ دشوار تھا۔

روس کو جاپان کی لڑائی سے سبق حاصل ہو چکا تھا اور اُس نے اپنی فوج نئے سرے سے آراستہ کر لی تھی اور جنگ کے طریقوں میں بہت کچھ اصلاح کی تھی اور اب اُس کی فوج دنیا میں ایک نہایت زبردست ساز و سامان سے آراستہ اور تعداد میں نہایت کثیر سمجھی جاتی تھی۔ اُس نے جاپان سے صلح ہو جانے کے بعد اس بات کی تحقیقات کی کہ کیوں اُس کی فوج نے جاپان کے مقابلہ میں شکستیں کھائیں اور ذلت اُٹھائی۔ اُس نے بڑے بڑے جنرلوں کو عہدوں سے علیحدہ کیا اور فوج کے ٹھیکہ داروں کو جنھوں نے ایسی قومی اور ملکی مصیبت کے وقت اپنا ذاتی فائدہ بیجا طور پر حاصل کیا تھا، بے رحمی سے سزائیں دیں ۱۹۱۴ء سے روس کی کوشش خاص طور پر یہ رہی کہ جرمنی اور آسٹریا کے مقابلہ میں اپنی سلطنت کی حفاظت کرے۔ پس فرانس نے روس اور برطانیہ کی فوجوں کی آمد کا خیال کر کے اپنی فوجوں کی نقل و حرکت تجویز کی تھی اور اس لئے السس لورین Alsace Lorraine پر بہت بڑے لشکر سے حملہ کر دیا تھا جہاں فرانس خیال کرتا تھا کہ جرمن کی فوج زیادہ تعداد سے مقابلہ پر آئے گی۔ فرانس یہ یقین رکھتا تھا کہ ان دونوں صوبوں کی رعایا ہمارے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے اور جرمن کی حکومت سے نکل جانے کو تیار رہے۔ اُس نے یہ تجویز کی تھی کہ بڑی فوج صوبہ لورین Lorraine میں رہے اور چھوٹی فوج جرمن کو اُتر کی طرف روکے رہے۔ فوج کے چند دستے بلجیم کی مدد پر رہیں۔ پیدل سپاہ کے دستے نامور (Namur) کی طرف بڑھیں اور دریائے میوس کے پار جرمن کو آنے نہ دیں۔ سواروں کے

رسالے بلجیم کے درمیانی حصہ تک پہونچ کر جرمن کے سواروں کو پیچھے ہٹادیں اور آمدورفت کے راستوں پر امدادی فوجوں کو جو علاقوں سے آئی تھیں تعینات کردیا جائے۔

لیج پر حملہ کرنے کے بعد جس کا ذکر ہوچکا ہے، شہنشاہ جرمن نے ملکہ ہالینڈ کے ذریعہ شاہ بلجیم کے پاس پیام بھیجا کہ اگر بلجیم مقابلہ نہ کرے اور فرانس پر فوج جانے کے واسطے راہ دیدے تو بلجیم کے باشندوں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جائے گا اور اس کی سلطنت بحال و برقرار رہے گی۔ شاہ بلجیم نے انکار کیا اور کہا کہ فرانس، برطانیہ اور روس ہماری مدد پر ہیں اور اگر وہ ہم کو تباہی اور بربادی سے بچا نہ سکیں تب بھی ہماری بات اسی میں رہتی ہے کہ ہم مقابلہ کریں اور پیچھے نہ ہٹیں تاکہ دنیا میں نام رہ جائے۔

جوانمرداں نہ پیچند از سخن رو
ہمی میداں ہمی چوگاں ہمی گو

رعایائے بلجیم کو اول تو جرمن سے ویسے ہی نفرت تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر گاؤں اور ہر قصبہ سے جرمن کے ظلم و ستم کی خبریں آرہی تھیں ان سے وہاں کے باشندوں کو اور بھی غصہ پیدا ہوا اور تمام قوم یکدل ہو کر اپنے ملک کو بچانے کے لئے تیار ہوگئی۔ شاہ بلجیم جو نہایت سادہ مزاج اور بہادر ہیں اس موقع پر پیشوا بنے اور بادشاہی کی شان و شوکت چھوڑ کر بغیر کسی جلوس اور ہمراہیوں کے، اپنے لشکر کے سپاہیوں کے ساتھ ساتھ رہ کر سب کی ہمت بڑھائی اور اسی طرح رہنا اختیار کیا جس طرح معمولی سپاہی رہا کرتے ہیں۔

جب بلجیم کا لشکر مقابلہ کرنے نکلا تو اس ملک کے کاہن صلیبیں لیے ہوئے لشکر کے پہلو بہ پہلو تھے اور ہمت دلاتے تھے کہ مذہب کے لئے شہید ہوجانا چاہیئے مگر بلجیم بلکہ تمام دنیا کو معلوم ہوگیا کہ اعلیٰ درجہ کی بہادری، جانبازی اور قومی جوش یہ سب بیکار ہیں، جبکہ مقابلہ میں ایسی فوج کثیر ہو جو تو اعد داں، زبردست اور جدید اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو۔ بلجیم کی فوج ایک لاکھ تھی جو میدان جنگ میں کام دے سکتی تھی اور اسی ہزار قلعوں کی فوج تھی جو سنہ ۱۹۱۴ء میں نئے سرے سے ترتیب دی جارہی تھی۔ لیکن کافی طور پر تیاری زمانہ حال میں کبھی نہیں کی گئی۔ بجائے اس کے کہ فوجی طاقت پر بھروسا کیا جاتا بلجیم ان حقوق پر بھروسا کرتا تھا جو عہدناموں کے

ذریعہ اُسے حاصل تھے کبھی کبھی ملک کی محافظت کے لئے بڑی بڑی تجویزیں ہوتی تھیں۔ بہت روپیہ خرچ کرنا قرار پاتا تھا۔ لیکن اُن تجویزوں پر عمل کبھی نہیں ہوتا تھا کبھی کبھی توپیں خریدی جاتی تھیں۔ مگر حوالگی کی نوبت نہیں آتی تھی، نہ قلعے بنائے جاتے تھے جن پر وہ توپیں چڑھائی جا ئیں۔ لیج اور نامور غیر محفوظ حالات میں تھے۔ سول گارڈ جس کی تعداد پچاس ہزار تھی اور جس کو قلعہ کی محافظت سپرد تھی اُس کا حال یہ تھا کہ جب جنگ شروع ہوئی اُس وقت اس کو موزر رائفل Mauser Rifle دیے گئے اور اُن کا استعمال کرنا اُس کو سکھایا گیا۔ غرضکہ بلجیم کی فوجی حالت بہت اصلاح کے قابل تھی اور جرمن کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتی تھی۔

اہل بلجیم فرانس اور برطانیہ کی مدد پر بھروسا کیے ہوئے تھے۔ صرف یہ چاہتے تھے کہ حملہ آوروں کو روکے رہیں جب تک کہ اتحادی فوجیں پہونچ جائیں۔ فرانس کی سپاہ کی نقل و حرکت بہت آہستہ رہی جس سے جرمن کو موقع ملا کہ اپنے منشاء دلی کے مطابق اُس نے چھاپا مارا اور بلجیم کی فوجوں کی طرف ایک بہت بڑا لشکر لاکر ڈال دیا۔ فرانس کی فوج نامور پر بھی دیر میں پہونچی اور تعداد میں بھی کم تھی بلجیم کی محافظت جو فرانس نہ کرسکا اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برطانیہ کی فوج میدان جنگ میں سات روز پانچ دن دیر کرکے پہونچی۔ اہل بلجیم کا ارادہ یہ تھا کہ دریائے میوس Meuse کی لین کو جس قدر عرصہ تک ممکن ہو بچاتے رہیں اور پھر اگر ضرورت ہو تو نامور Namur اور انٹیورپ کے قلعوں میں پناہ لیں۔

جب جرمن کا لشکر بلجیم میں داخل ہوا اُن کو اُمید تھی کہ ہم کو گذرنے کے واسطے راہ مل جائے گی اور شاید ہی کچھ مقابلہ ہو تو ہو۔ مگر اُن کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ یہاں کے باشندوں کو ہم سے سخت نفرت ہے اور ہر شخص سخت مقابلہ پر آمادہ ہے اور جو چیز جس کے ہاتھ پڑتی ہے اُس کو وہ بطور ہتھیار کے ہمارے مقابلہ میں کام میں لاتا ہے۔ انھوں نے اُس کی تدبیر کی۔ جرمن کی پالیسی یہ رہی ہے کہ سول آبادی یعنی عامہ رعایا جس کا تعلق فوج سے نہیں ہے وہ ہرگز ہرگز شریک جنگ نہ ہو۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں جب کہ فرانس اور جرمنی میں جنگ ہوئی تھی جرمنی نے اس حکمت عملی پر بہت سختی سے عمل کیا تھا۔ وہی عمل جرمن کو اس لڑائی میں بھی کرنا تھا مگر وہ سختی کی جو مہذب قوموں میں حالت جنگ میں نہیں برتی جاتی ہے۔ اُن زیادتیوں کا مفصل حال پہلے لکچر میں بیان کیا جاچکا ہے یہاں

تفصیل کی ضرورت نہیں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ خود ایک جرمن نامہ نگار نے جرمن کے ظلم و ستم کی شہادت دی ہے جس کو کافی ثبوت کہنا چاہیے۔ اُس نے سرکاری طور پر سفیروں کے فوجی مصاحبوں کے ساتھ بلجیم کے اُس حصہ کا سفر کیا جو جرمن فوج کے قبضہ میں تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے دو گاؤں Herve اور Battice کا معائنہ کیا وہ مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیے گئے۔ Herve میں پانچ سو مکانات تھے اُن میں سے صرف انیس باقی رہ گئے ہیں۔ ہر جگہ لاشوں کے انبار لگے ہوئے ہیں اور جلا ہُند آتی ہے گرجا کی عمارت اینٹ روڑے کا ڈھیر ہے۔ جو مکانات مسمار ہونے سے بچے ہوئے ہیں وہ ایسے ہیں جن پر یہ نوٹس لگے ہوئے ہیں "ہم کو نہ مارو۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ ہماری جان چھوڑ دو ہم بے گناہ ہیں۔" یہی حال لیج تک تمام راہ دیکھنے میں آیا ہے۔" غرضکہ جرمن قوم کے ظلم و ستم سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ موت کے فرشتے زمین پر اُتر آئے ہیں جنھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا ہے۔ نہ بچوں کو چھوڑتے ہیں نہ عورتوں کو نہ مردوں کو۔ یا یہ کہ کوئی وبا پھیلی ہوئی ہے جس نے گاؤں کے گاؤں اور قصبے کے قصبے صاف کر دیے ہیں۔ یا وحشی فرقے ملک میں گھس پڑے ہیں جو انسان کے خون کے پیاسے ہیں اور لوٹنا مارنا پھونکنا اُن کا کام ہے جن سے نہ عبادت گاہیں بچیں نہ کسی کا گھر۔

جرمن کا رسالہ قصبہ وسی سے گذر کر مقام Tongres پہونچا۔ بلجیم کا جھنڈا ٹاؤن ہال پر لہرا رہا تھا۔ جرمن نے اُس کو گرا دیا۔ میونسپلٹی کے خزانہ پر قبضہ کر لیا اور ڈاکخانہ سے دس ہزار فرانک لیے اور نیز Hasselt کے مقام پر حملہ کر دیا۔ وہاں کی نیشنل بینک سے دو ملین فرانک یعنی اسی ہزار پونڈ چھین لیے گویا پورے طور پر ڈاکوؤں کا کام کیا جس کی اجازت جنگ میں ہرگز نہیں ہے۔ ۱۲ اگست کو Orbmont کے مقام پر دو ہزار جرمن سوار بڑھے اور ادھر سے بلجیم کے نیزہ برداروں نے مقابلہ کیا، لیکن جرمن مشین گن کی آگ برداشت نہ کر سکے اور پیچھے ہٹ گئے۔ دوسری صبح جرمن نے پھر حملہ کیا لیکن بلجیم کی فوج نے وہ آگ برسائی کہ جرمن کچھ دور تک پسپا ہو گئے۔ اُس وقت ڈریگون Dragoon کے رجمنٹ نے مقام Aineffe پر چھاپا مارا تین گھنٹے تک سخت لڑائی ہوئی۔ جرمن فوج پیچھے ہٹا دی گئی اور اُس کے ۱۰۳ سپاہی مارے گئے اور ۱۰۲ گرفتار ہوئے۔ اسی طرح کئی موقعوں پر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں دونوں فریق میں ہوئیں جن میں بلجیم کو کامیابی ہوئی اور جرمن کا نقصان زیادہ ہوا۔ کبھی توپیں چھین گئیں کبھی گھوڑے، کبھی رسد کا سامان اہل بلجیم کے

ہاتھ آیا۔ دونوں طرف سے اعلیٰ درجہ کی بہادری ظاہر ہوئی۔ یہاں تک کہ جرمن کی شجاعت کا اقبال بلجیم نے اور بلجیم کی بہادری کا اعتراف جرمن نے کیا۔ اہل بلجیم کو اپنی فتح اور کامیابی کے باعث اپنے اوپر بہت بھروسا ہو گیا اور جرمن نے یہ سمجھا کہ جس دشمن کو بہت کمزور سمجھتے تھے وہ ویسا کمزور نہ نکلا۔

دشمن نتواں حقیر و بے چارہ شمرد

بتاریخ ۵ اگست، جرمن سپاہ بہت کثیر تعداد میں بلجیم کے وسط کی طرف بڑھی۔ سواروں کے رسالے آگے آگے تھے اور ان کی آڑ میں پیدل سپاہ چلی آتی تھی۔ دوسرے دن مقام Waremme سے ہالینڈ کی سرحد تک نہایت تیزی سے پھیل گئی اور مقام Tirlemont پر بڑے زور سے گولا برسایا۔ جرمن کے ہوائی جہاز گرداوری کرتے تھے اور بلجیم کی فوج جہاں جہاں تھی اُس کی ٹھیک جگہ کا پتہ گولہ اندازوں کو بتا دیتے تھے جس کے باعث نشانہ بہت ٹھیک لگتا تھا۔ بلجیم کی سپاہ برداشت نہ کر سکی اور پراگندہ ہو گئی۔ تب جرمن سواروں نے اُن پر حملہ کر کے اُن کو ہلاک کرنا شروع کیا۔ وہاں کے باشندوں نے بھاگنا شروع کیا اور مقام Waremme سے پانچ میل پر ریل تھی، وہاں جا کر ریلوں پر سوار ہو کر برسلس Brussels چلے گئے۔ وہاں بلجیم فوج کی شکست و تباہی اور تمام رعایا کی ہلاکت کا حال پر ملال کہہ کر سب کو گھبراہٹ میں ڈال دیا۔

۱۹ اگست کو بلجیم کی سپاہ نے لووین Louvain پر جم کر مقابلہ کیا۔ یہ مقام موقع کا تھا اور یہ سمجھا گیا تھا کہ یہاں دیر تک سخت مقابلہ ہوگا۔ مگر تھوڑی دیر بعد بلجیم کی سپاہ میدان سے ہٹ آئی اور جرمن کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکی۔ جرمن کی فوج نہایت جوش و خروش سے آگے بڑھتی تھی۔ ہر سپاہی اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے تھا۔ اُن کی زبردست توپیں بلجیم کی فوج میں آگ برسا رہی تھیں اور بیشمار مشین گنیں بھاڑ کی طرح بھونے ڈالتی تھیں اور ہوائی جہاز بم کے گولے آسمان سے پھینک رہے تھے ایسے حملہ کو روکنے میں بلجیم کا نقصان بہت ہوا۔ تین رجمنٹیں نیست و نابود ہو گئیں۔ آخر میں بلجیم کی سپاہ منتشر ہو کر انٹورپ کے قلعوں میں پناہ گیر ہوئی اور دارالسلطنت برسلس Brussels کو دشمنوں کے لیے کھلا ہوا چھوڑ گئی۔

جب جرمن سپاہ دارالسلطنت بلجیم کی طرف آ رہی تھی وہاں کے برگو ماسٹر نے باشندوں کو ہدایت کی کہ لڑائی سے باز رہیں اور بالکل خاموش رہیں ورنہ برسلس پر مفت میں تباہی آ جائے گی۔ ۲۰ اگست کو

جب برگو ماسٹر موٹر پر سوار ہو کر جرمن سپہ سالار کے پاس گیا تو اُس نے برگو ماسٹر سے پوچھا کہ تم اپنا شہر بغیر کسی شرط کے ہمارے سپرد کرنے کو تیار ہو یا نہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ سوائے اس کے کہ میں اس کو تسلیم کروں کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ تب سپہ سالار نے برگو ماسٹر سے کہا کہ تم ذمہ دار ہو۔ کوئی شخص ہماری فوج سے بری طرح پیش نہ آئے ورنہ تم کو سزا دی جائے گی اور تمھارا خاندان اور اہل وطن عبرت خیز مصیبت میں مبتلا ہو جائینگے۔ آج ہماری فوج برسلس میں داخل ہوگی۔ اس کے بعد فوج جرمن چالیس ہزار جس میں سوار اور پیادے دونوں تھے نہایت زرق برق سبز دھانی وردیاں پہنے ہوئے باجے بجاتی اور قومی گیت گاتی ہوئی داخل ہوئی۔ آمد سے پہلے دور سے توپوں کی سلامی کی آواز آئی پھر بینڈ کی سُریلی آواز سنائی دی اور ہراول نہایت جلوس سے فتحمندی کے نشہ میں چور آگے بڑھا۔ اہل بلجیم کی اُمید کے خلاف ہر جرمن سپاہی نہایت تازہ دم عمدہ اور نئے برق دم ہتھیار لگائے سپاہیانہ شان سے اکڑتا چلا آتا تھا۔ گویا پریڈ کرنے جا رہا ہے۔ شہر کے باشندے اُن کو دیکھ کر عش عش کرنے لگے۔ جب لشکر جرمن دارالسلطنت میں داخل ہوا تو اُس نے عمدہ مقامات فوجی ضرورت کے اپنے قبضہ میں کر لیے اور اُسی برگو ماسٹر کو شہر کے معمولی انتظام کے واسطے مقرر کیا۔ لیکن اپنی طرف سے ایک سول گورنر اُس پر افسر کر دیا۔ اس کے بعد شہر سے اسّی لاکھ پونڈ یعنی ۱۲ کروڑ روپیہ جنگ کا خرچہ طلب کیا۔ برگو ماسٹر نے یہ جواب دیا کہ شہر کا سب خزانہ اینٹورپ بھیج دیا گیا ہے، اس باعث یہ مطالبہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ برسلس میں جرمن سپاہ داخل ہونے تک اس جنگ عظیم کا ایک درجہ ختم ہوتا ہے۔ اس کے آگے لڑائی نے دوسرا رنگ بدلا۔ اس وقت تک لڑائی بلجیم کی سرحدوں کے اندر محدود تھی اور فوجیں بھی دونوں طرف بہت زیادہ نہ تھیں۔ آگے جو لڑائیاں ہوئیں وہ فرانس اور برطانیہ کے لشکر عظیم اور جرمن کی سپاہ کثیر میں، پہلے بلجیم کی سرحد پر اور بعد میں فرانس کی سرزمین پر ہوئیں۔

السس ALSACE میں فرانس کے جارحانہ حملے

جب فرانس نے اپنی سپاہ بلجیم کی مدد پر بھیجی، اُس کے ساتھ ساتھ Belfort کے مقام سے، (جہاں فرانس، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ تینوں کی سرحدیں ملتی ہیں) ایک برگیڈ السس میں بھیج دیا جس نے وہاں پہونچتے ہی Altkirk پر قبضہ کر لیا اور جنرل جفر نے، جو کل لشکر فرانس کا قائد اعظم یعنی

کمانڈر ان چیف تھا، یہ اشتہار دیا کہ ہم ۴۴ برس تک اس موقع کا انتظار نہایت افسوس کے ساتھ کرتے رہے کہ تمھارے ملک میں آئیں۔ اب ہم سب کو نہایت خوشی ہونا چاہیے کہ ہم نے آج اپنے دشمن جرمن سے بدلہ لیا اور تم کو جرمن کی ظالمانہ حکومت سے نجات اور آزادی ملی۔ السس کی عمر دراز ہو اور فرانس کو فتح نصیب ہو۔

اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب بلجیم میں فوج بھیجنے کی اشد ضرورت تھی تو کیوں آلسس پر حملہ کیا گیا اور سپاہ کا بڑا حصہ اس طرف سے جرمن پر حملہ کرنے کو بھیج دیا گیا۔ بڑے تجربہ کار جنرلوں اور مشہور مدبروں کی رائے ہے کہ جنرل جفر نے جو کچھ کیا اُس وقت یہی مناسب تھا۔ فوجی ضرورتیں اور ملکی مصلحتیں دونوں اسی کی مقتضی تھیں کہ آلسس پر حملہ کیا جائے۔ اول یہ کہ چونکہ آلسس اور لورین کے باشندے جرمن کی حکومت کو پسند نہ کرتے تھے، اس لئے یقین تھا کہ وہ فرانس کی رعایا بننا پسند کریں گے دوسرے یہ کہ ان صوبوں کی طرف سے سیدھا راستہ فرانس میں گھس پڑنے کا جرمن کو حاصل تھا۔ اس لئے مناسب تھا کہ دونوں صوبوں کی رعایا کو جرمن کے خلاف اُبھار دیا جائے تاکہ اُس طرف سے جرمن کا حملہ بالکل رُک جائے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ چالیس برس سے تمام مہذب دنیا جرمنی کو آداب جنگ و حرب اور شیوہ طعن وضرب کا اُستاد سمجھ رہی تھی۔ جاپان، ٹرکی، یونان وغیرہ جرمنی ہی سے سپہ سالار بلا بلا کر اپنی فوجوں کو فن جنگ سکھواتے تھے اور فرانس ۱۸۷۰ء کی شکست کے باعث عام نظروں میں کمزور و حقیر سمجھا جاتا تھا۔ البتہ زمانۂ حال میں بلقان کی بعض عیسائی ریاستوں نے پیرس کو فن حرب کا مرکز تسلیم کر لیا تھا۔ پس جنرل جفر نے مناسب سمجھا کہ Alsace پر قبضہ کر کے اپنی پوری قوت کا اظہار کر دیا جائے اور جرمن کو عام نظروں میں کم وقعت کر دیا جائے اور جو شکستیں ۱۸۷۰ء میں کھائی تھیں اُن کی یاد فرنچ قوم کے دلوں سے بھول جائے اور ملک کی تمام رعایا سمجھ لے کہ ۱۸۷۰ء میں فوج کے سرداروں نے یہ بڑی غلطی کی تھی کہ جرمن کے حملوں کو فقط روکتے رہے بلکہ خود جرمن پر حملہ کر دینا چاہیے تھا اور اس صورت میں فرنچ کو کامیابی ضرور ہو جاتی۔

سب سے پہلے فرنچ نے یہ کوشش کی کہ جرمن کو Altkirch اور Thann دونوں مقامات سے نکال دیا۔ باوجودیکہ جرمن مورچے بنائے ہوئے تھے اور تعداد میں بھی فرنچ کے برابر تھے، لیکن فرنچ نے دونوں مقامات فتح کر لیے۔ دوسرے دن یعنی ۸ راگست کو فرنچ مقام

Mulkansan کی طرف بڑھے اور شام ہوتے ہوتے اُس میں داخل ہو گئے۔ اُن کی آمد پر یہاں کے باشندوں نے نہایت خوشی ظاہر کی۔ لیکن دوسرے دن جرمن نے بڑی جماعت سے دو طرف سے فرینچ پر حملہ کیا اور سپاہ کی آمد و رفت کی راہ بند کرنا چاہی۔ اس لئے فرینچ کے سردار فوج نے یہی مصلحت دیکھی کہ واپس جائے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ جرمن کی فوج آلسس میں بہت زیادہ تھی جب سپاہ واپس آئی تو جنرل جفر کی رائے ہوئی کہ ابھی تک تو صرف چھاپا مارا ہے لیکن اب السس پر مہم بھیجی جائے تاکہ جرمن کے لئے آلسس اور لورین کی طرف حملہ کرنا مشکل ہو جائے۔ جنرل پیو، جو ۱۸۷۰ء میں جنگ فرانسہ اور جرمنی میں شریک رہ چکا تھا اُس کو یہ مہم سپرد ہوئی۔ شروع میں فرینچ کو کامیابی زیادہ ہوئی۔ Altkirk اور Thame پھر فتح کر لیے گئے اور Mulhansen پر بھی قبضہ کر لیا اور جرمن بہت بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے۔ اُن کی ۲۴ توپیں فرینچ نے چھین لیں۔ جرمن نے مجبور ہو کر آسٹریا کو اپنی مدد پر طلب کیا۔ فرینچ قوم نے اس فتح پر نہایت خوشی منائی۔ اسٹراس برگ strassburg کی تصویر سنگی پر جو ۱۸۷۱ء سے کالا ماتمی کپڑا رنج و غم کی نشانی کے طور پر پڑا ہوا تھا وہ اُتار ڈالا گیا۔ کئی اور مقامات پر جن کا ذکر طول سے خالی نہیں ہے، فرینچ کو کامیابی نصیب ہوئی خصوصاً وادی Bruche میں پندرہ سو جرمن گرفتار کیے اور بارہ توپیں جرمن کی چھین لیں اور آٹھ Mitraillenses مس رائز بھی (یہ ایک قسم کی توپ ہوتی ہے جس میں کئی نالیں ہوتی ہیں) نتیجہ یہ ہوا کہ آلسس کے اوپر کے حصہ سے جرمن نہایت بدحواسی سے ہٹ گئے اور بہت سامان رسد اور سامان جنگ چھوڑ گئے۔

لیکن افسوس کہ جو خوشی پیرس (Paris) میں منائی گئی تھی، وہ زیادہ دنوں قائم نہ رہی اور رنج سے بدل گئی۔ جرمن نے بہت فوج جمع کر کے ۲۰ اگست کو یعنی اسی دن کہ جب برسلس Brussels میں داخل ہوئے تھے لورین Lorraine میں فرینچ پر غلبہ حاصل کر لیا اور دس ہزار فرینچ گرفتار کیے اور پچاس توپیں فرینچ کی چھین لیں۔ فرینچ کو Naney کی طرف لوٹنا پڑا۔ دو دن بعد فرینچ کو السس سے بھی ہٹ جانا پڑا اور Mulhansen اور Donan وغیرہ چند مقامات خالی کر دینا پڑے جن پر جرمن نے قبضہ کر لیا۔ جرمن نے پیرس پر نہایت تیزی سے اور بڑی زبردست سپاہ سے حملہ کیا۔ جس کے باعث جنرل پو Pau جس کو السس کی مہم سپرد ہوئی تھی، پیرس آیا اور اُس کی

حفاظت میں مصروف ہوگیا اور اُس کے آنے کا یہ اثر ہوا کہ جرمن پیرس کا محاصرہ نہ کرسکے۔ جرمن کی فتح جو لورین Lorraine میں ہوئی اُس کی خبر جب برلن Berlin اور آسٹریا میں پہونچی تو دونوں جگہ بڑی خوشی منائی گئی۔

پیرس پر جرمن کا حملہ اور جنگ نامور و شال راوانس

جرمنی کو ۱۸۷۰ء کے واقعات یاد تھے کہ پیرس کے فتح ہونے سے گویا فرانس پر پورا غلبہ ہوگیا تھا لہذا اُس کو اُمید تھی کہ اب بھی پیرس کو فتح کرلینے سے وہی اثر ہوگا۔ اسی خیال سے اُس نے یہ تجویز سوچی تھی کہ بلجیم سے بہت تیزی سے گذر کر پیرس پر چڑھائی کرنا چاہیے۔ فرانس نے ۱۸۷۰ء کے بعد ڈکرور پونڈ خرچ کر کے اپنی سرحدوں پر قلعے بنا کر اپنے ملک کی محافظت جرمنی کے مقابل میں کردی تھی۔ فرانس کی پوربی سرحد کی طرف سے حملہ ہونے کا خوف زیادہ تھا اور شمالی سرحد کی طرف سے کم تھا۔ کیونکہ شمالی سرحد پر بلجیم واقع تھا جس کی نیوٹرلیٹی (Neutrality) یعنی علیحدگی و غیر جانبداری بحالت جنگ، کی ضمانت، فرانس، جرمنی اور برطانیہ نے کی تھی۔ چونکہ بلجیم کی طرف سے حملہ کا خوف کم تھا اور قلعوں کے بنانے میں روپیہ کا خرچ زیادہ تھا اس لئے شمال کی طرف کی سرحد پر فرانس زیادہ مضبوطی اور حفاظت نہ کرسکا۔ جرمنی خوب جانتا تھا کہ اگر اُتر کی طرف یعنی بلجیم کی طرف سے فرانس پر حملہ کیا جائے گا تو فرانس اس کو روک نہ سکے گا اور جرمن کی فوج بڑھتی ہوئی پیرس تک پہونچ جائے گی۔ لیئج اور نامور پر قبضہ کرنا جرمن کے واسطے ضرور تھا کیونکہ بغیر اس کے بلجیم سے فرانس تک جو ریل کی لائن گئی ہے اُس پر کچھ اختیار جرمن کا نہیں ہوسکتا تھا۔ جرمن زیادہ جلدی اس وجہ سے کر رہا تھا کہ بیشتر اس کے کہ روس مدد کو پہونچے فرانس پر غلبہ حاصل کرلے۔

نامور لیئج کی طرح محفوظ جگہ تھی اور جا بجا مضبوط قلعے تھے۔ پچیس ہزار فوج نامور میں تھی جس کا سردار میزل میکل تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ ۲۸ .C.M توپوں نے ہمارے قلعوں کو توڑ دیا۔ اس قدر دنادن توپوں کی مار تھی کہ جو کچھ قلعوں کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی تھی اُس کی مرمت ہم لوگ نہیں کرسکتے تھے۔ دس گھنٹے تک اہل بلجیم نے وہ آگ برداشت کی جو اُن پر برس رہی تھی اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ جس نے ٹوٹی پھوٹی فصیل سے سر باہر نکالا تڑاق سے گولا لگا۔ افسر بہت کثرت سے ہلاک ہوئے۔ آخرکار

بلجیم کی فوج مقابلہ کی تاب نہ لاسکی اور جہاں جس کے سینگ سمائے چل دیا اور فوج اپنے مورچے خالی کرگئی پھر اور قلعوں کی طرف جرمن بڑھے۔ اُن کا بھی یہی حال ہوا۔ قلعہ سورلی (Sauslee) پر جرمن نے ۲۳ / اگست کو چھ سو گولے مارے۔ گولے کا وزن ۵۰ ، پونڈ تھا۔ ۲۴ اور ۲۵ کو تیرہ اور چودہ سو گولے مارے اور یہ گولے وہی ۲۸ .C.M ، Howitzer سے مارے۔ تین دن میں یہ قلعہ فتح ہوگیا اور جس قدر سنگین برج قلعہ کے تھے سب مسمار ہوگئے۔ غرض کہ جنرل میکل نے چار روز تک دس گنا فوج جرمن سے مقابلہ کیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ زیادہ ٹھہرنے میں قلعہ کی سب فوج ہلاک ہو جائے گی تو اُس نے اور قلعوں سے فوجیں لانا شروع کیں۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ جاسوسوں نے زمین کے اندر کا ٹیلی فون توڑ دیا تو اُس نے پھر یہ ارادہ کیا کہ جس قدر فوج کو واپس لے جاسکے اُسی قدر بہتر ہے۔ مگر جبکہ فوج کے مختلف سردار نامور سے باہر جانے کے لئے اپنی فوجیں لڑتے بھڑتے نکال رہے تھے، بہت سپاہی ضایع ہوئے۔ نامور کے چھوڑنے اور فوج واپس لے جانے پر بہت اعتراض کیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر بارہ ۱۲ گھنٹے فوج اور نامور میں رہتی تو ایک سوار اور ایک پیدل اور ایک توپ بھی نہ بچتی۔

اس کے بعد جرمن کی فوج نے شہر شال رائے پر حملہ کیا۔ یہ وہ شہر تھا جس کے راستہ سے نپولین ۱۵ / جون ۱۸۱۵ء کو گذرا تھا۔ اُس وقت سے اس وقت تک سو برس کے عرصہ میں اس شہر میں بہت فرق آگیا تھا۔ لوہے اور کانچ ڈھالنے کے کارخانے یہاں بہت کثرت سے تھے۔ ۱۲ / اگست ۱۹۱۴ء کو بیس جرمن ہسار (Hussars) اس مقام میں داخل ہوئے اور اپنے آپ کو برٹش سوار کہکر دریائے سیمبر (Sambre) کی طرف گھوڑے پوئیائے گئے لیکن فرنیچ افسر نے اُن کو پہچان لیا اور دو آدمی اُن میں سے قتل اور تین زخمی کیے اور مار کر نکال دیا۔ دوسرے دن جرمنی نے شال رائے پر یورش کی۔ ۲۳ / اگست کو قصبہ کے اندر سخت لڑائی ہوئی اور ۲۴ / اگست کو سخت مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک طرف پروشین گارڈ Prussian gaurd تھے اور دوسری طرف فرانس کی سپاہ الجزائر و سنیگال (Senegal)۔ جرمن کا نقصان بہت زیادہ ہوا۔ لیکن ایک ویران فیکٹری میں جو توپیں جرمن نے لگا رکھی تھیں اُن کے باعث جرمن کو فرنیچ پر غلبہ ہوگیا اور فرنیچ کی سپاہ نے واپس آنا شروع کیا اور دریائے سیمبر (Sambre) نامور سے موبانج (Maubeuge) کے نواح تک جرمن کے قبضہ میں آگیا۔

اب یہاں سے برطانیہ کی سپاہ کا حال لکھا جاتا ہے جو دریائے سیمبر سے اُتر کی طرف مقامات

موبانج (Maubeuge) اور Cande کے درمیان تھی۔ مانس (Mons) کے نواح
میں برطانیہ کی فوج بظاہر اچھا کام کر رہی تھی۔ مانس پر قبضہ رکھنے کا کام برٹش فوج کے سپرد کیا گیا تھا
جس سے سر جان فرنیچ کو بہت خوشی تھی۔ کیونکہ مانس ایک ایسا مقام تھا کہ اسی کے آس پاس بہت
بڑی فتوحات اور کامیابیاں برٹش نے اٹھارھویں صدی کے شروع میں حاصل کی تھیں۔ مانس سے تین میل
کے فاصلہ پر جنوب کی طرف مال پلے (Malplaquet) کا مقام ہے جہاں ڈیوک آف مارل برا نے
لوئی چہار دہم کے مقابلہ میں سب سے آخری اور بڑی نمایاں فتح حاصل کی تھی۔ اسی طرح واٹرلو (Waterloo)
کا مقام بھی وہاں سے قریب برسلس (Brussals) کی راہ میں ہے جہاں ڈیوک ولینگٹن نے سب سے
بڑی فتح نپولین کے مقابلہ میں پائی تھی۔

بہ تحقیق معلوم ہوا تھا کہ ایک لاکھ جرمن برٹش فوج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ۲۲ اگست کو برٹش
سواروں کا رسالہ آگے کی طرف بڑھا اور واٹرلو سے ایک کوسے کے فاصلے پر پہونچا تھا کہ وہاں اولانس
(Uhlans) اور برٹش Hussars کی سپاہ سے معرکے پیش آئے اور اُن میں امتحان
ہو گیا کہ تلوار اور گھوڑے کے کرتب میں جرمن فرداً فرداً برٹش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ Sir Philip
Chetwoode سردار فوج نے ٹھیک کہا کہ ہمارے آدمی دشمن کی فوج میں ایسے گھستے ہیں جیسے
چاقو بادامی کاغذ کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ سر جان فرنیچ نے اسی ہزار سپاہ لڑائی کے لئے نکالی۔ ۲۳ اگست
۱۹۱۴ء اتوار کے دن مقام مانس پر برٹش فوجیں جمع ہوئیں۔ تیسرے پہر جرمن مقابلہ پر آئے اور نہایت
سخت حملہ Sir Douglas Haig کے دستہ سپاہ پر کیا۔ برٹش جنرل نے اپنے بازو کی فوج
کا حصہ پہاڑیوں میں Bray کے جنوب کی طرف ہٹا لیا اور سواروں کے رسالے نے اپنی جگہ چھوڑ کر
جنوب کی طرف رُخ کیا۔ آٹھ لاکھ فرنیچ سپاہ نے سرحد کے کنارے کنارے لوٹنا شروع کیا اور پندرہ لاکھ جرمن
فتح کی خوشی میں بھرے ہوئے اُن کا پیچھا کرتے آتے تھے۔ ایسی صورت میں اسی ہزار برٹش سپاہ اس زبردست
ریلے کو کیونکر روک سکتی تھی۔ مانس کے آس پاس جرمن گولہ اندازوں کو بظاہر بڑی کامیابی ہوئی۔
توپوں کی لڑائی میں برٹش سپاہ جرمن کے مقابلہ میں ویسے ہی ناکام رہی جیسے کہ اہل بلجیم نامور میں رہے تھے۔
برٹش کے بڑے تجربہ کار اور جنگ آزما افسروں کا قول تھا کہ ٹرانسوال کی جنگ میں جو سخت سے سخت مقابلہ
برٹش کو مقام Spionkop اور دریائے ماڈر پر کرنا پڑا تھا وہ بھی ان معرکوں کے آگے کوئی چیز نہ تھا

جو اس وقت مقام مانس پر انگریزوں کو پیش آئے۔ جرمن توپوں کی آواز دنادن ایسی ہولناک تھی کہ کلیجے دہلتے تھے اور بدن پر روئیں کھڑے ہوتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک گرم ہوا کا طوفان ہے جس کے ساتھ آگ برس رہی ہے اور بجلی کی چمک اور بادل کی گرج ساتھ ساتھ ہے اور جہاں گراب گرتے تھے وہاں بھونچال آ جاتا تھا۔ ایسے وقت میں توپوں کی پرشور آواز سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے اور فیر کے صدمے اور دھماکے سے زمین ہل رہی تھی اور انگریزی سپاہ کے چاروں طرف گولوں اور گولیوں اور گراب کا مینہ برس رہا تھا۔ برٹش سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ ذرا بھی نہیں گھبراتے تھے اور نہایت استقلال اور اطمینان کی حالت میں بخندہ پیشانی یہ بحث کر رہے تھے کہ فلاں امریکن پہلوان نے جو فلاں انگریز کے مقابلہ سے اپنی جان بچائی اس کی وجہ نامردی تھی یا کچھ اور۔ سپاہ انگریزی گو موت کے منہ میں تھی، مگر اس کو نہایت حقارت سے دیکھتی تھی اور اپنے افسروں پر پورا بھروسا رکھتی تھی کہ وہ ہمارے لئے سب کچھ کر رہے ہیں جو انسانی طاقت سے ممکن ہے۔ جرمن نے [illegible] تھا کہ مورچوں میں کوئی سپاہی بچا نہ ہوگا۔ لیکن انگریزوں نے جنگ ٹرانسوال میں یہ سبق سیکھا تھا کہ مورچے ایسے بنائے تھے کہ بڑی توپوں کے گراب سے اُن کو زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ جرمن یہ سمجھ کر کہ برٹش سپاہی سب مردہ یا زخمی ہوں گے مورچوں پر قبضہ کرنے کے لئے بڑھے۔ جب زیادہ قریب آگئے تب انگریزوں نے توپوں سے اُن کی خبر لی اور چاروں طرف لاشیں بچھا دیں۔ لیکن جرمن نے بہت فوج آگے بڑھائی جو آندھی کی طرح بڑھتی چلی آئی اور کسی چیز سے نہ رکی۔

غرضکہ مانس کی لڑائی آخر تک اُس کامیابی کے ساتھ قائم نہ رہی جو پہلے ہوئی تھی۔ وجہ یہ ہوئی کہ فرانس کی فوج دریائے سیمبر Sambres کے اُس حصہ پر جو نامور اور شال را کے درمیان ہے قبضہ نہ رکھ سکی اور یہ بات انگریزی افواج کے خلاف پڑی۔ جب جرمن فوج دریائے سیمبر کی راہ سے آگے بڑھی تو فرینچ سپاہ جنوب کی طرف واپس ہٹی۔ اگر انگریزی سپاہ وہاں سے ہٹ نہ جاتی تو جرمن فوج اُس کے داہنے بازو پر حملہ کرتی اور زیادہ نقصان پہنچاتی، اس لئے انگریزوں نے مناسب سمجھا کہ فرینچ کی سرحد پر واپس آ جائیں اور اُسی لین میں رہیں جہاں فرینچ سپاہ ہٹ کر واپس آ گئی تھی۔ اگر فرینچ نے مقام شال را پر قبضہ کر بھی لیا ہوتا تب بھی برٹش کی حالت نہایت نازک اور خطرناک ہوتی کیونکہ مانس کو جرمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

جنرل جفر (Jaffer) نے سرجان فرینچ کو اطلاع دی کہ کم سے کم تین Army
Corps ۲۳ اگست کو برٹش کے مقابل کی طرف آ رہی ہیں اور ٹور نے Journai کی طرف
سے دوسری سپاہ آ رہی ہے جو بازو سے حملہ کرے گی۔ یہ خبر صحیح ثابت ہوئی اور معلوم ہوا کہ تین لاکھ
جرمن بڑھتے ہوئے آ رہے ہیں اور توپوں کی تعداد اُن کے ساتھ برٹش توپوں سے چوگنا ہے۔ چونکہ انگریزی
سپاہ اسی ہزار تھی لہذا بڑی خوش تدبیری اسی میں تھی کہ بے فائدہ نقصان سے فوج کو بچایا جائے پس
برٹش جنرل یعنی سرجان فرینچ نے بڑی خوبی اور لیاقت سے سپاہ کو واپس لا کر فرینچ سرحد پر ڈال دیا۔
غرضکہ انگریزی سپاہ کی Retreat یعنی واپسی اسی طرح نہایت اعلیٰ درجہ کی تاریخی یادگار ہے
جس طرح دس ہزار فوج یونانی کی واپسی یونانی جنرل زانوفن کی کمان میں ہوئی تھی۔

جنگ عظیم پر تیسرا لکچر

(تحریری)

سرویا کس طرح اپنے زبردست دشمن آسٹریا سے مقابلہ کو آمادہ ہوا

فرینچ اور برٹش کے معرکے بمقابلہ جرمن دوسرے لکچر میں مذکور ہو چکے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر آسٹریا اور سرویا کی جنگ کا بیان کیا جاتا ہے۔ جب آسٹریا نے سرویا کے مقابلہ پر اعلان جنگ کیا اس وقت سرویا کی حالت بلقان کی سب ریاستوں کی طرح نہایت ابتر ہو رہی تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ رعایا لڑتے لڑتے تھک چکی تھی۔ چالیس لاکھ رعایا بلقان کی جنگ میں اپنا خون آب بار اں کی طرح بہا چکی تھی اور جان کے ساتھ مال و دولت بھی نثار کر چکی تھی۔ اس کے سوا آسٹریا کی پالیسی کے باعث ایسی سازشوں کا زمانہ آگیا تھا کہ سرویا کو ایک دم چین نہ ملتا تھا۔ ٹرکی کے مقابلہ میں سرویا تھک چکا تھا کہ دوسری لڑائی اتحادی فوجوں کے باہم جو ہوئی اُس میں رہی سہی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ سرویا ایک صدی سے آسٹریا کو اپنا دشمن سمجھ رہا ہے جس نے سروین قوم کی اپنی رعایا کو غلامی کی حالت میں رکھا ہے اس وجہ سے سرویا ہمیشہ آسٹریا سے ڈرتا رہا اور اُس سے نفرت کرتا رہا ہے اور بموجب اس مقولہ کے کہ "ازاں مار برپائے راعی زند۔ کہ ترسد سرش را بکوبد بسنگ" یہ چاہتا رہا ہے کہ آسٹریا کو تباہ و برباد کر دے۔ جب آسٹریا کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہوا تو سرویا یہ سمجھا کہ اب میرا خاتمہ ہوا چاہتا ہے لہذا اُس کا ہر مرد و عورت، پیر و جوان اپنی جان و مال سے تیار ہو گیا کہ کسی طرح سرویا کو فتح حاصل ہو۔

روس نے سرویا کو پہلے سے اطلاع دی تھی کہ کسی نہ کسی بہانہ اور حیلے سے ۱۹۱۴ء میں آسٹریا ضرور سرویا سے لڑائی ٹھانے گا اور خود بھی روس نے کوشش کی تھی کہ اپنی بری و بحری فوج کو نہایت جلد ترتیب دے اور اُس کو خوب درست کرے تاکہ جب موقع پیش آئے تو سرویا کو فوج سے مدد دے سکے کیونکہ اُس وقت اُس نامہ و پیام سے کام نہیں نکل سکتا تھا جو سفیروں کے ذریعہ روس نے

سرویا کو ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۲ء میں دیئے تھے سرویا بمقابلہ بلغاریہ کے دو لاکھ ۹۵ ہزار سپاہ لایا تھا مگر اس فوج میں توپوں اور افسروں کی کمی تھی اور پورے طور پر مرتب بھی نہ تھی۔ اُس وقت سے ریاست سرویا کی پوری توجہ یہ رہی کہ سپاہ کی آراستگی میں جو کمی ہے اُس کی تکمیل کی جائے۔ سرویا کو یہ اُمید تھی کہ مانٹی نیگرو چالیس ہزار فوج سے، جو جنگ آزمودہ بہادروں کی ہے، مدد دے گا۔ اُس وقت جو سپاہ سرویا میدان جنگ میں لانے والا تھا اُس کی تعداد دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی جس میں چالیس ہزار سرحدی گارڈ اور بیس ہزار قلعوں کی سپاہ شامل ہو سکتی تھی گویا کل فوج کی تعداد تین لاکھ بیس ہزار ہو سکتی تھی۔

فرانسس جوزف شہنشاہ آسٹریا کی سلطنت میں کم سے کم ایک کرور رعایا سروین نسل کی ہے اور اُن میں سے بہت بڑا حصّہ ایسا ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کسی مناسب موقع پر اپنے آپ کو آسٹریا کی حکومت سے آزاد کرے۔ پس سرویا یہ سمجھا کہ مانٹی نیگرو اور سرویا کی فوج مل کر جب آسٹریا پر حملہ کریگی تو اُس ملک میں جس قدر سروین ہیں وہ سب دوستانہ برتاؤ سے پیش آئیں گے اور ہمارے شریک ہو کر آسٹریا سے مقابلہ کریں گے۔ آسٹریا کو بلغاریہ سے اُمید تھی کہ وہ ہمارا شریک ہوگا، لیکن بلغاریہ کا خزانہ اور میگزین سب جنگ بلقان میں خالی ہو چکا تھا اور تین سو توپیں اور بہت کثیر تعداد میں رائفل وغیرہ سب چھین گئے تھے اور جو توپیں باقی تھیں وہ کثرت استعمال سے بیکار ہو گئی تھیں۔ بلغاریہ کو یہ خوف بھی تھا کہ اگر میں نے آسٹریا کو مدد دی تو سرویا پچھم کی طرف سے اور رومانیہ اُتر کی جانب سے مجھ پر حملہ کریں گے اور میں دو دشمنوں کے درمیان گھر جاؤں گا۔ رومانیہ کے پاس بہت بڑا خزانہ اور پانچ لاکھ سپاہ نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی اور اُس نے جنگ بلقان میں جب سے صلح کرائی تھی تب سے بلقان میں پولیس کی ڈیوٹی اختیار کی تھی یعنی اعلان کر دیا تھا کہ بلقان کی صلح میں اگر کسی ریاست نے خلل ڈالا تو میں اُس سے لڑوں گا اور اُس کو سزا دوں گا۔ بلغاریہ کو سرویا اور یونان سے سخت عداوت تھی مگر اس وقت سرویا سے بدلہ نہ لے سکا کیونکہ رومانیہ مدد کا معاہدہ سرویا اور یونان دونوں سے کر چکا تھا۔ پس بلغاریہ کو لازم آیا کہ خاموش رہے اور موقع کا انتظار کرے۔ بلغاریہ نے وقتاً فوقتاً باری باری سے روس، سرویا، یونان، آسٹریا، اٹلی اور ٹرکی سے دوستی کا اظہار کیا ہے لیکن کسی سے سچائی کا برتاؤ نہ کیا۔ جیسے کوئی ناکتخدا عورت شادی کے لئے بہت مردوں سے محبت کا اظہار کرے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ہرجائی کا شوہر بننا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ ع۔

که ایں عجوز عروس ہزار داماد ست

یہی حال بعینہ بلغاریہ کا ہوا۔

اہل رومانیہ چونکہ نسل اور زبان اور مذہب کے اعتبار سے لیٹن ہیں لہذا اُن کو جرمن قوم سے نفرت اور سلیو قوم سے محبت ہے۔ اسی بنا پر اُن کو آسٹریا سے بھی ہمدردی نہیں ہے کیونکہ ہنگری میں ۳۰ لاکھ رومانین قوم کی آبادی ہے جن کے ساتھ آسٹریا کا برتاؤ بہت سخت ہے۔ اس کے علاوہ بلقان میں جابجا پھیلا ہوا، ایک فرقہ ہے بنام نہاد Kutzo Vlachs جو خانہ بدوشی اور غارتگری پیشہ ہیں اور یہ رومانین نسل سے ہیں اور آسٹریا کی گورنمنٹ اُن کو اپنی پناہ اور حمایت میں رکھتی ہے۔ اس لیے جب کبھی رومانیہ نے کوئی اصلاح کا مسئلہ بلقان میں چھیڑا آسٹریا نے خفیہ اور علانیہ دونوں طرح اُس کی مخالفت کی۔ سچ بات یہ ہے کہ ترکوں کی سلطنت میں جو مقدونیہ نے ترقی نہیں کی اور تمدن میں اور قوموں سے پیچھے رہا اُس کا الزام ترکی پر ہرگز نہیں ہے بلکہ آسٹریا نے اپنے جاسوس نہایت کثرت سے جا بجا بلقان میں مقرر کر رکھے تھے اور وہ لوگ اس کام پر مقرر کیے جاتے تھے جن کا نامۂ اعمال بدچلنی کے باعث سیاہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مثل مشہور ہوگئی تھی کہ "بلقان کے جیل خانوں کو دیکھو تو اعلیٰ درجہ کے بدمعاش اور بدافعال لوگ ملیں گے جو آسٹریا کے جاسوس ہیں"۔ آسٹریا کی پالیسی سو برس سے یہی رہی ہے کہ بذریعہ ایسے جاسوسوں کے بلقان کی ریاستوں میں باہم نفرت پیدا کر دی جائے جس سے آسٹریا کو آسانی ہو کہ وہ چپکے چپکے بلقان میں اندر ہی اندر دخل پیدا کرتا جائے اور دریائے Adriatic کا شرقی کنارہ Avlona تک اپنے قبضہ میں کر کے Egean sea میں نکل کر سیلونکا Salonika تک پہونچ جائے۔ چونکہ مانٹی نیگرو اور سرویا راہ میں حائل تھے لہذا یہ ضروری تھا کہ نووی بازار کے وادی کو قبضہ میں لاکر مانٹی نیگرو کو سرویا سے الگ کر دیا جائے لیکن نووی بازار جنگ بلقان میں سرویا کے قبضہ میں آچکا تھا، لہذا آسٹریا نے ضروری سمجھا کہ سرویا سے لڑائی کا حیلہ ڈھونڈھ کر نووی بازار چھین لے۔ یہ پولٹیکل ارادہ آسٹریا کے حق میں بہت تباہی کا سبب ثابت ہوا جبکہ اُس نے سرویا کے مقابل میں فوج بھیجی۔

جب آسٹریا نے سرویا پر فوج بھیجی تو چاروں طرف سے نش Nish کو گھیر لینے کا ارادہ کیا۔ دو ڈیویژن نے دریائے ڈینیوب Danube بیلگریڈ کے نزدیک عبور کرنا چاہا اور تیسری پلٹن نے اُتر پچھم کی طرف سے دریائے Save کے پار اُترنا چاہا اور چوتھی پلٹن Visigrad کی طرف

بڑھی اس ارادہ سے کہ لودی بازار پر حملہ کرکے مانٹی نیگرو کو سرویا سے الگ کر دے۔ یہ تجویز اصل میں بہت اچھی تھی مگر تین باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا، وہ نہیں رکھا گیا۔

(الف) یہ کہ سرویا کی قوم نہایت تیزی کے ساتھ نقل و حرکت کر سکتی ہے۔

(ب) دریائے ڈینیوب کو عبور کرنے کی مشکلات۔

(ج) مانٹی نیگرو کا جوابی حملہ لودی بازار میں۔

جب تک آسٹریا کی فوجیں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور دریائے سیو Save اور ڈینیوب Danube کو عبور کرنے کی کوشش، بیدلی کے ساتھ کرتی رہیں، سرویا نے نہایت تیزی سے سپاہ کو حرکت دی اور جنوبی دستہ سپاہ کو ریل سے مقام نش (Nish) پر پہونچا دیا اور بلغاریہ کی طرف سے اپنی سرحد کو محفوظ کرکے اپنی مشرقی سرحد کی طرف کی سپاہ کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ مانٹی نیگرو نے اپنی فوج کا ایک دستہ Cattaro پر آسٹریا کو روکنے کی غرض سے بھیج دیا اور ایک زبردست فوج کا دستہ اُتر کی طرف روانہ کیا جس نے Visigrad پر آسٹریا کو دھمکی دی اب آسٹریا مجبور ہوا کہ مانٹی نیگرو کے مقابلہ کے واسطے اپنے بازو کی طرف سے سپاہ روانہ کرے تاکہ وہ سرویا کی فوج سے ملنے نہ پائے۔

سرویا نے اپنے دار السلطنت کو چھوڑ کر نش کی طرف واپس جانے کا دھوکا آسٹریا کو دیا اور اصل میں اُتر پچھم کے گوشہ کی طرف چلے یہاں Ushutya سے دوسری فوج آکر شریک ہوگئی۔ آسٹریا کی فوج دریائے ڈینیوب اور سیو کو عبور کرنے میں نہایت سخت کوشش کئی روز تک کرتی رہی مگر سرویا کے گارڈ نے اور دوسری فوجوں نے جو کئی جگہ سے آکر جمع ہوگئی تھیں، ایسا سخت مقابلہ کیا کہ آسٹرین سپاہ دریاؤں کو عبور نہ کر سکی۔ آسٹریا نے چاہا کہ سرویا پر پورب کی طرف سے بڑی سپاہ سے حملہ کرے۔ اس میں بھی اُسے ناکامی ہوئی۔ تین دستے سپاہ کے جو لشکر ہراول میں تھے ایسے پھیل پھوٹ گئے کہ وہ قلب سپاہ سے نہ مل سکے اور ایسے سروین فوج کی گھات میں پھنس گئے کہ ہلاک ہو گئے اور منجملہ تین ہزار چار سو آدمیوں کے صرف پچیس[۲۵] زندہ بچے جو گرفتار ہو گئے۔

اس لڑائی کے بعد آسٹرین فوج نے ۹ اور ۱۰ اگست کو دریائے Drina کے پار اُترنا چاہا جو سرویا کی مغربی سرحد ہے، لیکن عبور نہ کر سکے۔ ۱۱ اگست کو آسٹرین فوج نے رفلوں اور توپوں

کی باڑھیں مارنا شروع کیں اور اُن کی آڑ میں بڑی فوج سے تمام محاذ میں گرداوری کرتی رہی اور ہوائی جہازوں نے بڑی مستعدی سے کام کیا۔ تب بھی ان دونوں دریاؤں کے پار نہ جا سکی۔ سرویا کی فوج نے دیکھا کہ اب دشمن کی سپاہ ہماری فوج سے زیادہ آگئی ہے اور اگر کسی دریا کو بھی اُس نے عبور کر لیا تو ہمارے دونوں بازوؤں پر سے حملہ ہوگا، تو اُس نے مناسب سمجھا کہ ذرا ہٹ جائے تاکہ اپنی بڑی فوج سے جا کر مل جائے اور دشمنوں کی مدافعت کر سکے۔ سپاہ کا اس طرح بڑھنا کچھ تو اپنی حفاظت کے لئے تھا اور کچھ اس غرض سے کہ آسٹرین فوج کو دونوں دریاؤں کے عبور کرنے کی ترغیب ہو۔ ۱۲؍ اگست کو آسٹریا کی فوج ہراول دریائے Drina کے پار آکر پورب کی طرف بڑھی اور دوسرے دستہ فوج نے دریائے ساو (Save) کو عبور کر لیا۔ دوسرے دن بیسیوں کے پل کئی جگہ بنائے گئے اور آسٹریا کی سپاہ جوق جوق دریا کے پار اُتر کر سرویا میں داخل ہونے لگی۔

اس وقت سرویا کی امدادی فوجیں نہایت تیزی سے آگئیں۔ یہ تیزی ایسی تھی کہ اگر کسی نے جنگ بلقان میں سروین فوج کی گرداوری نہ دیکھی ہو تو وہ یقین نہ کرے گا، ۱۷، ۱۸، ۱۹؍ اگست کو یہ فوجیں اس کثرت سے جمع ہو گئیں کہ اگر بازو سے آسٹرین سپاہ حملہ کرے تو اُس کو روک دیں۔ آسٹریا نے حملے پر حملے کیے، اس غرض سے کہ سروین حملہ آوروں کی صفیں توڑ دے۔ مگر یہ کوشش بے فائدہ ثابت ہوئی اور سرویا کی فوج کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکی۔ ۱۸؍ اگست کو تیسرے پہر یہ معلوم ہوا کہ آسٹریا کی سپاہ نے حملہ کرنا موقوف کر دیا۔ اُس کا نقصان زیادہ ہوا اور سرویا کی سپاہ جو حملے روک رہی تھی اُس کا بال بیکا نہ کر سکی اور جو دو دستے سپاہ کے یعنی ۴ اور ۹ نمبر کے رُکے ہوئے تھے مدد کو نہ آسکے۔ ۱۹؍ اگست کو آسٹریا کی طرف سے حملے ہونے بالکل بند ہو گئے۔ آسٹریا کی دو پلٹنوں ۸ اور ۱۳ نمبر کی حالت بہت مایوسی کی ہو گئی اور دو پلٹنیں جو دوسری جگہ پھنسی ہوئی تھیں اُن سے مدد ملنے کی اُمید کچھ باقی نہ رہی۔ سامنے اور پہلو کی طرف آسٹرین فوج کے سرویا کی فوج تھی جس کو شکست ہوئی تھی اور پیچھے دریا تھا جو پایاب نہ تھا اور دریا کو عبور کر کے ایسے ملک سے جانا تھا، جہاں کے باشندوں کی حالت یہ تھی کہ اگرچہ دشمن نہ تھے تاہم کھلے بندوں باغی تھے۔ (شاید بوسینا سے مراد ہوگی) ایسی صورت میں آسٹرین فوج کا ہٹنا کیا تھا گویا شکست کھا کر بھاگنا تھا۔ اب ہر شخص کو اپنی فکر پڑی اور جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ سڑکیں تھیں، نہ گاؤں، نہ کھیت۔ تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ادھر تو سرویا نے تعاقب کر کے دشمن کی سپاہ کو ہلاک کیا، اُدھر فاقہ کشی سے ہزاروں مر گئے۔

۲۰، ۲۱، ۲۲ اگست تینوں دن سروین سپاہ نے تعاقب کیا اور آسٹرین فوج سے جو بچے تھے اُن کو دریائے Drina کے اُس پار بھگا دیا۔ منجملہ ایک لاکھ بیس ہزار آسٹرین سپاہ کے جنھوں نے دریائے Drina کو ۱۲، ۱۳ اگست کو عبور کیا تھا بیس ہزار مارے گئے اور زخمی ہوئے اور پانچ ہزار سے زیادہ قید ہوئے اور جو باقی بچے اُن میں سے بہت سے بھوکے مر گئے یا اوس اور سردی میں غیر محفوظ رہنے سے ہلاک ہوئے یا بھاگ کر گھر چل دیئے۔ آسٹریا کی ساٹھ توپیں سروین کے ہاتھ آئیں اور علاوہ اُس کے بہت سامان جنگ ملا۔ جب کہ آسٹریا کی فوج بھاگ رہی تھی، سرویا کی سپاہ نے تعاقب موقوف کرکے اُتر اور پورب کا رُخ کیا تاکہ جو سپاہ آسٹریا کی اُس طرف پھنسی ہوئی تھی اُس کو گھیر لے۔ اس سپاہ کے جنرل نے سرویا کے مورچوں پر بہت سخت حملہ کیا اور اس حملہ کی آڑ میں اپنے لشکر کا بڑا حصہ ہٹا کر دریائے سیو Save کے کنارے کی طرف لے گیا۔ اس حملہ میں آسٹریا کا نقصان بہت زیادہ ہوا اور دریائے سیو میں جو آسٹریا کے جنگی جہازوں کا بیڑا پڑا ہوا تھا اُس نے آسٹریا کی باقی ماندہ سپاہ کو دریا کے پار اُتار دیا اور قید ہونے سے بچا دیا۔ پس ۲۴ اگست کو یہ باقی ماندہ کم بختی کے مارے سپاہی سرویا کی سرزمین کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور اُس چھوٹی سی حقیر سمجھی ہوئی ریاست سرویا پر جو مہم سزا دینے کے واسطے بھیجی گئی تھی اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

اب آسٹریا کی صرف ایک فوج سرویا کی سرزمین پر رہ گئی جس نے پہلے پہل سرویا کے مشرقی حصہ پر حملہ کیا تھا۔ جب روس نے گلیشیا Galacia پر مہم بھیجی تھی تو اُس وقت یہ فوج آسٹریا واپس بلائی گئی کہ روس کی سپاہ سے مقابلہ کرے لیکن بہت دور نہ پہنچی تھی کہ جنگ Shabatz کا حال سن کر پھر سرویا آ گئی۔ اس فوج نے ۸، ۹، ۱۰ ستمبر کو سرویا کا مقابلہ کیا تھا لیکن شکست کھائی تھی۔ بوسینا کی سپاہ کے وہ دستے جو Shabatz کی شکست فاش میں شریک نہ تھے، وہ سرویا کو چھوڑ کر Visegrad کی طرف پیچھے ہٹ گئے، مگر وہاں سے بھی ۱۱ ستمبر کو سرویا اور مانٹی نیگرو کی فوجوں نے ان کو مار کر نکال دیا۔

شروع میں آسٹریا نے اپنے دشمن کو حقارت سے دیکھا اور اپنی سپاہ کو اِدھر اُدھر تقسیم کر دیا۔ جس وقت سے آسٹریا کو سرویا کے مقابلہ میں کامل فتح اور فوری کامیابی کی اُمید جاتی رہی، اُس وقت آسٹرین سپہ سالاروں کی عقل گم ہو گئی اور بغیر کسی مطلب یا مقصد کے کبھی فوجیں اِدھر کبھی اُدھر بھیجیں اور اس بیہودگی میں اپنا وقت مفت رائگاں کیا اور اپنی سپاہ کی طاقت زائل کر دی۔ سروین یہ دیکھ کر کہ آسٹرین سپاہ کا نہ کوئی مضبوط ارادہ ہے، نہ کوئی خاص غرض ہے، اُن کو اچھی طرح ناچ نچاتے رہے۔ بالکل یہ معلوم

ہوتا تھا کہ سروین گت بجا رہے ہیں اور آسٹرین جنرل اُس پر ناچ رہے ہیں۔ جس وقت موقع پایا سروین سپاہ نے دن سے دھاوا مارا اور آسٹرین سپاہ نیست و نابود ہو گئی۔

ایک مہینہ کچھ کم میں سرویا کی ڈھائی لاکھ فوج نے، جن کو آسٹریا نے حقیر سمجھا تھا، آسٹریا کی فوج کو جو تعداد میں کچھ زیادہ تھی، نہایت زبردست شکست دی اور سامان جنگ آدھے کے قریب چھین لیا اور کئی ہفتوں تک اُس کو لڑنے کے لائق نہ رکھا۔ لیکن اس جنگ Shabatz میں، جو جدار Jadar کی لڑائی کہلاتی ہے، اس کا اثر دور تک پہونچا۔ یہ پہلی لڑائی تھی جس کا نتیجہ قطعی طور پر آسٹریا کے خلاف ہوا اور اُس کا اثر بھی بڑا ہوا یعنی یہ کہ آسٹریا کو معلوم ہو گیا کہ سرویا کے مقابل میں بھی اُس کو کامیابی کی اُمید نہ کرنا چاہیے اور دو فوجیں آسٹریا کی جو جرمنی کو Alsace Lorraine میں مدد دینے کے واسطے تعینات تھیں فوراً واپس بلالی گئیں اور ریزرو Reserve فوج جو روسیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے گلیشیا (Galacia) میں بھیجی جانے کو تھی وہ بجائے پورب کے دکھن کی طرف روانہ کی گئی اور خود جرمن نے مناسب سمجھا کہ اپنی سپاہ فرانس اور بلجیم سے ہٹا کے آسٹریا بھیج دے۔ بجائے اُس فوج کے جو آسٹریا نے سرویا بھیج دی تھی۔ غرض کہ سرویا نے اتحادیوں میں سب سے پہلے قومی آزادی حاصل کرنے کے لئے جرمنی کے فوجی غلبہ کو سخت صدمہ پہونچایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سرویا کی توپوں کی گرج جو مقام Shabatz میں پیدا ہوئی وہ صوفیہ اور قسطنطنیہ بلکہ بحر Adriatic کے پار روما تک گونج اُٹھی۔

گلیشیا میں جرمن فتوحات

اب روس کے معرکے جرمن اور آسٹریا کے مقابلہ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ جرمنی نے دونوں طرف میدان جنگ میں یعنی فرانس اور روس کے مقابلہ میں فتح حاصل کرنے کا منصوبہ باندھا تھا لیکن تیس لاکھ سپاہ کی ضرورت، اُس کو فرانس کے مقابلہ میں لے جانے کی تھی اور صرف دس لاکھ سپاہ ملیشیا Militia میں روس کا حملہ روکنے کی غرض سے چھوڑنا چاہتا تھا اور آسٹریا ہنگری پر بھروسا کرتا تھا کہ وہ مشرق کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا۔ آسٹریا اور جرمن نے ارادہ کیا تھا کہ روسی پولینڈ کو فتح کرنے کے لئے حملہ کریں۔ تجویز یہ تھی کہ آسٹریا کی دس لاکھ فوج گلیشیا سے بڑھے۔ اُسی وقت جرمن سپاہ اُسی تعداد کی لیکن ذرا گھٹیا قسم کی مشرقی پرشیا Prussia اور جرمن پولینڈ کی طرف وارسا Warsaw پر حملہ کرے۔ اس سے یہ

خیال کیا جاتا تھا کہ روسی فوج پر تین طرف سے حملہ ہو جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ شکست کھائے گی یا اپنے ریلوے سنٹر Centre سے جو Brest Litorak میں تھا پیچھے ہٹا دی جائے گی۔

آسٹریا کی بدقسمتی سے روس ان سب تجویزوں سے جو جرمن نے سوچیں آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے مسلسل کئی حملے ایسے کیے کہ جرمن اور آسٹریا کو گمان بھی نہ تھا جس سے سب پروگرام آسٹریا اور جرمنی کا بگڑ گیا۔ جنرل Remen Kampi نے مشرقی پرشیا Prussia میں ایسا چھاپا مارا کہ جرمن فوج آسٹریا کی فوج سے نہ مل سکی۔ اس نے برلن میں رسد پہونچنے کے ذریعے بالکل بند کر دیے اور Kenigsberg اور Thom اور Dantzic کو ایسی دھمکی دی کہ جرمن کو اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی۔ جب جرمن کو اپنے شہروں کے چھین جانے کا خوف پیدا ہوا تو روسی پولینڈ سے سپاہ واپس آئی جہاں فوج ہراول مقام Lody تک پہونچ گئی جو وارسا (Warsa) کی راہ میں ہے اور نہایت بدحواسی سے جلد پروشیا Prussia میں جمع ہو گئی تاکہ کاسک حملہ آوروں کا مقابلہ کرے۔

اس وجہ سے آسٹریا کی فوجیں جو روسی پولینڈ کے پچھم میں تھیں ان کی موت زلیست روسی جنرلوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ جنرل Dauhl اور جنرل Auffenburg اور کئی آرچ ڈیوک جو آسٹریا کی فوجوں کے سپہ سالار تھے ان کو مایوسی نہیں ہوئی۔ ان کے پاس ڈھائی ہزار توپیں اور دس لاکھ چیدہ جوان فوج نظامیہ کے تھے۔ ان کے علاوہ ملیشیا Militia کی بڑی تعداد گلیشیا میں تھی۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ روس ایک بیوقوف دیو ہے جو خواب غفلت میں ہے اور جب تک اٹھے اٹھے گا ہم اس کو ہلاک کر دیں گے۔ پس ان جنرلوں نے دو بڑی زبردست سپاہیں سرحد پر جمع کیں، ایک دریائے Vistula اور دوسری دریائے Bugrivers کے پہلو بہ پہلو بڑھی۔ انھوں نے اسی میل تک لڑائی کی لین قائم کی اور Kholin کی طرف اس ارادے سے چلیں کہ وارسا Warsa پر دھاوا ماریں گے۔ روسی جنرلوں نے مشرقی گلیشیا کی سرحد کی لمبائی میں کاسک کی قوم بطور پردہ کے قائم کر دی اور اس کی آڑ میں فوجیں نقل و حرکت کرتی رہیں۔ ڈیڑھ سو میل کی لمبائی میں ہر راستہ اور پل پر دریائے Dniester اور دریائے بگ کے درمیان یہ کاسک مڈبھیڑ کرتے رہے۔

لڑائی کے شروع سے دو ہفتے تک یہی کیفیت رہی یہاں تک کہ آسٹرین سپہ سالار جو Lemburg میں تھا یہ سمجھا کہ یہ محض بیہودہ شورش ہے اور کچھ نہیں ہے تب اس نے دو ہزار سپاہی بھیجے

کہ Podolia میں گرداوری کریں جب یہ Gorodok مقام پر پہونچے تو وہاں نو سو کاسک تھے جن کے پیچھے آڑ میں بڑی فوج تھی۔ ان کاسکوں نے آسٹریا کی گرد آور فوج کو پسپا کر دیا اور بڑی فوج جو آڑ میں تھی اُس سے مدد نہیں مانگی، کیونکہ اُس میں بھید کھلنے کا اندیشہ تھا۔ کاسکوں نے قصبہ سے نکل کر جنگل میں صفیں آراستہ کیں۔ اُن میں سے تین۳۰ سپاہی آگے بڑھے اور آڑ میں بڑھتے ہوئے چلے گئے، یہاں تک کہ آسٹرین سپاہ کے مقابل آ گئے۔ مقابل آتے ہی کاسک بھاگ کھڑے ہوئے اور ظاہر کیا کہ گویا خلاف اُمید یکایک مقابلہ ہو جانے سے گھبرا گئے ہیں۔ آسٹرین فوج اس حیلہ کو نہ سمجھی اور بے تحاشا کاسکوں کا پیچھا کرنے لگی۔ ان کا پیچھا کرتے کرتے ایسی جگہ پہونچ گئی جہاں روسی فوج گھات میں بیٹھی تھی۔ یہاں دونوں طرف سے رائفل اور توپوں کی باڑھ اُن پر پڑنے لگی جس سے ایک ہزار سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جو تھوڑے بہت باقی بچے، اُن کا تعاقب کاسکوں نے کیا اور اب گلیشیا پر روسیوں نے بڑی زبردست فوج سے حملہ کیا۔ جنرل رسکی Russky کا دستہ سپاہ اُتر کی طرف لیم برگ Lemburg پر بڑھا اور جنرل Brussiloff کی سپاہ پورب کی طرف سے حملہ آور ہوئی، تاکہ دونوں فوجیں مل کر آسٹرین فوج سے تعداد میں زیادہ ہو جائیں جو لیمبرگ کی حفاظت کر رہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک جنرل کی علیحدہ علیحدہ سپاہ آسٹرین فوج کے مقابل میں مفلوج ہو جاتی، لیکن دونوں جنرلوں نے مل کر ایسی خوش تدبیری سے حملہ کیا کہ جنرل Brussiloff کی فوج گلیشیا کے اندر خفیہ گھس گئی اور پیشتر اس کے کہ دشمن سے کوئی بڑی لڑائی پیش آئے، ملک کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا۔ اس سپاہ کا گلیشیا میں داخلہ نہایت پوشیدہ طور پر عمل میں آیا اور ۱۹ راگست سے ۳۱ راگست تک ۱۳ دن میں روز روشن میں ہوا اور باوجودیکہ آسٹریا کے جاسوس نہایت کثرت سے تھے اور سواروں کے علاوہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سرحد کی نگرانی ہوتی تھی، لیکن تب بھی روسی فوج کے داخلہ کا بھید اُس وقت کھلا جب موقع نکل گیا۔

اس بھید نہ کھلنے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ مشرقی گلیشیا جس طرف سے جنرل Brussiloff اپنی فوج لایا، پُرانے زمانہ میں روس کی ایک ڈچی تھی جو اُس سے نکل کر آسٹریا کے ملک میں شامل ہو گئی تھی۔ مشرقی گلیشیا گویا سلطنت روس کا السس لورین Alsace Lorraine تھا، جس کے باشندے سلیو Slav نسل سے تھے اور جرمن زبان بولتے تھے اور پروٹسٹنٹ مذہب رکھتے تھے جو Brussiloff کی فوج کے سپاہیوں کا تھا۔ جب روسی سپاہ داخل ہوئی تب

قصبوں اور گاؤں کے باشندوں نے نکل کر بڑی خوشی سے روسیوں کا استقبال کیا اور اُن کو اپنا بھائی سمجھا اور قصبوں اور شہروں میں چھتوں، سے سڑکوں پر روسی فوج پر پھول برسائے گئے اور لوگ یہ سمجھے کہ ہمارے بھائی آئے ہیں جو اس پرانی ڈچی کو آسٹریا کے پنجہ سے چھڑائیں گے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ روسیوں کے خفیہ ایجنٹ اور جاسوسوں نے گلیشیا کی اُس رعایا کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا کہ جب روس کا حملہ ہو تو اپنی خوش قسمتی سمجھیں۔

کاسک جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ایک جنگجو قوم ہے، جو لڑکپن سے ایسی تعلیم و تربیت پاتی ہے کہ تمام عمر لڑائی میں بسر کرے۔ پردشین Prussian قوم بھی اپنے آپ کو ایسا ہی کہلانا پسند کرتی ہے، مگر اصل میں ایسی ہے نہیں۔ قدیم زمانہ میں کاسکوں اور مغلوں میں بہت جنگ و جدل رہی۔ کاسکوں نے پہلے پولینڈ کی سلطنت قائم کی اور پھر اپنی آزادی برقرار رکھنے کی غرض سے ڈیوک آف ماسکو کے طرفدار ہو کر اُنھوں نے روس کی سلطنت قائم کی۔ روس کی فوج میں یہ فرقہ نہایت بکار آمد ہے۔ ہر قسم کی لڑائی لڑ سکتا ہے اور ہر قسم کے کرتب لڑائی کے جانتا ہے کبھی نیزہ سے حملہ کرتا ہے۔ کبھی گھوڑے سے اتر کر سنگین ہاتھ میں لے کر پیدل کی طرح دھاوا کر کے مورچے فتح کرتا ہے۔ بوقت ضرورت خود مورچے بنا لیتے ہیں اور مورچوں سے اعلیٰ درجہ کے نشانے لگاتے ہیں۔

باوجودیکہ روسیوں کی سپاہ Lemburg کے نزدیک آ گئی اور اکثر آسٹریا اور روس کی سپاہ میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں مڈبھیڑ بھی ہوتی رہی، تب بھی آسٹریا کے سپہ سالار کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے رہے۔ یہاں تک کہ روسی جنرل Brussiloff کی سپاہ کئی دریاؤں کو یکے بعد دیگرے عبور کر کے Golden hipa کے پار جا پہونچی۔ اُس وقت بھی آسٹرین سپہ سالار نے یہ شبہ کیا کہ جنوب کی طرف سے ہمارے عقب پر دشمن کا حملہ ہونے والا ہے۔ آسٹریا کی تین بڑی بڑی فوجیں تھیں جو Lemburg کے آس پاس ڈیڑھ سو میل لمبی لڑائی کی لین کی حفاظت کر رہی تھیں لیکن جب معلوم ہوا کہ دونوں روسی جنرلوں کی فوجیں حملہ کریں گی، تو اور دو بڑی فوجیں علاوہ ملیشیا وغیرہ کے، دونوں جنرلوں میں آسٹریا نے اضافہ کیں۔ یہاں تک کہ پورے تین لاکھ آسٹرین سپاہی Lemburg کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ جو کچھ آسٹریا نے کیا اگست کے آخری دنوں میں بہت دیر بعد کیا۔ جنرل رسکی اور جنرل Brussiloff کی فوجیں Lemburg سے چالیس میل کے فاصلہ پر پورب کی

جانب متعین ہوگئیں اور اب متفقہ فوجیں جنرل Russky کی کمان میں Lemburg پر حملہ آور ہوئیں۔ آسٹریا کے جنرل کوئی ایسے نہ تھے جو روسی سپہ سالاروں کا مقابلہ دماغی طاقت یا فوجی کرتب میں کرسکتے۔ دونوں فوجیں آخر میں تعداد میں برابر ہوگئی تھیں، لیکن روس کی توپیں جو فرانس کے کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں، آسٹریا کی توپوں سے بہتر تھیں۔ اس کے علاوہ آسٹریا نے اپنے نہایت مشہور ۱۲ انچ کے مع بہت سے افسر توپخانہ کے جرمن کی مدد پر فرانس اور بیلجیم کی جانب Howitzer بھیج دیے تھے جن کے بھیج دینے سے آسٹریا کے سرحدی قلعے مثل لیمبرگ Lemburg وغیرہ کے بہت کمزور ہو گئے تھے۔

اس پر طرّہ یہ ہوا کہ جنوبی سپاہ کی مدد کے لئے جو دو پلٹنیں بھیجی گئی تھیں، وہ روسی جنرل Russky نے مقام Zloeyow پر روک دیں اور پراگندہ کر دیں اور فتحمند روسیوں نے آگے بڑھکر ایک پہاڑی موسومہ بہ Naked Hill پر قبضہ کر لیا جہاں سے لیمبرگ کی قسمت کا فیصلہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کرسکتے تھے۔ اس عرصہ میں جنرل Brussiloff کی سپاہ نے جنوب کی طرف سے لیمبرگ Lemburg کو گھیر لیا اور آسٹریا کی بڑی فوج کا جو جنوبی حصہ تھا اُس سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ یہ فوج مقام Holiey میں دریائے Zipa کے کنارے مورچے کیے ہوئے تھی جس جگہ یہ آسٹرین سپاہ تھی، وہ قدرتی طور پر بہت محفوظ تھی، کیونکہ جوالامکھی پہاڑ کا ڈھالو کرارا تھا اور اُس کا آتش فشاں دہانہ بھی تھا جو اس وقت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اُس کو حملہ کر کے لینا مشکل تھا۔ آسٹرین انجنیروں نے بیسیوں چھوٹے چھوٹے قلعے Holiey کے آس پاس بنائے تھے۔ دریا کا راستہ نہایت دشوار گذار تھا، مگر روسی سنگینیں دریا، خندق، مورچے سب پر غالب آئیں اور گولہ اندازوں نے قلعوں اور مورچوں کے ٹکڑے اُڑا دیے اور پیدل سپاہ کے لئے راہ کرلی۔ پہلے تو روسی کھلے بندوں سامنے سے بڑھے۔ پھر لیٹ کر رینگتے ہوئے چڑھے اور بلندی کی طرف فیر کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جب زیادہ نزدیک پہونچ گئے تو ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور ایک جگہ پکڑ کر گولیاں برسانا شروع کیں۔ اتنے میں اُن کی مدد بھی آپہونچی۔ پھر کیا تھا سنگینیں ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے اور پرانا مقولہ جو روسیوں میں مشہور چلا آتا ہے سچ کر کے دکھا دیا یعنی یہ کہ "The bullet is a fool but the bayonet a hero" یعنی گولیاں بیوقوف چلایا

کرتے ہیں اور بہادر سپاہی سنگین سے موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔ آسٹرین اور ہنگرین سپاہی بھی خوب لڑے اور انھوں نے پورے طور پر داد شجاعت دی۔ خوب سنگینوں کا مقابلہ کیا اور خود بھی سنگینیں چلائیں، لیکن اُن کی بندوقوں کے نشانے ٹھیک نہیں لگتے تھے کہ روسیوں کے حملے روک سکتے یہ لڑائی ۳۱ اگست کو ہوئی اور ۴۸ گھنٹے رہی۔ تیس ہزار آسٹرین مقتول اور زخمی ہوئے اور روسی فتحیاب ہوئے ؎

تو ہی دست را فتح شد رہنموں
بہ زنہار خواہی در آمد زبوں

اس فتح کے بعد روسی سپاہ لیمبرگ کی جانب بڑھی اور آسٹریا کی باقی ماندہ ٹوٹی پھوٹی سپاہ کو بھگا دیا۔ جنرل رسکی Russky کی سپاہ نے جو فاصلہ کہ Zloczow سے لیمبرگ (Lemberg) تک چالیس میل کا تھا، وہ بہت جلد طے کر لیا (حالانکہ فوج سترہ دن سے برابر کوچ کرتی ہوئی اور لیمبرگ کی طرف لڑتی بھڑتی آتی تھی) اور شہر مذکور کے قریب چند مضبوط مقام فتح کر لیے۔ چھ روز تک ہنگامہ کارزار گرم رہا، یعنی ۲۹ اگست سے ۳ ستمبر تک۔ روسی سپاہ صبح سے شام تک اور آخر میں دن رات لڑتی رہی اور آسٹرین سپاہ بھی نہایت تیزی سے لڑنے میں سرگرم رہی۔ روسی فوج گو نہایت تھکی ہوئی تھی اور گرمی کے موسم کے باعث پیاس سے بہت تکلیف اٹھا رہی تھی، لیکن فتح کی اُمید کی خوشی میں پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے لڑی۔ آسٹرین فوج جب جنگ سے تنگ آئی تو Lemberg کے قلعوں میں پناہ لی۔ اب روسیوں نے قلعہ کے آہنی گنبدوں پر گراب مارنا شروع کیے۔ جو کچھ کہ بلجیم پر لیج اور نامور میں گذری اور جو کچھ فرانس پر موبائج میں افتاد پڑی (بوجہ اُن آسٹرین Howitzers کے جو بطور مدد کے جرمنی کو دیے گئے تھے) اُن سب کے بدلے میں گلیشیا کے قلعوں کی سپاہ کو مصیبت برداشت کرنا پڑی اور اُن کے سب مضبوط قلعوں اور اُن کے آہنی گنبدوں کو روسی Howitzers نے جو فرانسیسی کارخانوں میں بنے ہوئے تھے، دو دن میں توڑ پھوڑ کے برابر کر دیا اور آسٹرین توپیں بھی توڑ دیں۔ جب توپیں بیکار ہو گئیں تو آسٹرین فوج اس خوف سے کہ مبادا روسی سپاہ سنگینوں سے حملہ کرے مورچے چھوڑ کر واپس ہوئی۔ مگر اس واپسی میں فوج چنداول یعنی سب سے پیچھے کا دستہ فوج بھاگا اور اُس کے بھاگتے ہی سب سپاہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ پیچھے کا دستہ فوج جو بھاگا اور اس سے تمام لشکر میں جو بھاگڑ مچ گئی، وہ حال عجیب و غریب حسب ذیل ہے۔

آسٹرین اور ہنگیرین افسروں نے اپنے آپ کو اور اپنے ہموطنوں کو بچانے کی غرض سے اپنے پیچھے سلیو قوم کی رجمنٹیں کھڑی کی تھیں جن میں گلیشیا کے روسی، پولینڈ کے باشندے، بوسینیا Bosnia کے سروین اور بوہیمیا Bohamia کے باغی سپاہی تھے اور اُن کے پیچھے ہنگیرین سپاہی کھڑے کیے تھے تاکہ اگر یہ سلیو رجمنٹیں لڑنے سے انکار کریں یا روسیوں سے مل جائیں تو ان صورتوں میں وہ توپ سے اڑا دی جائیں۔ روسی جنرل کو یہ حال معلوم ہو گیا تھا اُس نے حکم دے دیا کہ گراپ اسی دستہ فوج پر مارے جائیں جو سب سے پیچھے ہے۔ گولہ اندازوں نے ایسے نشانے لگائے کہ شیل سلیو رجمنٹوں کے سروں کے اوپر سے گذر کر آسٹرین اور ہنگیرین فوج میں جا کر گرتے تھے اور وہاں پھٹتے تھے۔ ان توپوں کی ہولناک گرج نے اور اس شیل اور گراب نے جو اولوں کی طرح گر رہے تھے اور پھٹ کر چاروں طرف موت کا بازار گرم کر رہے تھے لیمبرگ Lemburg سے واپس ہوتی ہوئی سپاہ کو سخت گھبراہٹ میں ڈال دیا۔ کائی سی پھٹ گئی اور فوج کے کالم کے کالم ٹوٹ گئے اور تمام فوج تتر بتر ہو گئی اور توپیں اور میگزین اور سامان رسد چھوڑ کر Gorodok کے قلعہ کی طرف بھاگ گئیں۔

اب روسی اُتر، دکھن، پورب تین طرف سے لیمبرگ Lemburg پر جمع ہو گئے اور آخری لین قلعوں کی لے کر ۳ ستمبر منگل کے دن، نو بجے صبح شہر مذکور کے بازاروں میں داخل ہو گئے۔ آسٹرین سپاہ کے چند دستوں نے مقابلہ بھی کیا، لیکن ہلاک اور گرفتار ہوئے۔ شہر کے سلیو باشندوں نے روسیوں کا خیر مقدم کیا اور خوشی کے نعرے بلند کیے اور روسیوں کے قومی گیت گائے۔ اِدھر کچھ توپوں کے فیر کی آوازیں آئیں، جو بھاگتے ہوئے دشمن نے شہر سے باہر کیے تھے۔ گویا اُنھوں نے بھی روسیوں کی آمد کی مبارکبادی میں سلامی دی۔ بالاخانوں پر سے، جہاں سے لوگ تماشا دیکھ رہے تھے، پھول برسائے گئے اور مرد و زن سب وہ زبان بولتے تھے جو روسی سپاہ سمجھ سکتی تھی۔ سپاہیوں کے ہاتھ چومتے تھے اور اُن کے روبرو کھانے پینے کی چیزیں پیش کرتے تھے۔ سپاہی گو نہایت تھکے ہوئے تھے کیونکہ رات دن سوائے لڑائی کے اُن کو کوئی دوسرا کام نہیں رہا تھا، لیکن جب وہ بازاروں میں آئے تو خوشی کے مارے اپنی تکان اور بھوک پیاس سب بھول گئے۔

ساڑھے دس بجے صبح روسی پھریرا ٹون ہال پر لہرانے لگا اور شہر کے رئیسوں کا ایک وفد روسی جنرل رسکی Russky کی بارگاہ میں حاضر ہوا جس نے اہل شہر کی یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم سلیو قوم کے

باشندے سلطنت روس کی خیر خواہ رعایا بننے کو تیار ہیں۔ فتحمند فوج کا طریق عمل نہایت قابل تعریف تھا چونکہ رسد کے سامان سے گاڑیاں بھری ہوئی ساتھ تھیں، اس لئے انھوں نے شہر کے باشندوں سے کسی قسم کی مدد نہیں چاہی اور سپاہ کے سرداروں نے میونسپل جماعت کی مدد سے فوراً امن و امان قائم کر دیا۔ اسباب غنیمت جو ہاتھ آیا وہ آسٹرین فوج کا میگزین تھا اور دو سو توپیں اور سب سامان ڈیرہ خیمہ اور لڑائی کا سامان جو ہاتھ آیا بے شمار تھا، کیونکہ آسٹریا اور ہنگری کے ہر حصہ سے جمع کر کے Lemburg میں اکٹھا کیا گیا تھا کہ سرحد پر چھ مہینے یا زیادہ تک فوج کے کام آئے۔

دریائے وسٹولا Vistula اور دریائے Driestar پر روسیوں کی فتح

اور افواج آسٹریا ہنگری کی ہلاکت و تباہی

کئی صدیوں سے آسٹریا حملہ آوروں کی جولانگاہ رہا ہے۔ ترکوں نے، سوئیڈن کے باشندوں نے، پروشیا والوں نے اور فرنچ نے وقتاً فوقتاً اس پر حملے کیے۔ ایک دفعہ ترکوں نے دار السلطنت وائنا Viena بالکل لے لیا ہوتا اگر پولینڈ کے بادشاہ John Sobraski نے اس کو نہ بچایا ہوتا، مگر اس کا شکریہ آسٹریا نے یوں ادا کیا کہ پولینڈ کی سلطنت پامال کرنے میں جو کوشش چند شاہان یورپ نے کی، ان میں آسٹریا شریک غالب تھا۔ روسیوں نے ۱۹ صدی کے وسط میں ہنگیرین Hungarian قوم کو آسٹریا کی حکومت سے آزاد ہونے سے روک دیا۔ اس کا بدل آسٹریا نہایت کفران نعمت کے ساتھ کر رہا ہے کہ روس سے متصادم ہے۔ یہ کام آسٹریا نے بڑی بیوقوفی کا کیا۔ گو ہنگیرین قوم روس سے اس بات کا بدلہ لینا چاہتی ہے کہ روس نے اس کی آزادی کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور اسی وجہ سے آسٹریا سے موافقت کر رہی ہے، لیکن تب بھی آسٹریا کا روس پر حملہ کرنا ایک دیوانگی کی حرکت ہے کیونکہ آدھی رعایا آسٹریا کی ایسی ہے جو سلیو Slave نسل سے ہے اور اپنے حاکموں سے ناخوش رہ کر روس کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے۔ یہ آدھی رعایا آسٹرین قوم کے خلاف ہے اور روس کی طرفداری کی خواہشمند ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جس وقت آسٹریا روس کے مقابل میں میدان جنگ میں آیا اس کی تباہی اور بربادی ہوتی گئی۔ روس پر حملہ کرنے میں آسٹریا کو کامیابی کی امید برائے نام بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے تو یہ کام آسان

تھا کہ وہ اپنے پرانے دشمن پروشیا Prussia پر حملہ کرتا۔ لیکن پروشیا نے اُس کو دھوکا دیا اور ہنگری نے، جو روس سے بدلہ لینا چاہتا تھا، اُس کو روس سے لڑنے کی ترغیب دی۔ ان دونوں وجہوں سے آسٹریا روس سے بھڑ گیا اور اپنی شامت اعمال سے اپنے آپ کو اُس نے تباہ کیا۔ آسٹریا نے جو مہم روس کے مقابلہ پر بھیجی، وہ پہلے تین ہفتہ تک کامیابی کے ساتھ کام کرتی رہی۔ سرحد کے پار جاکر پانچ لاکھ آسٹرین سپاہ روسی سرزمین پر پھیل گئی اور وارسا Warsa اور Brest Litorsk کی طرف بڑھی۔

یہ فوج دریائے Vistula کی طرف بہت آہستگی سے آگے بڑھی اور اُس کے دونوں طرف پھیل گئی۔ پھر اُس کے بائیں کنارہ پر Radom کی جانب اور داہنے کنارے پر Kholm اور Lublin کی طرف آہستگی سے بڑھی۔ اس آہستگی کی وجہ یہ تھی کہ آسٹریا کو جرمن کے آنے کا انتظار تھا۔ لیکن جرمن کی سپاہ ہراول Lodz اور Petrokov تک آکر واپس گئی، کیونکہ جو جوابی حملہ مشرقی پروشیا پر کیا تھا، اُس کے باعث جرمن نے اپنی تمام سپاہ جو وہ فرانس کے محاذ سے بچا کر لا سکتا تھا مشرقی پروشیا پر ڈال دی تھی۔ اب آسٹریا کو مشکل کا سامنا آ گیا۔ جرمن کی مدد کے وعدہ پر اعتبار کرکے ایسی سخت خطرناک مہم اپنے ذمہ لی تھی اور اب ایسے نازک وقت پر اُس کو محض اپنے بھروسے پر کام کرنا پڑا۔ آسٹرین جنرل زیادہ دور تک ملک روس میں بڑھ نہ سکتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس قدر ہم آگے بڑھ جائیں گے اسی قدر ہم اپنے ملک سے دور پڑ جائیں گے اور فوجوں کی مدد اور اُن کی آمدورفت میں دیر لگے گی۔ کیونکہ روس کے ملک میں نہ ریلیں زیادہ ہیں، نہ اچھی سڑکوں کی کثرت ہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ اس ملک میں نپولین کی سپاہ نے شکست فاحش کھائی تھی۔ ان خیالات کی بنا پر آسٹرین جنرل کوئی حملہ ایسی تیزی اور سختی سے نہ کر سکے جس تیزی اور سختی سے اُن کا دوست جرمنی بلجیم کی جانب فرانس کے مقابلے میں حملے کر رہا تھا۔ آسٹریا کا حال تو یہ تھا، مگر روس نہایت دور اندیشی سے کام کر رہا تھا اور وارسا Warsa اور Kiev کے درمیان بہت بڑا لشکر اُس نے جمع کیا تھا۔ آسٹریا کو اُس نے وارسا اور Ivangorod کی طرف بڑھنے سے روکا اور سواروں کے رسالوں کی آڑ میں اُس کو رکھ کر آسٹرین سپاہ کو ہلاکت کی جگہ پر پہونچانے کی تدبیر کر رہا تھا۔

دریائے Vistula کے دوسری طرف جو دریائے مذکور اور دریائے بگ کے درمیان جنگل ہے اُس راستہ پر روس نے پہلے آسٹرین سپاہ کو آگے بڑھنے کی ترغیب دی، خصوصاً Kholm کی جانب

بڑھا لے گیا۔ روسیوں کا جو دستہ فوج آگے تھا وہ بہت چھوٹا تھا اور اپنی جگہ چھوڑتا جاتا تھا۔ آسٹرین سپہ سالاروں نے ان چھوٹی سی کامیابیوں کو بہت مبالغہ سے اپنے ملک کے باشندوں پر ظاہر کیا، کیونکہ اپنے ملک کے باغی سلیو (Slavs) رعایا کو ڈرانے اور اُن کی ہمت توڑنے کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح کی کامیابی سے آسٹرین جنرل Auffenberg اور جنرل Dankl مقامات Lublin اور Kholme کی طرف بڑھے اور روس کے ملک میں پچاس میل تک پہونچ گئے۔ ۲۵ اگست کو آسٹرین فوج ایسی جگہ پہونچ گئی کہ وہاں سے اُن شہروں پر زد پڑ سکتی تھی۔ یہاں سے ریل کا سلسلہ جو ان مقامات کے درمیان تھا بہت قریب تھا اور یہیں سے وارسا اور Ivangorod کو بھی ریل گئی تھی لیکن روسیوں نے مقامات مذکور یا ریلوے کو آسٹرین سپاہ کے قبضہ میں آنے نہیں دیا۔ غرضکہ دریائے Vistula اور دریائے بگ کے درمیان، ایسی جگہ پر آسٹریا کی فوج آگئی جہاں گرانڈ ڈیوک نکلس (Grand Duke Nicholas) روسی سپہ سالار یا قائد اعظم اُن کو لانا چاہتا تھا ۲۲ سے ۲۹ اگست تک روسی سپہ سالار نے آسٹرین حملہ آور فوج کو Lublin Kholme ریلوے لین لینے سے روکے رکھا۔ دو مشین گن کے افسروں نے کچھ بلندی پر سے گولے مارے اور حملہ آوروں کی صفوں کو بہت نقصان پہونچایا اور پھر سنگین سے روسیوں نے ایسا حملہ کیا کہ آسٹرین سپاہ مقابلہ کی تاب نہ لاسکی اور بھاگی اور بھاگنے میں ایک دلدل میں پھنس گئی جس میں سے چھ ہزار سپاہ گرفتار ہوگئی۔

روسیوں کی سنگینوں نے آسٹرین سپاہ کے مقابلہ میں بڑا کام کیا۔ یہ سنگینیں جرمن کے مقابلہ میں بھی حملہ کا عمدہ اوزار ثابت ہوئیں۔ لیکن آسٹریا کے لئے تو پورا قہر تھیں۔ پولینڈ کے دریاؤں کے درمیان جو سلسلہ لڑائیوں کا روسیوں اور آسٹرین فوجوں کے درمیان رہا اُن میں ڈھائی لاکھ آسٹرین روسی سنگینوں کی بدولت گرفتار ہوئے۔ صرف ایک موقع پر سنگینوں کے حملہ میں ناکامی ہوئی اور ایک سارجن میجر جو سپاہ کے ساتھ تھا، حملہ کرنے میں گرفتار ہوگیا۔ اتفاقیہ جس افسر کے چارج میں وہ دیا گیا، وہ سلیو قوم کا ایک عہدہ دار تھا۔ روسی اور آسٹرین عہدہ داروں کی بولی ملتی جلتی تھی جس کو دونوں سمجھ لیتے تھے۔ روسی افسر نے نہایت فصاحت سے بیان کیا کہ آسٹریا میں جو سلیو قوم کی سپاہ ہے، اگر وہ روس سے جا ملے تو ہم لوگ نہایت مہربانی سے اُس کا خیر مقدم کریں گے اور یہ کہ روس چاہتا ہے کہ تمام سلیو رعایا کو آسٹریا کی حکومت سے آزادی دلائے۔ اس روسی افسر کی گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ وہ سلیو افسر مع اپنی تمام سپاہ کے واپس چلا گیا

اور سبھوں نے روسیوں کی اطاعت قبول کرلی۔

جب آسٹرین سپاہ نے دیکھا کہ سامنے سے روسیوں کی فوج دباتی ہوئی بڑھتی چلی آتی ہے اور
دریائے Vistula کے پار دریائے بگ کے بائیں کنارے تک پھیل گئی ہے تو انھوں نے بہت جلد
مدد بھیجی۔ یہاں تک کہ پولینڈ کے دریاؤں کے درمیان قریب سات لاکھ آسٹرین فوج ہوگئی اور تین لاکھ
گلیشیا میں رہی۔ ان کے علاوہ مدد کے واسطے سپاہ کے کئی دستے رہے جو آمدورفت کے راستوں کی بھی
حفاظت کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ کے لئے جو روسی سپاہ پہلے تھی وہ چھ لاکھ تھی پلٹنیں برابر ریلوں
سے اُتر رہی تھیں اور میدان جنگ میں جا رہی تھیں مگر تب بھی پوری مدد نہیں پہونچا سکتی تھیں۔
روسی جنرل Sukhomlinoff نے ایک کام بڑی جرأت کا کیا جس سے گرانڈ ڈیوک نکلس
روسی کمانڈر ان چیف کو پوری مدد پہونچ گئی۔ اُس نے اُس فوج میں سے جو مشرقی پروشیا پر حملہ کر رہی
تھی بہت سے دستہ سپاہ واپس بلا لیے اور Ivangorod پر پہونچا دیے تاکہ روسی سپاہ کے
بائیں بازو مقام Lublin پر مضبوط کر دے۔ یہ کام اس وقت کیا گیا جب کہ جرمن جنرل ہنڈن
برگ (Hendenburg) مقام Thorn پر لشکر جمع کر رہا تھا کہ روسی حملہ آور سپاہ پر مقام
Koingberg اور Zannenberg پر جوابی حملہ کرے۔ روسی جنرل Samsonoff
تو پروشیا میں Zannenberg کے مقام پر شکست کھا چکا تھا۔ اُس کی دو پلٹنیں سخت ضرورت کی
وجہ سے پولینڈ کی جانب مقامات Kholim اور Lublin پر بھیج دی گئیں اور دوسرا
روسی جنرل Rennen Kampf جو مقام Konigsberg میں تھا اُس کو یہ سخت مشکل کام
سپرد کیا گیا کہ اپنی کمزور سپاہ کو جنرل ہنڈن برگ (Hendenburg) کی سپاہ عظیم سے لڑتا ہوا
اپنی سرحد کی طرف لوٹ آئے۔ اس کا کام یہ بھی تھا کہ جرمن قائد اعظم کو (یعنی ہنڈن برگ کو) لڑائی میں
ایسا مشغول رکھے کہ وہ جرمن فوج کا کوئی بڑا حصہ پروشیا سے پولینڈ میں بھیج کر آسٹرین فوج کو مدد نہ دے
سکے۔ اس اثنا میں روسی فوج جو Kholim اور Lublin میں تھی اُس کو جنرل
Rennenkampf کے حصہ فوج سے مدد پہونچ گئی تو اُس نے حملہ کر دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ آسٹرین
جنرل Dankl کو بہت تردد ہو گیا اور Lublin کی جانب اس کا بڑھنا رک گیا اور
اس کی حالت بہت خطرناک ہو گئی۔ دو سو میل تک لڑائی کی لین چلی گئی تھی جس کے دہنے بازو پر جنرل

Dankel کی سپاہ رکی ہوئی پڑی تھی جس پر روسی فوج غلبہ کیے ہوئے تھی۔ روسی سپہ سالار نے کل لین پر دھاوا کر دیا اور اس تدبیر سے کیا کہ جو آسٹرین سپاہ بائیں بازو پر تھی وہ دہنے بازو کی مغلوب سپاہ سے نہ مل سکی اور اس کو مدد نہ پہونچا سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵ نمبر کا ہنگیرین ڈویژن (Hungarian Division) شکست کھا کر پراگندہ ہو گیا۔ ایک ہفتہ تک دریائے Vistula اور دریائے بگ (Bug) کے درمیان لڑائی ہوتی رہی اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس عرصہ میں روسی جنرل کا منشا فقط یہ رہا کہ جنرل Dankel کو روکے رہے اور جنرل Auffenburg کو ایسا تنگ کرے کہ وہ آرچ ڈیوک فریڈرک کو گلیشیا میں مدد نہ پہونچا سکے۔

دونوں آسٹرین جنرل یعنی Dankl اور Auffenburg جانتے تھے کہ جنوب کی طرف اُن کی فوج کا داہنا بازو مغلوب ہو گیا ہے اور شکست کھا چکا ہے۔ اس لئے انھوں نے سخت کوشش کی کہ روسی سپاہ کو سامنے سے مغلوب کر کے اپنی شکست کا بدلہ لیں۔ ایک زبردست سپاہ آسٹریا کی دریائے Vistula کے پار مقام Radom میں تھی۔ یہ نہایت تیزی سے Ivangorod کی طرف بڑھی، مگر یہاں کے قلعہ کی فوج نے دشمن کو شکست دی۔ آسٹرین فوج دریائے مذکور کے اوپر کی جانب ہٹ گئی۔ جہاں جنرل Dankl مورچے ڈالے ہوئے تھا وہاں جا کر پہیوں کے دو پل بنائے اور اس کی فوج سے جا ملی۔ جنرل Dankl یہ مدد پا کر Lublin ریلوے کی جانب بڑھا لیکن روسیوں نے اپنی ساری امدادی فوج اِدھر ڈال دی اور پھر آسٹرین سپاہ کو روک دیا۔ جب آسٹرین Ivangorod پر حملہ کر رہے تھے اور جنرل Dankl دریائے وسچولا Vistula کی دوسری طرف سے اُن کا شریک تھا، دوسرے آسٹرین جنرل Auffenberg نے روسیوں کے قلب سپاہ پر دھاوا کر دیا جس کے باعث روسی سپاہ سالار مشکل میں پڑ گیا۔ اب روسی سپاہ کو پیچھے ہٹنا پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مقام Kholm پر دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا کیونکہ یہی ایک مرکز در مقام روسی لین میں تھا جو فوج اس کی حفاظت کر رہی تھی وہ تھکی ماندی تھی۔

۶ ستمبر کو دونوں فریق کی حالت یکایک بدل گئی جنرل رسکی Russky مقام Lemberg سے فوج لے کر آ گیا اور اتنے فاصلہ سے برابر کوچ کرتا ہوا سپاہ لایا جو ایک

حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ اب آسٹرین جنرل Auffenberg کی سپاہ پر تین طرف سے حملہ ہوا، جس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ آسٹرین سپاہ جو حملے کر رہی تھی بخود روسی حملوں کی مدافعت کرنے لگی اور کئی موقعوں پر پیچھے ہٹنے لگی۔
خوب معرکہ کارزار گرم ہوا اور چند گھنٹوں تک تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسٹرین سپاہ کا درمیانی حصہ ٹوٹ جائیگا
لیکن اس کے جنرل اور قائد اعظم نے نہایت مستعدی سے سپاہ کے قلب اور بازو کو درست کر لیا۔ اتنے میں
جرمن کی امدادی فوج تین لاکھ نہایت شان و شوکت سے مع بھاری توپوں کے عین وقت پر پہونچ گئی
اس کے ساتھ بہت عمدہ سپاہ Tirol اور ہنگری کی شامل تھی۔ اس میں سے ڈیڑھ لاکھ سپاہ جرمن مع
بڑے توپ خانہ کے، روس کے علاقہ میں چلی گئی اور مقام Zurolinn کے اردگرد پہاڑیوں پر
دونوں آسٹرین جنرل Dankl اور Auffenberg کی فوجوں کے درمیان قائم
ہوگئی۔ دوسری ڈیڑھ لاکھ جرمن سپاہ اس تازہ وارد ہنگیرین فوج میں شامل ہوگئی اور مل کر ایک نیا دہنا بازو
قائم کیا۔ اس میں چونکہ سلیو قوم کے سپاہی شامل نہ تھے جن کے خیالات باغیانہ تھے لہذا یہ نئی ترتیب دی
ہوئی گلیشین فوج پہلی سپاہ سے زیادہ زبردست تھی اور آرچ ڈیوک فریڈرک قائد اعظم کی مستعدی اور
قابلیت بہت زیادہ تعریف کے قابل ہے جس نے فوج کو تباہی اور بربادی سے نکال کر طاقت بخشی۔

آخر میں جہاں آسٹرین نے جگہ پکڑ لی تھی وہ بہت مضبوط تھی۔ البتہ یہ برائی تھی کہ اس کے
پیچھے دلدل تھی۔ پچیس سو ضرب توپ اُس کے پاس تھی، جن میں جرمن توپیں اور Mixims بہت
کثرت سے شامل تھیں۔ یہ سب سپاہ مقام Ravaruska پر جمع ہوئی جو روسی سرحد کے قریب ہے۔
روسیوں نے آسٹریا کے قلب سپاہ پر Frontal attack حملہ کیا جیسا کہ نپولین کا
پرانا طریقہ تھا۔ لیکن ایسی زبردست سپاہ اور اتنی زبردست اور زیادہ توپوں کے مقابلہ میں حملہ کیا کہ
نپولین نے بھی واٹرلو Waterloo کے مقام پر نہیں کیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ قلب سپاہ توڑنے میں
حملہ آور فوج بہت ضایع ہوتی ہے خصوصاً جبکہ کثیر تعداد سے زبردست توپیں آگ برسا رہی ہوں۔
اس وجہ سے روسی سپاہ کا زیادہ نقصان ہوا۔ روسی سپاہی نہایت خاموشی بہادری اور استقلال سے
آگے بڑھتے جاتے تھے اور جہاں وہ گرے اُن کی جگہ پر دو چند سپاہی پیچھے سے پہونچ گئے وہ بھی
شہید ہوئے تو چار چند سپاہی عقب سے اُن کی جگہ پر آگئے۔ یہاں تک کہ کمپنی کے بعد کمپنی اور پلٹن کے
بعد پلٹن کٹتی جاتی تھی۔ آفتاب غروب ہوگیا اور رات کی تاریکی میں حملہ آور روسیوں نے سنگینوں سے

حملہ کیا۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ تڑکا ہوتے ہوتے روسی فوج نے آسٹرین قلب سپاہ کے ٹکڑے اُڑا دیے۔ آسٹرین فوج کا سویرا ہو گیا اور سپاہ میں ابتری پڑ گئی۔ آسٹرین جنرل Dankl جس کی فوج کا یہ حال ہوا اپنی جگہ مایوسی میں چھوڑ کر نہایت تیزی سے ہٹا۔ کیونکہ اُس کو یہ خوف تھا کہ مبادا کاسکوں کا رسالہ اُس کے عقب سے آکر واپسی کی راہ بند کر دے، تو ایسی صورت میں تمام سپاہ ہلاک ہو جائے گی۔ آخر وہ اپنی سپاہ کو دریائے Vistula کے کنارے کنارے ترتیب کے ساتھ لے آیا۔ لیکن Dankl کی سپاہ کے یکایک ہٹ جانے سے جرمن فوج ڈیڑھ لاکھ جو Sandomierz کی پہاڑیوں پر تھی غیر محفوظ حالت میں ہو گئی اور روسیوں نے اُن کی غفلت کی حالت میں پہلو پر سے حملہ کیا۔ جرمن اس وقت تک اپنی بڑی توپیں مورچوں پر لگا نہ پائے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ ہزار جرمن سپاہ کھیت رہی اور بڑی توپیں سب روسیوں نے چھین لیں۔ یہ ۳۲ نئی توپیں نہایت اعلیٰ درجہ کی تھیں جن پر شہنشاہ جرمن کا مانوگرام (طغرا) بنا ہوا تھا لیکن جرمن بہت بہادری سے لڑے۔ آخر کار اُسی طرف ہٹ گئے، جدھر ان کے ساتھی آسٹرین گئے تھے اور دریائے Vistula پر مقام Annopol میں پہنچ گئے۔

گرانڈ ڈیوک نکلس نے نہ چاہا کہ آسٹرین سپاہ کا وسطی حصہ یا قلب سپاہ اس طرح جان بچا کر نکل جائے۔ ۹ ستمبر کی شام سے رات بھر روسی سپاہ مارچ کرتی رہی اور فوج کے بعض دستوں نے بہت زیادہ تکلیف برداشت کی۔ بہت بڑا فاصلہ طے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹرین سپہ سالار Auffenberg کی سپاہ ۱۰ ستمبر کو چاروں طرف سے گھر گئی۔ روسی جنرل رسکی Russky نے اس نظر سے کہ کیوں لاکھوں بندگانِ خدا کا خون ناحق بہایا جائے، ایک افسر مع سفید جھنڈے کے جنرل Auffenberg کے پاس بھیجا کہ اطاعت قبول کرے۔ آسٹرین جنرل نے جیسا کہ آج کل دستور ہے، اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ اُس کا ارادہ تھا کہ میں اس فوج کو، جو مجھے گھیرے ہوئے ہے، چیر کر نکل جاؤں۔ کوئی لائق جنرل ہوتا، وہ بھی اس وقت ایسا ہی کرتا۔ کوئی گھری ہوئی فوج، جس کے پاس رسد اور لڑائی کا سامان کافی ہو اگر وہ نہایت تیزی اور جوش سے مقابلہ کرے جیسا کہ جرمن نے بعد میں مقام Lody پر کیا تھا تو اکثر محاصرہ چیر کر باہر نکل جاتی ہے، گو اس میں سپاہ کا چوتھایا پانچواں حصہ کام آ جاتا ہے۔ یہی جنرل Auffenberg کرنا چاہتا تھا

لیکن وہ اس ارادہ میں پورا کامیاب نہ ہوا۔ ایک دن کی سخت ہلاکت کے بعد سپاہ بیدل ہو گئی۔ اُتر، پورب، پچھم تینوں طرف سے روسی اُس کی سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ صرف دکھن کی طرف سے راہ خالی چھوڑ دی تاکہ اُس طرف کو آسٹرین فوج ہٹے۔ لیکن آسٹرین فوج کے لئے اس طرف ہٹنا قہر تھا کیونکہ دریائے San کی دلدل تھی جس میں Auffenberg کی سپاہ مار پر مار کھاتی ہوئی کٹتی پٹتی آکر پھنس گئی۔

اس عرصہ میں جنرل Dankl کی سپاہ جو اپنے مرکز سے ہٹ کر دو دن کی راہ چل چکی تھی اُس کی بہت بُری طرح روسیوں نے خبر لی۔ اس طرح پر کہ روسی سپاہ کے چند مسلح دستے دریائے Vistula کی طرف چلے تاکہ وہاں کی روسی سپاہ میں شامل ہو کر جنرل Dankl کی فوج کو ابتری کی حالت میں ڈال کر دوسری دلدل میں جو دریائے Vistula اور دریائے San کے درمیان تھی ڈال دیں۔ آسٹرین جنرل کی بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ اُس نے اپنی سپاہ ایسی جگہ قائم کی تھی کہ اُس کی پشت پر دلدل تھی۔ جس وقت اس جنرل کی سپاہ شکست کھا کر پیچھے ہٹی تو دلدل میں پھنس گئی جس میں آدھی فوج ضائع ہو گئی اور لڑائی کا سب سامان اور بہت توپیں چھن گئیں، لیکن بہت زیادہ توپیں دلدل میں پھنس کر رہ گئیں۔

جنگ عظیم میں برطانیہ کی فتح

ماہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں ایک جلسہ عام بمقام ٹون ہال فرخ آباد زیر صدارت مجسٹریٹ ضلع اس غرض سے منعقد ہوا کہ رعایا کو یہ خوشخبری سنائی جائے کہ دولت برطانیہ کو بمقابلہ جرمن کے، جنگ عظیم میں کامیابی حاصل ہوئی اور اس شکست میں جرمن کو کیا کیا نقصان پہنچے اور برطانیہ کو کیا کیا حاصل ہوا۔ مشران صاحب نے اس موقع پر حسب ذیل تقریر کی۔

حضرت میر مجلس اور حضرات انجمن!

روز عیش و طرب و بادہ و جام ست امروز
کام دل حاصل و ایام بکام ست امروز

آج نہایت خوشی کا دن ہے کہ ہم لوگ ہندو مسلمان عیسائی ہر فرقہ اور جماعت کے اشخاص اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اولیائے دولت انگلشیہ کی فتح و ظفر پر خوشی کا اظہار کریں۔ ایسی زبردست اور نتیجہ خیز فتح ابتدائے آفرینش سے کسی سلطنت کو کبھی میسر نہیں آئی۔ گویا عدل و انصاف نے بمقابلہ ظلم و ستم کے اور تہذیب و شائستگی نے بمقابلہ جہالت کے فتح پائی، یا نور نے بمقابلہ ظلمت کے غلبہ پایا۔ برطانیہ نے اپنی عادت اور خصلت مستمرہ کے موافق تہذیب انسانی اور آزادی دنیا کا طرفدار ہو کر چھوٹی قوموں کو پامالی سے بچانے کے لئے اور عہد و پیمان کو پورا کرنے کے لئے تلوار میان سے کھینچی تھی۔ وہ تلوار اس نے پھر میان میں ڈالی ہے، جبکہ حقوق انسانی کی حفاظت کر چکا اور اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو چکا اور اس تلوار کو دشمنوں کے خون میں رنگین کر چکا اور دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اتار چکا۔ سچ پوچھیے تو لڑائی کا نتیجہ جو ظہور میں آیا وہ قدرتی تھا۔

ہمارے ملک ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا ہے کہ اس نے اس جنگ عظیم میں کافی حصہ لیا۔ اس کی فوجوں نے ایشیا، یورپ اور افریقہ کی فوجوں کے سامنے بہادریاں دکھائیں اور داد شجاعت دی اور برٹش فوج کے ساتھ ساتھ ساؤتھ افریقہ، کناڈا اور آسٹریلیا کی فوجوں کے

کاندھے سے کاندھا بھڑا کر جرمن کو شکست پر شکست دی۔ اس کے چھکے چھڑا دیے اور دانت کھٹے کر دیے۔ جو کچھ ہندوستان نے اس موقع پر خیر خواہی یا جان نثاری کی، اس کو حضرت ظل الٰہی، یعنی شہنشاہ معظم اور جناب وزیر اعظم اور حضور ویسرائے بہادر تسلیم فرماتے ہیں، جس پہ ہم کو ہمیشہ فخر و ناز رہے گا۔ ہمارے ملک معظم اپنی زبان فیض ترجمان سے فرماتے ہیں:—

"In responding to the call upon her natural resources, India has played a part worthy of her martial qualities and high traditions. She has fulfilled my faith in her single-minded devotion to my person and Empire and she has vindicated my confidence in her loyalty."

شہنشاہ معظم کے وزیر اعظم نے جو پیام ویسرائے ہند کو بھیجا ہے، اس میں فرماتے ہیں:—

"In this titanic struggle India has borne a great and noble part and her armies with those of Britain and the dominions have shed their blood on the battle field of this continent."

حضور ویسرائے نے ۱۲ر نومبر کو شملہ میں جو اسپیچ دی ہے، اس میں فرماتے ہیں:—

"India has played a great and noble part in the struggle. She was early in the field helping to stem the rush of the teutonic hordes and she has been in at the end and her armies largely contributed to the staggering blow in Palestine, which first caused our foe to totter to his fall."

صرف اسی وقت نہیں بلکہ دہلی کی وار کانفرنس میں بھی حضور ویسرائے نے اپنی تقریر دلپذیر میں ہندوستان کے بارے میں جو الفاظ فرمائے وہ آپ کے سننے کے قابل ہیں اور ہمارے فخر و ناز کے لائق ہیں حضور پر نور فرماتے ہیں:-

"If the war were to stop tomorrow, the tale of India's share in the great war will form no unworthy page in her glorious annals. Her sons have fought not without glory on every front. In East Africa, in Palestine, in Mesopotamia they have borne away victorious laurels."

صاحبو! اس وقت عارضی طور پر لڑائی بند ہے اور اس کے متعلق بھی بہت سخت شرطیں جرمن سے کی گئی ہیں اور میعاد ۳۶ دن کی دی گئی ہے، جس میں توسیع کی بھی گنجائش ہے شروع سال ۱۹۱۹ء میں صلح کی ایک کانفرنس بیٹھے گی جس میں ہمارے ملک کا بھی ایک Representative یعنی سر ایس - پی - سنہا شریک ہوگا۔ یہ صاحب پہلے وار کانفرنس میں شریک ہو چکے ہیں۔ ہم کو گورنمنٹ کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اُس نے ہم لوگوں کو وہی حقوق دیے ہیں جو اور حکومت خود اختیاری رکھنے والی نوآبادیوں کو عطا فرمائے ہیں کہ ہم سلطنت کے معاملات میں پورا حصہ لیتے ہیں۔ گو اس وقت عارضی طور پر لڑائی بند ہے لیکن کامل طور پر یقین ہے کہ اب جرمنی سر نہیں اٹھا سکتا اور اتحادی سلاطین کی فتح کامل میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ میں آپ کو مختصر طور پر وہ شرطیں سناتا ہوں جو اتحادیوں نے قائم کی ہیں اور جرمن کو مجبوراً ماننا پڑیں، تب عارضی طور پر لڑائی بند ہوئی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جرمن تمام ملک اور مقامات خالی کر دے جہاں جہاں اُس کی فوجوں نے قبضہ کیا ہے۔

(۲) جن ملکوں اور مقامات کو جرمن خالی کرے وہاں رعایا جو ملک سے نکل گئی ہے، اُن کے نقصانات کا معاوضہ دے اور بلجیم کے بنکوں میں سے جو روپیہ امانت کا لیا ہے اُس کو واپس کرے اور جو جو مقامات خالی ہوں وہاں اتحادی بادشاہوں کی فوجیں داخل ہوں گی۔

(۳) پانچ ہزار توپیں، تیس ہزار مشین گنیں، دو ہزار ہوائی جہاز پانچ ہزار Locomotive ڈیڑھ لاکھ Waggon اور پانچ ہزار موٹر بطور تاوان دے۔

(۴) روس، رومانیہ اور ٹرکی کو خالی کردے اور رومانیہ اور روس کے ساتھ جو صلحنامے ہوئے تھے وہ سب منسوخ اور کالعدم سمجھے جائیں۔

(۵) جس قدر آبدوز کشتیاں بہم پہونچ سکیں اور چھ Battle cruiser اور دس Battle Ships اور آٹھ Light cruiser اور پچاس Destroyer اتحادی بادشاہوں کے حوالے کیے جائیں۔ وہ جس بندرگاہ میں جاہیں گے اُن کو گرفتار رکھیں گے۔

ان شرطوں کے علاوہ بے شمار سامان جنگ اتحادیوں کے ہاتھ آیا اور شروع سال میں جب کہ مستقل صلح کی شرطیں طے ہوں گی تو اور بھی زیادہ کڑی شرطیں ہوں گی جن سے جرمنی ہمیشہ کے لئے پامال ہوجائے گا اور کبھی آئندہ سر نہ اٹھا سکے گا۔

صاحبو! ڈیڑھ مہینہ ہوا کہ بلغاریہ شکست فاحش کھا چکا اُس کے بعد ٹرکی اور آسٹریا نے اطاعت قبول کی اور جب جرمنی اکیلا رہ گیا تو اُس نے پریسیڈنٹ ولسن سے درخواست کی کہ صلح کرادو اور اُن کی کوشش سے یہ صلح ظہور میں آئی۔ اس جنگ عظیم میں اس وقت تک جو نتیجے ظہور میں آئے وہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

(الف) جرمنی کے قبضہ سے آلسس لورین کے صوبے نکل گئے جو ۴۸ برس سے اُس کے قبضہ میں تھے اور وہ بدستور فرانس کے قبضہ میں چلے گئے اور جرمنی کے مقبوضات ماوراالبحر یعنی مشرقی افریقہ کی نوآبادیاں برطانیہ کے قبضہ میں آگئیں۔ اور اب اغلباً اُس کو واپس نہ ملیں گی۔

(ب) ترکوں کے قبضہ سے پانچ مشہور اور زرخیز مقامات نکل گئے۔ (ایشیا میں) بصرہ، بغداد، دمشق، موصل، بیت المقدس اور یورپ میں درّہ دانیال اور آبنائے باسفورس اتحادیوں کی فوج بحری کے لیے کھول دیا گیا اور قسطنطنیہ میں اتحادیوں کی افواج قاہرہ داخل ہوگئیں۔

(ج) اسی طرح آسٹریا کی سلطنت کے کئی ٹکڑے ہوگئے اور کئی خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں اور ہنگری، جو بہت عرصہ سے آسٹریا کی سلطنت کا جزو اعظم تھا خود مختار ہوگیا۔ اٹلی نے آسٹریا کے مقابلہ میں نمایاں فتح حاصل کی اور چند مقامات اس نے چھین لیے اور بہت سامان حرب و

ضرب اور لاکھوں قیدی گرفتار کیے اور آسٹریا کے شہنشاہ کو تخت چھوڑنا پڑا۔

(د) جرمنی کا شہنشاہ بھاگ گیا اور تخت سے اُتار دیا گیا۔ اُس کا بیٹا اور پوتا بھی تخت پر نہ بیٹھ سکا بلکہ اُس کے خاندان سے تخت نکل گیا اور سلطنت جمہوری قائم ہو گئی۔ شہنشاہ جرمنی ہالینڈ میں چھپا ہوا ہے اور تعجب نہیں کہ وہ اپنے ظلم وستم کی سزا پائے اور مثل نپولین بوناپارٹ کے کسی جزیرہ میں قید کر کے بھیج دیا جائے۔ اس وقت جرمن رعایا جو سات کروڑ ہے غلہ کی محتاج ہو رہی ہے اور برطانیہ اور امریکہ کی گورنمنٹ نے ذمہ لیا ہے کہ اُن کو خوراک پہونچائیں گے۔ دیکھیے یہ دھرم جدھ سے کہ لڑنے کے وقت لڑے اور اب اپنے دشمنوں کی جانیں بچا رہے ہیں کہ وہ بھوکوں نہ مریں۔

صاحبو! ہمارے ملک ہندوستان بلکہ ساری دنیا کی حفاظت اس وقت انگریزی فوج بحری کی بدولت ہوئی جس کے باعث جرمن فوج ہندوستان پر حملہ نہ کر سکی ورنہ ہندوستان کا حال بھی مثل بلجیم وغیرہ کے ہوا ہوتا اور ہم سب تباہ و برباد ہو گئے ہوتے۔ پس سرکار کا شکر گذار ہم کو ہونا چاہیے جس کی بدولت ہماری جان مال آبرو سب محفوظ رہی۔ اسی فوج بحری کی بدولت امریکہ کی فوج ملک فرانس میں پہونچ گئی اور نہایت تقویت کا باعث ہوئی۔

صاحبان والاشان۔ دنیا کو اس جنگ عظیم کے نتیجوں سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ بدعہدی اور جھوٹ، فریب اور ظلم وستم دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور اگر تھوڑے عرصہ تک بظاہر فائدہ پہونچائیں تو آخر میں سب کی نفرت کا باعث ہوتے ہیں جیسا کہ جرمنی کا حال ہوا کہ تمام دنیا کو اُس سے نفرت پیدا ہو گئی اور سب نے اُسے چھوڑ دیا، حتیٰ کہ اُس کے حلیفوں نے بھی اُس کی رہائش کر کے اُس سے علیحدگی اختیار کی اور نیز یہ کہ راستبازی، حق پرستی اور سچائی پر قائم رہنا اور عہد و پیمان کا پابند رہنا اور وعدہ وفا کرنا اور اس اصول پر عمل کہ Live and let live بڑی عمدہ باتیں اور دنیا میں کامیابی اور نیکنامی کے اوزار ہیں۔ دیکھیے انگریزوں نے اِنہی اصول پر عمل کرنے سے کتنی بڑی کامیابی اور نیکنامی حاصل کی۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ تکلیف و مصیبت اور مشکل کے وقت ہوش و حواس قائم رکھنا اور دامن صبر و تحمل دست استقلال سے نہ چھوڑنا، حق پر اور آیندہ کامیابی کی اُمید پر مضبوطی سے قائم رہنا اعلیٰ درجہ کے اصول کامیابی ہیں۔ دیکھیے برٹش قوم پر سال گذشتہ کس قدر مشکلات آپڑی تھیں مگر اِنہی اصول پر عمل کرنے سے سب حل ہو گئیں۔

برٹش قوم کی سیرت قدیم اہل روما سے مشابہ ہے کہ جس قدر مشکلات پیش آتی ہیں اُسی قدر صبر و استقلال اور جرأت و ہمت اور سعی و کوشش اور خوش تدبیری سے مشکلات پر غالب آتے ہیں۔

صاحبان ذی شان! آئیے اب ہم اور آپ سب کھڑے ہو کر اس عظیم الشان فتح کا شکریہ اُس قادر مطلق کی درگاہ میں ادا کریں اور اپنے ہر دلعزیز شہنشاہ کے حق میں ترقی دولت کی دعا مانگیں۔

"یا الٰہی ہم تیری درگاہ میں نہایت عاجزی سے شکر گذار ہیں کہ تو نے ایسے زبردست اور قوی دشمن کے مقابلہ میں ہمارے بادشاہ جارج پنجم کو کامیاب کیا جس نے دنیا بھر میں تہذیب اور آزادی قائم رکھنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ یہ تیری قدرت اور تیرا انصاف ہے کہ تو نے ظالموں اور بدعہدوں کو شکست دی اور جو بادشاہ حق پر تھے اُن کو کامیاب کیا۔ یا الٰہی تو نے ہمارے وطن مالوف ملک ہند کو اس لڑائی کی آگ سے محفوظ رکھا اور اس موقع پر تو نے ہم کو برٹش قوم کے سایہ عاطفت میں پناہ دی جس کے باعث اور جس کی بدولت تمام دنیا کی تہذیب اور آزادی بحال و برقرار رہی۔ یا الٰہی تو ہمارے شہنشاہ معظم کو سالہا سال تخت برطانیہ پر حکمران اور تندرست و خوش و خرّم رکھ"

مسٹر چنیتا منی کی ایک تحریک کی تائید

ماہ مئی ۱۹۱۵ء میں مسٹر چنیتا منی فرخ آباد میں اس غرض سے تشریف لائے کہ صوبجات متحدہ میں بجائے لفٹننٹ گورنر کے گورنر مع کونسل مقرر کرانے کی تحریک اہل شہر کی طرف سے کرائیں جس کے واسطے تمام صوبہ میں جابجا جلسے ہو رہے تھے، نیز یہ کہ ویسرائے لارڈ ہارڈنگ کی میعاد حکومت میں اضافہ کرایا جائے۔ چنانچہ ایک جلسہ عام بمقام سرستی بھون زیر صدارت نواب اقبال بہادر بی اے رئیس شمس آباد (ضلع فرخ آباد) منعقد ہوا جس میں اول مسٹر چنیتا منی نے تقریر کی اُن کے بعد اہل جلسہ کی تحریک پر مشران صاحب نے مسٹر چنیتا منی کی تائید میں حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

اس وقت ہم سب لوگ ہندو، مسلمان عیسائی اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈس (بیت الامراء) نے جو ہمارے صوبہ میں گورنر مع کونسل کے مقرر کرنا، نامنظور کیا ہے اُس پر اپنی ناراضی ظاہر کریں اور پارلیمنٹ کو عرضداشت دیں کہ وہ ہمارے صوبہ میں بجائے لفٹننٹ گورنر کے گورنر باجلاس کونسل مقرر کرے تاکہ ہمارے صوبہ میں ہر قسم کے انتظامات اُسی حسن وخوبی کے ساتھ ہوں جیسے کہ صوبہ بنگالہ، مدراس اور بمبئی میں ہو رہے ہیں۔ دوسری غرض ہمارے اجتماع کی یہ ہے کہ ہمارے وایسرائے بہادر جو بیدار مغزی اور فرزانگی اور برطانیہ و ہندوستان کی خیر خواہی اور جاں نثاری میں ممتاز ہیں اور جنھوں نے رعایائے ہند کو بیشمار فائدے پہونچائے ہیں اُن کی میعاد حکومت کی توسیع کے واسطے درخواست کی جائے۔

صاحبو! اس صوبہ کے واسطے گورنر کی درخواست کوئی نئی درخواست نہیں ہے، بلکہ ۱۸۳۳ء میں اور پھر ۱۸۵۳ء میں اس صوبہ کے واسطے (جو اس وقت صوبہ آگرہ کہلاتا تھا) پارلیمنٹ سے حکم ہو چکا تھا کہ گورنر مع کونسل کے یہاں حکومت کرے۔ پس تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اب جبکہ اس صوبہ میں دوسرا صوبہ اودھ کا شامل ہو گیا ہے جس کے باعث یہاں کی آبادی برطانیہ اعظم اور آئرلینڈ کی آبادی سے زیادہ ہے



سر سی۔ وائی۔ چنتامنی

اور رقبہ بھی اُس سے تھوڑا ہی کم ہے، ۸۲ برس بعد گورنر اور کونسل مقرر کرنے سے انکار کیا جاتا ہے۔

۱۹۱۳ء میں یہاں کے موجودہ لفٹننٹ گورنر نے سفارش کی تھی کہ انتظامیہ کونسل یہاں مقرر ہو۔ اُس کو ہمارے وایسرائے صاحب نے منظور فرمایا تھا اور سکریٹری آف اسٹیٹ نے بھی منظور کر لیا تھا۔ باوجود اس کے ہاؤس آف لارڈس نے یہ عملدرآمد کرنا مناسب نہ سمجھا جس سے ہم کو بہت مایوسی ہوئی۔ ایسے وقت میں کہ موجودہ جنگ یورپ میں رعایائے ہند اپنی جان و مال سے گورنمنٹ پر نثار ہو رہی ہے، گورنمنٹ کی قدردانی اور انصاف یہ چاہتا ہے کہ اس صوبہ کے پانچ کرور آدمیوں کا دل بڑھایا جائے اور اُن کے دل کی خواہش پوری کر کے اُن کو احسانمند بنایا جائے۔

انگریزوں کی یہ عادت ہے کہ چاہے نوآبادیاں ہوں یا ہندوستان، ہر جگہ اُنھوں نے رعایا کو حقوق دیر میں دیے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انگریزوں کی طبیعت میں بخل ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ نہایت فیاض قوم ہے اور انصاف و آزادی کی حامی ہے۔ اُس نے غلاموں کو آزادی اُس زمانے میں دی ہے جب دنیا کی تمام مہذب اور شائستہ قومیں لوگوں کو غلام بنانے میں بڑا فخر سمجھتی تھیں۔ امریکہ جیسا ملک غلامی کا بڑا حامی و مددگار تھا، مگر صرف برطانیہ نے یہ قانون نافذ کیا کہ کہیں کا غلام ہو، چاہے زنگی ہو، چاہے بربری جس وقت وہ برطانیہ کی سلطنت کے اندر قدم رکھے اُسی وقت وہ آزاد ہو جائے گا اور اُس کی بیڑیاں کٹ جائیں گی۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی درخواست برٹش گورنمنٹ کو دی جاتی ہے، وہ پہلے یہ دیکھتی ہے کہ درخواست کرنے والا جس چیز کو مانگ رہا ہے وہ اُس کے لینے کے لائق ہے یا نہیں، لیکن جس وقت اُس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی قوم جس چیز کو مانگ رہی ہے اُس کے لائق واقعی ہو گئی ہے تو فوراً اُس کی درخواست منظور کرتی ہے۔ جیسا کہ پنڈت بشن نراین در نے انگلستان کی تعریف میں کہا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "جس طرح ستار کے تار سے مطرب کی انگلیوں کی حرکت کے مطابق سر نکلتے ہیں اسی طرح انگلستان کا دل انصاف اور آزادی کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔" پس امید کی جاتی ہے کہ ہماری درخواست منظور ہوگی۔ کیونکہ وہ نہایت باضابطہ اور باقاعدہ ہے اور تمام ملک کی ذمہ دار جماعتوں کی طرف سے ہے۔ چونکہ انگریزوں کے نزدیک عام رائے کی بڑی وقعت ہے لہٰذا جب وہ سمجھینگے کہ یہ درخواست فی الواقع قوم کی طرف سے ہے اور قوم اس کے لائق بھی ہے تو ہم کو یہ حق ضرور ملیگا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ بمقابلہ اس کے کہ ایک لفٹننٹ گورنر تنہا حکومت کرے زیادہ بہتر ہے کہ گورنر ہو

اور اُس کے ساتھ اُس کی کونسل ہو جو اسے مشورہ دے۔ یعنی ایک طور پر پنچایتی حکومت ہو۔ کونسل سے خود گورنر کو بہت مدد ملے گی۔ جو مشکلات پیش آئیں گی زیادہ خوبی کے ساتھ حل ہو جائیں گی۔ عقلمندوں نے کہا ہے کہ "ایک چراغ سے گھر میں پوری روشنی نہ ہو تو دوسرا چراغ جلانا چاہیے۔ اسی طرح تیسرا یا چوتھا، یہاں تک کہ پوری روشنی ہو جائے۔" یعنی جب کوئی مشکل پیش آئے اور ایک شخص کی عقل کام نہ دے تو دوسرے کی عقل شامل کر لینا چاہیے تاکہ مشورہ سے وہ مشکل حل ہو جائے ؎

چو آید مشکلے پیش خردمند — کز اں مشکل فتد در کار او بند
کند عقل دگر با عقل خود یار — کہ تا در حل آں گردد مددگار
ز یک شمع نگیرد نور خانہ — فروزد شمع دیگر در میانہ

یہاں تک تو میں نے گورنر اور اُس کی کونسل کے بارے میں عرض کیا۔ اب حضور والیسرائے کی حکومت کی میعاد کی توسیع کے بارے میں چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔

ایسے نازک وقت میں کہ جنگ یورپ کے باعث ہندوستان میں نہایت پیچیدہ مسئلے پیدا ہو رہے ہیں اور آئندہ اور پیدا ہوں گے، ایسے بیدار مغز اور خیر خواہ ملک والیسرائے کا یہاں رہنا نہایت ضروری ہے، جو الجھے ہوئے معاملات کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھا سکے۔ ہم کو ہمارے ملک و قوم کا خیال، اور برٹش گورنمنٹ کے فائدوں کا خیال اور نیز ہمارے ہردلعزیز والیسرائے کے احسانوں کا شکریہ، مجبور کر رہا ہے کہ ہم یہ درخواست کریں کہ معمولی میعاد سے دو سال زیادہ لارڈ ہارڈنگ ہندوستان میں رکھے جائیں۔ ہمارے ویسرائے باوجودیکہ اپنی خانگی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مبتلا رہے، لیکن ہمارے ملک کا کام نہایت ہمت اور استقلال سے کرتے رہے اور جو احسانات انھوں نے ہمارے ملک و قوم پر کیے ہیں اُن کا نقش ہمارے دلوں پر سویدا کی مانند ہو گیا ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ انگریزی میں ایک جملہ کہا جاتا ہے کہ Self is Absolutely nothing وہ ہمارے ویسرائے پر پورا اطلاق کرتا ہے کہ ہمارے کاموں میں ایسے محو و مصروف ہیں کہ اپنے تن بدن اور اپنی تکلیفوں کا بھی ہوش نہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ ہماری یہ درخواست منظور فرمائیگی۔

مسیحی جماعت اور مقرّرین کا شکریہ

اکتوبر ۱۹۱۵ء میں فرخ آباد کی عیسائی جماعت نے مذہبی جلسے منعقد کیے، جن میں بیرونجات سے بھی واعظین تشریف لائے۔ جب مقررین کی تقریریں ختم ہو چکیں اور جلسہ برخاست ہونے کا وقت قریب آیا تو بعض سامعین نے مشران صاحب سے فرمائش کی کہ موصوف حضار جلسہ کی طرف سے مسیحی جماعت اور مقررین کا شکریہ ادا کر دیں چنانچہ موصوف نے اُن کی خواہش کے مطابق حسب ذیل تقریر فرمائی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

اگرچہ اس پلیٹ فارم سے جہاں مسیحی و مسلم اور آریہ علماء جمع ہیں، میرے ایسے شخص کا تقریر کرنا، ہرگز زیب نہیں دیتا، لیکن میں صرف اس خیال سے حاضر ہوں کہ مجھ سے میرے احباب نے اس امر کی فرمایش کی ہے اور بقول انیس ؎

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کہیں ایسا نہ ہو کہ عدم تعمیل حکم، دوستوں کو ناگوار گزرے اور ان کے دل کو رنج پہنچے۔ لہذا میں تمام جماعت سامعین کی طرف سے مسیحی مقررین اور مسیحی جماعت کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں و نیز اسی سپاس گذاری کے سلسلہ میں اُن اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کا بھی ذکر کروں گا جو یہاں کی مسیحی جماعت میں پائے جاتے ہیں اور ہر طرح قابل تعریف اور لایق تقلید ہیں۔ حضرات! قبل، اس کے کہ میں اس موضوع پر کچھ کہوں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس مباحثہ میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ تین وجہ سے، اول یہ کہ اس وقت مباحثہ میرے موضوع سے خارج ہے۔ دوم یہ کہ جب مجھ سے بہت زیادہ لائق اور محققین مذاہب موجود ہیں (مثلاً مولوی صاحب لکھنوی یا پنڈت شانتی سروپ صاحب) تو میرے ایسے شخص کا زبان کھولنا محض تحصیل حاصل ہے ؎

چو کارے بے فضولِ من برآید
مرا در وے سخن گفتن نہ شاید

سوم یہ کہ میں بذاتہ مذہبی مباحثہ کو اچھا نہیں سمجھتا ہوں۔ میرا قول وہی ہے جو شیخ سعدی کا ہے جنھوں نے

اس بارے میں ایک حکایت منظوم گلستاں میں یوں لکھی ہے ؎

یکے جہود و مسلماں خلاف می جستند
چنانکہ خندہ گرفت از نزاع ایشانم

بہ طنز گفت مسلماں گر ایں قبالۂ من
درست نیست خدایا جہود میرانم

جہود گفت بہ توریت می خورم سوگند
وگر خلاف بود ہمچو تو مسلمانم

گر از بسیط زمیں عقل منعدم گردد
بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے مسیحی بھائیوں نے یہ مذہبی جلسے کیے اور دوسرے مذاہب والوں کو اپنی فیاضی سے یہ موقع دیا کہ وہ تشریف لاکر اپنے شکوک رفع کریں اور دین عیسوی کے مقابلے میں اپنے مذہب کی خوبیاں بتائیں تاکہ ہم کو دینیات کے مسائل مقابلۃً سمجھنے کا موقع ملے۔ یہ برتاؤ جو ہمارے عیسائی بھائیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے کچھ نیا نہیں ہے بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا برتاؤ قدیم زمانہ سے ایسا ہی فیاضانہ چلا آتا ہے۔

ایک مسلمان مورخ لکھتا ہے کہ جب امام منصور تابعی نے قضا کی تو میں جنازہ کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ علاوہ مسلمانوں کے یہود و نصاریٰ اپنے اپنے گروہ جدا جدا قائم کیے ہوئے، جنازہ کے ساتھ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام مذکور کا برتاؤ غیر مذاہب والوں کے ساتھ کیسا تھا۔ امین الدولہ ابن تلمیذ بغداد کا ایک نہایت مشہور عیسائی طبیب تھا۔ اس کا مکان مدرسۂ بغداد کے پڑوس میں تھا۔ جب کوئی مسلمان طالب علم بیمار ہوتا تھا، یہ نیک دل طبیب اُس کو اپنے گھر لے آتا تھا اور نہایت آسایش و آرام سے رکھ کر اس کا علاج کرتا تھا اور بعد صحت پھر اُس کو مدرسہ میں پہونچا دیتا تھا۔ جب یہ طبیب مرا تو بقول ابن خلکان کے کوئی معزز مسلمان بغداد میں نہ تھا جو اُس کے جنازہ کے ساتھ گرجا گھر میں نہ گیا ہو۔

ہارون رشید عباسی نے جو محکمہ دار الحکمت قائم کیا تھا اُس کا منیجر ایک بڑا عیسائی فاضل تھا جس کا نام جبرئیل بن بختیشوع تھا۔ اُس نے ہندوؤں کے ساتھ وہ دوستی اور قدر دانی کا برتاؤ کیا کہ ہندوستان سے بڑے بڑے ہندو عالم اور ہندو وید بلوائے اور دار الحکمت کی جماعت کا ممبر اُن کو بنایا۔ ایک دفعہ ہارون رشید بیمار ہوا اور دربار کے بڑے نامی گرامی طبیب علاج سے

عاجز آ گئے تب منکا نامی وید جو اُس وقت ہندوستان میں نہایت مشہور فاضل اور وید تھا اُسی مسیحی عالم کے ذریعہ طلب ہوا۔ اُس کے علاج سے ہارون نے کامل صحت پائی۔ منجملہ بہت سے ہندوؤں کے جو اُس مسیحی فاضل نے ہندوستان سے بلوائے، دو شخص بغداد میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں نہایت ہردلعزیز رہے۔ایک کا نام سالی تھا جس کو اہل عرب صالح کے نام سے یاد کرتے ہیں اور دوسرے عالم کے باپ کا نام دہن تھا، اُس کو عرب ابن دہن کہتے ہیں۔

ایک بات خاص طور سے اس پلیٹ فارم پر بڑی خوشی سے دیکھی جاتی ہے۔وہ یہ کہ ہمارے مسلم بھائی اور آریہ بھائی دونوں موحدین فرقے یہاں موجود ہیں۔حسن اتفاق سے سناتن دھرمی بھی ہیں، جو توحید میں دنیا میں کسی مذہب والے سے کم نہیں ہیں (گو غیر مذاہب والوں نے اُن کو ازراہ تعصب بُت پرست کہا ہے) ہمارے مسیحی بھائیوں کی نسبت ابھی تک عام لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ بھی موحد ہیں، لیکن پادری جین دیر صاحب نے اپنے لکچروں میں تاکید سے فرمایا ہے کہ مسیحی جماعت بھی ایک ہی خدا کی ماننے والی ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام اور روح القدس بھی ایک ہی خدا کے پرتو ہیں۔ جُدا جُدا نہیں ہیں۔ لہذا نہایت مبارک موقع ہے کہ یہاں چاروں موحد فرقے جمع ہو گئے ہیں۔

ہمارے پادری صاحبوں کے کارنامے بھی مختصراً قابل ذکر ہیں۔ تمام ہندوستان میں تعلیم انگریزی کی اشاعت اُس وقت ان لوگوں نے کی جبکہ گورنمنٹ کی طرف سے بھی پورے طور پر تعلیمی وسائل ہم لوگوں کے لیے مہیا نہیں کیے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مشن تمام ملک میں نہایت مقبول ہے۔ ہم مشن کا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکتے کہ ہمارے ملک میں لاکھوں بیواؤں اور یتیموں کی پرورش پادری صاحبوں نے کی اور اُن کو انسانی مدارج پر پہونچایا۔ اُن کی خاتونوں نے ہمارے گھروں میں داخل ہو کر ہماری خاتونوں سے مراسم قائم کیے اور اُن کو اپنی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ کیا اور لڑکیوں کو مدرسوں میں لے جاکر پڑھایا لکھایا اور طرح طرح کی دستکاریاں سکھائیں۔ جن ادنیٰ ذاتوں کو ہم نے حقیر اور ناپاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اُن کو پادری صاحبوں نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اُن کو شائستہ بنا کر وہ انسانی حقوق دیے جن سے ہم نے اُن کو اپنی کم نصیبی سے محروم کر رکھا تھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک تمام اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتیں اور سب فرقے مل جل کر اس ملک میں کام نہ کریں گے اور برابری کا برتاؤ باہم

نہ ہوگا اس وقت تک ہم ترقی کا قدم آگے نہ بڑھا سکیں گے۔ ہم کو ہرگز نہ چاہیئے کہ ادنیٰ ذات کو نظر حقارت سے دیکھیں۔ یہ گناہ کبیرہ ہے ؎

در کم ز خویشتن بحقارت نظر مکن
گر بہتری بحال بہ گوہر برابری

ہمارے پادری صاحبوں میں ایک یہ بھی بڑا وصف ہے کہ اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑے سرگرم اور بلند ہمت اور بیخوف و بیباک ہیں۔ کہاں یورپ و امریکہ اور کہاں افریقہ! بعد المشرقین ہے۔ وہی فرق ہے جو سرد و گرم میں ہے۔ افریقہ کے گرم ملکوں میں جہاں مردم آزار بلکہ مردم خوار لوگ رہتے ہیں، جہاں کبھی سچے خدا کے نام کی منادی نہیں ہوئی تھی، وہاں خدا کے ان بہادر بندوں نے جا کر اپنے مذہب کی منادی کی۔ گو اُن ناحق شناس کفار نے ان کی محبت و ہمدردی کا بدلہ یہ دیا کہ ان کو ہلاک کر دیا مگر ان بہادروں نے اپنا کام اشاعت مذہب کا بدستور جاری رکھا اور آخر میں اُن وحشیوں کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر لیا یہاں تک کہ اُن وحشیوں اور مردم خوار باشندوں کی جھونپڑیوں میں اور اُن کے در و دیوار اور کوہ و صحرا میں باپ بیٹے اور روح القدس کی آوازیں گونج اٹھیں۔ ہم کو ان بہادروں کی پامردی اور استقلال سے سبق لینا چاہیئے۔ آخر میں تمام مسیحی جماعت اور مقررین و واعظین کا شکریہ دوبارہ عرض کر کے ختم کلام کرتا ہوں۔

ایک قطعہ تہنیت کی جوابی تقریر

آخر نومبر ۱۹۱۷ء میں جب مشران صاحب آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے، تو بابو بالمکند صاحب مختار، آنریری منصف و رئیس فرخ آباد کی طرف سے موصوف کو ایک پارٹی ٹاؤن ہال میں دی گئی جس میں حسب معمول ہندو اور مسلمان روسا، ہر طبقہ کے اشخاص شریک تھے۔ خوردونوش کے بعد چند ہندو مسلم احباب نے موصوف کو مبارکباد دی اور بابو شمبھو ناتھ صاحب وکیل و آنریری مجسٹریٹ نے قطعہ تاریخ مبارکباد پڑھا، جو حسب ذیل ہے ؎

خدا کے فضل سے حاصل ہوئی مرادِ دلی — کہ جس کے واسطے میں روز مانگتا تھا دعا
ملا خدا کی عنایت سے عہدۂ منصف — حصول پھر ہوا عہدہ مجسٹریٹی کا
دو عہدے آپ کو حاصل ہوئے ساتھ ہی ہیں — ہوا ہے حضرتِ مشران پر یہ فضل خدا
کمال غور سے میں نے کہی ہے یہ تاریخ — رہی تلاش میں دن رات جبکہ فکر رسا
ندا یہ ہاتف غیبی نے دی خوشی کے ساتھ
لطیف حاکم لائق مجسٹریٹ ہوا
۱۳۳۵ھ

مشران صاحب نے اس قطعہ کو سن کر حسب ذیل تقریر فرمائی۔

میرے دوستو اور بھائیو!

میں آپ حضرات کا شکریہ، تہ دل سے ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے پارٹی دے کر میری عزت افزائی فرمائی اور میرا پایہ افتخار ہمپایہ سپہر کر دیا ہے۔ چند ہندو مسلم بھائیوں نے ازراہ عنایت و نوازش اپنی فصیح تقریروں میں میری نسبت ایسے الفاظ فرمائے ہیں کہ میں اپنے آپ کو اُن کا مستحق ہرگز نہیں سمجھتا، بلکہ اُن کے لطف و کرم پر محمول کرتا ہوں۔ مثلاً میرے ایک دوست نے فرمایا ہے کہ "فرخ آباد میں آج تک کسی شخص کو منصفی اور مجسٹریٹی دونوں عہدے نہیں ملے اور نہ کسی شخص کے تقرر پر اُس کو پارٹی دی گئی، نہ پبلک کی جانب سے اظہار مسرت و مبارکباد ہوا۔" گو کہ یہ باتیں صحیح ہیں، لیکن ان سے میری لیاقت ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ حکام کی رضامندی اور احباب کی عنایت خاص

ثابت ہوتی ہے۔ میں نے جنگ یورپ کے وقت وار لکچر دیے جن سے یہاں کے حکام کو فوج بھرتی کرنے اور چندہ جمع کرنے میں مدد ملی جب عہدہ خالی ہوا تو کلکٹر ضلع نے بجائے زید و عمرو کے مجھے مقرر کر دیا۔ پارٹی دوستوں کی محبت اور قدردانی پر موقوف ہے۔ زمانہ بدلتا جاتا ہے اور اُس کے ساتھ اُس کی رسمیں بھی۔ ممکن ہے کہ اب یہ رسم پڑ جائے کہ کوئی شخص منصف یا مجسٹریٹ مقرر ہو تو اُس کے دوست احباب اُس کو پارٹی دیں اور اظہار مسرّت کریں۔

حضرات! آپ نے میری اُردو، فارسی اور انگریزی دانی کا ذکر کیا ہے اور خاصکر اُردو اسپیچوں کی داد دی ہے۔ البتہ اُردو زبان میری مادری زبان ہے، جس کو میں نے پیرزالان کشمیر سے سیکھا ہے، یعنی اپنی دادی، ماں اور اپنی بڑی بہنوں سے کسی عام تعلیم گاہ میں نہیں سیکھا۔ بیشک اس زبان سے تھوڑا سا واقف ہوں۔ فارسی اور انگریزی غیر زبانیں ہیں، ان کا صرف حرف شناس مجھے سمجھیے ؎

زباں دانانِ عالم کا کیا ہے امتحاں برسوں
زبانِ غیر کیا آئی نہیں اپنی زباں برسوں

اُردو زبان اگرچہ بظاہر اس قدر آسان ہے کہ اس وسیع ملک ہند میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ بولی اور سمجھی جاتی ہے، لیکن اس کو باقاعدہ بولنا اور لکھنا اور فصاحت و بلاغت برتنا اس قدر دشوار ہے کہ جن لوگوں کی زبان ہے وہ بھی غلطیاں کر جاتے ہیں خصوصاً اس کی تذکیر و تانیث اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ میری رائے ہے کہ اُردو میں اُسی قدر فصاحت و بلاغت برتی جاسکتی ہے جس قدر کہ ڈماس تھینز اور ایڈمنڈ برک نے یونانی اور انگریزی زبان میں برتی تھی۔ کوئی زمانہ تھا کہ اُردو زبان کو ریختہ یعنی گری پڑی زبان کہتے تھے، مگر وہ وقت گذر گیا، اب اُردو ایک مستقل اور علمی زبان ہوگئی ہے اور مختلف علوم و فنون ترجمہ کے ذریعے اور مستقل کتابوں کے وسیلے اُردو میں داخل ہو گئے ہیں۔ مثلاً صرف، نحو، منطق، معانی، بیان، بدیع، معما سیاست مدن، اخلاق، علم طبعیات، نجوم، موسیقی، نباتات، حیوانات، معدنیات، آثار قدیمہ، طبقات الارض، ہیئت، جفر، رمل، حکمت، طب، اقتصادیات، کیمیا، تاریخ، جغرافیہ، تصوف، ریاضی، اقلیدس، جبر و مقابلہ، فن خطابت، مصطلحات، بدیہہ گوئی، خوشنویسی، شعر گوئی، مصوری، جرّاحی، ورزش، محاربہ، ریاضت جسمانی، ناول نگاری، قصص و حکایات، قوانین ملکی، کلام، تفسیر، قرأت، فقہ، حدیث، درایت، علم اللغات، علم اللسان، علم النفس اور علم الرجال وغیرہ، غرضکہ شاید ہی کوئی علم یا فن ایسا ہو جس کی کتابیں

اُردو زبان میں موجود نہ ہوں۔ علاوہ ان کے سناتن دھرم، آریہ دھرم، تھیاسفی، اسلام، مذہب عیسوی، ان سب کا بیشمار لٹریچر اُردو میں موجود ہے۔

آپ صاحبوں نے یہ اُمید ظاہر فرمائی ہے کہ مجسٹریٹی کی بنچ کا کام اچھا ہوگا اور ناچیز کا تقرر بنچ میں ایک اچھے اضافہ کا ہم معنی ہے۔ اس کے بارے میں میری غرض یہ ہے کہ میں اس بات کی کوشش کرونگا کہ میرے ہمنشینوں کو مجھ سے کچھ مدد ملے اور باہم، ہم سب مجسٹریٹوں کے درمیان رابطۂ اتحاد بڑھے اور اتفاق رائے کے ساتھ کام ہو اور اگر اہل عمل کی کارروائی سے اہل مقدمہ کو شکایت ہو تو وہ بھی دور کی جائے۔ میں ابھی کام کا تجربہ نہیں رکھتا ہوں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ میرے ہمنشین جو مجھ سے بہت زیادہ تجربہ رکھتے ہیں، مجھے سکھا لیں گے اور مجھ پر نظر عنایت مبذول رکھیں گے اور میں بھی بار شاطر رہونگا، نہ کہ بارخاطر۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ وکیل صاحبان کا برتاؤ بھی میرے ساتھ دوستانہ اور فیاضانہ رہے گا اور مجھے اُن کی قانوندانی اور موشگافیوں سے انصاف کرنے میں مدد ملے گی۔ میونسپلٹی کے مقدمات اکثر بنچ میں آیا کرتے ہیں۔ اگر اُن میں پورا انصاف کیا جائے تو عامہ رعایا کو میونسپلٹی کے عملہ اور میونسپل ممبروں کی خدمات پر زیادہ اعتبار ہوگا جو بالآخر میونسپلٹی کے فروغ کا باعث ہوگا۔ اگر مجسٹریٹوں کی بنچ محنت اور توجہ سے کام کرے اور انصاف پر نظر رکھے تو میری رائے میں اہل شہر کو فائدہ پہونچا سکتی ہے اور اُس کی یہ خدمات اہل وطن کے حق میں برکت ثابت ہوسکتی ہیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے یہی سمجھ کر یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے کہ اپنے ہموطنوں کی خدمت کروں۔ میری دعا درگاہ الٰہی میں یہ ہے کہ خداوند تعالےٰ مجھے محنت و دیانت کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عنایت کرے اور میں آپ کی ان امیدوں کو پورا کر سکوں، جو آپ نے میرے تقرر کی نسبت ظاہر کی ہیں۔ مجھے صاحب کلکٹر اور گورنمنٹ کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے جنھوں نے مجھے پبلک کام کرنے کے قابل سمجھا۔

قحط سالی میں غربا کی امداد

۱۴ مارچ ۱۹۱۹ء کو ایک عظیم الشان جلسہ عام بمقام ٹاؤن ہال زیر صدارت مجسٹریٹ ضلع اس غرض سے ہوا کہ گرانی غلہ سے جو تکلیف عامہ رعایا کو ہو رہی تھی، وہ دور کر دی جائے اور چندہ کر کے محتاجوں کی دستگیری کی جائے۔ منتظمان صاحب نے حضرت میر مجلس کی تحریک پر جو تقریر کی وہ حسب ذیل ہے:-

میر مجلس اور حضرات انجمن!

اس وقت ہم لوگ اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ ہمارے بھائی اور بہنیں جو قحط سے تکلیف اور مصیبت اُٹھا رہے ہیں اُن کی مدد ہم اپنی حیثیت اور مقدرت کے مطابق کریں۔ جو بھوکے ہیں اُن کو کھانا پہونچائیں، جو ننگے ہوں اُن کو کپڑا دیں، جو پردہ نشین عورتیں ہیں اور کسی سے مانگ نہیں سکتی ہیں اُن کے گھروں پر مدد پہونچانے کا انتظام کریں۔ کیا آپ چاہیں گے کہ ہم تر نوالے کھائیں اور ہمارے محتاج بھائی سوکھی روٹیوں سے بھی اپنا پیٹ نہ بھریں۔ کیا آپ چاہیں گے کہ سردی میں لحاف اور شال دوشالے اوڑھیں اور ہمارے غریب بھائیوں کے پاس کمبل بھی نہ ہو۔ ہرگز نہیں ہم میں سے ایسا بے درد کوئی نہیں ہو سکتا۔

یاد رکھیے، قدرت نے امیر فقیر دونوں کو یکساں حقوق دیے ہیں۔ بھوک کے وقت امیروں کو حق حاصل ہے کہ وہ عمدہ اور لطیف غذائیں کھائیں، اسی طرح فقیروں اور محتاجوں کو حق ہے کہ بھوک کے وقت سوکھی روٹی ہی سے اپنا پیٹ بھریں۔ اسی طرح پیاس کی حالت میں امیر برف کا ٹھنڈا پانی پیے گا تو غریب تازہ پانی۔ نیند کے وقت امیر پلنگ پر نرم بستر بچھا کر آرام کریں گے، تو فقیر بوریے پر گدڑی بچھا کر سوئیں گے ؎

گر نبود بالشِ آگندہ پر   خواب تواں کرد حجر زیر سر

اسی طرح آپ اور باتوں کو بھی قیاس کر لیجیے غرضکہ جب قدرتی حقوق اور قدرتی خواہشات سب کی یکساں ہیں تو ہم کو چاہیے کہ اپنی حیثیت کے لائق نہ سہی تو اپنے غریب بھائیوں اور محتاج بھائیوں کی حیثیت کے لائق ہم اُن کو روٹی کپڑا بہم پہونچائیں اور ایسا کرنا ہم پر فرض ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم لوگ جو یہاں جمع ہیں، ہماری ذات پر قحط کا اثر بہت کم ہے بلکہ برائے نام ہے۔ لیکن جب دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے گردوپیش ہمارے بھائیوں پر تکلیف ہے اور وہ فاقہ کشی کر رہے ہیں تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم پوری بھوک کھائیں اور پوری نیند سوئیں۔ جب ہم دستر خوان بچھائے تر لقمے کھا رہے ہیں اور ہمارے بھائی جو بھوکے ہیں سامنے آجائیں تو کیا ہمارے حلق سے نوالہ اتر سکتا ہے جب تک کہ ہم اُن کو بھی نہ کھلائیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی بیمار ہو اور وہ رات کو کراہے تو ہم اُس کو چھوڑ دیں اور گہری نیند سو سکیں۔ محض ناممکن ہے ؎

چو بینم کہ درویش مسکیں نہ خورد
بکام اندرم لقمہ زہرست و دُرد

غور کیجیے تو اس وقت غریب اور فاقہ کش لوگوں کی حالت نہایت نازک اور دردناک ہے گویا وہ ایک کشتی پر سوار ہیں، جس کا لنگر ٹوٹ گیا ہے، ملاح سو گیا ہے، اہلِ کشتی طوفان میں مبتلا ہیں اور منجدھار میں پڑے ہوئے ہیں۔ موجوں کے تلاطم سے کشتی چاروں طرف ٹکراتی پھرتی ہے۔ اس وقت سوائے خدا اُن کا کوئی ناخدا نہیں ہے۔ ہم لوگ جن پر قحط کا اثر نہیں ہے گویا کنارے پر کھڑے اور سب آفتوں سے محفوظ ہیں۔ اہلِ کشتی پکار پکار کر ہم سے کہتے ہیں کہ ہم ڈوب رہے ہیں، برائے خدا ہم کو بچاؤ۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم اُن کو ڈوبنے سے بچائیں۔

اس وقت جو مصیبت زدہ غریب بھائی فاقہ کشی کر رہے ہیں اُن میں سیکڑوں بیوائیں ایسی ہوں گی جن کے شوہروں نے آپ لوگوں کی خاطر اور گورنمنٹ کے لئے اپنا خون آبِ باراں کی طرح بہایا۔ اسی طرح سیکڑوں یتیم بچے بھی ہوں گے جن کے باپ چچا نے اپنی جانیں اس جنگِ عظیم میں دیدیں اور اپنے قیمتی خون سے یہ عظیم الشان فتح خریدی جس سے ہم بے شمار فائدے اُٹھا رہے ہیں اور آئندہ اُٹھائیں گے۔ پس اُن بیواؤں اور یتیموں کی خاطر فیاضی اور دریا دلی سے اس وقت کام لیجیے اور اُن کی مدد کیجیے اور داخلِ حسنات ہو جیے۔ دیکھیے بمبئی میں لیڈی لائیڈ کی سرپرستی میں وہاں کی خواتین نے کمیٹی کی اور چودہ ہزار سے زیادہ روپیہ فوراً جمع کر لیا۔ وہ عورتیں جو جنگ میں کام کرتے کرتے تھک گئی تھیں اپنی بہنوں کی مصیبت اور فاقہ کشی دیکھ کر مردانہ وار مدد کرنے پر مستعد اور آمادہ ہو گئیں۔ تو کیا صاحبو ہم مرد ہو کر اُن عورتوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے ؟

ہماری گورنمنٹ اور اُس کے ماتحت قحط کے انتظام میں سخت کوشش کر رہے ہیں ہم کو اُن کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ بغیر ہماری مدد کے گورنمنٹ پورا کام انجام نہیں دے سکتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ سنہ ۹۷-۹۶ء کے قحط میں ہمارے لفٹننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل صاحب نے کیا کیا۔ اُس بندہ خدا نے قحط کا کام ایک بجے رات تک روزمرہ کیا اور اپنی تفریح اور سیر و شکار سے کچھ سروکار نہ رکھا۔ عالمگیر بادشاہ کی طرح اُس کا قول تھا کہ "شکار کار بیکاران است" جب اُن کے دوست احباب کہتے تھے کہ آپ بہت سخت محنت کرتے ہیں کبھی کبھی سیر و شکار سے بھی دل بہلائیے ؎

زمانے سیر و شطرنج و حکایات
کہ خاطر را بود دفع ملالے

تو وہ بندہ خدا جواب دیتا تھا کہ میری رعایا قحط سے بھوکوں مر رہی ہے اور میں سیر و شکار میں مصروف رہوں، یہ ناممکن ہے۔ اُس شخص نے اپنی تقدیر ہماری تقدیروں سے ملا دی تھی اور اس قدر سخت محنت و مشقت کی کہ اپنی تندرستی خراب کر لی اور چھ ماہ کی رخصت لے کر ولایت گئے، رخصت ختم ہوتے ہی پھر واپس آکر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ ہمارے کام میں ایسے محو تھے کہ کبھی اپنی پرواہ نہ کی۔

ذرا غور کیجیے کہ ایک عیسائی مذہب آدمی دنیا کے اُس حصّہ کا رہنے والا جہاں بظاہر دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ہمارے ملک میں سات ہزار میل سے آتا ہے اور باوجود اختلاف مذہب اختلاف قوم اور اختلاف ملک و زبان کے ہم سے ایسی ہمدردی کرتا ہے کہ اپنی صحت کو بھی معرض خطر میں ڈال دیتا ہے، گویا اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتا ہے اور ہم لوگ ایک ملک کے رہنے والے باوجود اتحاد مذہب، اتحاد قوم اور اتحاد ملک و زبان کے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی پرواہ نہ کریں کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ سنہ ۱۸۷۷ء کے قحط عظیم میں کیا ہوا تھا۔ باوجودیکہ گورنمنٹ اور اُس کے عہدہ داروں نے سعی و کوشش اور جد و جہد میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، لیکن محض اس وجہ سے کہ ہم لوگوں نے یعنی عامہ رعایا نے گورنمنٹ کا ہاتھ نہیں بٹایا پچاس لاکھ بندگانِ خدا ہلاک ہوئے۔ سچ پوچھیے تو اس میں نہ گورنمنٹ کا قصور تھا، نہ ویسرائے کا، نہ ملکہ انگلستان کا، بلکہ یہ خونِ ناحق ہماری گردنوں پر قیامت تک رہے گا۔

صاحبو! ہم کو گورنمنٹ کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ جب سے گورنمنٹ برطانیہ کی حکومت ہندوستان میں ہوئی ہے اُس وقت سے قحط کی وہ زیادتیاں اور بربادیاں نہیں دیکھی جاتیں جو حکومت انگلشیہ سے پہلے ہوا کرتی تھیں کہ شہر کے شہر صاف ہو جایا کرتے تھے۔ ہزاروں آدمی روز مرا کرتے تھے، ہزاروں لاشیں بے گور و کفن طعمۂ زاغ و زغن ہو جاتی تھیں۔ بجائے آدمیوں کے درندے بسنے لگے تھے، جیساکہ شہر واقع بنگالہ کا حال ہوا جو مورخوں نے لکھا ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے۔

Christian humanity and enlightened govt. have rendared modern statesmen ignorant of the meaning of the word in its aucient suese.

صاحبو! بھوکوں کو کھانا کھلانا، پیاسوں کو پانی پلانا، ننگوں کو کپڑا پہنانا، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، بیماروں کا علاج اور دوا دارو کرنا، حاجتمندوں کی حاجت برلانا، فریادیوں کی دادرسی کرنا، بیماروں اور دردمندوں سے ہمدردی کرنا، مظلوموں کا انصاف کرنا اور اُن کا دُکھ درد دور کرنا، ایسے کام ہیں جو تمام دنیا میں مقبول انام اور مطبوع خاص و عام ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خیرات کرنا بہت بڑا مذہبی کام ہے۔ ہندوؤں کی فیاضی اپنے ہمجنسوں تک محدود نہیں رہی ہے، بلکہ اُن کی خیرات سے خشکی و تری اور ہوا کے جانور بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ وہ چیونٹیوں کو شکر اور آٹا کھلاتے ہیں، گویا زمین کے اندر رہنے والے جانداروں کو کھانا پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح دریا کے جانوروں کو بھی مثل مچھلیوں اور کچھوؤں کے خوراک پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح ہوا کے پرندوں کو بھی آب و دانہ دیتے ہیں۔ غرضکہ ہندوؤں کی فیاضی سے ماہی و مرغ و مور بھی محروم نہیں ہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہمجنسوں کو بھوکا مرنے دیں اور اپنے فاقہ کش بھائیوں کی تکلیف گوارا کر سکیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے یہاں زکوٰۃ یعنی آمدنی کا چالیسواں حصہ خیرات کرنا مذہبی فرض ہے۔ مسلمانوں میں فرض اُس کام کو کہتے ہیں جس کے کرنے کا حکم خدا نے دیا ہو۔ اسلام کے جو ضروری ارکان ہیں یعنی کلمہ طیبہ، روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، اُن میں زکوٰۃ داخل ہے اور یہ زکوٰۃ یعنی چالیسواں حصہ آمدنی کا فقرا اور مساکین کو دینا فرض عین قرار دیا گیا ہے۔ میں نے سیاح سے، جو ابھی حال میں جنوبی افریقہ سے آیا، یہ سنا کہ وہاں کے مسلمانوں نے ۲ لاکھ روپیہ حال میں اپنے وطن گجرات بھیجا جو محض زکوٰۃ کا روپیہ تھا یعنی اُن کی آمدنی کا صرف چالیسواں حصہ جس سے بڑے

بڑے کام ہوئے۔ عالیشان مسجدیں اور مدرسے تعمیر ہوئے اور ان کے محتاج بھائیوں اور بہنوں کو بیشمار فائدے پہونچے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان خیرات کرنے میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں رہیں۔ امید ہے کہ اس وقت ہندو مسلم دونوں اپنی اپنی فیاضی اور دریا دلی کام میں لائیں گے۔

یاد رکھیے کہ ہر نعمت جو خدا نے ہم کو دی ہے اس کا شکر جداگانہ ہے۔ اگر خدا نے ہم کو حکومت دی ہے تو اس کا شکر یہ نہیں ہے کہ ہم یہ الفاظ کہیں کہ خدا نے ہم کو حاکم بنایا ہم اس کے بڑے شکر گذار ہیں۔ نہیں۔ بلکہ اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ جن لوگوں کے معاملات ہمارے سامنے پیش ہوں ہم ان کا انصاف کریں اور اہل معاملہ کی دادرسی کریں۔ اسی طرح اگر خدا نے ہم کو دولت کی نعمت دی ہے تو اس کا شکر یہ ہے کہ جو ہمارے غریب بھائی ہماری مدد کے محتاج ہیں ان کو ہم اس دولت میں سے کوئی حصہ تقسیم کریں تاکہ ان کو جو حق ہماری دولت میں حاصل ہے وہ حق ان کو پہونچ جائے۔ ع۔

چو حق بر تو پاشد تو بر خلق پاش

یہ دولت کا شکر یہ ہے۔

صاحبو۔ میں آپ کو نواب آصف الدولہ کے وقت کا ایک واقعہ سناؤں جس سے آپ کو یہ واضح ہوگا کہ نواب آصف الدولہ خیرات کرنے میں بے نظیر تھے اور قحط کے وقت رعایا کی پرورش کس طور پر کرتے تھے۔ ان کے عہد معدلت مہد میں اودھ میں قحط عظیم پڑا۔ انھوں نے شریف مرد و زن کی پرورش کے واسطے (جو علانیہ مانگ نہیں سکتے تھے) یہ تدبیر نکالی کہ امام باڑہ کی تعمیر شروع کرادی۔ (جو آصف الدولہ کا امام باڑہ کہلاتا ہے) تعمیر کا کام دن میں نہیں ہوتا تھا بلکہ رات میں ہوتا تھا۔ حکم تھا کہ مرد و زن جو مزدوری کرنے آئے اس کا نام و نشان کچھ نہ پوچھو اور سب کو تھوڑی رات رہے صبح سے پیشتر ہی اجرت دے کر رخصت کردو اور کام کی تاکید نہ کرو۔ مطلب یہ تھا کہ جو پردہ نشین عورتیں مزدوری کریں ان کا پردہ فاش نہ ہو اور جو شریف مرد شرم کے باعث دن میں مزدوری نہ کرسکیں ان کا راز بھی پوشیدہ رہے اور سب کی پرورش ہو جائے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ امام باڑہ کی تعمیر تمام و کمال ایام قحط ہی میں ہوئی اور ہزاروں پردہ نشین عورتوں اور شریف مردوں نے پرورش پائی۔ نواب آصف الدولہ کی فیاضی نے یہ مثل زبانزد خاص و عام کردی "جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ"۔ ہم لوگوں کو اس واقعہ سے سبق سیکھنا چاہیے کہ جو مرد و زن شرم اور خودداری کے باعث علانیہ مانگ نہیں سکتے ان کو

کسی عمدہ طریقہ سے مدد پہونچائی جائے۔

صاحبو میں آپ کی خدمت میں اُن فاقہ کش غریب بھائیوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جو بھوکے مر رہے ہیں اور جاڑے کی تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں، جن کو خوراک اور کپڑا بہم پہونچانا ہمارا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اُن غریبوں اور محتاجوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جن پر جاڑے کا موسم گذر گیا اور اُن کے بدن پر کپڑا نہ تھا۔ جو پوری نیند نہ سو سکے اور اب بھی رات کو اُن کو تکلیف سخت ہے۔ میں اس وقت اُن بیکس اور غریب بیواؤں اور یتیموں کی طرف سے سب ہندو مسلمان بھائیوں کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں، جو بیچارے ہماری طرف آسرا لگائے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے وکیل ٹون ہال میں آج جمع ہیں دیکھیں ہماری پرورش کی کیا کیا تجویزیں عمل میں لاتے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں اُن قحط زدہ فاقہ کش غریبوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جو بیچارے حالت بیکسی و کمزوری میں اپنی فریاد ہمارے کانوں تک نہیں پہونچا سکتے اور گونگوں کی طرح خاموش ہیں میرا فرض عین ہے کہ میں بلند آواز سے اُن کی مصیبتوں کا حال آپ کے گوش مبارک تک پہونچاؤں۔ میں آپ کی خدمت میں اُن معصوم چھوٹے بچوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جن کی پرورش کرنا ہندوؤں اور مسلمانوں بلکہ ہر مذہب والوں کے نزدیک فرض عین ہے جو بوجہ فاقوں کے موت کے منہ میں دکھائی دے رہے ہیں جو اُن کو مدد پہونچائیں گے تو گویا موت کے پنجہ سے نجات دیں گے۔

میں اُن غریب قابل رحم دردمندوں اور محتاجوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جو بیچارے موت کو اپنا مہربان دوست سمجھ کر ہر وقت اس کو بلایا کرتے ہیں۔

میں آپ کی خدمت میں قوم کے ہواخواہوں اور ملک کے خیراندیشوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں جنھوں نے قحط زدہ لوگوں کی حالت درست کرنے کے لئے کمر ہمت چست باندھی ہے۔ اُن باہمت وطن دوستوں کا دل بڑھانے کے لئے اور اُن کو تقویت پہونچانے کے لئے آپ بھی مدد کیجیے اور مستعد ہو جائیے تاکہ یہ اچھا کام بخوبی تمام انجام پاجائے اور آپ کی خیرات سے ہزاروں جانیں بچ جائیں اور لاکھوں مصیبت زدہ فائدہ اٹھائیں۔ دیکھیے اُن لوگوں کو جنھوں نے لاکھوں روپیے بھوکوں اور محتاجوں کو دیدیے ہیں اور بے دریغ روپیہ خرچ کرتے چلے جاتے ہیں۔

اب میں ختم کلام کروں گا تاکہ چندہ کا عملی کام شروع ہو۔

شفاخانہ کے لئے چندہ کی اپیل

سنہ ۱۹۲۰ء میں میموریل ہاسپٹل ٹڈھیور (ضلع فرخ آباد) کے لیے چندے کی ضرورت ہوئی، تاکہ آلات جراحی اور دیگر ضروری اشیاء شفاخانہ کے لیے مہیا کی جائیں اور وہاں کے کام کو وسعت دی جائے۔ مس ووڈرڈ (جو بعد میں ڈاکٹر ووڈرڈ کے نام سے مشہور ہوئیں) مشران صاحب کے مکان پر تشریف لائیں اور درخواست کی کہ زیر صدارت کلکٹر ضلع ایک جلسہ عام ہونے والا ہے اس میں آپ اسپیچ دیں اور خاص و عام سے چندہ کی اپیل کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ کی فرمایش کے مطابق، مشران صاحب نے جلسۂ مذکور میں حسب ذیل تقریر کی۔

حضرت میر مجلس اور حضرات سامعین!

ہم لوگ اس وقت نہایت مبارک کام کے لیے جمع ہوے ہیں کہ میموریل ہاسپٹل ٹڈھیور کو روپیہ سے مدد پہونچائیں تاکہ جو جو ضروری چیزیں یہاں کے مریضوں کے واسطے اور ہمارے بھائیوں اور بہنوں کے لیے مطلوب ہیں وہ مہیا کی جائیں۔ اگرچہ یہ شفاخانہ ہمارے عیسائی بھائیوں کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس کا انتظام کرتے ہیں لیکن یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں چوگنی تعداد ہندو مسلم کی یہاں سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اس شفاخانہ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا شفاخانہ کہنا چاہیے۔ اسی لیے ہندو و مسلمین سے اس کی امداد کے واسطے اپیل کی جاتی ہے، جو اس علاج گاہ کے احسانمند ہیں اور شکر گذاری کے طور پر اپنے عطیہ سے اس کو مستفیض کرنا ان کا فرض عین ہے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس وقت، اول آپ کی خدمت میں اس شفاخانے کے مختصر حالات عرض کر دوں۔ اس شفاخانہ کو بنے ہوئے تین سال کے قریب عرصہ گذرا ہے۔ ڈاکٹر ووڈرڈ لیڈی سرجن جو اس اسپتال کی انچارج ہیں، ایم، ڈی کی ڈگری رکھتی ہیں، جنھوں نے پانچ برس امریکہ میں ڈاکٹری پڑھی اور دو برس جرمنی اور انگلستان میں یہ فن سیکھا اور خاصکر عورتوں کے علاج میں ماہرانہ دستگاہ حاصل کی۔ آپ کے عملہ میں ایک نرس ہیں جو سب اسسٹنٹ سرجن کا درجہ رکھتی ہیں ان کے علاوہ اور باقی نرسیں کمپونڈر اور ڈریسر کا کام کرتی ہیں اور سب تعلیم یافتہ ہیں اور جو کام وہ کرتی ہیں

انھوں نے باقاعدہ سیکھا ہے۔ اس شفاخانہ کے اندر ایک ٹریننگ اسکول ہے جس میں عورتوں اور مردوں کو نرسنگ سکھایا جاتا ہے۔ دوائیں جو مریضوں کو دی جاتی ہیں اُن کی قیمت اس قدر کم رکھی گئی ہے جو غریب سے غریب مریض بھی دے سکتا ہے۔ مرد و زن بیمار، جو روزانہ اس شفاخانہ میں آتے ہیں اُن کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے اور جو مریض شفاخانہ کے اندر رہ کر اپنا علاج کرا رہے ہیں اُن کی تعداد ساٹھ سے کچھ زائد ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جو اوسط ہندو مسلم عیسائی بیماروں کا رہا وہ آپ کی اطلاع کے لیے سناتا ہوں، جن کی تعداد مجموعی ۱۴۲۵۲ ہے۔ سات ہزار نوسو اناسی عورتیں اور چھ ہزار دو سو تہتر مرد۔ ان اعداد کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

ہندو				مسلمان				عیسائی			
بچے		بڑے		بچے		بڑے		بچے		بڑے	
مرد	عورت	مرد	عورت	مرد	عورت	مرد	عورت	مرد	عورت	مرد	عورت
۱۸۴۹	۱۴۵۷	۱۸۱۹	۳۳۳۹	۴۶۷	۵۱۶	۵۱۱	۱۱۳۵	۸۰۸	۵۱۵	۸۱۹	۱۰۱۷

۱۹۱۸ء میں جو عمل جراحی ہوئے، اُن کی تعداد ۲۳۲ ہے۔ ۱۹۱۹ء میں اور ترقی ہوئی، یعنی جوان عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد جن کا علاج اس شفاخانے کے اندر ہوا ۸۹۹۵ ہو گئی اور مرد بیماروں کی تعداد ۷۳۶۸، یعنی کل ۱۶۳۶۳۔ گویا عورتوں اور مردوں کی تعداد میں ایک ہزار سے زیادہ اضافہ ہوا۔ عمل جراحی جو ۱۹۱۹ء میں شفاخانہ کے اندر ہوئے، اُن کی تعداد ۳۸۶ رہی اس میں بھی سال گذشتہ سے ایک سو چون کا اضافہ ہوا۔ ان کے علاوہ وہ بیمار ہیں، جن کا علاج شہر اور فتحگڑھ میں اُن کے گھروں پر کیا گیا۔ مس ووڈرڈ اس ضلع کی ہر تحصیل میں بیماروں کو دیکھنے جاتی ہیں اُن کی تعداد بھی مذکورۂ بالا تفصیل کے علاوہ ہے۔ قائم گنج اور راجہ پور میں شفاخانے مشن نے قائم کر رکھے ہیں، اُن میں جن بیماروں کا علاج ۱۹۱۸ء میں کیا گیا اُن کی تعداد ۵۲۱۴ ہے، جو بالکل الگ ہے۔

حضرات! اس تفصیل سے آپ پر واضح ہو گیا کہ اس شفاخانے کے علاج سے ۱۹۱۸ء میں تین ہزار

ایک سو انسٹھ عیسائی مستفیض ہوئے اور اس کے مقابلے میں گیارہ ہزار ایک سو تیرہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے فیض پایا۔ پس ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ یہ شفاخانہ عیسائیوں کا ہے۔ ہم کو ہر طرح یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا شفاخانہ ہے، اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ہسپتال کی مدد کریں، جس سے اُن کے مرد وزن فائدہ کثیر حاصل کرتے ہیں اور جہاں اُن کی عورتوں اور بچوں کی دوا اور پرداخت ایسی ہمدردی اور محبت سے ہوتی ہے کہ اُن کی مائیں اور بہنیں بھی نہیں کر سکتیں۔

مس ووڈرڈ نہایت مستعدی، ہمدردی، اور توجہ اور محنت سے مریضوں کا علاج کرتی ہیں اور بعض اوقات ہماری خاطر دیہات اور قصبات میں بھی جاتی ہیں، جہاں کی حالت وبا کے باعث بعض اوقات نہایت افسوسناک اور خطرناک ہو جاتی ہے۔

یہ حالات معلوم کرنے کے بعد اگر ہم ایسے شفاخانہ کو جو ہمارے لیے خدا کی رحمت اور برکت ہے روپیہ کی امداد دینے میں دریغ کریں تو نہایت درجہ ناسپاسی ہوگی۔ دیکھیے امریکہ کے مشن کو جو یہاں اپنے مذہب عیسوی کی تبلیغ کے لیے آیا ہے، لیکن ہمارے ملک میں رہ کر ہمارے ساتھ وہ برتاؤ کرتا ہے جو ہمارے ہموطن بھی نہیں کرتے، حالانکہ یہ لوگ بقول شخصے نئی دنیا سے یہاں آئے ہیں انھوں نے علاوہ شفاخانوں کے مدرسے اور کالج بھی کھول دیے ہیں، گویا جسمانی اور دماغی دونوں فائدے ہم کو پہونچاتے ہیں اور ہم شکرگذاری کو بالائے طاق رکھکر یہ کہا کرتے ہیں کہ ان سے پرہیز کرنا چاہیے، یہ ہمارے بچوں کو عیسائی بناتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

صاحبو! تمام دنیا میں ہمیشہ ہر مذہب والوں کے نزدیک بیماروں کی دوا کرنا، دکھیاروں کا دکھ درد دور کرنا، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، غمگینوں کے ساتھ ہمدردی کرنا، مرتے ہوؤں کی جانیں بچانا سب سے اعلیٰ خیرات اور نیکی سمجھی جاتی ہے۔ گو ہم تندرست ہوں لیکن جب کوئی ہمارے گھر میں بیمار ہوتا ہے تو ہم کو رات بھر نیند نہیں آتی اور پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھا سکتے، کیونکہ انسانی ہمدردی کا اقتضا یہی ہے زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ ہم خود بھی تندرست ہوں اور آرام و آسائش سے رہیں اور دوسروں کو بھی تندرست اور آرام و آسایش سے رہتے ہوئے دیکھیں۔ اسی ہمدردی کے اصول کو ذرا اور وسیع کر دیجیے تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارے شہر اور دیہات اور قصبات میں ہزاروں آدمی ایسے بیمار پڑے ہیں جو ہماری

ہمدردی کے محتاج ہیں، جن کے واسطے ہمارا فرض ہے کہ ہم علاج کا سامان مہیا کریں۔ وہ سامان اس سے بہتر طریقہ سے مہیا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس شفاخانے کو مالی امداد بہم پہونچائیں، جہاں عورتوں اور بچّوں کا علاج خاصکر بہت اچھا ہوتا ہے اور جہاں علاج کے لیے ماہر معالج موجود ہیں۔

تمام دنیا کے عقلمندوں کی رائے ہے کہ دو تین قسم کی خیراتیں سب سے اعلیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ تعلیم گاہیں بنائی جائیں، جن میں دماغی، جسمانی اور روحانی تعلیم دی جائے۔ دوسرے یہ کہ بیواؤں اور یتیموں کے واسطے پرورش اور تربیت کا انتظام کیا جائے اور اُن کے لیے آشرم بنائے جائیں۔ تیسرے یہ کہ شفاخانے قائم کیے جائیں اور ان میں بیماروں کے علاج اور آرام و آسائش کے ساتھ ان کی تیمارداری کا انتظام کیا جائے۔ ہم لوگ جو خیرات کیا کرتے ہیں اُس کا زیادہ حصہ فضول اور برباد جاتا ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ غلط ضرورت ظاہر کر کے ہم سے پیسہ لے جاتے ہیں، مگر شفاخانے میں جو شخص بیمار آئے گا، کیا وہ بھی ہم کو دھوکا دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ شفاخانوں کو روپیہ دینے سے چند قسم کی خیرات ہو جاتی ہے۔ غریبوں کو وہاں کھانا دیا جاتا ہے اور کپڑا اور کمبل بھی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہوتی ہے اور بیماروں کی دوا دارو بھی۔ دُکھ درد والوں کی تکلیف دور کی جاتی ہے، اُن کو آرام بھی پہونچایا جاتا ہے، مرنے والوں کی جان بچائی جاتی ہے اور ضرورت پڑنے پر اُن کے دفن و کفن سے بھی دریغ نہیں کی جاتی۔ زہے قسمت اس شخص کی جس کا روپیہ ایسے عمل خیر میں خرچ ہو جائے کہ ایک نیکی کر کے متعدد نیکیوں کا ثواب ہاتھ آئے۔

صاحبو۔ میں آخر میں ہندوؤں کی خدمت میں بھی چندہ کے لیے اپیل کروں گا جن کی خیرات مرغ و ماہی و مور تک پہونچتی ہے، جن کی فیاضی اور دریا دلی سے پانی کے جانور اور ہوا کے پرندے بھی محروم نہیں رہتے ہیں، جن کے مذہب میں جان بچانا اور دکھ درد دور کرنا اعلیٰ درجے کی خیرات اور نیکی سمجھی جاتی ہے اور اس کے بعد مسلمانوں کی خدمت میں بھی اپیل کروں گا، جن کے مذہب میں زکوٰۃ یعنی پیداوار کا چالیسواں حصہ خیرات کرنا مذہب کے ارکان میں داخل ہے اور مذہبی فرض ہے اور جن کے پیشواؤں میں حضرت علی کا اور ان کے ہفت و ہشت سالہ بچوں یعنی حسن و حسین کا یہ واقعہ یادگار ہے کہ تین دن مسلسل روزے پر روزہ رکھا اور سامنے آیا ہوا کھانا اُٹھا کر بھوکے فقیر اور قیدی اور یتیم کو دے دیا۔ میں آپ کی خدمت میں اُن بیمار عورتوں کی طرف سے اپیل کروں گا جو بیچاریاں طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہیں جو عورتوں کو عارض ہوا کرتی ہیں اور جو محض اس وجہ سے بے وقت ہلاک ہو جایا کرتی

ہیں کہ اُن کو مناسب تیمارداری اور دوا میسر نہیں آتی۔ ایسی عورتوں کے لیے اس شفاخانہ میں کافی سامان مہیا ہے، لیکن ضروری اشیا زیادہ فراہم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اعلیٰ پیمانہ پر علاج کو وسعت دیجائے اور مس وُوڈورڈ اُن کے علاج کے لیے بہت ماہر موجود ہیں۔ میں اُن بچوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جو پچاس فی صد سے زیادہ مرجایا کرتے ہیں اور جن کی جانیں بچانے کے لیے ہماری گورنمنٹ کچھ عرصہ سے مناسب تدبیریں کر رہی ہے۔ ان کے علاج کے لیے بھی ہمارے ہسپتال میں کافی سامان جمع ہوجائے گا، اگر آپ مالی امداد فرمائیں گے اور لائق ڈاکٹروں اور نرسوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ میں اُن غریب بیکس بیماروں کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں جن کے واسطے کھانے، پینے کی اور سرمائی کپڑوں کی ضرورت سخت ہے اور آپ کی ادنیٰ فیاضی اور توجہ سے اُن کے واسطے کھانا، پینا، اوڑھنا اور بچھونا سب کچھ مہیّا ہوجانا ممکن ہے۔ میں اُن بیماروں کی طرف سے آپ کی خدمت میں اپیل کروں گا جن کی جان بچانے کے لیے اعلیٰ پیمانے کے عمل جرّاحی کی ضرورت ہے۔ آپ کے چندے سے وہ اوزار خریدے جائیں گے اور اُن کی جانیں بچ جائیں گی اور آپ کو ثواب دارین حاصل ہوگا۔



پنڈت موتی لال نہرو

موتی کی خدمت میں خیر مقدم کے ہار

فروری سنہ ۲۱ء میں آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو بعض عمائدین کی دعوت قبول فرما کر، فرخ آباد تشریف لائے اور ایک جلسہ عام تلک بھون، میں اس غرض سے منعقد ہوا کہ سارے ضلع کے حضرات جو پنڈت جی کے شائق دیدار ہیں، اس موقع پر ان کی زیارت سے مشرف ہو جائیں۔ مشران صاحب نے جلسہ مذکور میں حسب ذیل تقریر فرمائی۔

صدر جلسہ اور حاضرین انجمن!

اولاً میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ کو قوم کے گرانبہا گوہر یعنی پنڈت موتی لال صاحب نہرو کی خدمت میں خیر مقدم کے ہار پیش کرنے کے لیے انتخاب فرمایا اور یہ خدمت سپرد کر کے میری آبرو بڑھائی۔ گو کہ میری شخصیت ایسی نہیں کہ موصوف جیسے عظیم المرتبت انسان کو خوش آمدید کہنے کی جسارت کروں، مگر بفحوائے المامور معذور اس کار خیر کو اپنے لیے فال نیک سمجھ کر بصد شکریہ و امتنان قبول کرتا ہوں۔

صاحبانِ والا شان!

روز عیش و طرب و بادہ و جام است امروز	کام دل حاصل و ایام بکام است امروز
آنچہ می خواستم از حضرت باری شبہا	للہ الحمد کہ حاصل بتمام است امروز

حضرات! یہ وہ مبارک گھڑی ہے جس میں اہل فرخ آباد اور اطراف و اکناف کے خاص و عام کی، دلی تمنا بر آئی۔ ایک مدت سے یہ حسرت دل میں تڑپ تڑپ کر کروٹیں لے رہی تھی کہ رہنمایان قوم کی مالا کا یہ انمول موتی اور زمین ہند کے خزانے کا یہ بیش قیمت لال، جس کا لال بھی بھارت ماتا کی ہتھیلی کا ایک گرانقدر جواہر ہے، ہمارے وطن (فرخ آباد) کی خاک کو اپنے پاک قدموں سے عزت بخشے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہماری یہ حسرت بر آئی اور اس لعل شب چراغ نے ہمارے اندھیرے دل کی بستی میں اجالا کر دیا۔

پنڈت جی! آپ نے فرخ آباد کی سرزمین کو قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرما کر جو عزت ہم لوگوں کو بخشی ہے اس کے تشکریہ سے ہماری زبان قاصر ہے۔ جناب والا کی تشریف آوری سے جو بے پایاں

خوشی ہم کو حاصل ہوئی وہ الفاظ کے تنگ جامہ میں نہیں سما سکتی۔ بس۔ ع

دل من داند و من دانم و داند دل من

البتہ اتنا افسوس ہے کہ ہم اپنی بے مایگی کے باعث، آپ کی شان کے مطابق لوازم استقبال مہیا نہ کر سکے۔ حق یہ ہے کہ جو کچھ آرایش ہم لوگوں نے کی ہے، آپ کی ذات والاصفات جو علم و عمل کے زیورات سے آراستہ ہے، اس آرائش سے کہیں بالاتر ہے، تاہم اس جلسے کو ایک امتیاز حاصل ہے جس پر اہل فرخ آباد بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں اور دوسری جگہ کے لوگوں کو یہ فخر نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ امتیاز یہ ہے کہ یہ استقبالی جلسہ ایسے متبرک مقام میں منعقد ہوا ہے، جو پیشوائے قوم اور فدائے ملک، مہاتما تلک کے نام نامی اور اسم گرامی سے منسوب ہے۔ وہ مہاتما تلک جو ہمارا اور ہماری قوم کا سچا بہی خواہ اور بھارت ماتا کا دیر سپوت تھا اور جس کا یہ زریں مقولہ سونے کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے اور ہمارے پنڈت جی کی لوح دل پر بھی کندہ ہے کہ ـــ "سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اس کو ضرور حاصل کروں گا۔"

عہد قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ استقبال کے موقع پر مقررین اپنے مہمان کی مدح سرائی میں تر زبان ہونا فرض سمجھتے ہیں، مگر میں اس کے بجائے موصوف کے نفس الامری اوصاف بیان کرنے پر اکتفا کروں گا جس سے ہمارے نوجوانوں کو، جو اس جلسے میں شریک ہیں، سبق حاصل ہو اور وہ بھی آپ کے نقش قدم پر گامزن ہونے کی کوشش کریں۔

ہمارے پنڈت جی جس زمانے میں وکالت کرتے تھے، اس وقت آپ ہائی کورٹ کے ایک منتخب اور منفرد ایڈووکیٹ تھے۔ اگرچہ آپ کو اس پیشہ میں لاکھوں کی آمدنی ہوتی تھی مگر جن کا ظرف عالی ہوتا ہے وہ مال و زر کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچے۔ چنانچہ پنڈت جی نے جب یہ دیکھا کہ ان کا وطن اور قوم ایک ایسے خطرناک اور پرخار راستے سے گزر رہے ہیں جس کے نشیب و فراز کو سمجھنا عوام کا کام نہیں، تو درد وطن سے بےچین ہو کر اس پیشے کو ترک کر دیا اور ملک کو سوراج دلانے کی وکالت فرمانے لگے۔ آپ مظلوموں کی فریاد سننے والے، غریبوں کی مدد کرنے والے، بیکسوں کے پشت پناہ، بیماروں کے چارہ ساز، ملکی اور قومی آزادی کے علمبردار اور ہمارے حامی و مددگار ہیں اور ایسی تحریکوں میں، بغیر کسی جاہ و مال کی خواہش کے، سب سے پیش پیش رہتے ہیں۔ جس طرح کہ ابراہیم ادہم نے راہ خدا میں تخت و تاج پر لات ماردی تھی، اسی طرح آپ نے بھی ہماری خاطر عیش و آرام کو ٹھکرا کر

لاکھوں روپیہ کی آمدنی پر خاک ڈال دی اور ذاتی منفعت پر قومی فلاح کو ترجیح دے دی۔ حق یہ ہے کہ راحت و آرام کو چھوڑ کر دوسروں کے رنج میں شریک ہونا، اپنی تکلیف کا احساس نہ کرکے دوسروں کا غم بٹانا، آپ نے اپنا شیوۂ عمل اور طریقہ کار بنالیا ہے۔

سامعین باتمکین! اس وقت جو سودیشی کی تحریک، سارے ہندوستان میں ہمارے سیاسی دیوتا مہاتما گاندھی کی کوشش سے ترقی پذیر ہے، پنڈت جی موصوف اس کے فقط زبانی ہی مؤید نہیں بلکہ پورے طور پر اس کے عامل ہیں۔ اگرچہ آپ پہلے ولایتی کپڑا اور انگریزی لباس استعمال کرتے تھے لیکن اب دیسی کپڑا اور ہندوستانی پوشاک زیب تن فرماتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سادھوؤں کے جلوس میں جلوہ گر ہیں، آپ کے دلی جذبات آپ کے لباس سے ظاہر ہیں۔ گویا یہ شعر آپ ہی کے لیے کہا گیا ہے ؎

ادراک حال ما زنگہ می تواں نمود
حرفے زحال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

صاحبان والاشان! بندوں پر خداوند عالم کی یہ بہت بڑی مہربانی ہے کہ وہ مصلحت زمانہ کے مطابق اپنے خاص بندوں کو عام لوگوں کی اصلاح اور بہبود و فلاح کے لیے مقرر کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ جس طرح راجہ رام موہن رائے، بابو کشب چندر سین، سرسید اعظم اور سوامی دیانند جی اپنے اپنے کارہائے خاص کے واسطے منتخب ہوئے تھے، اسی طرح ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیے مہاتما گاندھی اور ہمارے مہربان پنڈت جی موصوف مقرر ہوئے ہیں۔

جناب والا! ہم سب ایک مدت سے آپ کی زیارت کے خواہشمند اور آپ کی دید کے صمیم قلب سے متمنی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا پرخلوص انتظار اور سچی محبت کی کشش ہی آپ کو یہاں تک کھینچ لائی ہے لہٰذا اگر آپ اجازت دیں تو نہایت ادب سے یہ عرض کروں کہ ؎

مرا، ز آمدن خود مدار، منّت دار
کہ ایں نتیجۂ ایام انتظار من است

معزز حاضرین! ہمارے پنڈت جی کی گرانقدر خدمات اور ان کے عظیم کارناموں سے کون واقف نہیں۔ آپ ہندوستان کے تمام صوبوں میں، بلکہ اطراف و اکناف عالم میں بھی اسی قدر مشہور ہیں جس قدر اپنے صوبۂ آگرہ واودھ میں شہرت رکھتے ہیں جب پنجاب میں شورش برپا تھی اور دار و گیر کا بازار گرم تھا، اس وقت

آپ وہاں تشریف لے گئے اور ذاتی زر و دولت اور وقت و فرصت کا نہایت خندہ پیشانی اور فراخدلی سے ایثار کیا اور ایک مدت تک وہاں رہ کر، ایسے واقعات تحقیق فرمائے جو ہنٹر کمیشن کو نہ معلوم ہو سکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت سے پنجاب کا بچہ بچہ اس محسن کا نام عظمت سے لیتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ہی، اہل پنجاب نے اعتراف امتنان کے طور پر آپ کو امرتسر کانگریس کا صدر منتخب کیا۔ وہ کانگریس جس کا صدر ہندوستان میں بے تاج کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی خدمات ہیں جن کا معاوضہ سوائے اس کے کہ اہل قوم اپنا دل آپ کے قدموں میں نثار کر دیں، اور کچھ نہیں ادا ہو سکتا اور اس سے زیادہ ہم غلاموں کے پاس اور کچھ دھرا ہی کیا ہے جو ایسے محسن کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

اب میں اپنی تقریر کو ختم کر کے پنڈت جی سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی تقریر دلپذیر سے مجمع کو محظوظ فرمائیں اور ہماری راہ میں چراغ ہدایت جلائیں۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی فتح

ماہ مارچ ۱۹۲۲ء میں جبکہ ترک، دوبارہ فتحیاب ہوئے، تو گھمنا کی نئی جامع مسجد میں بوقت شام مسلمانوں کا جلسہ عام اس غرض سے منعقد ہوا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کو اُن کی فتح کامل پر مبارکباد دی جائے اور آئندہ فتوحات کے واسطے دعا مانگی جائے۔ اول چند مسلم حضرات کی تقریریں ہوئیں۔ بعد ازاں مشران صاحب نے ہندوؤں کی نمایندگی کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی:-

بھائیو! کل جلسہ عام میں جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے، دو باتیں طے ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندو آج اپنے مندروں میں فتح مسلمین کی دعا مانگیں اور دوسری یہ کہ تمام ہندوؤں کی طرف سے مجھے اس جامع مسجد میں بھیجا جائے کہ میں مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہندوؤں کی طرف سے دعا میں شریک ہوں۔ چنانچہ میں اس غرض سے حاضر ہوا ہوں اور اس وقت اس متبرک جگہ پر ہندوؤں کی طرف سے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو اُن کی نمایاں کامیابی پر مبارکباد، بادل شاد دیتا ہوں اور اس احکم الحاکمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے مسلمانوں کو فتح کرامت کی اور اسلام کی عزت اور خلافت کی حرمت، تمام دنیا میں قائم رکھی۔ اب ہم آئندہ کی فتوحات کے واسطے دعا مانگیں گے۔ اس عرصہ میں جو خبریں موصول ہوئیں وہ یہ ہیں کہ یونانیوں نے درّہ دانیال کے کنارے، بہت سے اضلاع خالی کر دیے اور پندرہ ہزار سپاہی جو بہت زیادہ زخمی ہوئے تھے اُن کو جہاز پر سوار کرا کے بھاگ نکلے۔ یونانی فوج کا سپہ سالار گرفتار ہو گیا ہے اور بہت سے یونانی جنرل بھی گرفتار ہوئے ہیں، جن کو ترکوں نے اپنے بڑے بڑے فوجی مقامات پر بھیج دیا ہے۔ وہاں وہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے مہمان ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجیے، کس قدر فیاضی اور مہربانی اور برادری کا برتاؤ مسلمان کا اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ ہے۔ اس وقت جہاں جہاں مسلمان ہیں، ہر جگہ وہ جنگ کی حالت میں ہیں۔ ترک اپنے دشمنوں سے آسٹریا اور سلیشیا وغیرہ میں لڑ رہے ہیں۔ شام اور عراق عرب میں مسلمان اپنی حکومت خود اختیاری قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مصر اپنی پوری خود مختاری کے واسطے کوشاں ہے اور ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان خلافت کے معاملہ میں کس قدر گورنمنٹ ہند کے ساتھ ترک موالات کرنے پر آمادہ

ہیں، غرضکہ تمام دنیائے اسلام سیاسی جد وجہد میں مصروف ہے، خدا کرے، یہ سعی مشکور ہو۔

اس جنگ میں دنیائے اسلام کے علاوہ روس کی امداد بھی شامل ہے، جو ترکی کا حلیف ہے۔ روس اور ترکی کے عہد نامہ کی تفصیلات وہ حضرات جانتے ہیں جو اخبارات پڑھتے رہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے ستمبر میں بمقام باکو جو سلطنت آذر بائیجان کا دار الحکومت ہے، اسلامی ملکوں کے وکلا جمع ہوئے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ ایشیا کی تمام قوتیں مل کر برطانیہ کے خلاف متفقہ کوشش کریں۔ اس وقت سلطنت روس نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ خود مختاری حاصل کرنے میں ہم مدد دیں گے۔ چونکہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو یہ امر بہت ناگوار تھا کہ ترکوں کے مقبوضہ ممالک یونانی سلطنت کے محکوم رہیں، اس لیے اس تحریک میں وہ "مخالفت برطانیہ" کے لیڈر بن گئے۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں اسلام کو آزاد کرنے کے واسطے بمقام انگورہ، لیگ کی کمیٹی بیٹھی، جس کے میر مجلس خود مصطفےٰ کمال پاشا تھے۔ کمیٹی کے اختتام پر مصطفےٰ کمال نے اعلان کیا کہ ہم اسلام کو متحدہ سلاطین سے آزاد کریں گے اور یہ بھی کہا کہ مشرق میں جس قدر مذہبی کوشش ہے اور ترکی قوم پرستوں کی جو تحریک ہے وہ سب سلطنت روس کی امداد سے ہے۔ مصطفےٰ کمال کی جو کوشش ہے وہ محض اس غرض سے ہے کہ ترکوں کو غلامی سے آزاد کریں جو بموجب عہد نامہ کے اُن پر عائد ہوتی ہے۔

صاحبو! آج جو اس مقدس مقام میں ہندو مسلم بھائی سب متحد اور مشترک غرض سے جمع ہو کر خوشی منا رہے ہیں، یہ مسئلہ خلافت کی بدولت ہے، جس میں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندوستان میں بھی اسلام برٹش کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا اور ہندو مسلم بھائی سب مل کر حکومت خود اختیاری یعنی سوراج حاصل کر لینگے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم ہندوؤں کے تعلقات آپ مسلمانوں کے ساتھ صرف اس وقت سے نہیں ہیں، جب سے کہ آپ سب ہندوستان میں آکر ہمارے مہمان ہوئے، بلکہ منصور عباسی خلیفہ بغداد کے وقت سے ہیں جس کو ساڑھے گیارہ سو برس کا عرصہ گذر گیا۔ اس سے پہلے بھی قریش اور ہنود کے تجارتی تعلقات تاریخ عرب سے ثابت ہوتے ہیں۔ منصور کے وقت میں اور خلیفہ ہارون رشید اور مامون رشید کے زمانے میں، بہت سے برہمن، جو مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے، بغداد میں بلائے گئے تھے۔ اُنھوں نے وہاں جا کر عربی علوم میں دستگاہ حاصل کی اور نجوم، ویدک، فلسفہ، مذہب، اخلاق، جنگ و حرب اور علوم ریاضی کی تصنیفات جو سنسکرت

میں تھیں، اُن کا ترجمہ عربی زبان میں کر دیا۔ اُس وقت ہندو راجاؤں مہاراجاؤں سے بغداد کے خلفاء کی خط و کتابت رہا کرتی تھی اور بڑے دوستانہ مراسم باہم تھے۔ اُس زمانے میں بہت سے مسلمان ہندوستان آئے اور انھوں نے سنسکرت زبان میں بڑا ملکہ حاصل کیا اور بغداد جاکر ہندوؤں کے ویدانت پر عربی زبان میں کتابیں لکھیں۔ ایک نایاب کتاب ہمارے یہاں کی تصنیف سے، جس میں زہروں کا علاج تھا، بغداد لے گئے، اُس کا ترجمہ بھی عربی زبان میں ہوا۔ اُن مسلمانوں میں ایک شخص یعقوب کندی تھا، جو سنسکرت کا ایسا فاضل تھا کہ یہ زبان نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بول سکتا تھا۔ اس نے ہندو شاستر اور دیگر کتب مذہبیہ کا ترجمہ کیا ہے اور بغداد میں فیلسوف کے لقب سے اب تک مشہور ہے۔ وہ مامون رشید کے دربار کا سب سے بڑا فاضل اجل اور مترجم سمجھا جاتا ہے۔

مسئلہ خلافت کے علاوہ ایک دوسرا سبب اور پیدا ہو گیا جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں حقیقی بھائیوں سے زیادہ اتحاد و ارتباط پیدا ہو گیا ہے۔ میرا مطلب شاہ کابل کے فرمان شاہی سے ہے، جس میں بڑے بڑے عالموں اور مفتیوں اور قاضیوں کے فتووں کا حوالہ دے کر گاؤکشی بند کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، محض ہندو بھائیوں کی خاطر سے کہ اُن کا دل نہ دکھے اور مسلمان اور ہندو تمام ملک میں شیر و شکر ہو جائیں۔ شاہ افغانستان اور قاضیوں اور مفتیوں کی تعریف تو جس قدر کی جائے کم ہے، مگر ہم اُس مسلمان رعایا کی تعریف بہت زیادہ کریں گے جس نے اپنے بادشاہ کے حکم اور مفتیوں کے فتوے پر پورا عمل کیا اور ۳۱ کروڑ ہندوستانیوں کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ جناب رسول مقبول صلعم نے گائے کے بارے میں فرمایا ہے کہ "لحمھا داءٌ و لبنھا شفاءٌ" یعنی گائے کا گوشت بیماری ہے اور اس کا دودھ صحت و تندرستی ہے۔ یہ مانا کہ اسلام میں گائے مباح[۵۱] ہے مگر جو چیزیں مباح ہیں اُن میں ترک و فعل دونوں کا اختیار دیا گیا ہے خواہ اُن کو کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ میں اس مسئلہ پر زیادہ عرض نہ کروں گا کیونکہ ایسے مسائل میں غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔

اب میں مسلمان بھائیوں کی طرف پھر متوجہ ہوتا ہوں۔ پہلے ترکوں پر جو غلبہ یونانیوں کو ہوا تھا، اصل میں اللہ تعالیٰ کو ترکوں کے ایمان کی آزمائش منظور تھی، اس امتحان میں ترک پورے اترے اور خداوند تعالیٰ نے اُن کو پوری کامیابی دی جس سے ظاہر ہوا کہ ترکوں میں جذبۂ ایمان موجود ہے۔ اسی طرح

---

۵۱ وہ کام جس کو کرسکتے ہوں مگر کرنا ضروریاتِ دین میں شامل نہ ہو۔

ہماری آپ کی آزمائش بھی اللہ تعالےٰ کر رہا ہے۔ ہم سب کو بھی ایمان میں مضبوط رہنا چاہیے۔ اُمید ہے کہ خلافت کا مسئلہ ہم سب کے حسب دلخواہ طے ہوگا۔ ہمارے مسلم بھائیوں کے سامنے جناب رسول مقبول اور ائمہ اور اصحاب کی مثالیں موجود ہیں۔ خود آپ کے بزرگ اور دادا پردادا کس قدر ایمان کے پکے تھے اور کس قدر اخلاق محمدیؐ ان میں تھا۔ ابتدائے اسلام کا ایک تاریخی واقعہ سناؤں۔ ایک مرتبہ ایک تاجر کو تین لاکھ دینار کا منافع ہوا۔ امام وقت نے اُس سے کہہ دیا کہ یہ نفع جائز نہیں، حرام ہے۔ اُس تاجر نے وہ تمام دینار دریائے دجلہ کی ریت میں پھینک دیے۔ مورخ لکھتے ہیں کہ مدتوں وہ دینار دریا کے کنارے ریت میں پڑے رہے اور کسی نے نہیں اُٹھائے، کیونکہ یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ یہ دینار منافع حرام کے ہیں۔ جو لوگ شریعت کے زیادہ پابند اور پرہیزگار تھے، اُنھوں نے دریائے دجلہ کی مچھلیاں کھانا چھوڑ دیں کہ مبادا کوئی مچھلی کوئی دینار نگل گئی ہو تو اُس مچھلی کا اور اُس کے بچوں کا کھانا ہم پر حرام ہے۔

حضرات! آئیے اب ہم سب باادب کھڑے ہو کر اُس احکم الحاکمین کی بارگاہ میں دعا کریں، جو تمام دنیا کے بادشاہوں کا حاکم علی الاطلاق ہے۔ "یا الٰہی تو ترکان احرار اور اُن کے پیشوا غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو فتح پر فتح نصیب کر اور مسئلہ خلافت کو ہندوستان کے مسلمانوں کی خاطر خواہ طے کر کے اسلام اور خلافت کا احترام تمام دنیا میں قائم کردے —— یا الٰہی تو ہم اہل ہند کو معزز قوم بنا اور غلامی سے آزاد کر۔ ہم کو وہ سچی آزادی دے جو انگریزوں کو خود حاصل ہے اور ہم کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال پر پہونچا۔ یا الٰہی تو ہند و مسلم اتحاد کو مضبوط کر اور ہم کو توفیق دے کہ ہم دونوں مل کر حقیقی بھائیوں کی مانند سوراج میں شریک ہوں اور باہم شیر و شکر ہو کر اس ملک میں بسر کریں۔ یا الٰہی تو ہم کو توفیق نیک دے کہ ہم سب اپنے گھروں میں چرخہ کو رواج دیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک متبرک چیز ہے اور سودیشی کے استعمال سے بدیسی کا بازار سرد کردیں —— یا الٰہی تو شہیدان پنجاب کی پاک روحوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے جنھوں نے اپنا خون بہا کر ہم کو سوراج کا راستہ بتایا ہے اور آزادی کی قربانگاہ پر قربانی چڑھ کر ہم کو سبق سکھایا ہے —— یا الٰہی تو حکام وقت کو توفیق نیک دے کہ وہ قوم پرستوں کی دار و گیر سے باز آئیں اور رعایا پروری اور معدلت گستری اختیار کریں۔ تو اُن کی عقل کو راہ راست پر لا کہ وہ ایسا شاہانہ عمل اختیار کریں، جو عادل بادشاہوں کا شیوہ ہے —— یا الٰہی تو ہمارے بادشاہ کو ہدایت کر کہ وہ وائسرائے اور گورنروں سے جواب طلب کرے جنھوں نے

ظلم و ستم سے رعایا کو درہم و برہم کر رکھا ہے اور وائسرائے کو توفیق دے کہ وہ خلافت کے مسئلہ کو مسلمانوں کے حسب دلخواہ طے کرے اور رولٹ ایکٹ، پریس ایکٹ اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو یکقلم منسوخ کرکے، سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر دے جس سے اہل ہند کا دل بھی شاد ہو جائے اور انگریزی حکومت کے حق میں بھی نہایت مفید ثابت ہو ــــ یا الٰہی تو ہم کو توفیق دے کہ ہم انگریزی سلطنت کے ساتھ ترک موالات پُر امن طریقوں سے کریں اور ملک میں فتنہ و فساد برپا نہ ہونے دیں اور بموجب ہدایت مہاتما جی اور علی برادران کے کوئی ایسا خیال اپنے دلوں میں نہ آنے دیں جس سے کسی قسم کی جسمانی تکلیف انگریزوں اور حکام وقت کو پہنچے ــــ یا الٰہی تو ہمارے اخلاق درست کر اور ہم میں اتفاق باہمی پیدا کر جس کی بڑی ضرورت ہے۔ تو ہم کو جرأت و ہمّت عطا کر اور ملک و قوم کی خاطر سرفروشی سکھا جس کے بغیر نہ سوراج ہی مل سکتا ہے اور نہ مسئلہ خلافت ہی خاطر خواہ طے ہو سکتا ہے ــــ یا الٰہی ہم ہوں اور ہمارا ملک ہند ہو، ہم ہندو ہوں اور ہمارے بھائی مسلمان، ہم ہوں اور مہاتما جی اور علی برادران، ہم ہوں اور سوراج۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

قومی نعرہ ــــ نعرۂ تکبیر

گاندھی جنم دن

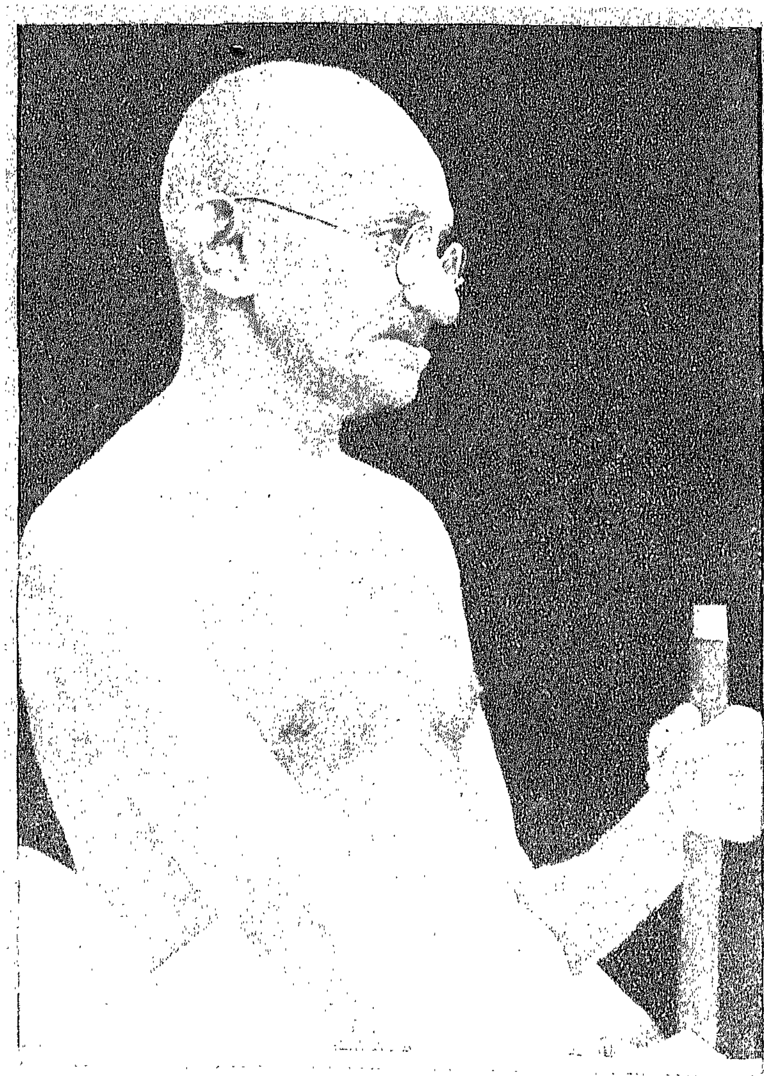
ماہ اگست سنہ ۲۲ء میں گاندھی جی کا جنم دن منانے کے لئے بمقام سرتی بھون ایک جلسہ بصدارت مشران صاحب منعقد ہوا، جس میں ارباب کانگریس اور شہر فتحگڑھ کے دیگر باشندوں کا اژدحام کثیر تھا۔ خاتونیں بھی شریک جلسہ تھیں۔ موصوف نے اس موقع سالگرہ پر جو تقریر کی وہ درج ذیل ہے۔

بھائیو اور بہنو۔ آج مہاتما گاندھی کی سالگرہ کا روز دلفروز ہے اور ہم سب ان کے جنم دن کی خوشی منانے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں اور دعا کرتے ہیں ؎

وہ سلامت رہیں قیامت تک　　　　اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو

یہ میرے لیے ضروری نہیں ہے کہ مہاتما جی کی سوانح عمری شروع سے آخر تک بیان کردوں کیونکہ اس ضیق وقت میں یہ ناممکن ہے۔ لیکن ان کی عادت، خصلت، خوبو کا مختصر بیان کرنا جس سے ہمارے واسطے کچھ سبق نکلتے ہوں، ضروری ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کو بمقام پوربندر علاقہ کاٹھیاوار میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کی عمر اس وقت ڈیڑھ مہینہ کم ترپن (۵۳) برس کی ہے۔ مہاتما جی کے باپ اور دادا دونوں اپنی آزاد مزاجی اور آقائی خیر خواہی کے باعث نہایت مشہور شخصیتوں کے مالک تھے۔ ان کے دادا صاحب رانائے پوربندر کے یہاں دیوان ریاست تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ رانی ناخوش ہوئیں تو یہ نواب جوناگڈھ کے یہاں پناہ گیر ہوئے۔ لیکن نواب کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا کرتے تھے۔ جب وہاں کے درباریوں نے نواب سے کہا کہ یہ شخص بائیں ہاتھ سے آپ کو سلام کرتا ہے، تو انھوں نے جواب دیا کہ گو مجھے رانی پوربندر سے بہت ناخوشی حاصل ہوئی ہے لیکن تاہم میں اپنا داہنا ہاتھ انہی کے سلام کے لیے محفوظ رکھتا ہوں اور دوسرے کے سلام کے واسطے بایاں ہاتھ کام میں لاؤں گا۔ اسی طرح مہاتما جی کے باپ دیوان پوربندر تھے۔ جب وہاں کے رانا سے کچھ ناچاقی ہوئی، تو یہ راج کوٹ چلے گئے اور وہاں کے دیوان



مہاتما گاندھی

ہو گئے۔ راجہ راج کوٹ نے ان کو زمین جاگیر میں دینا چاہی مگر انھوں نے نہیں لی۔ جب دوستوں نے بہت سمجھایا، تو اس کا ذرا سا ٹکڑا لے لیا۔ ایک دن پولٹیکل ایجنٹ نے کچھ الفاظ ان کے رانائے راج کوٹ کی نسبت کہے، جن کو سن کر انھوں نے سخت جواب دیا۔ پولٹیکل ایجنٹ نے کہا کہ تم مجھ سے معافی چاہو۔ انھوں نے انکار کیا کہ میں معافی نہ چاہوں گا۔ تب پولٹیکل ایجنٹ کو معافی کا خیال چھوڑنا پڑا۔

مہاتما جی کی ماتا جی بہت دھرماتما عورت تھیں۔ کسی بھوکے کو دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ سخت سے سخت برت رکھتی تھیں۔ جب تک کسی بھوکے کو کھلا نہ لیں خود نہیں کھاتی تھیں۔ گویا دیبی جی سروپ تھیں۔ ایسے ماں باپ کے گھر میں گاندھی جی پیدا ہوئے، جو اس وقت سب سے بڑے آدمی ہیں۔ نیکی میں، سچائی میں، آزادی اور ایثار میں یکتائے روزگار ہیں اور راکتیس کرور باشندگان ہند کے پیشوائے اعظم ہیں۔

گاندھی جی نے سترہ برس کی عمر میں کاٹھیاوار کے ہائی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس سے پہلے بارہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہو چکی تھی۔ وشنومت میں اہنسا کی بہت بڑی ہدایت ہے، یعنی کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔ لیکن مدرسہ کی تعلیم انگریزی سے، جیسا کہ قاعدہ ہے، ان کے دل سے اہنسا کا خیال جاتا رہا اور انھوں نے یہ سمجھا کہ گوشت کھانے میں کوئی برائی نہیں ہے اور گوشت سے پرہیز کرنا محض ایک وہم ہے۔ چنانچہ چند ساتھیوں کے ہمراہ ہر روز شام کو کسی ندی کے کنارے کھانے پکا کرتے تھے اور گاندھی جی گھر سے بہانہ کر کے نکل جایا کرتے تھے کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ اور وہاں جا کر وہ کھانے کھایا کرتے تھے، جو دلشنو لوگ نہیں کھا سکتے تھے۔ گویا تھوڑے دنوں کے لیے وشنو سے شیوی بن گئے تھے۔ لیکن چونکہ گاندھی جی کا دل ہمیشہ سچ بولنے پر مائل رہا کرتا تھا اور ان دنوں اس صحبت میں بھی ان کا دل ٹھکانے نہیں رہتا تھا، انھوں نے دیکھا کہ مجھے روز جھوٹ بولنا پڑتا ہے، اس لیے جھوٹ سے بچنے کی غرض سے گوشت کھانا چھوڑ دیا۔

انٹرنس پاس کرنے کے بعد گاندھی جی کے دوستوں نے صلاح دی تھی کہ اب تم ولایت جا کر بیرسٹری کا امتحان پاس کرو۔ وہ تیار ہو گئے، لیکن ان کی ماتا جی بہت خلاف تھیں، کیونکہ

وہ انگلستان کی بری صحبت کے حالات سے واقف تھیں اور وہاں جانا ایسا سمجھتی تھیں کہ گویا دوزخ میں رہنا ہے۔ لیکن گاندھی جی نے ضد کی اور ماں کو ماننا پڑا۔ ماں نے تین باتوں کی قسم لی تب اجازت دی۔ ایک یہ کہ شراب نہ پیوں گا۔ دوسرے یہ کہ گوشت نہ کھاؤں گا۔ تیسرے وہاں کی عورتوں سے بیزار ہوں گا۔ انگلستان جاکر انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ مگر وہاں پورے انگریز بن گئے انگریزی فیشن اختیار کیا اور انگریزی ناچ ناچنے لگے اور انگریزی باجے بجانے لگے اور انگریزی گیت گانے لگے۔ ایک دن ایک دعوت میں گوشت سامنے لایا گیا۔ اُس وقت ان کو تینوں قسمیں یاد آگئیں۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ نہیں کھایا۔ اسی دن سے انگریزی بہروپ چھوڑ دیا اور یہ کیچلی بدل ڈالی اور روحانیت میں غرق ہو گئے۔ دوستوں نے یہ صلاح دی کہ اگر روحانیت چاہتے ہو، تو مذہب عیسوی اختیار کرو لیکن بھگوت گیتا کے مطالعہ نے ان کو ثابت قدم رکھا اور ملک و قوم کی خدمت کے شوق میں امتحان بیرسٹری پاس کرکے ہندوستان واپس آئے اور بمبئی ہائی کورٹ میں نام داخل کرا کر وہیں وکالت کرنے کا ارادہ کیا۔

یہاں آکر وہ وقت شروع ہوتا ہے۔ جو نہایت آزمائش و امتحان کا زمانہ تھا یعنی وہ وقت جب سے آپ نے ملک و قوم کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کیں اور سخت تکلیفیں اٹھائیں جن کے باعث آپ کا نام تمام دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہو گیا۔ بمبئی میں آکر ماتاجی کے بیکنٹھ باس ہونے کی خبر وحشت اثر سنی۔ ماں کیا تھی فرشتہ تھی جس نے گاندھی کو مہاتما گاندھی بنا دیا۔ بمبئی میں وکالت کرتے تھے کہ ایک مقدمہ میں ٹرانسوال جانا پڑا۔ جس وقت نیٹال پہونچے اسی وقت سے تکلیفوں اور مصیبتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عدالت میں حاکم نے کہا کہ بیرسٹری کی پگڑی اتار ڈالو۔ جب ریل پر ٹرانسوال جا رہے تھے تو گارڈ نے اول درجہ کی گاڑی میں سے ان کا اسباب اتار کر پھینک دیا اور ریل چل دی۔ دوسری دفعہ گارڈ نے گاڑی پر سے اتار دیا اور جب انھوں نے اترنے سے انکار کیا، تو دو چار گھونسے رسید کیے۔ ایک مرتبہ پرٹیوریا (Pretoria) میں ایک سنتری نے انھیں ڈھکیل دیا اور یہ سڑک کے کنارے گر پڑے۔ جب مقدمہ ختم ہوا اور گاندھی جی ہندوستان کو واپس آنا چاہتے تھے، اس وقت معلوم ہوا کہ کوئی قانون پاس ہونے والا ہے۔ جس سے ہندوستانیوں کے تمام حق چھن جائیں گے۔

گاندھی جی نے اپنی واپسی موقوف کر دی اور کالونیل پارلیمنٹ میں درخواست دی کہ یہ قانون پاس نہ کیا جائے، مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی تب انگلستان کے وزیر خارجہ کو لکھا۔ وہاں سے بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ تب گاندھی جی نے ایک جماعت وہاں قائم کی کہ جو جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کی نگرانی کرتی رہے۔ وہاں کے ہندوستانی باشندوں نے کہا کہ آپ ہندوستان جانا موقوف کریں اور ہم آپ کی وکالت کا ذمہ لیتے ہیں۔ آپ کے قیام سے فائدہ ہوگا۔ تب گاندھی جی نے نیٹال (Natal) کے سپریم کورٹ میں اپنا نام داخل کرایا اور ہندوستان کی واپسی کا ارادہ موقوف کر دیا۔

۱۸۹۶ء میں گاندھی جی اس غرض سے ہندوستان واپس آئے کہ اپنی بیوی بچوں کو جنوبی افریقہ لے جائیں۔ اُس وقت اس ملک میں اُن کا استقبال وخیر مقدم ہر جگہ بڑی شان سے ہوا، کیونکہ جو خدمات انھوں نے ہم لوگوں کی افریقہ میں انجام دی تھیں، ان کی خبر اس ملک میں مشہور ہو چکی تھی۔ افریقہ سے چلتے وقت انھوں نے ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ اُن تمام شکایات کو بیان کیا تھا، جو ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ میں تھیں اور جو ظلم وستم ہم لوگوں پر وہاں ہوتے تھے ان کو خوب واضح طور پر دکھایا تھا۔ اخباروں نے رنگ آمیزی کر کے یہ خبریں افریقہ میں پہونچائیں کہ گاندھی جی ہندوستان میں اپنی اسپیچوں میں کہہ رہے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں اہل ہند کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا ہے کہ گویا یہ لوگ وحشی جانور ہیں۔ اس پر افریقہ کے سفید چمڑے والوں میں بہت ناراضی پھیل گئی اور گاندھی جی کو وہاں کے باشندے بہت سخت سست الفاظ میں یاد کرنے لگے۔ گاندھی جی کو پھر وہاں کے ہندوستانی باشندوں نے بلایا۔ جب گاندھی جی افریقہ روانہ ہوئے تو دو جہاز تھے، جن میں ہندوستانی مسافر چھ سو سے زیادہ تھے۔ یہ دونوں جہاز بندرگاہ ڈربن (Durban) پر قرنطینہ کی غرض سے روک دیے گئے۔ یہ ارادہ کر لیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو جہازوں سے اترنے نہ دینا چاہیے، بلکہ جہازوں کو ڈبو دینا چاہیے۔ ہزاروں سفید چمڑے والے جمع ہو گئے اور سمندر کے کنارے ہندوستانیوں کی طرف تحقیر کے نعرے لگانے لگے۔ گاندھی جی کو اطلاع دی گئی کہ اگر تم جہاز سے اترو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے، مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی۔ جب یہ لوگ جہاز سے اترے، تو وہاں کے باشندے

جو ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے بہت غل وشور مچانے لگے۔ وہاں سرکار کے اٹارنی جنرل نے منع کیا اور وعدہ کیا کہ گورنمنٹ تمہاری خواہشوں پر لحاظ کرے گی۔ تب مجمع ہٹا۔ راستہ میں گاندھی جی پر حملے ہوئے اور جس مکان میں پولیس نے ان کو چھپایا تھا، اس میں آگ لگا دینے کی دھمکی دی گئی۔ تب گاندھی جی پولیس کی وردی پہن کر پولیس اسٹیشن پر پناہ گیر ہوئے۔ غرضکہ اس طرح اس وقت بہ ہزار خرابی جان بچی۔

اکتوبر ۱۸۹۹ء میں برطانیہ اور ٹرانسوال میں جنگ چھڑ گئی۔ گاندھی جی نے سیکڑوں ہندوستانیوں کو اپنی کمان میں لیا اور والنٹیئر بننے کی درخواست کی کہ سلطنت برطانیہ کو مدد دیں۔ یہ درخواست نامنظور ہوئی۔ دوسری مرتبہ پھر درخواست دی۔ وہ بھی نامنظور ہوئی جب انگریزوں کو وہاں شکست ہونے لگی تب برطانیہ کی آنکھیں کھلیں اور گاندھی جی کی درخواست منظور ہوئی، کیونکہ برطانیہ کا مطلب تھا۔ تب ایک ہزار ہندوستانیوں نے ایمبولینس کی جماعت تیار کی اور گاندھی اس کے سردار بنے۔ اس جماعت نے زخمیوں کی بڑی خدمت کی اور ان کو اسپتال پہونچایا۔ افریقہ کے باشندوں نے بھی اس خدمت کو بہت پسند کیا۔ اُس وقت انگریزوں نے گاندھی جی سے کہا کہ Firing line میں سے زخمیوں کو اٹھا کر بیس میل پر پہونچاؤ تو یہ خدمت نہایت بیش قیمت ہوگی۔ اس پر تمام ہندوستانی والنٹیئر جن میں گاندھی جی شامل تھے فائرنگ لین (Firing line) میں کام کرنے لگے، جہاں ہر وقت گولیوں اور گراب کا مینہ برستا تھا۔ بہت سے ان میں سے مارے گئے۔ جب انگریزوں کی فتح ہوئی اور ملک ٹرانسوال انگریزی سلطنت میں شامل ہو گیا، تو گاندھی جی کو امید تھی کہ ہماری خدمتوں کی قدر ہوگی اور ہم لوگوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا، مگر نتیجہ اس کے برعکس ہوا۔ بور گورنمنٹ تو کوڑوں سے ہم لوگوں کی خبر لیتی تھی، مگر اتار پ نے بچھو کے ڈنک چلائے۔ ایسے ایسے قانون پاس ہوئے کہ ایشیا کے باشندے وہاں گھسنے نہ پائیں اور جتنے پہلے سے حقوق تھے وہ سب چھین لیے گئے۔ گاندھی جی ہندوستان واپس آ گئے تھے اور افریقہ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، مگر یہ حالت دیکھ کر وہ بھی ٹرانسوال واپس گئے اور وہاں پریٹوریا (Pretoria) کے سپریم کورٹ میں اپنا نام بیرسٹری میں داخل کرایا اور ایک اخبار

موسوم بہ Public Opinion جاری کیا جس میں بیس ہزار روپیہ کا ذاتی نقصان اُٹھانا پڑا، مگر وہ اخبار آخر میں بہت زوردار ہو گیا اور اُس نے ہندوستانیوں کی بڑی خدمت کی جو جنوبی افریقہ میں بیش قیمت خیال کی گئی۔

۱۹۰۴ء میں ملک ٹرانسوال میں طاعون بہت شدت سے پھیلا جن میں ان ہندوستانیوں کی، جو جونس برگ (Johns Burg) لکھتے، بہت موتیں ہوئیں۔ وہاں کی میونسپلٹی نے کچھ مدد نہیں دی۔ مگر گاندھی جی نے اپنے والنٹیروں سے مدد پہونچائی اور میونسپلٹی کو خبر دی۔ ایک دن اکیس ۲۱ ہندوستانی مرگئے اور ایک ہفتہ میں ایک سَو ہندوستانی طاعون کی نذر ہوئے۔ گاندھی جی نے بیماروں کو ایک علیحدہ جگہ پر پہونچایا اور وہاں بیماروں کو آرام سے رکھا اور ان کا علاج کرایا۔ اگر اس موقع پر گاندھی جی مدد نہ کرتے اور بہادری سے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالتے، تو ہزاروں آدمی طاعون کا شکار ہو گئے ہوتے۔

۱۹۰۶ء میں زولو قوم سے برطانیہ کی جنگ چھڑ گئی۔ گاندھی جی نے اس وقت بیس ۲۰ ہندوستانیوں کو اپنی کمان میں لے کر زخمیوں کو اسپتال پہونچایا اور ان کی مرہم پٹی کی۔ اس سچّی انسانی ہمدردی کی داد وہاں کے باشندوں نے قرار واقعی دی۔

۱۹۰۹ء میں نئی ٹرانسوال گورنمنٹ نے ایک قانون پاس کیا کہ سب ہندوستانی خواہ بچے ہوں یا جوان یا بوڑھے، مرد یا عورت اپنے نام نئے سرے سے درج رجسٹر کرائیں اور انگوٹھے کے نشان لگائیں۔ یہ برتاؤ وہاں کے مجرموں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ گویا ہم لوگوں میں اور وہاں کے مجرموں میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی اور سب ہندوستانیوں نے اُن کے کہنے پر عمل کیا۔ ایک وفد ولایت بھی بھیجا گیا اور ایک کمیٹی ولایت میں بنائی گئی۔ جس کے چیرمین لارڈ امپتھل ہوئے جو گورنر مدراس رہ چکے تھے۔ مگر یہ صرف ہمدردی تھی اور کچھ نہیں۔ گاندھی جی نے اس کی مخالفت میں Passive Resistance کی تحریک شروع کر دی، کہ چاہے قید جاؤ چاہے مرجاؤ مگر رجسٹری نہ کراؤ۔ اب سختی شروع ہوئی اور جیل خانے قیدیوں سے بھر دیے گئے اور گاندھی جی کو بھی دو ماہ قید بلا مشقت کی سزا دی گئی اور بچے اور عورتیں قید فرنگ میں ڈال دیے گئے۔ بچے ماں باپ سے الگ،

بیوی اپنے خاوند سے الگ قید میں رکھی گئی۔ جنرل اسمٹس General Smuts نے وعدہ کیا کہ اگر ہندوستانی اپنی خوشی سے اپنا نام درج رجسٹر کرائیں گے تو یہ قانون منسوخ کر دیا جائے گا۔ مگر افسوس کہ یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ گاندھی جی یہ سمجھ کر کہ یہ قانون مذکور منسوخ ہو جائے گا اور سب ہندوستانیوں کی مصیبتیں دور ہو جائیں گی، خود اپنا نام لکھانے کے واسطے تیار ہو گئے۔ ایک پٹھان نے جب یہ دیکھا کہ ہمارا پیشوا نامردی کر رہا ہے اور ہم کو دھوکا دیتا ہے تو راستے میں گاندھی جی کو ایسا مارا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگوں نے کہا کہ تم اس پر نالش کرو۔ گاندھی جی نے انکار کیا اور کہا کہ پٹھان نے جو کچھ کیا وہ اپنے نزدیک اچھا سمجھ کر کیا۔ جب اُس پٹھان کو اصلی حالات معلوم ہوئے، تو اُس نے بڑا افسوس کیا اور گاندھی جی کے پاؤں پر گر پڑا اور معافی چاہی۔ گاندھی جی نے اپنے مقتضائے طبیعت کے موافق اس کو معاف کر دیا۔

غرض کہ مسٹر گاندھی ٹرانسوال میں پندرہ برس Passive resistance کے پیشوا رہے۔ وہاں جو ہندوستانی تھے اُن میں پہلے نااتفاقی تھی اور آپس میں میل جول رکھنے کے بجائے الگ تھلگ رہتے تھے۔ گاندھی جی نے ان میں اتفاق و اتحاد قائم کیا اور خودداری اور خوشیاتن داری کا خیال پیدا کر دیا۔ جنوبی افریقہ میں جو تکلیفیں ان ہندوستانیوں کو تھیں اور جو وحشیانہ برتاؤ وہاں کی گورنمنٹ اور سفید چمڑے والوں کا ہم لوگوں سے تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے حکام نے نہ صرف زیورِ تہذیب کو اتار کر پھینک دیا تھا، بلکہ جامہ انسانیت کو بھی پارہ پارہ کر ڈالا تھا لیکن ہندوستانیوں نے جن میں ہندو مسلمان عیسائی پارسی سب شامل تھے، اپنے حقوق اور اپنی عزت و آبرو رکھنے کے لیے جو سخت مقابلہ کیا ہے اور جو جو ایثار اور قربانیاں کی ہیں، وہ ہمیشہ صفحاتِ تاریخ پر یادگار رہیں گی۔ ان سب ہندوستانیوں میں مہاتما گاندھی ایسے تھے جیسے فوج میں جنرل یا ستاروں میں چودھویں رات کا چاند۔

جب یورپ کی جنگ عظیم چھڑی اُس وقت مہاتما جی نے رنگروٹ بھرتی کرانے میں بہت بڑی مدد گورنمنٹ برطانیہ کو دی اور تمام ملک کو ہدایت کرتے رہے کہ برٹش گورنمنٹ

کو ہر طرح مدد دینا چاہیے۔ چنانچہ ان کے فرمانے کے مطابق تمام ہندوستان نے جان و مال سے سرکار کو مدد دی۔ حضور وائسرائے کی تقریروں اور وزیر اعظم برطانیہ کی اسپیچوں اور خود شہنشاہ معظم کی تقریروں میں اس امداد کا ذکر نہایت تعریف اور شکریہ کے ساتھ کیا گیا۔ جو ہندوستان نے جان و مال کی قربانی کر کے دی۔ بائیس لاکھ ہندوستانیوں نے اپنا خون پانی کی طرح بہا کر برطانیہ کے لیے فتح حاصل کی، لیکن جب مہاتما جی نے دیکھا کہ فتح کے بعد بھی ہندوستان کو مکمل آزادی حاصل نہیں ہو سکی بلکہ ڈومینین اسٹیٹس (یعنی درجۂ نوآبادیات) بھی نصیب نہیں ہوا اور ہم

ع۔ پھر آ گئے اسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

کا سراسر مصداق بن کر رہ گئے۔ تب مہاتما جی نے نہایت مایوس ہو کر ترک موالات (نان کوآپریشن) کی تحریک جاری کی، جس کا حال آپ سب کو معلوم ہے۔ ہماری گورنمنٹ عالیہ نے، جس کو ہم دنیا میں سب سے زیادہ عادل و منصف اور رعایا پرور سمجھتے ہیں، گاندھی جی کی بے بہا خدمات کا صلہ ان کو یہ دیا کہ قدیم پیشوایان دین و ملت کی طرح اُن کو قید خانوں میں رکھ کر اپنے جیل خانوں کی زیب و زینت اور قدر و منزلت بڑھائی۔ ہم کو چاہیے کہ گاندھی جی کی زندگی اور سوانح عمری سے سبق حاصل کریں۔ لہذا میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ کیا کیا سبق مہاتما جی کی سوانح عمری سے ہم کو سیکھنا چاہیے۔

۱۔ یہ کہ ماؤں کا اثر بچوں کی تربیت پر بہت کچھ ہوتا ہے، جیسا کہ گاندھی جی پر ہوا۔ ولایت میں، جہاں وہ بالکل انگریز بن گئے تھے، وہاں بھی جب ماں کی قسموں اور نصیحتوں کا خیال آیا۔ تو پھر سنبھل گئے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید احمد، امیر خسرو دہلوی اور سعدی شیرازی، یہ تینوں ایسے گذرے، جو اپنی ماؤں کو ہمیشہ بڑھاپے میں بھی یاد کرتے رہے اور ماؤں کی محبت و نصیحت کا نقش ان تینوں مشاہیر کے دلوں پر زندگی بھر سویدا کی طرح مرتسم رہا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کے دل صفا منزل پر ان کی مادر مہربان کی نصیحت اور محبت کا اثر اب تک منقش ہے۔

۲۔ یہ کہ اگر بُری صحبت میں انسان پڑ جائے، تو پھر بھی سنبھل سکتا ہے، بشرطیکہ غور کرنے کی عادت رکھتا ہو اور اپنی اصلاح اُس کو مثل گاندھی جی کے منظور ہو۔ ایک صوفی کے دو برہ

کسی نے ایک مردِ صالح کی تعریف کی اور یہ کہا کہ وہ شخص کبھی بے راہ نہیں چلا۔ صوفی نے کیا اچھا جواب دیا۔ اس نے کہا، "کاش کردے وگذشتے" اس کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ اچھا یہ ہوتا کہ اس کو کچھ لغزش ہوئی ہوتی اور اس کے بعد سنبھل گیا ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ برائی سے واقف ہو کر اور پھر اس کا برا نتیجہ اٹھا کر انسان اگر راہِ راست پر آ جائے، تو وہ زیادہ تجربہ کار اور مستقل مزاج سمجھا جائے گا، بمقابلہ اس شخص کے جس کو برائی کے جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔

۳۔ یہ کہ تکلیف اور مصیبت میں پڑ کر کس طرح صبر و تحمل کیا جاتا ہے اور خویشتن داری اور آزادپسندی قائم رکھی جاتی ہے۔ گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں جو سختیاں اٹھائی ہیں اور جس صبر و تحمل سے ان کو برداشت کیا ہے، وہ انہی کا کام تھا۔ جنوبی افریقہ وہ مقام ہے جہاں دن میں آگ برستی ہے اور زمین بھاڑ کی طرح بھننے لگتی ہے اور رات کو ایسی سردی پڑتی ہے کہ برف گرنے لگتی ہے۔

جیل خانہ میں دن میں مہاتما جی دھوپ میں اور رات کو کھلے میدان میں رکھے جاتے تھے۔ اسی طرح دیکھیے، ہندوستان میں مہاتما جی نے ترکِ موالات کی تحریک میں مسلمانوں کو خلافت کے معاملہ میں مدد دینے میں اور سوراج حاصل کرنے کے واسطے ہندوؤں اور مسلمانوں کی خدمت کرنے میں کس قدر جبر و ظلم کیسے صبر و تحمل سے برداشت کیے ہیں۔

۴۔ ماں کی فرماں برداری اور راست گفتاری اور اپنے قول کی پابندی ولایت میں رہ کر اس قدر استحکام اور پامردی سے کی جو ادروں کے لیے سخت مشکل کام تھا۔ جو تین قول انھوں نے اپنی ماں کو دیے تھے، ان تینوں کو آخر وقت تک نباہا، حالانکہ ان کی ماں وہاں پر یہ دیکھنے کو موجود نہ تھیں کہ یہ اپنے قول پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔ اس سے کس قدر ماں کی اطاعت اور صداقتِ قول کا ثبوت ملتا ہے۔

۵۔ سچ بولنے میں بیباکی اور سچوئی، چاہے جس قدر سچائی میں تکلیف ہو اور چاہے کوئی برا کہے۔ جنوبی افریقہ میں سچ بولنے میں اور سچ کی پیچ کرنے میں عالمِ مسافرت میں بیحد و بے شمار تکلیفیں انھوں نے اٹھائیں۔ سعدی کی طرح ان کا بھی قول تھا بلکہ قول پر عمل تھا۔

گر راست سخن باشی و در بند بمانی   بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

۶- یہ کہ اگر ماں باپ اولاد سے قسم لیا کریں (اور خصوصاً عبادت گاہوں میں اگر قسم لیا کریں) تو اولاد یقیناً وہ قسم یاد رکھے اور اُس پر عمل بھی کرے، جیسے کہ گاندھی جی نے کیا۔ تاریخ میں لکھا ہے Hannibal carthaginian general (ہنی بال کارتھجینین جنرل) جبکہ بارہ برس کا تھا اس کا باپ اس کو عبادت گاہ میں لے گیا۔ اور اُس سے کہا کہ قسم کھاؤ کہ جب تک زندہ رہو گے رومیوں سے برابر لڑتے رہو گے یہاں تک کہ یا خود مٹ جاؤ یا اُن کو مٹا دو۔ ہنی بال نے وہ قسم مرتے دم تک قائم رکھی اور عمر بھر رومیوں سے لڑتا رہا اور اُن کو سخت سے سخت شکستیں دیتا رہا۔ آخر میں مغلوب ہوا اور اپنے آپ کو ہلاک کر لیا، تاکہ رومیوں کے ہاتھ میں زندہ گرفتار نہ ہو جائے۔

۷- قوم و ملک کا عاشق زار ہونا اور اس کو آزادی دلانے میں انتہا درجہ کا ایثار اور قربانی کرنا۔ یہ ساتواں سبق ہے جو گاندھی جی کے سوانح عمری پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی ہندوستانیوں کی خاطر اپنی وکالت چھوڑ دی۔ جنوبی افریقہ جا کر بسے کہ اپنے ملکی بھائیوں کے حقوق بڑھوائیں۔ وہاں کی تمام تر ذلتیں اٹھائیں اور بے حد و بے شمار جبر و ظلم سہے اور یہاں ہندوستان میں سوراج اور خلافت کی خاطر بے انتہا تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں، جو اخباروں کے ذریعہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہیں، کیونکہ یہ سب کچھ آج گذر رہا ہے۔

۸- منکسر مزاجی۔ جس کو انگریزی میں Modesty کہتے ہیں۔ ہمارے مہاتما جی تین تین ہفتے کے برت رکھتے ہیں۔ جب انھوں نے ہندوؤں مسلمانوں میں جھگڑے، فساد دیکھے، یا جب کبھی ہم لوگوں سے بڑی خطائیں اور گناہ سرزد ہوئے، تو ہمارے قصوروں اور خطاؤں کا کفارہ اُنھوں نے حضرت عیسیٰ کی طرح ادا کیا۔ جس طرح منصورؔ انا الحق کہتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے، اُسی طرح مہاتما جی بھی ہم لوگوں کے فائدوں کی خاطر ہمیشہ پھانسی پر چڑھنے کے لیے تیار رہے اور تکلیفیں تو ہمیشہ ہی اٹھاتے رہے۔ ان کا قول یہی رہا۔

دیر ست کہ آوازہ منصور کہن شد   من بار دگر جلوہ دہم دار و رسن را

۹۔ حال میں اُن کی زندگی سے ہم کو دو سبق اور بھی ایسے ملے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ ایک کھدر اور دوسرا چرخہ کا رواج۔ اگر ان دونوں چیزوں کا ذکر اس ملک میں کسی اور نے کیا ہوتا تو یقیناً ہنسا جاتا اور لوگ اس کو دیوانہ کہتے۔ لیکن انھوں نے کھدر اور چرخہ کے فائدوں پر تقریریں کیں اور لکچر دیے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے خود کھدر پہنا اور چرخہ چلایا اور ان کے خاص خاص پیرودں نے ان دونوں چیزوں کا استعمال کیا تو ہندوستان میں اس کا عام رواج ہو گیا اور ستر برس پہلے سے جو چرخہ چھوٹا ہوا ہے، وہ پھر نئی شان اور نئی مقبولیت کے ساتھ رواج پا گیا۔ مسلمانوں نے چرخہ اس بنا پر قبول کیا کہ ان کے رسولؐ مقبول کی چہیتی بیٹی بی بی فاطمۃ الزہرا کے گھر جہاں اور گرہستی کی چیزیں تھیں وہاں چرخہ بھی تھا جس کو وہ چلایا کرتی تھیں۔ ہندوؤں نے اس پر مہر تصدیق اس بنا پر لگائی کہ ستر برس پہلے ان کے گھروں میں گرہستی کی چیزوں میں سے جو ایک چیز نہایت مفید اور بکار آمد تھی لیکن حکومت انگریزی میں لوگ اُس کو بھول گئے تھے، وہ نئے سرے سے گھروں میں زیب و زینت کا باعث ہوئی۔ عورتوں نے اس کو یوں قبول کیا کہ جہاں گرہستی کے بیسیوں دھندے ہیں وہاں چرخہ چلانا بھی ایک نہایت ضروری دھندا ہے، جس کے ذریعہ سودیشی کپڑے ہر قسم کے اور کھدر خاص طور پر تیار ہوا کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ مردوں نے بھی نہایت شوق سے چرخہ چلانا اختیار کیا ہے۔ اگر بغیر گاندھی جی کی ہدایت کے کسی مرد نے چرخہ چلایا ہوتا، تو یقیناً وہ ہم لوگوں میں مجنون سمجھا گیا ہوتا۔ اب چرخہ چلانا کفایت شعاری، دور اندیشی، ملک و قوم کی خدمت اور سوراج دلانے کا ایک زبردست آلہ سمجھا جاتا ہے۔

۱۰۔ دسواں یا آخری سبق جو ہم کو حاصل ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز چیز ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مہاتما جی کا خاص ایجاد نہ صرف بلحاظ مفہوم بلکہ بلحاظ بندش الفاظ کے بھی ہے یعنی Non violence Non co-opration جس کا ترجمہ یہ ہے "بلا تشدد ترک موالات" ہندی میں اس کو اسہیوگ کہتے ہیں۔ آج تک کہیں دنیا کے پردہ پر اس قسم کا ترک موالات نہ کسی

رعایا نے کسی بادشاہ کے ساتھ کیا ہے نہ کوئی جماعت کسی گروہ کے ساتھ عمل میں لائی ہے۔ ہوا کبھی ہے تو تشدّد کے ساتھ ہوا ہے۔ مہاتماجی کے ترک موالات کا منشا یہ ہے کہ تشدّد، نہ خیال کے ذریعہ ہو نہ زبان کے وسیلہ اور نہ عمل سے۔ پھر یہ کہ انگریزوں کی ذات کے ساتھ ترک موالات نہ ہو، بلکہ حکومت انگلشیہ کے ساتھ عدم تعاون عمل میں لایا جائے۔ یعنی فی المثل کوئی انگریز حالت علالت میں یا کسی دوسری وجہ سے ہماری مدد کا محتاج ہو، تو فوراً وہ مدد اس کو پہونچائی جائے، بلکہ اُس کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کی جائے۔ واہ اس ترک موالات میں بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا فیاض طبعی اور صلح جوئی دکھائی ہے جس کی تعریف نہیں ہوسکتی! گوتم بودھ صلح کے شہزادے تھے، لیکن ان کے بعد اس دنیا میں صلح کے شہزادے بے نظیر و عدیل، یہ سمجھتے جاتے ہیں۔

سوامی پورنانند جی کا تعارف
اور اُن کے پاٹ شالہ کے حالات

۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کو سوامی پورنانند بنارس سے اس غرض سے تشریف لائے کہ رام کرشن سیتا پتری پاٹ شالہ کے سالانہ جلسہ میں شریک ہوں۔ ایک بہت بڑا جلسہ عام بمقام سرستی بھون زیر صدارت مشران صاحب اس غرض سے کیا گیا تھا کہ سوامی جی موصوف کو یہاں کی پبلک سے روشناس کیا جائے اور اس پاٹ شالہ کے حالات جزئی و کلی بیان کیے جائیں، تاکہ فرخ آباد کی پبلک سب حالات سے واقف ہو جائے۔ مشران صاحب نے اس موقع پر حسب ذیل تقریر کی۔

بھائیو اور بہنو۔ اس وقت مجھے بڑی خوشی کا کام سپرد ہوا ہے جو میرے لئے سرمایہ نازش ہے کہ سوامی پورنانند جی مہاراج رئیس بنارس کو، جو اس جلسہ میں ہماری خوش قسمتی سے رونق افروز ہیں، آپ سب صاحبوں سے روشناس کردوں اور رام کرشن سیتا پتری پاٹ شالہ کے حالات جزئی و کلی بیان کر کے یہاں کی پبلک کو آگاہ کردوں۔ ہمارے سوامی جی بڑے عالم فاضل سنیاسی ہیں، جنھوں نے تعلیم و تربیت اور دھرم شکشا (تعلیم مذہبی) کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اور یہاں اس مقصد سے تشریف لائے ہیں کہ رام کرشن سیتا پتری پاٹ شالہ کے سالانہ جلسہ میں، جو اس وقت ہو رہا ہے شریک ہوں اور دھرم پر آپ کو اپدیش دیں (یعنی وعظ فرمائیں)۔ آپ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں اور اپنے علم و فضل، تعلیمی خدمات اور دھرم اپدیش کے باعث بنارس میں اُسی قدر معروف و مشہور ہیں، جس قدر بنارس بجائے خود معروف و مشہور ہے۔ بنارس ایسا مقام ہے، جو فقط ہندوؤں ہی کے نزدیک متبرک نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کو بھی اُس سے لگاؤ ہے۔ شیخ علی حزیں، جو ایرانی شعراء کے طبقہ متاخرین میں بہت نامی گرامی شاعر گذرا ہے، اُس نے بنارس کو اپنا وطن مالوف قرار دیا تھا۔ اُس کا قول تھا ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است ایں جا

یعنی میں بنارس نہ چھوڑوں گا کیونکہ عام ہندوؤں کی عبادت گاہ اور تیرتھ جاترا کا مقام ہے

جہاں ہر برہمن کا لڑکا رام و لچھمن کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارے سوامی جی مہاراج اسی مقدس شہر کے رئیس ہیں۔

ہمارے سوامی جی نے بمقام مئو ضلع اعظم گڑھ ایک پاٹ شالہ قائم کیا ہے، جو اس وقت نہایت خوبی سے آپ کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ اضلاع مشرقی میں اکثر مقامات میں آپ بہ نفس نفیس تعلیمی کاموں میں مصروف و مشغول رہا کرتے ہیں۔ ہم سب اہل شہر آپ کے درشنوں کے آرزومند تھے۔ شکر ہے، ہماری تمنائیں آج پوری ہوئیں اور آپ کی زیارت سے بڑا شرف حاصل ہوا، بلکہ سعادت دارین حاصل ہوئی۔ ہمارے شہر میں ایک رسم ہے کہ جہاں لوگوں کو معلوم ہوا کہ گنگا کنارے اتنی مورتیاں آئی ہوئی ہیں، ان کو وہ اپنے گھر لے آتے ہیں اور ان کو بھوجن کراتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ وہ بے پڑھے سادھو ہیں یا عالم و فاضل سنیاسی۔ کاش ہمارے یہاں کے رئیس ایسے بزرگوں کی خدمت کریں جیسے ہمارے سوامی جی مہاراج ہیں، تو حقیقت میں دھرم کی اونتی (یعنی ترقی) ہو اور جو لوگ آپ کی خدمت کا فیض حاصل کریں ان کی دنیا اور عاقبت دونوں بخیر ہوں۔ آپ ایسے مہاتما ہیں کہ اگر آپ کے قدموں پر ہم روپیہ نچھاور کریں، تو ہم کو حق پہونچتا ہے، تاکہ سوامی جی وہ روپیہ تعلیم گاہوں پر خرچ کر کے ہزاروں طلبہ کو فوائد کثیر پہونچائیں اور طلبہ کی دنیا و آخرت دونوں بخیر گذریں۔ لیکن ہم تو ان فقیروں کو دان دیتے ہیں، جو گداگری پیشہ ہیں اور سوائے اپنے ذاتی فائدہ کے ہم سے یا ہمارے بچوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے ہیں۔

صاحبو۔ مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے، جو حسب موقع ہے اور اس کو سن کر آپ خوش ہونگے۔ ایک بادشاہ بے سوچے سمجھے فقیروں کو خیرات دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے غلام کو اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی دی اور کہا کہ یہ اشرفیاں زاہدوں کو تقسیم کر آ۔ غلام بڑا زیرک تھا۔ شام تک ادھر ادھر پھرتا رہا۔ رات کو وہ تھیلی بادشاہ کے سامنے رکھ دی کہ کوئی زاہد نہیں ملا جس کو میں یہ دیتا۔ بادشاہ نے کہا کہ میری دارالسلطنت میں کم سے کم چار سو زاہد رہتے ہیں۔ غلام بولا کہ حضور! جو زاہد ہیں وہ تو لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں ہیں۔ بادشاہ ہنسا اور کہنے لگا کہ زاہدوں کے حق میں جس قدر مجھے عقیدت ہے، اسی قدر اس کمبخت کو ان سے نفرت ہے، لیکن کہتا سچ ہے۔ وزیر دانا و فرزانہ پاس حاضر تھا۔ عرض کرنے لگا کہ حضور عالموں فاضلوں کو روپیے اور وظیفے دیجیے

تاکہ وہ فراغت سے تعلیم دینی و دنیوی میں مصروف رہیں۔ لیکن زاہدوں اور عابدوں کو کچھ نہ دیجیے تاکہ وہ اپنی پرہیزگاری اور عبادت پر قائم رہیں۔ ہمارے شہر کے رئیسوں اور خیرات کرنے والوں کو اس مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

رام کرشن اور سیتا پتری پاٹ شالہ کی وجہ تسمیہ

رام کرشن پرم ہنس ایک بڑے نامور پیشوائے مذہب بنگالہ میں گذرے ہیں۔ جن کا مشن شمالی ہندوستان اور اضلاع مشرق میں بہت کامیابی سے قائم ہے۔ بنارس، الموڑہ، الہ آباد، کنکھل اور اضلاع بنگالہ میں جا بجا شفاخانے اس مشن کے قائم ہیں۔ اس پاٹ شالہ کا ایک حصہ یعنی لڑکوں کا مدرسہ انہی رام کرشن کے نام نامی سے منسوب ہے اور لڑکیوں کا مدرسہ سری سیتا مہارانی کے اسم گرامی کے ساتھ الحاق رکھتا ہے ؎

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

حال کی بارش سخت سے، جو طوفان حضرت نوحؑ کا نمونہ تھی، بنگال کے بعض اضلاع میں بڑا سیلاب آیا اور لوگوں پر جو مصیبت گذری وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ لیکن رام کرشن مشن نے مصیبت زدہ لوگوں کی دستگیری کی یہ فیاضانہ امداد قابل یادگار سمجھی جائے گی۔

پاٹ شالہ کا افتتاح اور منیجر صاحب کا مختصر حال

اس پاٹ شالہ کا افتتاح بہ ساعت سعید ۸ رنومبر ۱۹۲۱ء کو ہوا۔ اس کے منیجر پنڈت راج کشن صاحب وانچو بی، اے ہیں، جو محکمہ آبکاری میں ۱۴ برس انسپکٹر رہے۔ جب سے پنڈت صاحب موصوف نے ملازمت ترک کی، اُس وقت سے تعلیم و تربیت کا مفید کام آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور اُس کو نہایت خوبی و جانفشانی اور ایثار سے انجام دے رہے ہیں۔ علاحدہ علاحدہ کمروں میں اس درس گاہ کے دو صیغے ہیں۔ ایک لڑکوں کا اور دوسرا لڑکیوں کا۔ اس پاٹ شالہ میں ذات پات اور قوم کا کوئی فرق سر مو نہیں ہے۔ نہ کوئی فیس اب تک لگائی گئی ہے خرچ کے

کفیل خود پنڈت صاحب ہیں۔ ہندوؤں کے لئے پوجا اور راماین کا پاٹھ روزانہ لازمی ہے منیجر صاحب اور اُن کی دھرم پتنی دونوں اس مبارک کام کو بڑے شوق اور محنت سے کر رہے ہیں اور ہماری تعریف، شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ایک برس سے اس تعلیم گاہ کا پورا خرچ پنڈت صاحب کی ذات والاصفات سے متعلق ہے اور جو جو مشکلات اس وقت تک سال بھر میں پیش آئیں، اُن پر پنڈت صاحب غالب آئے۔ ہمارے بچوں، یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کو اس طرح پڑھاتے لکھاتے ہیں، گویا وہ سب انہی کے پیارے بچے ہیں۔ اس پاٹ شالہ میں اُردو، ہندی، انگریزی سنسکرت پڑھائی جاتی ہے اور گورنمنٹ کے سررشتہ تعلیم کے قواعد کے بموجب تعلیم دی جاتی ہے اس مدرسہ میں چند اعلیٰ خاندانوں اور رئیسوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں، جو ویش، کھتری اور برہمن خاندان ہیں۔

صاحبان ذی شان اس پاٹ شالہ کی عمدہ تعلیم و تربیت نے میونسپلٹی کو متوجہ کیا ہے۔ اکثر میونسپل بورڈ کے ممبروں میں یہ چرچا ہوا کرتا ہے کہ فلاں مدرسہ میں (یعنی اس پاٹ شالہ میں) تعلیمی طریقے قابل نمونہ ہیں اور اسی طرح ہماری میونسپلٹی کے مدارس میں بھی تعلیم و تربیت ہونا چاہیے۔ اسی طرح سرکاری افسران نے (مثلاً لیڈی انسپکٹروں نے، جو ضلع اور صوبہ سے تعلق رکھتی ہیں اور پنڈت شرغا صاحب نے جو ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہیں) چند مرتبہ اس پاٹ شالہ کے معائنے کیے اور مدرسہ کی عمدہ تعلیم اور منیجر صاحب کی توجہ اور قابلیت اور ایثار اور طلبہ کی تعداد میں دن بدن ترقی دیکھ کر نہایت اطمینان ظاہر فرمایا ہے اور بہت مداح و ثنا خواں ہیں اور دوسری تعلیم گاہوں پر اس پاٹ شالہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح سرکاری افسروں کی طرف سے تحریک ہو رہی ہے کہ اس پاٹ شالہ کا الحاق سررشتہ تعلیم سرکاری سے کرانا چاہیے اور گورنمنٹ سے امداد لینا چاہیے لیکن منیجر صاحب نے ابھی تک کوئی درخواست دربارہ الحاق (Recognition) بدیں وجہ نہیں دی ہے کہ پہلے مدرسہ کی بنیاد مضبوط کر لینا چاہیے۔ اسی طرح پونا میں، جو عورتوں کی یونیورسٹی ہے، وہاں سے یہ خبر آئی ہے کہ ہم تمہارے پاٹ شالہ کا الحاق، یعنی Affiliation اپنی یونیورسٹی سے کرنے کو تیار ہیں۔ غرضکہ پاٹ شالہ نے اپنے آپ کو بہی حالت میں کر لیا ہے اور اُس کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم اور دھرم شکشا کی ایسی شہرت ہو گئی ہے کہ ضلع کے باہر جہاں جہاں اس کی خبر پہونچی ہے وہاں سے ہمدردی کی تحریریں آ رہی ہیں، جو دل

بڑھانے والی ہیں۔

صاحبو! ہر ملک و قوم میں مدرسوں اور معلموں نے تہذیب و شائستگی پھیلانے میں کافی حصہ لیا ہے اور طلبہ کو تعلیم و تربیت دے کر انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر پہونچایا ہے۔ گویا تعلیم گاہ کو، انھوں نے قومی و ملکی ترقیوں کی کارگاہ بنا دیا ہے۔ جہاں مادرِ وطن کے ہونہار فرزند ارجمند تہذیب اخلاق اور فرائض انسانی سیکھ کر قوم و ملک کی امید گاہ بن جاتے ہیں۔ سعدی شیرازی نے مدرس کو زاہد و عابد پر ترجیح دی ہے۔ جس سے اُس کی مراد یہ ہے کہ ایک زاہد یا عابد خدا شناس سے خلق اللہ کو اُس قدر فائدے نہیں پہونچتے جس قدر مدرس عالم سے۔ وہ کہتا ہے ؎

صاحب دلے بہ مدرسہ آمد ز خانقاہ — بشکست عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میانِ عابد و عالم چہ فرق بود — تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را
گفت او گلیم خویش بدر می برد ز موج — ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

حضرات! حقیقت میں مشائخ اور عابد اپنا ذاتی فائدہ چاہتے ہیں اور اپنی عاقبت بخیر کرنے کی فکر میں مستغرق رہا کرتے ہیں، لیکن علما اور مدرسین ڈوبتوں کو بچاتے ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے کہ جو قوم کی نبض شناس ہے جس نے تعلیم و تربیت کے نسخے پلا پلا کر لاکھوں آدمیوں کی اخلاقی صحت درست کر دی اور طلبہ کے آداب و اخلاق درست کر کے اُن کی تمام زندگی گویا سانچہ میں ڈھال دی۔

رام کرشن اور سیتا پتری پاٹ شالہ کیا چاہتا ہے

صاحبانِ عالیشان۔ رام کرشن اور سیتا پتری پاٹ شالہ یہ بات چاہتا ہے کہ ملکی اور قومی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر بچوں کو مذہب و اخلاق کی تعلیم دی جائے، تاکہ ہمارے ہونہار بچے مادرِ ہند کے سچے فرزند کہلائیں اور اُسی طرح مذہب میں پکے اور قول و فعل کے سچے نکلیں جیسے قدیم آریہ اُن کے بزرگ ہوا کرتے تھے۔ وہ یہ بات چاہتا ہے کہ **National lines** یعنی قومی اصول پر تعلیمی مذہبی اور اخلاقی دی جائے کہ ہماری اولاد کے دلوں میں قوم و ملک کی محبت سویدا کی طرح نقش ہو جائے اور وہ قدیم رشیوں، منیوں اور مرتاضوں کی سچی اولاد کہلائیں

جنھوں نے مذہب و اخلاق، حکمت و فلسفہ، نجوم، ریاضیات اور موسیقی وغیرہ میں تمام دنیا میں اول درجہ کی شہرت حاصل کی تھی۔ اور جگت استاد کہلاتے تھے۔ پاٹ شالہ اور اس کے منیجر کا یہ مقصد ہے کہ اولاد کو ایسی تعلیم و تربیت دی جائے کہ وہ اپنے ماں باپ اور گرو کے فرمانبردار بچے اور شاگرد کہلائیں۔ اور جبکہ وہ ایک طرف انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون سے بہرہ کافی حاصل کریں تو دوسری طرف سنسکرت کی تعلیم کے ذریعہ materialism یعنی مادیات کے زہریلے اثر سے محفوظ رہیں اور ان کے روحانی جذبات کو اس قدر برانگیختہ کیا جائے کہ وہ مادیات کی طرف اعتدال سے زیادہ میلان طبع نہ بڑھا سکیں اور رام کرشن اور سیتا ستری پاٹ شالہ کے ودیارتھی (طالب علم) کہلانے کے قابل ہو سکیں۔ منیجر صاحب کی طرز تعلیم میں ایک خاص بات دیکھی گئی ہے کہ شاگردوں کو اس محنت و مشقت سے پڑھاتے ہیں کہ شاگرد نوشت و خواند میں اس قدر محو و منہمک ہو جاتے ہیں جیسے کھیل کود میں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ چھٹی کا دن جب آتا ہے تو شاگرد لڑکے لڑکیاں سب بے بلائے پاٹ شالہ میں چلے آتے ہیں۔ میں نے بہت حیرت سے یہ واقعہ دیکھا ہے کہ بسنت کے دن جبکہ بچے، جوان اور بوڑھے پتنگوں کے پیچھے دیوانے ہو جاتے ہیں، اس پاٹ شالہ کے طالب علم ہنستے کھیلتے پاٹ شالہ میں چلے آ رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو بمقابلہ لہو و لعب کے منیجر صاحب اور ان کی بیوی کے پاس بیٹھنے اٹھنے اور تھوڑا ہی سا پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ شاعر فارسی نے جو کہا ہے وہ اس پاٹ شالہ نے صحیح واقعہ کر کے دکھا دیا ؎

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے،
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

یہ ہنر ہمارے منیجر صاحب میں خاص طور پر ہے اور میرے نزدیک یہ ہنر آپ کی ذات والا صفات پر ختم ہو گیا ہے۔

صاحبو۔ جب ایک پردیسی نے یہاں آ کر ایسا عمدہ کام کیا ہے اور اپنا روپیہ اور بیش بہا وقت ہمارے بچوں کے پڑھانے لکھانے میں صرف کیا ہے، تو ہم کو بھی اپنا فرض انجام دینا چاہیے۔ یعنی اس کی پوری قدر دانی کرنا چاہیے۔ ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس قسم کا مدرسہ خصوصاً

لڑکیوں کے پڑھانے کا قائم کیا گیا ہے، وہ ایسا ہے کہ جس کی نظیر اس شہر بلکہ اس ضلع میں نہیں ہے گو یہاں میونسپلٹی اسکول ہیں، جو لڑکیوں کے پڑھانے کے لئے مخصوص ہیں، لیکن ان کی حالت سے ہم لوگ واقف ہیں، جو نہایت افسوس ناک بلکہ شرم ناک ہے۔ عیسائی مدرسوں کو دیکھنا چاہیے، جن کو ہندو مسلمان ویسے ہی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ حال میں ایک واقعہ گذرا جس سے ہم لوگ اور بھی چونک گئے۔ اب ہم ہر ذات اور ہر قسم کے شریف آدمی اپنی لڑکیاں یہاں سیتا پتری پاٹ شالہ میں بھیجیں، کوئی حرج نہیں ہے چونکہ ہم سب کو پاٹ شالہ کا کافی تجربہ ہو گیا ہے، لہذا بے تامل ہم کو اپنے بچوں کو، خصوصاً لڑکیوں کو داخل کرانا چاہیے۔ اس کے پروگرام میں خاص بات اس وقت یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے ڈپارٹمنٹ الگ الگ کیے جائیں اور اس کے عمل میں لانے کے واسطے استادوں کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم مالی امداد پاٹ شالہ کو پہونچائیں۔ اس وقت تک کوئی فیس نہیں لگائی گئی ہے۔ یہی قدیم طریقہ ہمارے ملک کا تھا کہ پاٹ شالوں میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی اور تعلیم و تربیت مفت دی جاتی تھی، لیکن اب وہ وقت نہیں رہا۔ یہ کیا تھوڑا ہے کہ سال بھر سے زائد بغیر فیس کے منیجر صاحب نے مدرسہ چلایا اور اس کے خرچ برداشت کیے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لیں اور مالی امداد کافی پہونچا کر اس پاٹ شالہ کو قائم اور برقرار رکھیں۔

تعجب ہے کہ ہمارے ضلع کے ڈسٹرکٹ بورڈ اور شہر کے میونسپل بورڈ نے اس پاٹ شالہ کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دونوں بورڈوں کے ممبروں نے اس کی شہرت تو ضرور سنی ہوگی، لیکن کوئی تحریری رپورٹ مطبوعہ اس مدرسہ کے حالات کی اُن کے پاس نہیں بھیجی گئی ہے، نہ اُن سے کوئی درخواست استمداد کی گئی ہے۔ ہم منیجر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ ایک رپورٹ مطبوعہ جس میں سرکاری افسروں کے معائنے درج ہوں، مع درخواست استمداد دونوں بورڈوں کو جلد بھیجدیں۔ پھر ہم لوگوں کا فرض ہوگا کہ ممبروں سے تحریک کریں تاکہ اس تعلیم گاہ کو وہ فیاضانہ امداد دے کر اس نونہال کی آبیاری کریں اور اُن کے سایۂ عاطفت میں یہ درسگاہ نشو و نما پاکر بارآور ہو۔ ہماری رائے میں اس ضلع اور شہر میں کوئی دوسری تعلیم گاہ بورڈوں کی فیاضانہ امداد کی، اس قدر مستحق نہیں ہے جس قدر کہ یہ پاٹ شالہ۔

ہمارے ملک میں عمدہ ترین خیرات ودّیا دان ہے یعنی تعلیم گاہ کا قائم کرنا، اس کو امداد پہونچانا اور اس کو اس کے برقرار رکھنا، بعد بھوکوں کو کھلانے کا نمبر ہے۔ پس اس ودّیا دان کا موقع اس سے بہتر کیا آئے گا، جو آپ کے سامنے اس وقت موجود ہے۔ فقط آپ کی توجہ کی دیر ہے۔ ع۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

آخر میں ہماری دعا یہ ہے کہ اے پاک پروردگار! تو رام، کرشن اور سیتا جی کے صدقے میں، جن کے مقدس ناموں سے یہ درس گاہ منسوب ہے، اس پاٹ شالہ کو چشم زخم زمانہ سے محفوظ و مصئون رکھ کر ترقی گوناگون اور فروغ روز افزوں عطا فرما! ع

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

پنڈت راج کرشن زندہ باد   رام کرشن سیتا پتری پاٹ شالہ پائندہ باد

ایک کتب خانے کی

امدادی رقم میں اضافہ کی تحریک

ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں مشران صاحب نے میونسپل بورڈ کے جلسے میں تحریک کی کہ پبلک لائبریری فرخ آباد کی سالانہ امداد میں چار سو روپیہ کا اضافہ کیا جائے چنانچہ ان کی درخواست منظور ہوئی اور مبلغ چار سو روپیہ کا اضافہ عطیہ میونسپل بورڈ میں ہو گیا۔ موصوف نے اپنی تحریک پیش کرنے کے وقت حسب ذیل تقریر فرمائی:-

میر مجلس اور حضرات انجمن!

میرا فرض ہے کہ میں پہلے بورڈ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ صاحبوں نے مجھے حاضری کا موقع دے کر میری عزت افزائی کی ہے اور دوسرے اس بات کی سپاسگذاری مجھے کرنا چاہیے کہ بورڈ نے چھبیس ۲۶ برس سے لائبریری کو مالی امداد عطا کی اور باوجود اس امداد کے انتظامی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کر کے اُس کی آزادی اور خوشتین داری کو قائم رکھا۔ آپ صاحبوں پر واضح ہو کہ مجھے یہ عزت حاصل ہے کہ میں اس لائبریری کی بنیاد ڈالنے میں شریک ہوں اور ۲۲ برس سکریٹری کی حیثیت سے اُس کی خدمت کرتا رہا ہوں اور اُس کا لائف ممبر ہوں، گویا اُس کی خدمت کرتے کرتے جوان سے بوڑھا ہو گیا ہوں اور اب اگرچہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا مگر باایں ہمہ، دوستوں نے ازراہ عنایت مجھے اس کا سینیئر وائس پریسیڈنٹ مقرر کر رکھا ہے۔ اس عرض سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ اپنی خدمتوں کا اظہار کروں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ میں اپنے دائمی تعلقات اور خدمات کے باعث اس لائبریری کی اندرونی حالت سے اور اُس کے منشا و مقصد سے بخوبی واقف ہوں اور جو کچھ عرض کروں گا وہ واقف کار کی حیثیت سے عرض کروں گا۔

لائبریری کی طرف سے جو درخواست، میونسپلٹی کی امدادی رقم میں چار سو روپیہ سالانہ اضافہ ہو جانے کے لیے آئی ہے، اُس کی تائید میں مجھے صرف دو باتیں دکھانا مقصود ہیں۔ ایک تو، یہ کہ

جو کچھ ہم مانگتے ہیں اُس کا حق بھی رکھتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ہم کس غرض اور مقصد کے واسطے اضافہ چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ لائبریری ۲۶ برس سے اپنے بل بوتے پر بکار آمدگی کے ساتھ قائم ہے، اس میں زندہ رہنے کی طاقت ہے، جمہور کی ہر جماعت اور ہر گروہ کی خدمت کر رہی ہے، اس پر کبھی کسی قسم کا شبہ حکام وقت کو نہیں ہوا، نہ کسی طرح کی بدگمانی پبلک کی کسی جماعت کو ہوئی، نہ کسی مذہب یا فرقہ یا جماعت کی کبھی اُس نے بیجا طرفداری کی، نہ کبھی تعصب کا برتاؤ کسی موقع پر کیا، نہ یہ کوشش کی کہ ایک جماعت کی مقبول اور دوسری پارٹی کی مردود بنے، بلکہ خاموشی کے ساتھ بغیر کسی شورش یا ہلچل کے فائدے ہی فائدے پہونچاتی رہی۔ نیز یہ کہ جب جیسی ضرورت عوام کو ہوئی اور وہ ضرورت بجا ہوئی، اُس کو لائبریری نے ہر موقع پر ملحوظ رکھا۔ مثلاً شروع میں بادشاہ وقت کی خیر خواہی کا اظہار کرنا زیادہ مناسب تھا، لائبریری نے بادشاہ کی سالگرہ وغیرہ کی تقریبوں پر خیر خواہی کے جلسے کرکے حکام کو اور معزز ہندوستانیوں کو پارٹیاں دیں، نیز اُن کے ماتم کے وقت تعزیت کے جلسے منعقد کرکے بادشاہ وقت کے رنج و غم میں شرکت کی۔ غرضکہ بادشاہ وقت اور حکام ضلع کے رنج و خوشی میں لائبریری نے برابر حصہ لیا۔ جس وقت بنگالہ میں انارکسٹ لوگوں کی شورش برپا تھی اور سر کرزن ولی قتل کیے گئے تھے، اس وقت ہم لوگوں نے جو لائبریری کے ممبر تھے انارکی کو قابل نفرت قرار دیا اور سر کرزن کی بیوہ کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ جب یورپ میں جنگ ہو رہی تھی اُس وقت عوام کی خواہش تھی کہ ایسے اخبار اور کتابیں منگائی جائیں، جن سے جنگ کے حالات معلوم ہوں تو ویسے ہی اخبار اور کتابیں خریدی گئیں، جن میں ہمارے بہادر سپاہیوں کی تصویریں تھیں، لیکن جب زمانے نے پلٹا کھایا اور دوسرا ورق الٹا یعنی رعایا کو اپنے حقوق کی نگہداشت اور طلب کی طرف توجہ ہوئی اور آزادی کی آواز ہندوستان میں ہر چہار طرف گونجنے لگی، اس وقت لائبریری نے اُسی قسم کے اخبار اور کتابیں خریدیں یعنی اخبار انڈیپنڈنٹ (آزاد) مدتوں آتا رہا اور ہوم رول لائبریری خریدی گئی۔ غرضکہ لائبریری ہمیشہ رعایا کی طرفداری اور ملک و قوم کی خدمت، جائز اور مناسب طور پر ہر صورت اور ہر حالت میں کرتی رہی کبھی یہاں تغلب نہیں ہوا۔ کبھی کتابیں غائب نہیں ہوئیں حساب کتاب یہاں کا بہت صاف رہا۔ آڈیٹر لوگوں نے ہمیشہ یہاں کے حسابات کی تعریف کی۔

ہم کو اعتراف ہے کہ ابتدا سے اس وقت تک لائبریری کو آپ کے میونسپل بورڈ نے بھی امداد دی

اور وقتاً فوقتاً بورڈ سے لائبریری کا حساب اور واصل باقی طلب کی گئی اور کوئی اعتراض منجانب بورڈ کبھی نہیں ہوا اور ہمیشہ بورڈ کے کم سے کم چار ممبر (اور اکثر زیادہ) لائبریری کے رکن رہے۔ غرضکہ اس کی ترقی میں بورڈ نے بھی کافی حصہ لیا، بلکہ بورڈ اگر دعوےکرے کہ اسی کی توجہ اور امداد مالی لائبریری کے فروغ کا باعث ہوئی، تو اُس کو حق پہونچتا ہے۔ ممبران بورڈ پر لائبریری کی درخواست سے واضح ہوگیا ہے کہ اس وقت لائبریری کے لیے وہ رقم کفایت نہیں کرتی جو بورڈ سے امدادی طور پر ملتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اور جماعتیں بھی امداد کی طالب ہیں لیکن لائبریری اُن پر ترجیح پانے کی حقدار ہے۔

لائبریری نے ثابت کردیا ہے کہ اُس میں زندہ رہنے کی طاقت موجود ہے۔ فتحگڑھ میں ایک لائبریری قائم ہوئی تھی وہ ٹوٹ چکی۔ اُس میں زندہ رہنے کی طاقت نہ تھی۔ پیدا ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد گویا مرگئی۔ اسی طرح ہمارے شہر میں "ہوم رول لائبریری" اور "ناگری پرچارنی لائبریری" قائم ہوئی تھی۔ ان دونوں میں بھی طاقت زندہ رہنے کی نہ تھی اور پیدا ہونے کے تھوڑی مدت کے بعد فنا ہوگئیں۔ اور اب ع

خاکش چناں بخورد کز واستخواں نماند

جو روپیہ ان کتب خانوں پر میونسپل بورڈ کا اور رعایا کا خرچ ہوا وہ سب بیکار گیا۔ ہماری لائبریری کو اگر امداد مالی زیادہ دی جائیگی تو وہ زندہ رہنے کے ساتھ تندرستی اور طاقت کے ساتھ بیشمار فائدے لوگوں کو پہونچائے گی۔

میں نے آپ صاحبوں کی خدمت میں یہ بھی ظاہر کردیا کہ اور حاجتمندوں کے مقابلہ میں ہمارا حق مرجّح ہے اور زمانہ حال کے مسلمات کے مطابق ایسے ہی زندہ انسٹی ٹیوشن (ادارے) کو مالی امداد دینا بورڈ کا فرض سمجھا جاتا ہے جیسی کہ ہماری لائبریری ہے۔

اُمید ہے کہ آپ حضرات اس درخواست کو منظور فرماکر فرخ آباد کی ادبی، علمی اور تمدنی روح میں مزید بالیدگی پیدا کردینگے۔

تقسیم انعامات کے بعد ——!

بماہ فروری ۱۹۲۶ء، شریمتی ساوتری دیوی کے پاٹ شالہ، واقع فرخ آباد میں تقسیم انعام کا جلسہ ہوا، جس کی صدارت مسٹر جے، ایف، سیل، صاحب کلکٹر بہادر ضلع نے فرمائی۔ جملہ تقریبات سے فراغت کے بعد، مشران صاحب نے حاضرین جلسہ کے اصرار پر حسب ذیل عالمانہ تقریر کی جس میں موصوف نے ارتجالاً معلومات کے دریا بہا دیے ہیں۔

جناب صدر! ہم سب لوگ آپ کی تشریف آوری کے ممنون اور احسانمند ہیں کہ آپ نے ہمارے پاٹ شالہ کے معاملات میں دلچسپی لی اور ہمارے بچوں کو اپنے ہاتھ سے انعام عطا فرمایا۔ جن لڑکوں نے آج انعام پایا ہے، وہ بہت خوش ہیں اور سال آیندہ بھی اپنا یہ اعزاز و امتیاز باقی رکھینگے اور جنھوں نے انعام نہیں پایا ہے، وہ استحقاق پیدا کرنے میں جد و جہد کرینگے۔ بہر کیف یہ انعام، تمام طلبہ کے سمند شوق پر تازیانہ کا کام کرے گا۔

عالی جاہا! یہ پاٹ شالہ، شریمتی ساوتری دیوی کی فیاضی اور علم دوستی کی مجسم یادگار رہے، جنھوں نے ایک ایسا چشمۂ فیض جاری کر رکھا ہے جس کی بدولت ہمارے ہونہار بچوں کو بہت فوائد پہونچ رہے ہیں اور جس کے باعث اس شہر میں تعلیم سنسکرت کا دروازہ کھل گیا ہے، جو بقول پروفیسر "میکس مولر" کے ام الالسنہ (تمام زبانوں کی ماں) ہے۔ یہ صرف میرا یا تنہا ہندوستانیوں ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ اس کی تائید، یورپ کے ماہرین علم زبان نے بھی جا بجا کی ہے اور علمائے مصر و عرب نے بھی، تسلیم کیا ہے اور تاریخ سے بھی اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہماری زبانِ سنسکرت میں قریب قریب تمام وہ مادی اور روحانی علوم، پہلے سے مدوّن ہیں، جن پر آج یورپ کو ناز ہے۔

سیاحوں اور مورخوں کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام علوم و فنون، اول ہندوستان سے اُن یونانیوں نے حاصل کیے جو سکندر اعظم کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، پھر یونان کے ذریعہ تمام یورپ اور مصر و عرب میں ان کی اشاعت ہوگئی عرب میں یہ علوم براہ راست بھی پہونچے چنانچہ تاریخ عرب کے زریں اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عربی زبان میں آج جس قدر علوم و فنون کا ذخیرہ ہے، ان میں

اکثر و بیشتر سنسکرت کی مہتم بالشان اور مستند کتابوں سے ترجمہ ہوے ہیں، جو خلیفہ ہارون رشید عباسی کے دور سلطنت میں علمائے ہند کو عرب میں بلا کر حاصل کیے گئے اور ان سے اپنی زبان عربی میں لکھائے گئے۔ چنانچہ منکا و بیدا اور سالی (جس کو اہل عرب صالح کہتے ہیں) کی تصانیف، جو کہ عربی زبان میں ہیں، سنسکرت کی تصنیفات سے حرف بحرف مطابقت رکھتی ہیں مضمون یکساں ہے صرف بولی کا فرق ہے۔ روح ایک ہے، صرف جسم کا امتیاز ہے۔

علم حدیث کے ماہرین اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہارون رشید سے بہت پہلے، خود رسول اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلعم نے بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس وقت دنیا میں علم کے مخزن دو ہیں۔ ایک میرا گھر اور دوسرا ہندوستان۔ پس آنحضرت کا قول جو کہ "مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی" کا مصداق ہے، سب سے بڑی سند اس بات کی ہے کہ ہندوستان اور اس کی قدیم ترین زبان یعنی سنسکرت سرچشمۂ علوم ہے۔

حضور والا۔ ہم لوگ ہندو دھرم، اپنی مقدس زبان سنسکرت پر اسی قدر فخر کرتے ہیں، جس قدر آپ اپنی انگریزی پر۔ اس لیے پاٹ شالہ یہ بات چاہتا ہے کہ ہندوؤں کے بچے سنسکرت زبان سیکھیں، ہمارے شاستر پڑھیں اور وید مقدس کے احکام سے واقف ہوں، جو کہ سر تا سر فلسفیانہ اور حکیمانہ ہیں، اپنے مذہب و اخلاق کے اصول سمجھیں تاکہ بے دینی اور بد اخلاقی سے بچ سکیں اور جو تعلیم ہندوستان میں مادیات کی پھیل رہی ہے، اس کے زہریلے اثر سے محفوظ رہیں۔ پاٹ شالہ یہ بات چاہتا ہے کہ ہمارے ہونہار لڑکے پڑھ لکھ کر اپنے مذہب میں مضبوط ہوں، اپنے بزرگوں کے قدم بقدم چلیں اور ان رشیوں منیوں کی سچی اولاد کہلائیں، جنھوں نے علم کی روشنی تمام دنیا میں اس وقت پھیلائی جبکہ چاروں طرف جہالت کی ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکے دھرم شکشا چاہیں اور سچی آزادی حاصل کریں اور ویسے ہی دیش بھگت بنیں، جیسے یونان و روم کے قدیم باشندے ہوا کرتے تھے۔

یورپ فخر کرتا ہے کہ کشش ارضی کا مسئلہ سر اسحاق نیوٹن نے دریافت کیا تھا، جو کہ بالاتفاق ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوا تھا، مگر یہاں محقق مذکور سے پانسو برس پیشتر ۱۱۵۰ء میں ہمارا افضل بھاسکر اچارج، اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ دلائل و براہین سے ثابت کر چکا تھا۔ اس کی تصنیف "سدھانت شرومنی" لاجواب اور قابل دید کتاب ہے۔ اس نے سب سے پہلے کہا کہ زمین، نہ سانپ کے پھن پر قائم ہے، نہ گائے کے

سینگوں پر، نہ کچھوے کی پیٹھ پر، بلکہ ہوا میں معلق ہے اور آفتاب کی کشش سے قائم ہے۔ اسی طرح اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ زمین ہر چیز کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔

تمام دنیا کے ریاضی داں متفق ہیں کہ عرب کے جبر و مقابلہ پر ہندوستان کا جبر و مقابلہ فائق ہے۔ اس فن کی ایک شہرۂ آفاق اور مستند کتاب "لیلاوتی" ہے، جو انہی بھاسکر اچارج نے اپنی بیٹی لیلاوتی کے لیے تصنیف کی تھی اور اسی کے نام پر کتاب کا نام رکھا تھا۔ تمام دنیا کے عالم اس کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اگرچہ اہل یورپ نے اس علم کو عرب سے حاصل کیا ہے اور انہی کی زبان سے مشتق کرکے اس کا نام "الجبرا" رکھا ہے مگر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا ہے کہ عرب، اس علم کی تہذیب و اصلاح میں ہندوستان سے مستفیض ہوئے ہیں، بنا بریں بالواسطہ یہ علم بھی، یورپ میں ہندوستان ہی سے پہنچا ہے۔

ڈاکٹر ہاروے جس کا شمار متاخرین میں ہے، اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے دوران خون کے مسئلہ کا انکشاف کیا، مگر علم طب میں ایک کتاب زبان سنسکرت میں "سشرت" کے نام سے موسوم ہے جس میں دوران خون کا ذکر موجود ہے اور علمائے یورپ خود اعتراف کرتے ہیں کہ وہ چھ سو برس قبل مسیح تصنیف ہوئی تھی۔ اس کتاب کا ترجمہ، عربی زبان میں خلیفہ منصور (عباسی) کے عہد میں ہوا، پھر عرب نے اس میں حسب ضرورت اضافے اور ترمیمیں کرلیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ہاروے کی ولادت سے بہت بیشتر مسلمانوں کو بھی، دوران خون کا مسئلہ معلوم ہو چکا تھا۔

ان واقعات و حقائق کو جاننے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں علوم کی کمی ہے یا یورپ نے نیز عرب نے یہاں کے خوان علم سے فیض نہیں پایا۔ علم ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کے دیوجولانگاہ عمل میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ راجاؤں کو لیجیے تو مہاراجا دسرت، راجہ جنک اور بکرماجیت کی سلطنت کا سکّہ کس کے دل پر بیٹھا ہوا نہیں۔ سورماؤں کا ذکر کیجیے تو ارجن اور بھیم کی دھاک کون نہیں مانتا مردوں اور عورتوں میں اخلاق کے نمونے ڈھونڈھیے تو سری رام چندر جی اور مہارانی سیتا دیوی کے کارنامے کافی ہیں۔ یہ تو پرانے زمانے کا ذکر ہے۔ آئیے آخری دور پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ مُردوں میں مہاتما تلک، گوکھلے اور سر سید وغیرہ اور زندوں میں مہاتما گاندھی اور علی برادران، آج بھی ایسی ہستیاں ہیں جن پر ہندوستان قیامت تک ناز کرے گا۔

حضور والا! میں کہاں سے کہاں جا پہونچا جس سے آپ کی بہت سمع خراشی ہوئی۔ اس کی معافی چاہتا ہوں اور ایک بار آپ کی زحمت کا شکریہ پھر ادا کرتا ہوں۔

ہندو مسلم اتحاد

بماہ ستمبر ۲۷ء، ایک جلسہ عام میں جو ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے منعقد ہوا تھا، مشران صاحب نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

جناب صدر و حضرات انجمن!

آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ۸ ستمبر ۲۷ء کے جلسہ عام میں، جو کہ ٹاؤن ہال میں اس غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ہندو مسلم اختلاف کی زہریلی ہوا سے فرخ آباد کو محفوظ رکھا جائے اور یہاں مزید اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، چار اشخاص کو عملی اقدامات کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا، جن میں خاکسار بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں میری پہلی تجویز یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں میں جو جلوس نکلتے ہیں، اُن میں بجائے ایک فرقہ کے، دونوں فرقے برابر کا حصہ لیں اور اس طرح یکجہت و یکدل ہو کر جلوس اُٹھائیں کہ دیکھنے والوں کو محسوس نہ ہو سکے کہ یہ ہندوؤں کا جلوس ہے یا مسلمانوں کا۔

فی الحال رام لیلا کا جلوس نکلنے والا ہے۔ اس موقع پر ہم کو ایسی یگانگت کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے کہ معمولی انتظامات جو پولیس کیا کرتی ہے، ان کے علاوہ حکام کو کسی قسم کی مداخلت کی گنجایش باقی نہ رہے اور وہ بھی ہمارے مہذب و متمدن قوم ہونے کا اعتراف کرلیں۔

بھائیو! گو کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان نہیں ہوں، مگر میرے دل میں دونوں فرقوں کے لیے ایک سی جگہ ہے اور میں دونوں کو صرف "ہندوستانی" ہونے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اپنے آپ کو دونوں جماعتوں کا نمایندہ سمجھتا ہوں اور مجھکو یہاں دونوں کی نمایندگی کا حق حاصل ہے۔

میں اوّل ہندوؤں کی نمایندگی کے طور پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ یہاں (ہمارے شہر میں) ہنود کی اکثریت ہے اور وہ کسی دوسرے گروہ کی معاونت کے محتاج نہیں، مگر باایں ہمہ وہ تنہا بغیر اپنے پڑوسی کی شرکت کے، کوئی کام کرنا نہیں چاہتے اور مسلم بھائیوں کو اپنا برابر کا شریک، بلکہ شریک غالب بنانا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں کی محبت و مروت، جو مسلم بھائیوں کے ساتھ ہے، وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہے۔ اگلے زمانے کو چھوڑیے، ابھی کل کی بات ہے کہ خلافت ایجی ٹیشن کے زمانے میں ہندو مسلمانوں کے

ساتھ شریک ہوکر "اللہ اکبر" کے نعرے لگا چکے ہیں، جو کہ خالص اسلامی نعرہ ہے۔ مہاتما گاندھی اس ایجی ٹیشن کے قائدِ اعظم تھے۔ ہندوؤں کی یہ رواداری اور مواسات و غمخواری اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان کا دل کس قدر کشادہ، حوصلہ کتنا بلند اور ظرف کس درجہ عالی ہے۔

اب میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ مسلم بھائی بھی ہندوؤں کی اس یگانگت و ہمدردی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ شکر گزار قوم ہیں، حق پسند ہیں، ان کی رگ رگ میں محمد عربی کے اخلاق کی روح دوڑ رہی ہے، وہ معاشرت و تمدن میں اپنے نبیؐ برحق کی ہدایات کا قدم قدم پر لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ نبی برحق جس کی بزم میں یہود، نصاریٰ اور بت پرست سبھی آتے تھے اور مسلمانوں کے شانے سے شانے سے شانہ ملا کر بیٹھتے تھے۔ اپنے پرائے کا امتیاز بالکل نہ تھا، بلکہ بسا اوقات حضرت محمدؐ ان یہود و نصاریٰ کے لیے اپنی عبائے مبارک کا فرش بچھا دیتے تھے۔ اس سے بھی بڑھکر رواداری کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ، جھوٹ موٹ کسی ذاتی مفاد کی غرض سے یا ڈپلومیسی کے طور پر، آنحضرتؐ کی بزم میں آکر شریک ہوتے تھے اور دھوکا دینے کے لیے مسلمان بن گئے تھے، جن کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے اور پورا سورۂ منافقون انہی کے بارے میں موجود ہے، رسول صلعم ان کو جانتے اور پہچانتے تھے، مگر آپ نے صرف اپنی وسعت اخلاق سے مرتے دم تک اپنے صحابہ کو ان لوگوں کے نام و نشان سے آگاہ نہیں کیا۔ میں آج کل سیرت نبوی پڑھ رہا ہوں، جو سر ولیم میور نے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ اس میں جا بجا رسول مقبولؐ کے اخلاق کا ذکر ہے، جس کو پڑھکر، میں بہت خوش ہوا۔ ان کی مروت، غمخواری، ہمدردی اور فیاضی فقط دوستوں کے ساتھ نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی بیان کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اگرچہ ان کی طبیعت میں بہت پرشور جذبات تھے، مگر نفس کشی سے وہ اپنے غصّے کو ایسا فرو کرتے تھے کہ یہ جذبات اوپر کی سطح پر نمایاں نہیں ہونے پاتے تھے۔ پس ایسے خلیق نبی کی امت سے سوائے خوش خلقی اور رواداری کے کبھی ہرگز کسی دوسرے سلوک کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔

ہندو مسلم، ہر دو فریق کی رواداری کے جو مظاہرے، ہمارے فرخ آباد میں ہوتے رہتے ہیں، ان پر نظر کر کے ہم کو اس وسوسۂ باطل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہاں کسی قسم کی کشمکش کبھی پیدا ہوگی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اب سے پندرہ سال قبل محرم الحرام اور رام لیلا ایک ہی وقت میں پڑے تھے اور اتفاق سے امام حسینؓ کے سیوم اور بھرت ملاپ کا دن ایک تھا۔ یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے جذبات

غم کا احترام کرکے، اپنی طرف سے بغیر کسی تحریک کے مسلمان لیڈروں کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اول ہم آپ کے یہاں، امام کے پیچھے میں شریک ہونگے، بعد ازاں بھرت ملاپ کی رسم ادا کرینگے۔ یہ ہے یہاں کے ہندوؤں کی رواداری۔ اب مسلمانوں کی کیفیت سنیئے۔ محرم کے دس دن، سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں سوگ اور ماتمداری ہوتی ہے اور ان کے گھروں میں، بلکہ دلوں میں بھی، خوشی کے لوازم کو دخل نہیں ہوتا، مگر بھرت ملاپ کے مراسم میں علی العموم مسلمانوں نے شرکت کی اور دل وجان سے حصہ لیا۔ یہ بات تو ہمارے شہر میں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے کہ یہاں کے ہندو محرم میں جا بجا سبیلیں رکھتے ہیں اور شربت پلاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ہولی وغیرہ میں ہندو احباب کی تواضع عطر، الائچی اور سگریٹ وغیرہ سے کرتے ہیں اور یہ باہمی سلوک، یہاں عام ہے کسی خاص طبقے سے خصوصیت نہیں رکھتا۔ میں اس موقع پر اپنے مسلمان بھائیوں کو نیز ہندوؤں کو شاہ افغانستان کا ایک قول، جو میں نے اخبار میں پڑھا ہے، سنانا چاہتا ہوں، جس کو سن کر آپ بہت خوش ہونگے۔ شاہ موصوف فرماتے ہیں کہ:— "ہندو مسلم، میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں"

حضرات! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے ضلع کے اور تمام ہندوستان کے ہندو اور مسلمان، شاہ ممدوح کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو ان کی توقعات سے زیادہ ثابت کردکھائینگے اور جو قوت درپردہ اختلاف پیدا کرنے کی حامی ہے، اس پر واضح کردینگے کہ ہندوستان، ایک جسم ہے اور ہم اس کی داہنی، بائیں، آنکھیں ہیں۔ ہم میں کسی قسم کا اختلاف ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔

صاحبان ذیشان! اس وقت چونکہ اختلاف کا منحوس لفظ میری زبان پر آگیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی چند کلمات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ دو پڑوسیوں میں اختلاف کبھی نہیں ہوسکتا، البتہ اس صورت میں کہ ایک دوسرے کے مقابلے میں خود غرضی کو دخل دے۔ پڑوسیوں کا تو کیا ذکر ہے، اس خود غرضی کی وجہ سے تو بھائی، بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ پس یہ اختلافات جو فرقہ وارانہ، جا بجا ہوتے رہتے ہیں اسی قسم کی خود غرضیوں پر مبنی ہوتے ہیں، جن کی ہوس میں، دنیا کے حریص وطماع اپنے سگے بھائی کی خونریزی میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر پائیں

غرض اس بحث سے یہ ہے کہ ان نزاعات و فسادات کا باعث، مذہب نہیں ہوتا۔ کوئی صاحب، ہندو یا مسلمان، بتائیں کہ ان دونوں میں سے کسی کا مذہب یا دھرم یہ حکم دیتا ہے کہ تم کسی وقت اور کسی حال میں بھی، بنی نوع انسان کا خون بہاؤ۔ نہیں ہرگز نہیں۔ دفاع کے لیے ہر مذہب نے اجازت دی ہے اور اس میں جو خون بہہ جائے، وہ روا بھی ہوتا ہے، مگر خود سے بہیمانہ طور پر حملہ کر دینے کو کوئی مذہب گوارا نہیں کرتا۔ بہر صورت جہاں جہاں، اس قسم کے جھگڑے آپس میں ہو گئے ہیں یا خدانخواستہ آیندہ ہوں، وہاں کے لوگوں کو مصالحت کی طرف آنا چاہیے اور مصالحت کے وقت ایک گُر یاد رکھنا چاہیے کہ دائمی اور پائدار صلح اسی وقت ہوتی ہے، جبکہ متخاصمین کو مساوات کے حقوق مل جائیں۔ پس اگر کسی فرقہ کے لیڈر، اپنی اکثریت کی بنا پر، مساوات کے حقوق دوسرے فرقے کو نہ دیں تو یہ ان کی نادانی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مل جل کر رہنا نہیں چاہتے۔ مساوات بڑی بہترین چیز ہے۔ اگر ایک فریق نے اکثریت کے زعم میں دباکر صلح کرنا چاہی تو اول تو یہ صلح ہونا ہی ناممکن ہے اور اگر کسی مصلحت یا مجبوری سے دوسرے فریق نے دب کر صلح کر لی تو وہ دیرپا نہیں ہوگی اور بات بات پر ٹوٹتی رہے گی اور دونوں فریق میں محبت کبھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ یاد رکھیے کہ محبت کا اصول ہی برابری ہے۔ ایک بہت بڑا ہے اور دوسرا بہت چھوٹا، تو ان دونوں میں دلی محبت نہیں ہو سکتی۔ سچی اور مستقل محبت انہی دو شخصوں یا گروہوں میں ہو سکتی ہے جو باہم برابری رکھتے ہوں یا ان دونوں میں یہ بات قرار پا جائے کہ ہم ہمیشہ برابری کا برتاؤ کریں گے۔

مجھے اُمید ہے کہ اگر آپ اس اصول کو ملحوظ رکھیں گے، تو کبھی کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔

عید اضحیٰ

۲۰ مئی ۱۹۲۹ء کو عید اضحیٰ کی تقریب میں، بمقام لال سرائے فرخ آباد ایک جلسہ، ہندو مسلم اتحاد بورڈ کی طرف سے منعقد کیا گیا، تاکہ اس جگہ ہندو مسلمان جمع ہوکر عید ملیں۔ شران صاحب نے بحیثیت صدر جلسہ جو تقریر کی وہ درج ذیل ہے:۔

حاضرین مجلس! آج ہم سب ہندو مسلمان بھائی، ہر طبقہ اور زمرہ کے اشخاص اور ہر گروہ و جماعت کے لوگ یہاں اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ عید اضحیٰ کی تقریب میں سب مل کر خوشی منائیں اور اس تقریب میں ایک دوسرے کو گلے لگائیں، کیونکہ یہ بھی ایک وسیلہ اتحاد و مواخات بڑھانے کا ہوتا ہے۔ آج ہر شخص کا چہرہ بشاش نظر آتا ہے۔ چاروں طرف خوشی کے آثار نمودار ہیں۔ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ تیوہار، عید اضحیٰ، نیز اس کے کچھ دن بعد محرم، دونوں تقریبات اسی اہتمام و انتظام کے ساتھ ہندو مسلم کی شارکت و معاونت سے، بخیر و خوبی تمام انجام پائیں، جس طرح دسہرا کا تیوہار سال گذشتہ زیب و زینت کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی امداد اور شرکت سے انجام پا چکا ہے۔ ہمارا بورڈ یہ چاہتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہی محبت و اتحاد، پھر قائم ہو جائے، جس پر ہم پہلے فخر و ناز کرتے تھے اور جو ہمارے آباؤ اجداد کا زیور حیات تھا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جناب رسول مقبول صلعم نے جو ہدایت اپنی پیاری امت کو کی تھی کہ "معاشرت کے معاملات میں تمام بنی نوع انسان کے ساتھ جس میں غیر اقوام بھی شامل ہیں، اخلاص اور مساوات کا برتاؤ کرنا چاہیے"، وہی برتاؤ مسلم بھائی ہندوؤں کے ساتھ کریں اور اسی طرح ہندو بھائی، مسلم بھائیوں کے ساتھ شیر و شکر ہو جائیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ شہر اور ضلع میں امن و امان اس طور پر رہے اور ہندو مسلم تیوہار دونوں فریق کی شرکت سے اس خوبی اور زیب و زینت سے انجام پایا کریں کہ ہمارے ضلع کے حاکموں کو کوئی تردد اور فکر و اندیشہ نقص امن کا لاحق ہونے ہی نہ پائے اور وہ نہایت اطمینان سے ہندو مسلم تیوہاروں میں ہمارے بھائیوں کی طرح خود شریک ہوں اور اُن کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

سال گذشتہ جب ہم اسی جگہ اسی موقع پر ہندو مسلم اتحاد بورڈ کے جلسے میں شرکت کے لئے جمع ہوئے

تھے، تو ہماری جماعت کم تھی، کیونکہ وہ پہلا موقع تھا اور اب ایک سال گذرنے پر دونوں فریق کے باہم محبت و اخلاص میں ترقی ہوئی، یہی وجہ ہے کہ آج مجمع زیادہ ہے اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ہمارے اتحاد بورڈ نے یہ بہت بڑا کام کیا ہے، یعنی اس وقت جو کیفیت دکھائی دے رہی ہے، یہ ہمارے بورڈ ہی کی کوشش کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ دونوں فریق ہندو مسلم کے درمیان اتفاق و محبت کے کھلے ہوئے آثار پائے جاتے ہیں۔ میں بلاتشبیہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا اتحاد مثل ایک مشت خمیر کے ہے، جو منوں آٹے میں ملادیا گیا ہے، ہنوز چند تہیں اُس آٹے کی خمیر سے متاثر ہوئی ہیں، مگر وہ وقت قریب آتا ہے کہ تمام آٹا خمیر ہو جائے گا۔

جب ۱۷۰۹ء میں فرخ آباد بسایا گیا تھا اُس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ محبت تھی کہ ہندو وسط شہر میں آباد تھے اور مسلمان اُن کے گرداگرد۔ تاکہ مسلمان جو اہل فوج تھے، ہندوؤں کی حفاظت کرسکیں اور ہندو جو ہر قسم کا کاروبار اور بیوپار کرتے تھے اور دولتمند تھے، مسلمانوں کو فائدے پہنچا سکیں اور دونوں فریق میں نزدیکی رہے، دوری نہ ہونے پائے۔ اس وقت بھی جو مسلمانی محلے ہیں وہ شہر کے گرداگرد ہیں مثلاً بھیکم پورہ، گڑھی عبدالمجید خاں، گڑھی کہنہ، گڑھی خانخاناں، امیٹھی، مدار باڑی وغیرہ۔

صاحبو۔ یہ عید اضحیٰ کا تیوہار مسلمان بھائیوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس دن حضرت اسمٰعیل کی یادگار میں قربانی ہوتی ہے اور یہی حج کے دن ہیں۔ ان دنوں مکہ معظمہ میں حاجیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ کوئی خانۂ کعبہ کے طواف میں مشغول ہے، تو کوئی مناسک میں۔ کوئی احرام باندھ رہا ہے تو کوئی مسجد الاقصیٰ کا طواف کر رہا ہے۔ کوئی حج سے فارغ ہوکر مدینۂ منورہ میں آنحضرت کے روضہ کی زیارت کے لیے جا رہا ہے تو کوئی مشہد مقدس کے لیے کمربستہ ہے۔ کوئی کربلائے معلّٰی کی خاک کو سرمۂ چشم بنا رہا ہے تو کوئی نجف کی زیارت کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں کوئی ہندوستان کا ہے تو کوئی ایران کا۔ کوئی عرب کا تو کوئی ترکستان کا۔ غرضکہ جگہ جگہ کے لوگ ہیں، جن کی صورتیں بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں، مگر دل اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ دو سگے بھائیوں میں بھی ایسا مخلصانہ برتاؤ کیا ہوگا، جو کہ اُن میں ہے۔ ہم کو اس سے سبق لینا چاہیے ــــ شکر ہے کہ ہندوستان میں جابجا ہندوؤں اور مسلمانوں کے سرگروہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی فریق اپنے تیوہاروں میں ایسا کوئی کام نہ کرے جو دوسرے فریق کی ناراضی کا باعث ہو اور وہ دن جلد آنے والا ہے کہ ہندو مسلمان باہم ایک جان دو قالب ہوکر سوراج یا حکومت خوداختیاری جلد حاصل کرینگے۔

حاضرین مشاعرہ کا خیر مقدم

آداب شاعری اور حالات شعراء

۲۸ / اپریل سنہ ۳۲ء کو ایک بزم مشاعرہ بمقام مدرسہ مفتی صاحب قرار دی گئی تھی۔ جس میں چند اضلاع کے شعرا شریک ہوئے تھے اور میر مجلس ایک رئیس مین پوری تھے۔ مشران صاحب کو استقبالیہ کمیٹی کی صدارت تفویض کی گئی تھی اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ تشکریہ کی تقریر کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے موضوع پر بھی کچھ بیان ایسا کیا جائے جو شعرا کے لئے بکار آمد اور اُن کی دلچسپی کا باعث ہو۔ موصوف نے احباب کے اصرار پر انکار مناسب نہ سمجھا اور حاضرین کا خیر مقدم کرنے کے بعد آداب شاعری اور حالات شعرا بیان کیے اور شعرائے ہند و عجم کے کلام کی مخصوص خوبیاں پیش کیں۔ خطبہ صدارت درج ذیل ہے۔ یہ تقریر یک گھنٹہ سے کچھ زائد عرصہ میں ختم ہوئی تھی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بحیثیت صدر استقبالیہ کمیٹی، آپ سب حضرات کی سپاس گذاری کروں، جنھوں نے اپنے قدوم سے اس بزم سخن کو زیب و زینت بخشی ہے۔ مجھ سے میرے دوستوں نے جب صدارت کی درخواست کی تو مجھے بہت تامل ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کام کے لئے میں موزوں نہیں ہوں ؎

نہ ہر کس سزاوار باشد بصدر
صدارت بجاہ است و منزل بقدر

مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور بزم مشاعرہ میں نثاری معمول کے خلاف معلوم ہوتی ہے لیکن میرے دوستوں نے اصرار کیا اور فرمایا کہ تمھاری نثر میں نظم بھی ہوتی ہے اور شعر و سخن کے موضوع پر بھی تم ضرور کچھ کہو تاکہ شعرا کو دلچسپی ہو اور صحبت مشاعرہ بکار آمد ہو۔ مجھ کو بجز منظور کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ لہذا بفحوائے "المامور معذور" آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں کمیٹی کی طرف سے

آپ سب مہمانانِ عظیم الشان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جن کی تشریف آوری سے ہم کو فخر حاصل ہوا ہے۔ جو صاحب غیر اضلاع سے تشریف لائے ہیں وہ ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہم اپنے مہمانوں کی شان کے لائق آسائش و مہمانداری کا انتظام کرنے سے قاصر رہے ہیں اس کی ایک وجہ تو ضیق وقت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو لوگ زیادہ کام کرنے والے ہیں وہ اتفاق سے اس وقت اپنے مشاغل کو چھوڑ نہ سکے۔ تاہم ہم نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع آپ سب مہمانانِ ذیشان کی خدمت گذاری کر سکیں اور ہم کو پوری اُمید ہے کہ حالاتِ موجودہ پر نظر کر کے آپ سب حضرات ہماری فردگذاشتوں کو معاف فرمائیں گے۔

شعر و شاعری کی عظمت

اب میں دوستوں کی فرمائش کی تعمیل میں شعر و سخن کا ذکر کروں گا۔ واضح ہو کہ زمانہ قدیم سے اب تک شعر کی عظمت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ عرب میں یہ حالت تھی کہ شاعر کسی قبیلہ میں پیدا ہوتا تھا تو جا بجا سے سفارتیں آتی تھیں جو اُس کو مبارکباد دیتی تھیں اور تمام خاندان میں بڑی خوشی منائی جاتی تھی اور تمام قبیلہ معزز سمجھا جاتا تھا اور اُس قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر فخریہ گیت گاتی تھیں اور خوشی کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ شاعر کا اقتدار ایسا بڑھا ہوا تھا کہ جس کو چاہتا تعریف کر کے آسمان کا تارہ بنا دیتا اور جس کو چاہتا ہجو کے ذریعہ عرش سے فرش پر گرا دیتا ؎

یکے را زمہ اندر آرد بچاہ
دگر را زچہ برفرازد بماہ

ایک شخص گمنام تھا اس کی تین بیٹیاں تھیں جن کو بر نہیں ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک شاعر اُس کے یہاں آکر مہمان ہوا۔ جب شراب کا دور چلا، تو شاعر نے میزبان کے اہل و عیال کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا کہ میری تین بیٹیاں ہیں اور جوان ہو گئی ہیں۔ کہیں سے اب تک شادی کا پیام نہیں آیا ہے۔ شاعر بولا خاطر جمع رہو میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ جب عکاظ کے میلہ کے دن آئے تو اُس شاعر نے مجمع عام میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں اُس میزبان کے خاندان کی تعریف تھی۔ قصیدہ ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اُس کے میزبان کے گرد اگرد لوگ جمع ہو گئے اور تینوں لڑکیاں معزز خاندانوں میں پہونچ گئیں۔

ایک شاعر کو کسی معزز قبیلہ سے رنج پہونچا۔ اُس نے اُس کے آباؤ اجداد کی ہجو کی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اُس قبیلہ کی ذلت اس قدر بڑھی کہ وہ نہایت گم نام ہو گیا اور اوج کمال سے پستی زوال میں گرا یہاں تک کہ نام و نشان بھی مٹ گیا۔

عجم میں بھی یہی حال تھا۔ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو کہی۔ سب جانتے ہیں کہ محمود کس سطوت و جبروت کا بادشاہ تھا اُس نے منادی کرادی تھی کہ ہجو جس کسی کے یہاں نکلے گی وہ سزا پائے گا۔ لیکن ہجو کے اشعار بچّہ بچّہ کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ نو سو برس سے اس وقت تک جس قدر نسخے شاہنامہ کے دنیا میں شایع ہوئے ہجو سے کوئی خالی نہیں۔ گویا ہجو شاہنامہ کا جزو لاینفک ہو گئی ہے اور ہمیشہ رہے گی بقول فردوسی ؎

چو شاعر برنجد بگوید ہجا
بماند ہجا تا قیامت بجا

ہندوستان میں بھی شعرا کی بڑی وقعت تھی اور ہے۔ سیکڑوں شاعروں نے لاکھوں روپیے انعام میں پائے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ خسرو دہلوی نے فیل بار سونا انعام میں پایا۔ ایک مرتبہ محمد تغلق کے دربار میں مولانا جمال الدین پایہ تخت کے شاعر نے مبارکباد کا قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ تھا ؎

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہاباں را
محمد شاہ تغلق ابن تغلق ابن سلطاں را

بادشاہ نے سنکر کہا کہ بس مولانا میری مجال نہیں ہے کہ ایک شعر سے زیادہ کا صلہ میں دے سکوں۔ یہ کہکر خزانچی کو حکم دیا کہ روپیوں کی تھیلیاں شاعر کے گرد رکھ دی جائیں یہاں تک کہ شاعر کے سر تک پہونچ جائیں۔ چنانچہ اُسی وقت تھیلیاں گرد رکھ دی گئیں۔ جب شاعر کے سر تک پہونچیں مولانا کھڑے ہو گئے۔ یہ ادا بادشاہ کو بہت پسند آئی حکم دیا کہ شاعر کو کھڑا رہنے دو اور تھیلیاں اُس کے سر تک لگا دو غرضکہ ایک ہی شعر کے صلہ میں شاعر تین پشت تک مالدار ہو گیا۔ جب فتح علی شاہ قاچار والی ایران نے روس کے مقابلہ میں فتح پائی تو قاآنی نے قصیدہ تہنیت کا پیش کیا قاآنی اُس وقت دربار کا ملک الشعرا تھا اور ختم الشعرا اُس کا لقب تھا۔ جب پڑھتے پڑھتے اس شعر پر پہونچا ؎

آں قدر نصرانیاں را کشت در روز نبرد   عیسیٰ دوراں بہ گردوں دست پیغمبر گرفت

تو بادشاہ نے فقط اس ایک شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا۔ یہی حال ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ والیان بیجاپور کی قدر دانی کا تھا کہ ملا نورالدین ظہوری کی اس قدر قدر و منزلت کی کہ اس نے کبھی دربار مغلیہ کی طرف رخ نہیں کیا۔ عرفی کو دیکھیے کہ اُس نے ابوالفتح گیلانی اور خانخاں کے سوا امرائے دربار میں سے کسی کی آستاں بوسی نہیں کی۔ ان دونوں قدر دانان شعر و سخن کے دربار دُربار سے عُرفی عمر بھر فیض پاتا رہا۔ سلاطین مغلیہ کے وقت میں ایران کے بڑے بڑے شعرا اپنا وطن مالوف چھوڑ کے ہندوستان کھنچے ہوئے چلے آئے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانہ کو اپنا قبلہ حاجت قرار دیا اور سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب و زینت سمجھتے رہے۔

صاحبو! میں نے شعر و شاعری کی عظمت اور قدر و منزلت آپ کی خدمت میں عرض کی۔ اب میں شعر کی حقیقت مختصراً عرض کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارہ میں ہیں وہ بیان کروں گا۔

شعر کی ماہیت اور حقیقت

اس موضوع پر سب سے پہلے ارسطو نے کتاب لکھی جس کا نام بوطیقا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی کا نام ہے صرف فرق یہ ہے کہ مصور مادی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس بنا پر جب کسی چیز کا بیان اس طور پر کیا جائے کہ ہوبہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آجائے گی۔ ارسطو کی اس تصنیف کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ابن رشیق نے جو بہت بڑا فلسفی گذرا ہے اُس کا خلاصہ کیا۔ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا۔ اس لئے شاعری کی نسبت جو خیالات ارسطو کے تھے وہ مسلمانوں میں پھیل نہ سکے۔

ادب کی کتابوں میں جو تعریف شعر کی گئی ہے وہی خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہے۔ یعنی یہ کہ کلام موزوں ہو اور متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو۔ جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی جملہ کہے جو اتفاق سے بطور نظم بھی کہا جا سکے تو اُس پر مصرع کا اطلاق نہ ہوگا اور وہ شعر کا جزو نہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً کوئی کہے کہ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے" یہ موزوں بھی ہو سکتا ہے۔ تین الفاظ آرسی، کیا، ہے، اگر بڑھا کر

پڑھے جائیں تو پورا مصرع موزوں ہو جائے گا۔ اگر گھٹا کر پڑھے جائیں تو نثر ہے۔ مگر یہ عامیانہ تعریف ہے۔ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں ہے۔

ایران کے شاعروں کے نزدیک شاعری دراصل تخیل کا نام تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے جو بہت بڑا شاعر گذرا اپنی کتاب چہار مقالہ میں شاعری کی تعریف جو لکھی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ کسی مضمون کو خیال میں ایسا ترتیب دیا جائے کہ اچھی چیز بدنما اور بری چیز خوشنما ثابت ہو جائے جس سے محبت اور غصہ کی طاقتیں بھڑک اٹھیں۔ یہ تو ایشیا کے پرانے قول اور خیالات شعر اور شاعری کی نسبت تھے۔ یورپ والوں نے بہت باریک بحثیں کی ہیں۔ اور عجیب وغریب نکتے پیدا کیے ہیں۔

جان اسٹوارٹ مل نے ایک مطول مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن سے انسانی جذبات کو کچھ تعلق نہیں۔ مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی سوال حل کریں تو اس سے ہم کو غصہ یا خوشی یا رنج پیدا نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی کی مصیبت و تکلیف کا حال درد بھر لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس سے ہم پر اثر ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کو جذبات یا احساسات کہتے ہیں اور جو چیز ان جذبات کو بھڑکاتی ہے اس کا نام شاعری ہے۔ اس تعریف کی بنا پر تصویر، تقریر اور وعظ وغیرہ بھی بعض لوگوں کے نزدیک شاعری میں داخل ہیں کیونکہ یہ چیزیں بھی انسانی جذبات کو بھڑکاتی ہیں۔ لیکن مل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں یعنی تصویر وغیرہ شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جو کلام کرتا ہے اس کی غرض کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر اثر ڈالے، جیسے بذریعہ لکچر اسپیچ وغیرہ کے کبھی وہ رنج یا خوشی کے موقع پر خود اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے، مثلاً کسی شخص کا بیٹا مرجائے تو جو بھی الفاظ، زبان سے نکلیں گے ان سے یہ غرض نہ ہوگی کہ وہ کس شخص یا جماعت سے خطاب کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے آپ سے بات کرتا ہے۔ فرض کیا جائے کہ وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی اس کی زبان سے وہی الفاظ نکلیں گے۔ شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے۔ اس بنیاد پر شاعری کی منطقی تعریف یہ ہوگی کہ جو کلام اس قسم کا ہو کہ اس سے انسانی جذبات بھڑک اٹھیں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود ہی اپنا مخاطب ہو تو اس کا نام شاعری ہے۔

مل صاحب نے اگرچہ بہت باریک بات کہی ہے لیکن شاعری کا دائرہ اس سے بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا کہ مل صاحب کرنا چاہتے ہیں۔ نہ اس قدر

وسیع ہے جیسا کہ ایشیا کے عالموں نے کیا ہے۔ شعر کی اصلی حقیقت یہ ہے جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے کہ وہ ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر ہر قسم کے خیالات اور جذبات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس چیز کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آجائے گی۔ مثلاً دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، شبنم کی جھلک، ہوا کے جھونکے، دھوپ کی حدت، گرمی کی شدت، جاڑوں کی فسردگی، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج، غم، خوشی، غصہ، محبت، افسوس، حسرت، ان چیزوں کا بیان اس طرح کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائے یہی شاعری ہے۔ شاعری کی تعریف اور ایک طرح بھی کی جاسکتی ہے۔

دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں خواہ وہ مادی ہوں جیسے پہاڑ، دریا، جنگل، باغ وغیرہ۔ یا وہ غیر مادی ہوں مثلاً تعریف، نفرت، محبت، غصہ، اُمید، نااُمیدی، رنج، خوشی۔ ان سب کا دل پر اثر پڑتا ہے لیکن یہ اثر کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ بعض پر کم، بعض پر زیادہ پس جو شخص ان قدرتی چیزوں اور کیفیتوں سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ اثر قبول کرے اور اپنے الفاظ سے دوسروں پر بھی زیادہ اثر ڈال سکے، وہی شاعر ہے۔ مولوی حمید الدین نے فن بلاغت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں شعر کی حقیقت یوں بیان کی ہے کہ شاعر کے لفظی معنی ہیں صاحب شعور۔ شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں جس کو انگریزی میں فیلنگ کہتے ہیں یعنی شاعر وہ ہے جس کا احساس تیز ہو۔ انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی رہتی ہیں جیسے رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا وغیرہ۔ یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکتیں صادر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ انگڑائی کے وقت بدن تن جاتا ہے۔ اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصہ کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام شاعری ہے۔ ان خیالات سے صاحبو آپ کو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا اور معلوم ہوا ہوگا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اُس کو شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ تو شعر کی تعریف عرض کی گئی۔ اب شعر کے اجزا اور عناصر کا حال سنیے۔

شعر کے دو اجزا ہیں مادہ اور صورت۔ مادہ سے غرض ہے مضمون۔ یعنی کیا کیا بیان کیا جائے۔ صورت

سے غرض یہ ہے کہ طرز ادا کیا ہو۔ شاعری کے اصلی عناصر دو ہیں۔ محاکات اور تخئیل۔ باقی سلاست اور بندش اور عمدہ ترکیبیں اور صنایع بدایع زیب و زینت اور نقش و نگار کا کام دیتے ہیں۔ انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے خوشی، رنج، غصہ، آرزو، تعجب، فخر وغیرہ اُن کا ادا کرنا یا مناظر قدرت مثلاً باغ، جنگل، پہاڑ، بہار، خزاں، صبح، شام ان کی تصویر کھینچنا شاعری کے اصلی عناصر ہیں۔

محاکات کی تعریف یہ ہے کہ شاعر کسی چیز کا بیان ایسا کرے کہ جو اثر اُس کی طبیعت میں ہو، وہی دوسروں کی طبیعت میں پیدا کر دے یا یہ کہ اُس چیز کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ تخئیل اُس قوت کو کہتے ہیں کہ جس سے ایجاد و اختراع کا کام لیا جائے یا کوئی مسئلہ فلسفہ کا حل کیا جائے۔ یا اگر کوئی شے ہمارے عالم خیال میں ہو اُس کو ہماری نظر کے سامنے لے آئے۔ یہی قوت تخئیل شاعری میں مضامین بلند پیدا کرتی ہے۔ محاکات کا دوسرا نام مرقع نگاری ہے۔ مثنوی لکھنے میں مرقع نگاری سے کام زیادہ لیا جاتا ہے کیونکہ اُس میں مسلسل واقعات کا بیان ہوتا ہے اور استعارہ اور صنائع بدائع محاکات میں مخلل انداز ہوتے ہیں بخلاف غزل یا قصیدہ کے کہ اُس کا ہر شعر جدا جدا مضمون رکھتا ہے اور استعارہ یا صنایع بدائع کے استعمال کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ میں اعلیٰ درجہ کی مرقع نگاری کی ہے۔ وہ واقعات کا بیان نہایت سادہ کرتا ہے اور استعارہ کے پاس کبھی نہیں پھٹکتا ہے۔ بخلاف اس کے نظامی نے مثنوی (سکندرنامہ) میں مرصع نگاری سے زیادہ کام لیا تو واقعات کی تصویر کھینچنے سے قاصر رہے ہیں ایک مثال کے ذریعہ کمند اندازی کا واقعہ دونوں شاعروں کا دکھاتا ہوں ؎

کمند عدو بند را شہریار
بینداخت چوں چنبر روزگار

نظامی

کمند کے ساتھ عدو بند کے الفاظ بہت خوب ہیں۔ بندش چست ہو گئی چنبر روزگار بھی خوب استعارہ ہے۔ لیکن غور کیجیے، قباحت یہ ہو گئی کہ سننے والے کی توجہ کمند عدو بند، اور چنبر روزگار، کی طرف زیادہ تر مصروف رہی کمند پھینکنے کا واقعہ نظر سے بالکل چھپ گیا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کمند پھینکنے کا نتیجہ کیا ہوا۔ کوئی اس میں پھنسا یا نہیں۔ بخلاف اس کے فردوسی جو رزم کا دھنی ہے کہتا ہے ؎

چو از دست رستم رہا شد کمند
سر شہریار اندر آمد بہ بند

زبیل اندر آورد وزد بر زمین
بہ بستند بازوئے خاقان چین

فردوسی نے چار مصرع کہے ہیں اور ہر مصرع میں ایک مضمون علیحدہ ہے جو اُس مصرع میں پورا پورا ادا ہو گیا۔ پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ رستم نے کمند پھینکی۔ دوسرے میں بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کا سر پھنس گیا تیسرے میں بتاتا ہے کہ جھٹکا دے کر ہاتھی سے اُس کو نیچے گرا لیا اور چوتھے میں کہتا ہے کہ پھر مشکیں کس لیں۔ ہر مصرع میں ایک واقعہ پورا بیان کر دیا۔ اس کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ واقعات کی تدریجی رفتار دکھادی۔ پہلے کمند ڈالی گئی۔ اُس کے بعد گردن پھنسی اُس کے بعد ہاتھی سے نیچے گرایا گیا۔ آخر میں مشکیں کسی گئیں۔ اگر اس سلسلہ اور ترتیب میں فرق آتا تو اسی قدر مرقع نگاری کا معیار گھٹ جاتا
اسی طرح تیر اندازی کا واقعہ بیان کرنے میں فردوسی نے جو مرقع نگاری کی ہے وہ لاجواب ہے۔ کوئی شاعر نہ کر سکا۔ کہتا ہے ؎

تہمتن کہ بند کمر بُرد چنگ — گزین کرد یک چوبہ تیر خدنگ
خدنگے بر آورد پیکاں چو آب — نہادہ برو چار پر عقاب
بمالید چاچی کماں را بدست — بہ چرم گوزن اندر آورد شست

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست
خروش از خم چرخ چاچی بخاست۔

ان اشعار کی خوبی بیان کی محتاج نہیں۔ فطرت کے قاعدہ سے جو واقعات یکے بعد دیگرے ہونا چاہییے، اُسی طرح اُن کا بیان کیا گیا ہے یعنی پہلے رستم کمر کی طرف ہاتھ لے گیا کہ ترکش سے تیر نکالے۔ پھر اُس نے ترکش میں ہاتھ ڈال کر تیر کا انتخاب کیا کہ حسب موقع تیر نکالوں اُس کے بعد تیر چن کر نکالا۔ کیونکہ تیر کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔ اب شاعر کا فرض تھا کہ دکھائے کہ وہ تیر کس شکل کا تھا۔ بتاتا ہے کہ اُس کی نوک نہایت تیز اور آبدار تھی اور سوفار میں چار پر عقاب لگے ہوئے تھے۔ پھر کمان ہاتھ میں لی۔ اُس کے بعد شست باندھی کمان کھینچنے اور شست باندھنے میں جو مخصوص حالت ہوتی ہے یعنی یہ کہ بایاں ہاتھ سیدھا کیا جاتا ہے اور داہنے ہاتھ کو خم کیا جاتا ہے بعینہ وہی تصویر چوتھے شعر میں کھینچ دی۔ کمان تنومند آدمی کھینچتا ہے تو کمان چرچراتی ہے۔ یہ سب جزئیات بیان کیے گئے ہیں

جس سے واقعہ نظر کے سامنے آگیا ہے۔ چوتھا شعر محاسن شعری کے لحاظ سے لاجواب ہے۔ چپ درست۔ ستوں کردن۔ چرخ چاچی۔ یہ الفاظ اور اصطلاحات اور اس پر بندش کی چستی اور صفائی یہ خوبیاں مذاق سلیم رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ آج تک کسی شاعر نے تیر کھینچنے کی مخصوص حالت اس حسن و خوبی سے بیان نہیں کی۔ صرف مصرعۂ اول میں تصویر کھینچی ہے اور دوسرے مصرع میں دوسرا واقعہ جو مصرع اول کا نتیجہ ہے بیان کر دیا ہے۔ یعنی کمان کا چرچرانا۔ فردوسی نے تیر مارنے کے اس قدر جزئیات بیان کیے کہ نو شعر کے بعد کہا کہ دشمن تیر کھا کر ہلاک ہوا۔ دوسرا کوئی شاعر اس واقعہ کو لکھتا تو ایک یا دو شعر میں ختم کر دیتا کیونکہ وہ جزئیات میں نہیں جا سکتا تھا جزئیات میں جانا قادر الکلامی پر دلیل ہے۔ انھی اشعار میں دو شعر اور آپ کے سننے کے قابل ہیں ؎

چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس
سپہر آں زماں دست او داد بوس

قضا گفت گیر و قدر گفت دہ
ملک گفت احسن فلک گفت زہ

جب ہم شکار کھیلنے جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ اکثر دوست احباب اور نوکر چاکر بھی ہوتے ہیں اور ادھر اُدھر گاؤں کے لڑکے شکار کھانے یا سیر و تفریح کی غرض سے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ جب ہمارے نشانہ سے شکار گرتا ہے تو دوست اپنی شائستہ زبان میں داد دیتے ہیں کہ واہ کیا نشانہ لگا ہے۔ سبحان اللہ واہ واہ کیا کہنا۔ لیکن دیہاتی دوسری طرح داد دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مارا، وہ گرا، جانے نہ پائے۔ بھاگنے نہ پائے، پکڑو وغیرہ۔ شاعر نے دونوں طرح کی داد تیر انداز کی بیان کی ہے۔ یعنی آسمان نے اُس کے ہاتھ چوم لیے پھر آسمان اور فرشتوں نے احسنت و مرحبا کہا۔ لیکن قضا نے کہا کہ پکڑ لو جانے نہ پائے۔

مصور مادی چیزوں کی تصویر خوب دکھا سکتا ہے بلکہ بعض جذبات کو بھی بذریعہ تصویر نظر کے سامنے لا سکتا ہے، مثلاً ہنسی خوشی، غم، رونا، تعجب، مایوسی، غصہ، دیوانگی وغیرہ اور شاعر کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ شاعر جن یا دیو کی تعریف میں کہتا ہے۔

دانت اُس کے تھے گورکن قضا کے　　دو نتھنے رہ عدم کے ناکے

زنبورِ سیاہ خال اُس کے
برگد کی جٹائیں بال اُس کے

اگر کوئی اچھا مصور دیو یا جن کی تصویر کھینچے ہیں اُس کے دانت اور بال اور خال ایسے ہی دکھائے جیسے کہ الفاظ کے ذریعہ بیان کیے گئے ہیں تو یقیناً اُس تصویر کو دیکھ کر ہم زیادہ حظ اٹھائیں گے۔ یا شاعر کہتا ہے ۔ع۔

شتر لب غول منظر خوک دنداں خرس پیشانی

اگر مصور لب اور دانت اور پیشانی اسی طرح دکھادے جیسی بذریعہ الفاظ بیان کی گئی ہے تو یقیناً زیادہ لطف آئے گا۔ لیکن بیشتر گوناگوں، واقعات، واردات اور حالات ایسے ہوتے ہیں جن کو دکھانے سے مصور قاصر ہے اور شاعر ہی بذریعہ الفاظ دکھا سکتا ہے اور اُن کا بیان کرنے میں پورا کامیاب ہو سکتا ہے۔ مثلاً نظامی کہتا ہے ؂

نسب نامہ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوے برد باد

شاعر کو یہ دکھانا منظور ہے کہ دارا کے مرنے سے تمام خاندان کیانی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور نسل کیانی برباد ہو گئی اور اُس کا شیرازہ بکھر گیا۔ شاعر عالم خیال میں یہ بات دیکھ رہا ہے اور دکھانا چاہتا ہے۔ اس عالم خیال کی تصویر مصور کی طاقت سے باہر ہے۔

صاحبو! میں شعرائے عجم و عرب کے کلام سے مثالیں لا رہا ہوں مجھے چاہیے کہ فردوسیِ ہند حضرت انیس کے کلام بلاغت نظام سے مرقع نگاری اور محاکات کی مثالیں عرض کروں۔ کہتے ہیں:-

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپا تا تھا جگر کو جو، شورِ آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا مُنہ سوار کا

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت عباسؑ علم بردار نہر فرات سے پانی لینے گئے ہیں۔ چونکہ اہل بیت کئی روز سے پیاسے تھے گھوڑا بھی دو روز سے پیاسا ہے۔ انھوں نے اپنی مشک پانی سے بھر لی ہے تاکہ پانی لا کر اہل بیت کو دیں۔ خود پانی نہیں پیتے ہیں اور نہ گھوڑے کو پلاتے ہیں۔ گھوڑے نے حالت

تشنگی میں نہر کو دیکھا تو اپنی فطرت کے مطابق ہنہنانے لگا۔ وہ اپنے شہسوار کے ارادہ سے واقف ہے کہ مجھے وہ پانی نہ پینے دے گا۔ گھوڑا عربی النسل مالک کا اطاعت شعار و وفادار ہے۔ لیکن ایک طرف تو اُس کو پیاس بے چین کر رہی ہے دوسری طرف آقا اُس کو روک رہا ہے تو اُس بے چارے بے زبان کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ بار بار کانپتا ہے اور اُس کا بند بند سمٹ رہا ہے۔ پیاس کی حالت میں جو حالت گھوڑوں پر طاری ہوتی ہے، اس کا فطری منظر دکھایا ہے۔

واضح ہو کہ محاکات یا مرقع نگاری بجائے خود ایک لطف انگیز چیز ہے۔ یعنی کسی چیز کا بیان ایسا کرنا کہ وہ نظر کے سامنے آجائے یا اُس کی تصویر بذریعہ قلم کے کھینچ دی جائے۔ یہ فطرۃً انسان کو مرغوب ہے چاہے وہ چیز اچھی ہو یا بری ہو۔ ایک حبشی یا زنگی جو مردم آزار بلکہ مردم خوار ہو اور جس کا حال یہ ہو کہ ع

لب خرس کے منہ خوک کا، لنگور کی گردن

اور وہ ہمارے سامنے یا ہمارے پاس آکر بیٹھ جائے تو طبیعت کو نہایت کراہت ہوگی اور اُس کا بیٹھنا ہم کو نہایت ناگوار ہوگا لیکن اگر اُسی کی تصویر ہو بہو کھینچ کر کوئی ہمارے پاس لے آئے تو ہم اُس کو دیکھ کر نہایت پسند کریں گے اور مصور کی صنعت کی نہایت تعریف کریں گے۔ اسی طرح شعر میں بذریعہ محاکات و مرقع نگاری جس چیز کا منظر دکھایا گیا ہے اُس کو ہم پسند کریں گے، چاہے وہ ناگوار یا خوش گوار چیز کا ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ شعر اگر اچھا ہو تو ضرور وہ ایک موثر چیز ہے جس طرح شعر بوجہ محاکات کے پسند ہے اسی طرح شعر بوجہ موسیقیت کے بالطبع پسند ہے یعنی شعر میں جتنا زیادہ جزو موسیقی کا ہوتا ہے اُسی قدر وہ زیادہ موثر اور دل پسند ہوتا ہے۔ کیونکہ موسیقی بجائے خود بہت دل پسند اور موثر چیز ہے۔

مصور بذریعہ تصویر زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر باوجودیکہ کبھی کبھی تصویر کا ہر جزو نمایاں نہیں کرتا مگر اپنے الفاظ سے اُس سے زیادہ اثر پیدا کرتا ہے جو خود اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ آپ جنگل میں جاتے ہیں سبزہ پر اوس پڑی ہوئی دیکھتے ہیں، اُس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں شاعر اپنے شعر کے ذریعہ آپ پر ایک نیا اثر پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا　　　　تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

یا　　ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ　　　　زمرد را بمروارید بستہ

زمرد سے مراد سبزہ اور گوہر سے مراد شبنم کے قطرے اوس جو سبزہ پر پڑی ہے، شاعر کہتا ہے کہ موتی

اور رزم دایک ہی لڑی میں ٹکے ہوئے ہیں۔

اسی طرح آپ باغ میں جاکر گلاب کے پھول دیکھتے ہیں اور کانٹے بھی اور سبزہ بھی۔ یہ خوش نما چیزیں آپ کی نظر کو خوش کرتی ہیں۔ لیکن شاعر اپنے شعر سے آپ کے دل میں ایک نیا خیال پیدا کرتا ہے چنانچہ شمیم امروہوی شاعر دربار ریاست رامپور کہتے ہیں ؎

کانٹے بھی تر زباں ہیں شگوفہ نیا یہ ہے　　سبزے کے حسن میں بھی نمک کا مزا یہ ہے

اسی طرح شاعر عالم خیال میں ایک منظر دکھاتا ہے جو مصور بذریعہ تصویر دکھانے سے قاصر ہے کہتا ہے ؎

مثل آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آپ کی ضیافت طبع کے لئے دو تین بند حضرت انیس کے اور عرض کروں۔ جن میں مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے اور مرصع نگاری کی بھی جھلک ہے۔ گرمی کا سماں دکھاتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت　　پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینہ میں تھے غازیوں کے جسم　　سونلا گئے تھے رنگ جوانان نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے تھے
توسنے ہوئے سمند زبانیں نکالے تھے

اس بند میں وہ تمام جزئیات موجود ہیں جو گرمی کا سماں دکھانے کے واسطے ضروری تھے یعنی پہاڑی راستہ پر چلنے سے جو مسافروں کو تکلیف ہوا کرتی ہے۔ پانی اور سایہ کا نہ ہونا اور سواروں کا پسینہ میں تر ہونا۔ اُن کے رنگ سونلا جانا۔ بوجہ تمازت آفتاب کے چہروں پر عباؤں کا ڈال لینا۔ گرمی اور پیاس سے گھوڑوں کا زبان نکال دینا۔ یہ سب معمولی واقعات ہیں جو گرم ملک کے سفر میں کم و بیش پیش آتے ہیں۔ رزم کا سماں ملاحظہ فرمائیے۔

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی تھیں　　نوکیں وہ تیز تھیں کہ دلوں میں کھٹکتی تھیں
نیزے تلے ہوئے تھے سنانیں چمکتی تھیں　　ترکش کھلے ہوئے تھے کمانیں کڑکتی تھیں
پیکانیں تھیں کہ پھول تھے وہ بے کھلے ہوئے
گوشوں سے تھے کمانوں کے گوشے سلے ہوئے

میدان جنگ کا سماں اس بند میں دکھایا ہے۔ برچھیوں کا نکلنا۔ اُن کی انی کا تیز ہونا اور چمکنا۔ نیزہ بازوں کا اپنے نیزے تولنا۔ ترکشوں کا کھلا ہونا اور کمانوں کا کڑکنا۔ پیکانوں کا پھول کی کلیوں کی طرح دکھائی دینا اور کمانوں کے چلوں کا کانوں تک کھنچا ہوا دکھائی دینا یہ سب میدان جنگ کے آلات حرب و ضرب اور واردات و واقعات ہیں۔ دوسرے شعر میں اور نیز ٹیپ میں صنایع لفظی بھی دلکش ہیں۔ پھر اسی شعر میں دُہرے دُہرے قافیے اور الفاظ دونوں مصرعوں کے ہم وزن ہیں۔ نیزے، ترکش، نکلے ہوئے تھے، کھلے ہوئے تھے۔ سنانیں، کمانیں، چمکتی کڑکتی۔ یہ الفاظ دونوں مصرعوں کے صنعت ترصیع ظاہر کر رہے ہیں اور ٹیپ میں پیکاں کی تشبیہ غنچے کے ساتھ پُر لطف ہے۔

صاحبو۔ مرقع نگاری اور مرصع نگاری کا موضوع ختم کرنے سے پہلے ایک بات آپ کی دلچسپی کے لئے اور عرض کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے انگریزی تعلیم پائی ہے وہ ایشیائی نظم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں خویشتن داری اور سیلف ہیلپ اور آزادی کے مضامین نہیں ہیں۔ وہ واقف نہیں ہیں کہ فقط گلستاں اور بوستاں میں خودداری اور آزادہ روی کے مضامین بھرے پڑے ہیں اسی طرح اور شعرا کے یہاں بھی بے شمار مضامین ہیں مثلاً ؎

بدستِ آہک تفتہ کردن خمیر   بہ از دست بر سینہ پیشِ امیر
گر راست سخن باشی و در بند بمانی   بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

دونان از دست دونان جہاں باشد سنان خوردن
سنان در سینہ خوردن بہ کہ از دونان دونان خوردن

شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد   حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی ست
وگرنہ راعی خلق ست زہر مارش باد   کہ ہرچہ میخورد از جزیۂ مسلمانی ست

اسی طرح ہزاروں موقعوں پر شریفانہ اور آزادانہ مضامین کی بھرمار ہے لیکن میں صرف دو شعر نظامی کے سناؤں گا اور انگریزی خواں بھائیوں کو مخاطب کر کے عرض کروں گا کہ مختصر مضمون خویشتن داری اور سیلف ہیلپ کا اس سے بہتر سنائیں جو کسی انگریزی کتاب میں انھوں نے پڑھا ہو۔

؎ بہ تنہائے خویش تا روزِ مرگ   درختے شو از خویشتن ساز برگ
چو پیلہ ز برگ کساں خورد گاز   ہمہ تن شد انگشت وقتے کرد باز

معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی روزی خود محنت کے ساتھ حاصل کرنے میں درخت بن جائے اور معاش حاصل کرنے میں کسی کا احسان مند اور محتاج نہ بنے۔ جیسے درخت اپنی ہی قوت و ہمت سے پرورش پاتا ہے۔ کسی آدمی کی مدد کا محتاج نہیں رہتا ہے۔ یہی طریق انسان کو اختیار کرنا چاہیے۔ درخت جب تک کہ بچہ ہے آدمی کی مدد کا طالب ہے لیکن جس وقت سے کہ وہ نوجوان ہوتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ بچپن میں وہ ہمارا محتاج ہے کہ ہم اُس کو پانی دیں۔ مٹی بھی اُس کے لئے اچھی اور کافی ہونی چاہیے۔ دھوپ کی بھی اُس کو ضرورت ہے۔ ہوا بھی کافی اُس کو لگنا چاہیے۔ یعنی یہ کہ اُس کے گرداگرد جھاڑیاں اور درخت نہ ہوں کہ دھوپ اور ہوا کو روکیں۔ لیکن نوجوان ہونے کے بعد وہ خود سب سامان اپنی نِہانی اور خوراک کا کر لیتا ہے۔ پانی زمین سے جذب کرتا ہے۔ اُس کی جڑیں زمین کی مٹی کو پکڑ لیتی ہیں۔ ہوا اور دھوپ وہ خود لیتا اور جذب کرتا ہے۔ اس کے سوا اُس کی ہمت اور استقلال کو بھی دیکھنا چاہیے جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور ساون بھادوں کا مینہ اور ماگھ پوس کی سردی اور برف اور اولے اور طوفان ہوا اور زمین کے زلزلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی آگ سب برداشت کرتا ہے اور جب اُس میں میوہ لگتا ہے تب وہ ہمارے پتھر اور بانس کھاتا ہے۔ لوگ اُس سے پھل پھول، چھال، لکڑی، پتے لیتے ہیں۔ دوست اور دشمن دونوں کی خاطر تواضع کرتا ہے اور بے انتہا فائدہ پہونچاتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے (یعنی سوکھ جاتا ہے) تب بھی جلانے کی لکڑی اور عمارت کی لکڑی ہم کو دیتا ہے اور زندگی اور موت دونوں حالتوں میں فائدہ پہونچانے اور فیاضی کرنے میں عذر نہیں کرتا، پس ایک درخت سے زیادہ Self help، Self respect اور Self reliance کس میں پائی جا سکتی ہے اور نہ ایسی ہمت، استقلال، تواضع، فیاضی اور رفاہ عام کسی میں ہو سکتا ہے۔

اب میں آپ کی خدمت میں توارد، سرقہ، ترجمہ، استنباط کے موضوع پر کچھ بیان کروں گا۔ آج کل نو آموز شاعر اکثر اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں شاعر نے فلاں شاعر کا مضمون چرا لیا۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ توارد تو کسی صورت میں بھی قابل الزام نہیں ہے۔ علمائے معانی نے توارد کی مثال یہ دی ہے کہ دو راہ رو ہیں۔ ایک آگے نکل گیا ہے اور جس طرف جس سڑک پر وہ چل رہا تھا، اُسی طرف اُسی سڑک پر دوسرا راہ رو بھی چل رہا ہے۔ لیکن اس کو کچھ خبر نہیں ہے کہ میرے آگے ایک مسافر چلا گیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر پہلے مسافر کے نقش قدم پر دوسرے مسافر کا قدم پڑ جائے تو کیا

مضائقہ ہے اور کیا الزام اس پر آ سکتا ہے۔ اسی طرح اغراض و مطالب متحدہ کے بیان میں توارد ہو سکتا ہے مثلاً فردوسی نے یوسف زلیخا لکھی۔ اُس کے بعد جامی نے بھی کئی سو برس بعد یوسف زلیخا لکھی۔ تمام روایات و حکایات جو فردوسی نے بیان کیں وہی جامی نے کیں تو کوئی شخص جامی کو سارق اور اُس کی یوسف زلیخا کو مسروقہ نہیں کہہ سکتا۔

توارد و سرقہ کے سوا ایک شکل ترجمہ کی ہے۔ یعنی شاعر نے دیکھا کہ کسی زبان غیر میں کسی شاعر نے نہایت عمدہ مضمون پیدا کیا ہے۔ اُس کو اُس نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے لے لیا۔ چاہے وہ اُس میں زیادہ خوبی پیدا نہ کر سکا۔ یہ جائز ہے۔ کیونکہ اس میں زبان کی ترقی مقصود ہے۔ شاعر کے واسطے یہ خوبی کی بات ہے کہ وہ اپنی زبان کو ترقی دے۔ اور عمدہ عمدہ مضامین لاکر اُس میں داخل کرے۔ جیسے ناصر علی کا شعر ہے ؎

برقع برخ افگندہ بردناز بہ باغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

اس کا ترجمہ میر افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے زبان اُردو میں بہت خوبی کے ساتھ کیا ہے اور مطلع کا مطلع رکھا ہے ؎

نقاب ڈال کے رُخ پر وہ باغ میں آئے
کہ چھن کے نکہت گل بھی دماغ میں آئے

گو یہ ترجمہ بہت اچھا ہے لیکن ناز کا لفظ ترجمہ میں نہیں آیا جو شعر کی جان ہے۔ اگر فارسی شعر سے ناز کا لفظ نکال ڈالا جائے تو پھر کچھ خوبی نہیں رہتی۔ تاہم مترجم قابل تعریف ہے۔

ان کے سوا چوتھی شکل اور ہے جس کو کتابوں میں تو سرقہ مستحسن لکھا ہے۔ لیکن عالموں اور شاعروں نے زمانہ حال میں اُس کو استنباط کہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شاعر پہلے شاعر کے مضمون کو پورا یا تھوڑا دانستہ لے لے۔ لیکن اُس مضمون کو بلند کر دے۔ یعنی اُس میں ترقی یا اضافہ کرے جیسے فردوسی کا شعر ؎

یکے خیمہ داشت افراسیاب
ز مشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جب نظامی کی باری آئی تو اُس نے دیکھا کہ مضمون تو بہت اچھا ہے مگر شاعر ثبوت نہ دے سکا اُس نے ایک لفظ تبدیل کر کے ثبوت دے دیا اور یوں کہا ؎

یکے خیمہ داشت چوں آفتاب
زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین شعر آسمان تک بلند ہوگئی۔ سعدی کہتا ہے ؎

تراہر آئنہ باید بہ شہر دیگر رفت
کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو بہت اچھا کیا تھا مگر طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے۔ عاشق کا محبوب سے یہ کہنا کہ تم یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کو چلے جاؤ کس قدر نازیبا ہے۔ لہذا اس نے ترقی دے کر شعر کو چمکا دیا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

استنباط کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ایک چراغ سے سو چراغ روشن کر لیے جائیں تو کیا مضائقہ۔ تیل اپنا، بتی اپنی، چراغ اپنا۔ کسی کے یہاں چراغ جل رہا ہے۔ اس کی لو سے چراغ روشن کر لیا تو یہ کیا چوری ہے۔ اگر یہ چوری ہے تو ٹمٹم اور فٹن اور بائیسکل، ریل گاڑی موٹر وغیرہ سب چوری میں داخل ہیں۔ کیونکہ چھکڑا اور اس کے پہیے تو موجود تھے اسی کی نقل تو ہے۔

صاحبان والا شان۔ میں آپ کے شکریہ اور خیر مقدم کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ کجا بودم اشہب کجا تاختم۔ لیکن خیال کرتا ہوں کہ آپ کی ضیافت طبع کا سامان بذریعہ اس تقریر کے کچھ ہوا ہو تو عجب نہیں۔

ساردا بل

بتاریخ ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۹ء ایک جلسہ بمقام "گاندھی اسکول فرخ آباد" اس غرض سے منعقد کیا گیا کہ رائے صاحب ہربلاس سارداصاحب نے جو کمسنی کی شادی روکنے کا قانون پاس کرایا ہے، اُس کا حال بیان کر کے ان فوائد پر روشنی ڈالی جائے جو اس قانون سے قوم اور ملک کو پہونچیں گے اور بعض لوگوں نے جو اس قانون کی مخالفت کی ہے اس کا بھی تھوڑا سا ذکر کیا جائے۔ یہ جلسہ بھارتی پاٹ شالہ کے طالبعلموں کی جماعت "بال سمتی" کی طرف سے مشرا ن صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا اور موصوف نے حسب ذیل خطبہ صدارت ارشاد فرمایا:۔

میرے بھائیو اور دوستو!

مجھے پہلے آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ نے مجھے اس جلسہ کی صدارت دے کر میری عزت افزائی کی ہے۔ اس مہربانی اور قدردانی پر اگر میں ناز کروں تو مجھے حق پہونچتا ہے۔ اس جلسہ کا مدعا یہ ہے کہ کمسنی کی شادی روکنے کا قانون جو مسٹر ہربلاس سارداصاحب نے پیش کر کے پاس کرایا ہے اور اُس کے ذریعہ جو تمام ملک و قوم پر احسان کیا ہے اُس کا بیان کیا جائے اور شکریہ ادا کیا جائے اور جو بیجا مخالفت بعض لوگوں نے غلطی سے کی ہے اُس کا اظہار کر کے اُن فوائد کی صراحت کی جائے، جو اس قانون کے نافذ ہونے سے تمام ملک کو پہونچیں گے اور جو مدد گورنمنٹ ہند اور اُس کے مددگاروں نے اور ولیسرائے نے قانون مذکور کو پاس کرانے میں پہونچائی ہے، اس کا بھی شکریہ ادا کیا جائے۔

قانون مذکور کا خلاصہ

(۱) اس قانون کے رو سے دولھا کی عمر ۱۸ برس سے کم اور دلھن کی عمر ۱۴ برس سے کم نہ ہونا چاہیے۔ اگر دونوں میں سے ایک کی عمر بھی مقررہ عمر سے کم ہو، تو سمجھا جائے گا کہ انھوں نے قانون مذکور کی خلاف ورزی کر کے کمسنی میں شادی کی۔

(۲) اگر کوئی مرد ۱۸ برس سے زیادہ اور ۲۱ برس سے کم کا ہو اور وہ کمسنوں کی شادی کا معاہدہ کرے تو

اُس کو ایک ہزار روپیہ تک جرمانہ کی سزا دی جائے گی اور اگر ایسا معاہدہ کرنے والے کی عمر ۲۱ برس سے زیادہ ہے، تو اُس کو زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کی قید محض کی سزا دی جائے گی، یا ایک ہزار روپیہ تک جرمانہ کیا جائے گا، یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص کمسنوں کی شادی کرائے، یا اُس کا انتظام کرے، یا اُس کی تکمیل یا انصرام اپنے ذمہ لے، یا اس کی ہدایت کرے تو اُس کو بھی مذکورہ بالا سزائے قید و جرمانہ دی جائے گی۔ اِلّا اُس حال میں کہ وہ ثابت کر دے کہ وہ یہ سمجھنے کی کافی وجہ رکھتا تھا کہ یہ شادی کمسنی کی شادی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی نابالغ کا ولی جائز یا ناجائز ہو اور وہ کمسنی میں اس کی شادی کرنے کی اجازت دے، یا ایسی شادی کے روکنے میں غفلت کرے، یا خود کوئی ایسا عمل کرے جو ایسی شادی واقع ہونے کا باعث ہو، تو وہ بھی سزائے مذکورہ کا سزاوار ہوگا۔

اس قانون میں صرف دو رعایتیں رکھی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عورت کو قید کی سزا نہ دی جائے گی وہ صرف جرمانہ کی مستوجب ہوگی، جبکہ جرم ثابت ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ عدالت کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ جرمانہ ادا نہ ہونے کی حالت میں زائد سزا دے، جو قانون فوجداری کی رو سے ہر مجرم کو در صورت عدم ادائے جرمانہ دی جاتی ہے۔

ہمارے یہاں، ملک ہند میں، دو تین ذاتوں میں نہایت کمسنی میں شادی ہونے کا رواج ہے مثلاً کہار، ٹھاکر، اگروال ویش وغیرہ۔ ان سب کو اس قانون سے خاص طور پر فائدہ پہونچے گا۔

یہ قانون جو ایکٹ نمبر ۱۹ سنہ ۱۹۲۹ء کہلاتا ہے، یکم اپریل سنہ ۱۹۳۰ء سے تمام ہندوستان میں جس سے برٹش انڈیا مع برٹش بلوچستان اور سنتھال پرگنات کے مراد ہے نافذ ہوگا، جو کہ "قانون انسداد شادی صغر سنی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس قانون کے واضع رائے صاحب ہر بلاس سارداصاحب کا نام نامی اور اسم گرامی ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ع۔

نام زندہ ہے تو بس جیتے ہیں مرنے والے

قانون مذکور اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ دونوں سے پاس ہو چکا ہے۔ اس کے پاس کرانے والے بڑے نامی گرامی اشخاص، مسٹر جے کار، نواب سر عبد القیوم، لالہ رام سرن داس، مسٹر نیٹسن ہوم ممبر سر جیمس کریرر اور پنڈت موتی لال نہرو صاحب ہیں، ان کے علاوہ بہت سے انگریز سرکاری

اور غیر سرکاری ممبر ہیں، جنھوں نے گورنمنٹ ہند کی تائید کی۔ اگر یہ مدد نہ کرتے تو یہ قانون ہرگز پاس نہ ہوتا۔ ہم ان حضرات کے شکر گزار ہیں۔

۱۵ر دسمبر ۲۹ء کے اخبار لیڈر میں ایک مضمون اس قانون کی تائید میں چھپا ہے جس میں بہت سے نامی گرامی مسلمانوں کے دستخط ہیں (جن کی تعداد کم سے کم تیس ہے) اس میں گورنمنٹ ہند کو مبارکباد دی ہے کہ اس نے نہایت ثابت قدمی سے سارداایکٹ کو پاس کرکے، وہ پرانی خرابیاں دور کردیں، جو بہت مدت سے قابل اصلاح سمجھی جا رہی تھیں۔ نیز یہ کہ قانون مذکور شرح محمدی کے بھی اصول کے مطابق ہے۔ ان مسلمانوں میں جامعہ ملیہ دہلی، علی گڑھ، الہ آباد، صوبہ بہار، صوبہ پنجاب اور بنگال وغیرہ کے مشاہیر شامل ہیں اور ہر معزز طبقے کے لوگ ہیں، مثلاً مولوی صاحبان، پروفیسر اور بیرسٹر وغیرہ۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلامی دنیا اس قانون کو پسند کرتی ہے اور اس سے فائدے اٹھائیگی۔

مخالفت کا ذکر

صاحبو! اس ملک میں چند قوانین، پہلے بھی ایسے پاس ہو چکے ہیں جن پر بڑی سخت مخالفت ہوئی تھی۔ ایک تو اس وقت جبکہ ستی کی رسم، روکنے کا قانون پاس ہوا تھا، اس وقت بھی پنڈتوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارے مذہب میں سرکار دخل دیتی ہے، مگر راجہ رام موہن رائے نے لارڈ بینٹنک کی کونسل میں یہ قانون پاس کرا کے ہی دم لیا۔ انھوں نے صوبہ بنگال کے مشہور اور گنوان پنڈتوں سے اور بنارس اور مدراس کے عالم فاضل برہمنوں سے، تحقیق کرکے اس مسئلہ کو پیش کیا کہ ستی ہونا، ہمارے شاستروں کے خلاف ہے، اور کہیں وید وں میں اس کا حکم نہیں۔ اس قانون کے پاس ہونے سے ہزاروں بیواؤں کی جان بچ گئی، جو خود غرض لوگوں کی طرف سے مجبور کی جاتی تھیں کہ ستی ہو جائیں۔ ستی کے حالات فرنچ ڈاکٹر برنیر نے اپنی سیر و سیاحت میں تفصیل سے لکھے ہیں، جو میں نے پڑھے ہیں۔ یہ ڈاکٹر شہنشاہ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں، دربار مغلیہ میں نوکر رہا تھا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہندوؤں میں ایسی عورتوں کی کمی تھی یا ہے، جو اپنے خاوند کی سچی محبت میں اس کی لاش پر جل جانے کے لیے اپنی خوشی سے تیار نہ ہو جاتی ہوں۔ ان کی وفاداری کو غیر اقوام نے بھی مانا ہے۔ چنانچہ فارسی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست
بر چراغ کشتہ مردن، کار ہر پروانہ نیست

جس کا مطلب یہ ہے کہ "پروانہ جلتے ہوئے چراغ پر گرتا ہے اور جل کر مر جاتا ہے، اگر بجھے ہوئے چراغ پر گر کر مر جانا ہر پروانے کا کام نہیں ہے۔ یہ صرف ہندو عورت کا کام ہے، وہ اپنے خاوند کے ساتھ جل کر مر جانے کو، اس کی مفارقت میں زندہ رہنے پر ترجیح دے دیتی ہے۔" مگر با ایں ہمہ ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں رہی جن کو صرف طعنوں کے نشتر بھونک بھونک کر ستی ہو جانے پر مجبور کیا گیا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ قانون تعزیرات ہند میں ایک ایکٹ کے ذریعہ سے، ایک ترمیم ہوئی تھی جس کو انگریزی میں "ایج آف کنسنٹ ایکٹ" اور اردو میں "قانون ہمبستری" کہتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے عورت کی عمر، جوازِ ہمبستری کے لئے، بجائے دس برس کے، بارہ برس قرار دی گئی۔ اس وقت بھی بڑی مخالفت ہوئی تھی کہ ہمارا مذہب گیا اور گورنمنٹ ہمارے مذہب میں کیوں دخل دیتی ہے، لیکن وہ قانون بھی پاس ہو گیا اور مخالفین منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس موقع پر اور نیز ستی کے روکنے پر، جو مخالفت کا طوفان ہندوستان میں اُٹھا تھا، وہ ایسا تھا کہ گویا بڑے زور شور سے، ایک سیلاب آیا، جس کا پانی لوہے کی دیواروں اور پتھر کی چٹانوں سے ٹکرایا اور ان کو ہلا دیا، مگر ان خواتین کے مددگاروں نے اس صبر و تحمل اور استقلال و ثبات سے، اس طوفان کا مقابلہ کیا کہ باید و شاید۔ اصلاحی ہوا کے خوشگوار، مگر تیز جھونکوں نے، تھوڑی ہی دیر میں، اس سیل تند رو کو نذر قلزم کر دیا اور قومی تمدن کی دیواریں اس کے نقصان سے محفوظ رہیں۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ سوشل ریفارم بھی خود نہیں کر سکتے، جب تک کہ گورنمنٹ کی مدد نہ ہو یا گورنمنٹ دخل نہ دے۔

ہندوستان ایسا ملک ہے اور اس میں اس قدر فرقے اور جماعتیں ہیں اور ہر ایک کے دستوروں، رسموں اور رواجوں میں ایسے اختلافات ہیں کہ کیسا ہی مفید کام کیوں نہ کیجیے، اس کے دشمن، برساتی کیڑوں کی طرح پیدا ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ کام کسی نہ کسی فرقہ یا جماعت کے رواج اور دستور کے خلاف ہوتا ہے اور وہ جماعت اس کی مخالفت کرنے لگتی ہے، لیکن جو لوگ نیک نیتی سے، بغیر خود غرضی کے، کوئی اچھا کام کرنے والے ہیں وہ بازی لے جاتے ہیں اور مخالفین کو شکست ہوتی ہے۔ ؏

آواز سگاں کم نکند رزق گدا را

ساردا بل کے فوائد اور کمسنی کی شادی کے نقصانات

انگریزی میں ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "کمسنی کی شادی اور کم عمری کی موت، دونوں ہم معنی ہیں، کہ جلد شادی کرنا اور جلد مرنا ایک چیز ہے کمسنی کی شادی، یوں تو مردوں کے لیے بھی مضر ہے مگر عورتوں کے لیے تو گویا قہر ہے۔ اس ملک میں لاکھوں عورتیں، بچہ پیدا ہونے کے وقت مر جاتی ہیں اور اگر اُس سے بچ بھی جاتی ہیں، تو آیندہ بیمار ہوکر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ یعنی زچہ خانہ ہی میں کوئی نہ کوئی بیماری اُن کو ایسی لگ جاتی ہے جس سے وہ جانبر نہیں ہوتیں۔ بعض ایسی ہوتی ہیں کہ اُس وقت بیمار تو نہیں ہوتیں مگر نہایت کمزور اور ناتواں ہو جاتی ہیں، جس کا باعث اکثر یہ ہوتا ہے کہ اُن کے عزیز و اقارب، بوجہ افلاس کے، اُن کو کافی اچھی خوراک نہیں دے سکتے اور نہ اُن کی پرداخت کر سکتے ہیں۔ اُن کو بسا اوقات "ٹیوبر کلوسس"، کا مرض عارض ہو جاتا ہے جس کو ہم "آنتوں کی تپ دق" کہتے ہیں۔ یونانی اطبا تپ دق کا تعلق پھیپھڑے سے بتاتے ہیں، لیکن یورپ کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ آنتوں کے خراب ہو جانے سے بھی، تپ دق لاحق ہوتی ہے۔ یہ بیماری بمقابلہ مردوں کے، عورتوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ تحقیق ہوا ہے کہ بچے جو پیدا ہوتے ہیں، وہ پچاس فی صد سے زیادہ پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں اور جو زندہ رہتے ہیں وہ نہایت کمزور رہتے ہیں اور جوانی کے پہلے مر جاتے ہیں۔ اگر جوانی تک پہونچے تو بہت کمزور اور دائم المرض رہتے ہیں اور عمر دراز نہیں ہوتے اور بہت پست ہمت ہوتے ہیں پھر وہ بھی اپنے ماں باپ کی طرح، جلد شادی ہونے سے، جلد صاحب اولاد ہو جاتے ہیں، اس وجہ سے تعلیم و تربیت اعلیٰ درجہ کی حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ نہ کوئی پیشہ اعلیٰ درجہ کا سیکھ سکتے ہیں کیونکہ اُن کو یہ فکر دامنگیر ہوتی ہے کہ ہم کسی طرح کچھ پیدا کریں تاکہ اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں۔ برخلاف ان کے، جن لڑکوں کی شادی کمسنی میں نہیں ہوتی وہی آگے چل کر کالج میں خوب جی لگا کر، پڑھتے لکھتے ہیں اور کامیابی اور ترقی حاصل کرتے ہیں، کیونکہ نہایت بفکری اور اطمینان کے ساتھ ہمہ تن، پڑھنے لکھنے ہی میں مصروف رہتے ہیں غرضکہ سیکڑوں نقصانات ہیں جو ہم کو کمسنی کی شادی کے باعث، برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ ان سب نقصانات سے ہم اس قانون کی بدولت بچیں گے اور ہماری صحت درست اور ہماری ہمت بلند ہوگی۔

دہلی میں "لیڈی ہارڈنگ کالج" میں جو لیڈی ڈاکٹر کیمبل ہیں، وہ اپنا تجربہ لکھتی ہیں "میں نے

ایک ہزار سے زیادہ ہندو عورتوں کو بچہ جننے کے وقت مدد دی، جن کی عمریں بارہ برس سے ۱۶ برس تک تھیں۔ اس کہنے میں مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں نے اُن میں اور اُن کی شکل اور وں میں جو بڑی خرابیاں دیکھیں وہ سب کمسنی کی شادی کے نتائج تھے۔" پھر آگے چل کر فرماتی ہیں کہ "حمل کے ایام میں اور وضع حمل کے بعد، دودھ پلانے کے دنوں میں آنتوں کی تپ دق کی بیماری نے اُن کو پکڑ لیا اور یہ بیماری محض اس وجہ سے ہوئی کہ بہت کمسنی میں خلاف فطرت، وہ صاحب اولاد ہوگئیں، جس کے باعث پیٹ کے تمام رگ پٹھے کمزور اور ڈھیلے پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ لڑکوں کے، یہ عارضہ لڑکیوں میں زیادہ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی لڑکیاں ۴۰ فیصدی تو پہلے ہی سال کے اندر مر گئیں اور جو باقی بچیں وہ نہایت کمزور اور پژمردہ رہیں۔"

صاحبو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ عورتیں اس قانون کے خلاف ہیں اور زیادہ عمر تک وہ اپنی لڑکیوں کو کنواری نہیں رکھنا چاہتیں۔ یہ سب غلط اور سراسر غلط ہے۔ روز اخباروں میں ہم پڑھتے ہیں کہ الہ آباد وغیرہ مشہور مقامات پر عورتوں نے جلسے کیے اور نہایت مسرت و اطمینان کے ساتھ اپنے حق میں اس قانون کو برکت و رحمت سمجھا۔

ملک میں جب سے کمسنی کی شادی نے رواج پایا، بیواؤں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بیس برس کی عمر تک مرد زیادہ مرتے ہیں اور بیس برس سے آگے عورتوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ بیس برس میں ہڈی کی نشوونما پوری ہوتی ہے اور جب تک مرد کی ہڈی کی نشوونما پوری نہ ہو جائے، اُس کے مرنے کا اندیشہ زیادہ ہے۔ پس اگر مرد کی شادی بیس برس سے کم عمر میں ہوگی، تو عورت کے بیوہ ہونے کا اندیشہ زیادہ رہے گا۔ ہمارا ملک ہند، یورپ اور امریکہ کا مقابلہ اُسی وقت کر سکے گا، جبکہ شادی کے وقت عورت کی عمر ۱۸ سال سے کم نہ ہو اور مرد کی عمر ۲۰ سال سے زائد ہو، بلکہ ۲۵ برس سے کم نہ ہو، تاکہ ۲۵ برس تک وہ تحصیل علم و ہنر سے فارغ ہو کر، اپنی معاش حاصل کرنے لگے۔ یورپ اور امریکہ میں عموماً شادی کے وقت، عورت کی عمر بیس سال سے کم نہیں ہوتی اور مرد ۲۵ سال سے کم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے مرد و زن، اُن خرابیوں سے محفوظ رہتے ہیں جو ہمارے ملک میں لاحق ہوتی ہیں۔ بیس برس کے بعد ہندوستانی عورتوں کی موت کا باعث تو صاف ظاہر ہے کہ وہ بچہ والیاں ہوتی ہیں اور یہ حالت چالیس برس تک

رہتی ہے، اس عمر تک موت کا امکان زیادہ رہتا ہے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ہندوستان کی رسم کے مطابق، خصوصاً ہندوؤں میں، لڑکیوں کے ساتھ میکے میں کیا برتاؤ ہوتا ہے اور سسرال میں کیا۔ لڑکی چاہے کنواری ہو، چاہے بیاہ کے بعد اپنے ماں باپ کے گھر آئے، بہر صورت، اُس کے حق میں اس کا میکا بہشت ہے۔ یہاں وہ منہ نہیں چھپاتی، نہایت آزادی سے رہتی اور کھاتی پیتی ہے، اپنی ہمجولیوں کے پاس، پڑوس میں جاسکتی ہے اور عورتیں اُس سے ملتی جلتی رہتی ہیں، ہر قسم کی بات چیت کرسکتی ہے، اُس کے ماں باپ، بھائی بند، اُس کے بڑے چھوٹے، برابر والے مرد و زن سب اس کو محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کبھی اس پر کوئی لعن طعن نہیں کی جاتی کوئی اُس سے ایسی محنت نہیں لیتا جو اس کو ناگوار ہو، لیکن وہ جب بہو بن کر سسرال جاتی ہے، تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میں دوزخ میں آگئی ہوں۔ میکے کی آزادی سسرال میں کہاں۔ یہاں تو وہ حوالات اور قید میں ہے۔ تمام گھر کا کام اُس کے ذمہ ہے۔ تمام گھر کا آٹا پیسنا، سب گھر کی روٹی پکانا، سب کے جھوٹے برتن مانجنا اور سب گھر کا پانی بھرنا، اُس کا خاص کام ہے۔ کوئی دوسرا شخص ان کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتا، وہ منہ چھپائے رہتی ہے، کسی سے بات نہیں کرسکتی اور یہ سب کام ایسی حالت میں انجام دیتی ہے۔ اس کی چھوٹی عمر کی کسی کو پرواہ نہیں۔ اُس کی سخت محنت و مشقت پر کسی کو رحم نہیں آتا، سسرال کے جتنے مرد و زن ہیں سب اُس کے دشمن ہیں۔ ہر طرف سے اُس پر مار پڑتی رہتی ہے۔ ہر شخص اُس کو طعن و تشنیع کرتا رہتا ہے۔ کوئی اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے والا نہیں ہوتا۔ چھوٹے سے چھوٹا قصور بھی اُس کا قابل معافی نہیں سمجھا جاتا۔ اُس کا خاوند بھی اُس کے ساتھ اکثر بدسلوکیاں، خود بھی کرتا ہے اور دوسروں کی بدسلوکیاں بھی اپنی بی بی کے حق میں جائز رکھتا ہے۔ سسرال میں جو ظلم ساس اور نند کی طرف سے ہوا کرتے ہیں، وہ تو گیتوں میں بھی گائے جاتے ہیں، کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ اسی پر قیاس کرکے غور کرنا چاہیے کہ جب شوہروں کی زندگی میں، عورتوں کا یہ حال ہے تو بیوہ ہونے کے بعد کیا برتاؤ سسرال والوں کی طرف سے ہوتا ہوگا۔ بیچاری بیواؤں کے لیے، تو اُن کے ماں باپ کا گھر بھی دوزخ ہوجاتا ہے۔ اکثر ماؤں کی طرف سے بھی بیوہ لڑکیوں کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ ہوتا ہے۔ اگر ماں نہیں ہے تو باپ اور بھائی بند بھی اُس کو روٹی کپڑا نہیں دیتے، یہی وجہ ہے کہ بیواؤں کی حالت نہایت دردناک ہے اور اُن کی آہوں کا دھواں آسمان تک دھواں دھار چھایا ہوا ہے۔

جب کوئی لڑکی کمسنی میں بیوہ ہو جاتی ہے، تب اُس کی ماں بحالت درد والم کہتی ہے کہ "ہم سے تو میری بچی کنواری ہی رہتی تو اچھا ہوتا۔ میری لڑکی کھا پی تو سکتی، رنگین کپڑا اور زیور وغیرہ تو پہن سکتی۔ اب حالت بیوگی میں وہ نہ کچھ کھا سکتی ہے، نہ پی سکتی ہے، نہ پہن سکتی ہے۔ ہائے یہ کمسنی کا جلاپا کن آنکھوں سے دیکھوں کہ میری لاڈلی کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے سے بھی محروم ہوگئی"۔ کاش ایسے درد ناک بین کرنے والی ماں، یہ سب باتیں کمسنی میں شادی کرنے کے وقت سوچتی، تو کاہے کو یہ روز سیاہ دیکھنا نصیب ہوتا۔

جب لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے تو اُن کو مدرسہ نہیں بھیجا جاتا، چاہے وہ کتنی ہی کمسن کیوں نہ ہوں۔ اب اس قانون سے، ان کو کم سے کم ۱۴ برس تو مدرسوں میں تعلیم وتربیت پانے کا موقع مل سکتا ہے، جو آٹھ دس برس کی عمر میں بیاہے جانے کے بعد کسی طرح نہیں مل سکتا۔

چونکہ والدین نے کمسنی کی شادی کر کے لڑکیوں کی جسمانی صحت کو معرض خطر میں ڈالا اور اُن کی بیوقت موت کا باعث ہوئے اور طرح طرح کی تکلیفیں لڑکیوں کو پہونچیں، لہٰذا لڑکیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ حاکم وقت سے بذریعہ قانون کے اپنی محافظت کی طلبگار ہوں۔ ہندوستان میں سوشل رفام صرف دو طرح ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ فرقوں اور ذاتوں کی جماعتیں ایسی ہوں جو اپنے افراد کے اندر اصلاحات کر سکیں۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ حاکم وقت بذریعہ قانون وہ رفارم کرے۔ اگر فرقوں اور ذاتوں میں یہ طاقت ہوتی تو اُس کے ذریعہ اصلاحات ہو سکتی تھیں۔ لیکن بہت عرصہ سے، جب سے کہ ہندوستان کی پولیٹیکل طاقت کو زوال آیا، اِن فرقوں اور ذاتوں کی طاقت کو بھی زوال آ گیا اور ان میں اتنی قوت عمل ہی باقی نہ رہی کہ کوئی اصلاح کر کے اپنی جماعت کو فائدہ پہونچا سکیں، لہٰذا حاکم وقت کے ذریعہ اب یہ کام ہونا چاہیے۔ ایک بڑے مصنف انگریزی نے لکھا ہے کہ "جب ملک میں بڑی بڑی جماعتیں ہوں، تو سب سے اچھا اور قابل اعتبار طریقہ یہ ہے کہ حاکم وقت قانون بنا کر اصلاحات کرے"۔ دنیا میں کسی جگہ اصلاحات نہیں ہوئی ہیں، بجز اس کے کہ حاکم وقت نے کی ہوں۔ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ سوشل اصلاحات عام رائے سے ہونا چاہیے، یا تعلیم وتربیت یا ذاتوں اور فرقوں کے ذریعہ، اصل میں اُن لوگوں نے نہ تو اصلاحات کی اصلیت کو سمجھا ہے، نہ وہ قانون کے منشا اور مقصد کی تہ تک پہونچے ہیں اور نہ انھوں نے ملک و قوم کی حالت زار پر غور کیا ہے۔ جب کسی جماعت کے حقوق سے انکار کیا جاتا ہے

یا اُس پر زیادتیاں کی جاتی ہیں، یا اُس کو انسانی حقوق نہیں دیے جاتے ہیں، یا اُس سے چھین لیے جاتے ہیں، تو مظلوم جماعت کو ہمیشہ حق حاصل ہے کہ حاکم وقت سے اپیل کرے اور حاکم وقت کا فرض اولین ہے کہ وہ اُس کے حقوق انسانی دلائے اور اُن کی محافظت کرے۔

انسان کی طبیعت کا خاصہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ دیکھتا ہے کہ فلاں رسم یا رواج ہمارے ملک کو نہایت نقصان پہونچا رہا ہے، مگر اس پر بھی وہ اس کو تبدیل کرنا نہیں چاہتا، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اصلاح سے وہ رسم بدجاتی رہے گی، جو مضرت پہونچا رہی ہے۔ وہ تبدیلی سے یہ تو اندیشہ نہیں کرتا کہ اس کے بعد، موجودہ حالت سے بھی زیادہ مضرت پہونچے گی مگر نادان ہمچشموں کی طعن و تشنیع کے خوف سے وہ ایسا نہیں کرتا۔ ہندوؤں کے علاوہ صوبۂ پنجاب کے مسلمانوں میں، مسلمان عورت، ورثہ کے حق سے محروم کر دی گئی ہے۔ گو کہ شریعت میں اُس کو حق دیا گیا ہے، لیکن رسم و رواج نے اُس کو ہندو عورت کی طرح محروم کر دیا ہے۔

یہ قانون جو جاری ہوا ہے اس سے بچوں کی سلامتی متصور ہے اور عورتوں کے جائز حقوق کا تحفظ اور اُن کی بقا مقصود ہے۔ اس سے یہ فائدے ہونگے کہ لڑکپن میں عورتیں کمتر بیوہ ہونگی اور لڑکیاں جو اس وقت بیمار اور تمام عمر کمزور رہا کرتی ہیں اور اُن کی موت جلد ہوتی ہے، ان سب مضرتوں سے وہ محفوظ رہینگی اور اُن کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع زیادہ ملے گا۔ تمام قوم جو نہایت کمزور اور پست ہمت ہوتی جاتی ہے، یہ نقصان اب نہ ہوگا اور لڑکے بھی قوی، جفاکش اور اولو العزم ہونگے اور دنیا میں رہ کر لطف کے ساتھ زندگی بسر کرینگے۔ زمانۂ قدیم کے ہندوؤں میں عورتوں کی تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی اور اُن کی قدر و منزلت اعلیٰ پیمانہ پر کی جاتی تھی۔ گھر کے اندر اُن کے حقوق اور اُن کے اعزاز نہایت قابلِ رشک تھے۔ ہمارے یہاں جو عورتیں سلف میں نہایت معروف و مشہور، فرد و یگانہ اور یادگارِ زمانہ گذری ہیں، وہ سب وہی عورتیں تھیں جن کی شادیاں جوانی میں ہوئی تھیں۔ اب ہندوؤں کی قوم اس قدر گر گئی ہے کہ مردوں میں تو شادی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اگر ایک مرد کی عورت مر جائے، تو وہ چار چھ دفعہ شادی کر سکتا ہے، بلکہ اپنی بی بی کی زندگی میں بھی دوسری شادی کر لیتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں عورتوں کو کوئی حق، پہلے شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی کا، نہیں دیا گیا۔ اگر ہندوؤں میں شادی کا مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ اور ایک تقدس کا مسئلہ ہے، تو کیا وجہ ہے کہ وہ مرد و زن دونوں پر

یکساں اطلاق نہ کرے۔ چونکہ مردوں نے اپنے واسطے قانون میں آسانی رکھی ہے اور عورتوں کو حق نہیں دیا ہے اور اُن پر ظلم روا رکھا ہے، اس لیے حاکم وقت نے بذریعہ قانون عورتوں کے ساتھ انصاف کر کے عورتوں کو، ظلم سے بچانا لازم سمجھا اور یہ قانون پاس کیا۔

صاحبو۔ میں نے ساردا ایکٹ کا خلاصہ اور اس کا مقصود اور منشا اور اس کے فوائد آپ کے روبرو عرض کیے ہیں جانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا عطائیانہ کہا۔ اگر کوئی شخص قانوندان آپ کے سامنے اسی موضوع پر تقریر کرتا تو وہ زیادہ موثر ہوتی اور آپ کو زیادہ لطف آتا۔ اب میں آخر میں آپ کی خدمت میں بال سبھی (جماعت طلبہ) کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، جن کی طرف سے یہ جلسہ منعقد کیا گیا ہے اور جنھوں نے ہم کو یہاں مدعو کیا ہے۔

حضرات! بال سبھی، اُن ودیارتھیوں (طالب علموں) کی جماعت ہے، جو یہاں کے "بھارتی پاٹ شالہ" میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ان کی ایک اور سبھا میں شریک ہو کر ان کا کام دیکھا ہے اور اس کو بہت پسند کیا ہے۔ ہم لوگوں کو چاہیے کہ ان کو مدد دیں اور ان کی ہمت بڑھائیں۔ کیونکہ یہی لڑکے ہیں جن پر ملک کو بھروسا ہے۔ یہی لڑکے ہیں جن پر قوم کا آسرا ہے۔ ایک مثل ہے "طلبۂ امروزہ، قوم فردا" جس کے معنی یہ ہیں کہ جو آج طالب علم ہیں وہ کل بڑے ہو کر ایک قوم بنائیںگے۔ پس ان کو آپ اسی نظر سے دیکھیں کہ یہ لڑکے کچھ مدت کے بعد ایک قوم بنائیں گے، جو سوراج لینے والی ہوگی۔ چونکہ یہ لڑکے دیش بھگتی، سیکھ رہے ہیں اور اچھے کام کر رہے ہیں، اس لیے جس طرح یہ اپنے ماں باپ کے پیارے ہیں اسی طرح ہماری آنکھوں کے بھی تارے ہیں۔ ابھی حال میں جب مہاتما گاندھی آئے تھے، تو لڑکوں نے بھی روپیہ جمع کر کے ایک تھیلی اُن کی نذر کی تھی۔ یہ چھوٹا کام نہ تھا۔ انھی میں سے بعض لڑکوں نے میری درخواست پر قومی جھنڈا نصب کرنے کے دن، یہ عہد کیا تھا کہ ہم اس جھنڈے کی آبرو اور عزت قائم رکھیںگے اور چاہے ہم پر کیسی ہی آفت آ جائے، مگر ہم جان و مال کی بازی لگا دینے سے، دریغ نہ کریں گے۔ بھارتی پاٹ شالہ کو ان پر فخر و ناز کرنا چاہیے اور ہم سب کو بھی۔

رآماین پر ایک نظر

بتاریخ ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۳۱ء پروفیسر کمار صاحب رئیس لاہور جو تھیوزافیکل سوسائٹی کے ایک رکن اعظم ہیں، بمقام سرستی بھون تشریف لائے اور ایک جلسہ عام زیر صدارت مشران صاحب منعقد ہوا۔ موصوف نے اس جلسے میں حسب ذیل خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔

بھائیو اور بہنو! مجھے پہلے آپ سب صاحبوں کا شکریہ دلی ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے مجھے اس جلسہ کی صدارت دے کر میری عزت افزائی فرمائی۔ نہایت خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے مہمان عالی شان پروفیسر کمار صاحب اس جلسہ میں رونق افروز ہیں اور اُس کی زیب و زینت کا باعث ہو رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو آپ صاحبوں سے روشناس کرنے کے لیے میں زیادہ طویل تقریر کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ چند مرتبہ پہلے بھی پروفیسر صاحب کا خیر مقدم ہم لوگ اس شہر میں کر چکے ہیں اور اُن کا نام نامی تھیوزافیکل سوسائٹی کے رکن اعظم کی حیثیت سے پنجاب اور اضلاع متحدہ میں معروف و مشہور ہے۔ اس وقت ہمارے دوست، پروفیسر صاحب موصوف رآماین پر لکچر دینگے، جو اُس برگزیدہ عالم اور فخر بنی آدم، مقتدائے عالمیاں اور پیشوائے جہانیاں یعنی سری رام چندر جی اور ملکہ فردوس جاہ عرش پناہ، مادر گیتی یعنی شری سیتا مہارانی کے سوانح حیات کی یادگار ہے، جس کو ۲۴ کرور ہندو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔

حضرات! یہ رآماین یادگار ہے اُن بے نظیر اور مشہور عالم بہادروں کی جنھوں نے لشکر جرار سمندر پار لے جاکر راون کے ایسے زبردست شہنشاہ کو شکست فاحش دی، لیکن اُس کی سلطنت کو مثل شاہان دنیا کے اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ اُسی کے خاندان کے ایک بھائی کو وہ سلطنت بخش دی جس سے مراد یہ تھی کہ راون راج جو ظلم و ستم کی یادگار تھا دنیا سے مٹا دیا جائے اور عدل و رحم کی حکومت یعنی رام راج دنیا میں قائم ہو۔

یہ رآماین یادگار ہے اس سعادتمند فرزند ارجمند کی جس نے صرف اپنے باپ ہی کے حکم کی متابعت میں نہیں، بلکہ اپنی سوتیلی ماں کے حکم کی تعمیل میں سلطنت جیسی عزیز چیز کو چھوڑ دیا اور چودہ برس جنگلوں اور

بیا بانوں میں بود و باش اختیار کی۔ مجبوری سے نہیں، بلکہ نہایت مسرت سے اپنا فرض مذہبی و اخلاقی سمجھکر۔ پھر اس جلاوطنی میں بھی اس بے نظیر بہادر نے وہ بے بہا خدمتیں انجام دیں جو کسی سے نہ ہو سکی تھیں، یعنی پہاڑوں اور جنگلوں کو ان شیاطین سے پاک و صاف کر دیا جو رشیوں اور منیوں کی عبادت میں خلل ڈالتے تھے۔ ان بھیڑ بیا بانوں میں وہ ہر وقت دیووں اور جنوں، درندوں اور زہرناک حشرات الارض سے دوچار رہتا تھا، جو اس کی خداداد قدرت کے آگے سر جھکا دیتے تھے۔

یہ راماین یادگار ہے اُن خاتونِ عالی قدر و عالی منزلت کی، اُن عفت مآب و عصمت جناب بی بی کی جنھوں نے شاہی محلوں میں ناز و نعمت سے پرورش پائی تھی، لیکن شوہر کے ساتھ جنگلوں اور بیا بانوں میں کانٹوں پر اس خوشی سے چلتی تھیں گویا پھولوں کے فرش پر چل رہی ہیں۔

یہ راماین یادگار ہے اُن سوتیلے بھائیوں کی سچی محبت کی جنھوں نے اپنے بڑے سوتیلے بھائی کی جدائی میں سلطنت کرنا گوارا نہ کی اور ایسی عزیز چیز چھوڑ دی جس کی برابر دنیا میں کوئی چیز پیاری نہیں، جس کے لیے بھائی بھائی کے خون کا پیاسا رہتا ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے باپ بیٹوں کو ہلاک کر دیتا ہے، اُن کی آنکھیں نکلوا لیتا ہے اور بیٹے باپ کو قتل کرا دیتے ہیں یا اس کو قید کر دیتے ہیں۔

یہ راماین یادگار ہے اُن محبت کرنے والے بھائیوں کی، جنھوں نے سلطنت کا لطف چھوڑ کر اپنے جلاوطن بھائی کو جنگلوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا، تاکہ اگر وہ روٹھ گیا ہو تو اُس کو منالائیں اور اسی کو تخت پر بٹھائیں اور خود اُس کی خدمت کا شرف حاصل کریں۔ لیکن جب دیکھا کہ ہمارا بھائی اپنے عہد پر مضبوط ہے اور جب تک چودہ برس گذر نہ جائیں گے کبھی وطن واپس نہیں آ سکتا، تو پھر نہایت خوشی اور مسرت دلی سے (نہ کہ مایوسی سے) اپنے بڑے بھائی کی کفش یا یعنی کھڑاؤں نہایت تعظیم و تکریم سے لے کر اپنے سر آنکھوں پر چڑھائی اور بھائی کے بجائے اُسی کو تخت سلطنت کی مسند شاہی پر رکھ دیا اور خود اُس کے سامنے کمربستہ اور دست بستہ کھڑے ہو رہے اور سلطنت کا کام، مشیروں اور وزیروں کی مانند، خادموں اور غلاموں کی طرح بخوبی تمام، اُس وقت تک انجام دیتے رہے، جب تک صادق الاقرار رام چودہ برس گزار کر جنگل سے واپس آئے۔

بھائیو اور بہنو! ہمارے کرۂ ارضی کی پیدائش کو دو ارب اور چار سال شمسی گذرے ہیں، جو ڈاکٹر مولٹن کے حساب سے مطابق ہیں، جو کہ یورپ میں سب سے بڑا مہندس گذرا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ملک

کوئی قوم اور کوئی جماعت، ایسا سعادتمند فرزند ارجمند پیش کر سکتی ہے، جیسے کہ سری رامچندر جی تھے؟ کیا زمانے میں کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی جماعت اس مدت دراز میں ایسی خاتون عالی قدر عالی منزلت اور شوہر پرست خاتون دکھا سکتی ہے، جیسی کہ سری سیتا مہارانی تھیں؟ کیا کوئی ملک کوئی قوم اور کوئی جماعت اس دوارب کے زمانۂ دراز میں ایسے محبت کرنے والے اور جان نثار بھائی بتا سکتی ہے، جیسے کہ سری رامچندر جی کے بھائی لچھمن جی اور بھرت جی تھے؟ ہرگز نہیں میں کہتا ہوں کہ زمانہ قیامت تک خود کف افسوس ملتا رہے گا کہ افسوس میں نے ایسے بے نظیر اور عدیم المثال لوگوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔

صاحبان والا شان! میں سری رام چندر جی کے عشق میں ایسا متوالا اس وقت ہو گیا کہ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا کہ ہمارے مہمان عظیم الشان عالی جناب پروفیسر صاحب لکچر دینے کے لیے اس بزم سخن میں رونق افروز ہیں اور آپ سب لوگ اُن کی تقریر دلپذیر سننے کے شائق ہیں۔ میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ میری تقریر طول کھینچ گئی۔ اب میں آپ سب بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آپ پروفیسر صاحب کا کلام فصاحت نظام بگوش دل سنیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اُن کی پوری داد دیں گے اور ہماری بہنیں بھی جو کہ خوش قسمتی سے اس جلسہ میں شریک ہیں، راماین کی مذہبی اور اخلاقی داستانوں کو بڑے شوق اور دلچسپی سے سنیں گی۔ اب میں جناب پروفیسر صاحب کی خدمت عالی میں باادب عرض کروں گا کہ پلیٹ فارم پر تشریف لائیں اور سامعین باتمکین کو اپنی جادو بیانی اور شیوا زبانی سے محظوظ فرمائیں۔

کہہ رہی ہے آج پبلک لیبریری شہر سے
میں بھی ہوں سندر نرائن جی کی زندہ یادگار
(حفیظ مجیبی)



پبلک لیبریری، فرخ آباد

سپاسنامہ اور جواب سپاسنامہ

بتاریخ ۳۱/ جولائی ۳۲ء، پبلک لائبریری فرخ آباد (قائم کردہ مشران صاحب) کی انتظامیہ کمیٹی نے لائبریری ہال میں ایک سنگ مرمر کی لوح، مشران صاحب کی یادگار میں نصب کی۔ اس تقریب میں شہر اور ضلع کے خاص و عام شریک ہوئے۔ لوح کا پتھر رائے بہادر بابو سروپ نراین وکیل و رئیس فتحگڑھ نے نصب فرمایا اور جلسۂ عام میں ایک سپاسنامہ اعتراف امتنان کے طور پر ممبران لائبریری کی طرف سے موصوف کی خدمت میں پیش کیا گیا جس کو مرزا عبدالحمید بیگ صاحب (میونسپل کمشنر و رکن لائبریری) نے پڑھکر سنایا۔ مشران صاحب نے اس کے جواب میں ایک دلکش تقریر فرمائی۔ ذیل میں سپاسنامہ اور اس کا جواب دونوں ملاحظہ کیجیے۔

سپاسنامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سپاسنامہ بعالیخدمت، فیضدرجت، جناب پنڈت سندر نراین صاحب مُشران، ایم، آر، اے، ایس (لندن) سینیر وائس پریسیڈنٹ و بانی پبلک لائبریری فرخ آباد۔

نوید عظمت و عز و وقار یار آئی — ہر ایک سمت ہے سامان محفل آرائی
برنگ گل ہیں شگفتہ خوشی سے پیر و جواں — عجیب گلشن عالم میں ہے بہار آئی

ہم لوگ لائبریری کمیٹی کے ممبر اور ہر قوم و ملت کے اشخاص اس موقع سعید پر جمع ہوکر آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ خوش قسمتی سے ہم کو یہ موقع میسر آیا ہے کہ آپ کی ۳۳ سال کی نمایاں خدمات کی یادگار میں سنگِ مرمر پر ایک کتبہ کندہ کراکر لائبریری کے کمرے میں نصب کرنا چاہتے ہیں اور اس تقریب سے شہر و فتحگڑھ کے تمام رؤساء عظام اور حکام عالیمقام یہاں انجمن آرا ہیں اور اس بزم کو زیب و زینت اور رونق و آرائش بخش رہے ہیں۔ آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں اُن کا پورا ذکر اس ضیق وقت میں کرنا محال اور لاطائل خیال ہے صرف بطور مشتے نمونہ از خروارے و قطرہ از دریا بار عرض کرتے ہیں کہ ایک ہزار روپیہ جو میونسپل بورڈ سے عطیۂ سالانہ لائبریری کو مل رہا ہے آپ کی کوشش بلیغ کا ایک ادنی کرشمہ ہے۔ اسی طرح گورنمنٹ سے چار سو روپیہ عطیہ سالانہ محض آپ نے اپنی کوشش ذاتی سے مقرر کرایا اور میونسپل بورڈ سے ایک ہزار روپیہ یکمشت ابتدا میں لیا۔ سیکڑوں کتابیں آپ نے اپنے احباب سے

نذر لائبریری کرادیں اور خود بھی دیں۔ چندہ کا ایک معتدبہ حصہ آپ کے احباب آپ کی تحریک پر دے رہے ہیں اور خود آپ اپنا چندہ ۳۳ سال سے برابر ادا فرما رہے ہیں جس کی نظیر چندہ دینے والوں میں پائی نہیں جاتی۔ اس کے علاوہ آپ نے اس کے انتظام میں دخل کافی و وافی رکھکر لائبریری کو چار چاند لگا دیے ہیں اور نہایت دیانت و امانت سے اس کا کام ضرب المثل ہو رہا ہے۔ یہ آپ کے انتظام کی خوبی ہے کہ حکام عالیمقام کی نظر میں لائبریری اسی قدر مقبول خاص ہے جس قدر عوام الناس کی نگاہ میں مطبوع عام۔ عمدہ کتابوں کا ذخیرہ آپ کی کوشش ذاتی سے ایسا موجود ہے کہ سوائے قائم گنج کی لائبریری کے کوئی دوسری لائبریری اس ضلع کے اندر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ چند دیگر اضلاع میں بھی، جو ہمارے ضلع سے بڑے ہیں، ایسا عمدہ کتب خانہ نہیں ہے۔

ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ایک وقت میں ہندو ممبروں کی تعداد لائبریری کمیٹی میں زیادہ تھی اور مسلم ممبر صرف ایک تھا، آپ نے ایک ہی وقت میں آٹھ مسلم ممبروں کا اضافہ کر دیا اور خود اُن کے نام تجویز فرمائے تاکہ ان کو مثل ہندوؤں کے لائبریری کے انتظامات میں دخل رہے اور دونوں قوموں کے حقوق یکساں رہیں، جس سے آپ مسلم بھائیوں کے دلی تشکریہ کے مستحق ہوئے۔ آپ نے ابتدائے بنیاد سے اس وقت تک لائبریری کے دشمنانِ دوست نما کے حملوں کی مدافعت اس خوبی اور حکمت عملی سے کی کہ کچھ شورش نہ ہونے پائی اور اختلافات باہمی کا فوری انسداد اس طور پر فرمایا کہ بعض مخالفین کی استمالت ہوگئی اور بعض کا استیصال جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حملے بجائے اس کے کہ لائبریری کے لیے مضر ہوتے اس کے حق میں مثمر برکات ہوئے ؎

حملہ گیری ترا کے زکسے غم باشد　　　خیر حملہ است اگر حملۂ رستم باشد

جنگِ عظیم کے دوران میں آپ نے بحیثیت سکریٹری لائبریری چار برس تک بطور وارلکچرر کے گورنمنٹ اور رعایا کی خدمت بخوبی تمام اور بخوش اسلوبی مالاکلام انجام دی اور ان عظیم الشان جلسوں میں، جو مجسٹریٹ ضلع کی صدارت میں منعقد ہوئے، آپ نے وہ فصیح و بلیغ پولیٹیکل تقریریں فرمائیں جو آپ کا علمی کارنامہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ پولیٹیکل لکچر گورنمنٹ اور رعایا کے حق میں رحمت و برکت ثابت ہوئے اور رعایا اور سرکار کی باہم خیر خواہی اور ہمدردی کے تعلقات میں بہت اضافہ ہو گیا۔ آپ کے یہ سب کام ایسے تھے جو اس وقت کے، تمام خیر خواہانِ ملک و قوم کرنا سرمایۂ نازش سمجھتے تھے۔

فارسی زبان میں صحیح اضافت پڑھنا بہت مشکل کام ہے اور اسی طرح صحیح اعراب پڑھنا بھی آسان نہیں ہے، لیکن آپ اضافت پڑھنے کے اصول و قواعد سے ایسے ماہرانہ واقف ہیں کہ اگر تمام ہندوستان سے معدودے چند اشخاص اس فن کے ماہرین جمع کیے جائیں، تو ان میں بھی آپ کو کوئی امتیازی درجہ حاصل رہے گا۔ نثر و نظم فارسی و اُردو،

صحیح اضافت اور صحیح اعراب کے ساتھ جس عمدہ لب[1] و لہجہ سے آپ پڑھ سکتے ہیں، اس کی مثال اس ضلع میں بلکہ چند اضلاع میں بھی نہیں مل سکتی۔ اسی طرح مجالس عام میں جو آپ کی تقریریں ہر قسم کے موضوع پر ہوتی رہتی ہیں، ان میں اعلیٰ درجہ کی فصاحت بیانی اور شیوا زبانی ہوتی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ فن خطابت سے بھی اعلیٰ درجہ کی واقفیت رکھتے ہیں۔ آپ کا روزمرہ، زبان اُردو میں نہایت شستہ اور فصیح و بلیغ ہے اور ان لوگوں کی طرح نہیں، جو زبان اُردو میں بے محل انگریزی الفاظ کی بھرمار کر دیتے ہیں اور جن کی زبان کو لکھنؤ کے علماء گنگا جمنی اُردو، اور عوام گڈھیر اُردو کہتے ہیں۔ جب آپ اُردو میں گفتگو کرتے ہیں تو سامع کو آپ کی انگریزی دانی کا شک بھی نہیں ہوتا، حالانکہ آپ زبان انگریزی میں بھی بہت کافی و وافی استعداد رکھتے ہیں۔

اس شہر میں ایسے لوگ شاذ و نادر پائے جاتے ہیں جو ہر قوم و مذہب کے اشخاص سے بے تعصبی اور رواداری کا برتاؤ کرتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند　　　که در آفرینش ز یک جوہر اند

آپ کی ذات والاصفات میں ہر مذہب اور ملت کے ساتھ ہمدردی اور رواداری بدرجہ غایت ہے اور آپ کا عمل ہمیشہ اس اصول پر رہا ہے کہ ؎

نہ شاید کہ بیند خردمند ریش　　　نہ بر عضو مردم نہ بر عضو خویش

شہر میں صرف آپ ایسے شخص ہیں جس کو مسلم اور عیسائی بھائی واقعی دلی محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ برادران اسلام اور برادران مسیحی کے لیے جو محبت اور قدر و منزلت اپنے دِل صفا منزل میں رکھتے ہیں، وہ اور باشندگان شہر میں ہم کمتر پاتے ہیں۔ آپ نے خلافت کمیٹیوں کی صدارت نہایت کشادہ دلی سے کی اور مستقل نائب صدر منتخب ہوئے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے آپ کو اپنا صدر یا نائب صدر اسی حالت میں منتخب کیا، جبکہ آپ کے آئینۂ دل کو تعصبات مذہبی کے زنگ سے پاک و صاف پایا اور آپ کے دل میں اسلام کی عزت اور قدر و منزلت دیکھ لی۔ مسیحی بھائیوں نے اپنی جماعت مذہبی کے عام جلسوں میں بارہا آپ کو صدارت عطا فرمائی اور یہ ادنیٰ ثبوت اس بات کا ہے کہ آپ ہر قوم اور ہر مذہب کی جماعت میں یکساں ہر دلعزیز ہیں۔

آپ نے جو خدمات بحیثیت آنریری منصف و مجسٹریٹ انجام دیں، وہ جمہور کے نزدیک بہت قدر کے لائق سمجھی گئیں جس آزادی اور معدلت گستری سے آپ نے یہ خدمتیں انجام دیں اس کی نظیر اس شہر میں کمتر ملتی ہے اور پھر جس استغناء

---

[1] یہاں لہجے سے ترنم ریزیاں مراد نہیں ہیں، بلکہ عالمانہ انداز مراد ہے ۱۲

سے آپ نے دونوں عہدوں سے دست کشی کی، وہ اس شہر کی تاریخ میں یادگار رہے گی ان عہدوں کو حاصل کرنے کے لیے لوگ ہمیشہ آرزومند رہتے ہیں، لیکن آپ نے ان عہدوں کو ایسی بے پرواہی سے چھوڑا، گویا آپ ان کی طرف سے بالکل مستغنی و بے نیاز تھے۔ صحیح یہ ہے کہ آپ نے ان عہدوں کو خود تلاش نہیں کیا، بلکہ ان عہدوں نے خود آپ کو ڈھونڈھا تھا، یعنی حکام نے آپ کی لیاقتوں اور کارگزاریوں کے صلے میں آپ کو یہ عہدے عطا فرمائے تھے کہ عامۂ رعایا کے حق میں آپ باعث رحمت اور موجب برکت ثابت ہوں۔ جب اس شہر میں ۱۹۲۱ء میں پنچایت کمیٹیاں قائم ہوئیں، تو ایک عظیم الشان جلسہ میں ہندوؤں مسلمانوں نے آپ کو سرپنچ انتخاب کیا اور اس صیغہ میں بھی آپ کی خدمتیں قابل تحسین سمجھی گئیں۔ آپ نے جس آزادی اور رحم دلی سے سنٹرل جیل کی انسپکٹری کی وہ اہل زنداں کو ہمیشہ یاد رہیگی۔ ہمارے شہر کے اکثر بڑے آدمی اس عہدے پر مقرر ہوئے مگر کسی نے بیچارے قیدیوں کے حال زار پر کوئی توجہ مبذول نہ کی۔ آپ نے ہمیشہ رپورٹیں لکھیں، جن میں آپ نے اہل زنداں کی غذا، آرام و آسایش، سیر و تفریح اور لہو و لعب کے واسطے وقتاً فوقتاً سفارشیں کیں۔ پولٹیکل قیدیوں کو خاندان کے عزیزوں سے خط و کتابت کرنے کی اجازت دلوائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل زنداں عموماً اور پولٹیکل قیدی خصوصاً، آپ کو اپنے حق میں بخشندۂ برکات سمجھتے رہے۔ پانچ برس سے آپ نے جو شاندار خدمتیں بطور "میر مجلس ہندو مسلم اتحاد بورڈ" کے انجام دیں وہ حکام عالی مقام سے پوشیدہ نہیں ہیں اور شہر و فتحگڑھ، بلکہ تمام ضلع کے ہندو مسلمان ان سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کی صدارت میں پانچ سال سے اس شہر میں نہایت امن و امان رہی ہے اور سب ہندو مسلم تیوہار، بہ تزک و احتشام اور بحسن و خوبی تمام انجام پا رہے ہیں جس کی وجہ سب سے بڑی یہ ہے کہ ہمارے اتحاد بورڈ کے میر مجلس یعنی آپ، ایسے شخص ہیں جو تعصبات مذہبی سے محض ناآشنا اور فسادات قومی کے دشمن ہیں۔ بورڈ کا کام اور انتظام اس حسن اخلاق اور حسن تدبیر سے ہوتا رہا ہے کہ پانچ برس میں کبھی ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوئی، گویا سب کام بہ اتفاق تمام انجام پاتے رہے۔ آپ کی سفارش پر آٹھ یا نو ہندو مسلم ارکان بورڈ کی خدمتوں کی قدر دانی منجانب حکام ضلع، دو مرتبہ کی گئی اور خوشنودی مزاج کی سندیں عطا ہوئیں۔

اب ہم آپ کی مدح و ثنا ختم کر کے آپ کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں ؎

الٰہی "تا رہے گلزار خلد و باغ جناں ۔۔۔ چمن میں باعث نزہت رہے نسیم بہار
بگوش دل سنیں جب تک سخن کو صاحب فہم ۔۔۔ صدف میں قطرۂ نیساں بنے دُرِ شہوار
رباب و چنگ و دف و نے ہوں زیب بزم نشاط ۔۔۔ پیالہ اور بط مے ہو اور ہو میخوار

نسیم عیش سے خنداں ہوں آپ گل کی روش
عدو کا ہو شجرِ زندگی سراپا خار

آپ کے خیر اندیش و نیاز کیش

بابو بشمبر پرشاد۔ ڈاکٹر اے، این، سینیال ہیلتھ آفیسر۔ مرزا عبد الحمید بیگ، میونسپل کمشنر۔ شب چرن لال، پنشنر منصرم ججی۔ پنڈت کیشب دیو نرل۔ بابو برجھو دیال، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول۔ شفیق علی خاں، ایڈوکیٹ۔ محمد عبد الرحمٰن، ایڈوکیٹ و آنریری منصف فرخ آباد۔ حفیظ الرحمٰن خاں مجیب، اڈیٹر مجیب اخبار۔ سید حیدر خاں میونسپل کمشنر بابو گیندن لال، ایڈوکیٹ۔ بابو سرجو پرشاد، آنریری اسسٹنٹ کلکٹر۔

ممبرانِ مجلس انتظامیہ پبلک لائبریری۔ فرخ آباد

جواب سپاسنامہ

جناب رائے بہادر صاحب، مرزا عبد الحمید بیگ صاحب، پنڈت کیشب دیو صاحب نرل ڈاکٹر سینیال صاحب اور حضرات انجمن!

مجھے سب سے پہلے آپ صاحبوں کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میری ناچیز خدمتوں کے صلے میں آپ نے سنگ مرمر کی لوح، ایوان لائبریری میں نصب فرمائی اور سپاسنامہ و قصائد و قطعات میں نہایت قدر دانی اور مہربانی کے کلمات تحریر فرمائے اور شہر و فتحگڑھ کے رؤسا، و عمائدین نے تشریف لاکر اس جلسے کو رونق بخشی اور میرا پایہ افتخار، آسمان تک بلند کر دیا۔

حضرات! اصل میں لائبریری کا حسن انتظام، ہماری لائبریری کمیٹی کی بدولت ہے، جس میں میرے بہت سے دوست شامل ہیں اور اسی جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے لیے یہ کہے کہ ؎

میرے باعث سے ہے شہرہ اس رخ پر نور کا　　جس طرح موسیٰ سے چمکا نام برقِ طور کا

میں اس وقت جدھر نگاہ اٹھاتا ہوں، مجھے سب دوست ہی دوست نظر آتے ہیں، جنھوں نے اس موسم بارش میں شہر اور فتحگڑھ سے یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ آپ کی قدر شناسیوں اور ذرہ نوازیوں کو دیکھکر اگر میں اپنی انتہائے مسرت میں خود اپنے آپ کو مبارکباد دوں تو مجھے یہ حق

پہنچتا ہے ؎

لب نمی آید بہم از خندۂ ایں شادیم　　آفتاب از آسماں گوید مبارکبادیم

بعض دوستوں نے میرے آباؤ اجداد اور ان کی لیاقتوں اور قومی خدمتوں کا ذکر اپنی تقریروں میں کیا ہے، جس کو سنکر مجھے فخر کرنا چاہیے، مگر جب میں اپنی بے ہنری کی طرف دیکھتا ہوں تو فخر و ناز کے بجائے خود بخود شرم سے سر جھک جاتا ہے ؎

بجدٍّ لا بجدٍ کلُّ مجدٍ　　وما جدٌّ بلا مجدٍ بجدٍ

اگر کوئی شخص اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پہ فخر کرے اور خود کوئی وصف یا ہنر نہ رکھتا ہو، تو اس کو فارسی میں "استخوان جد فروش" کہینگے۔ "پدرم سلطاں بود" سے کیا فائدہ! خوبی جب سمجھی جائے گی کہ انسان میں کوئی جوہر ایسا ہو جس سے اس کے آباؤ اجداد کے نام نیک کو چار چاند لگ جائیں۔ جیساکہ عرفی نے اپنے لیے کہا ہے ؎

دودمان علم را از من گرامی تر نہ زاد　　جوہر من کرد روشن گوہر آبائے من

حق یہ ہے کہ یہ اس نے اپنے حق میں سچ کہا ہے۔

صاحبان والاشان! سپاسنامہ میں، میری اُردو وفارسی دانی کا ذکر آپ صاحبوں نے کیا ہے جس کو سن سن کر اپنی بے مایگی و ہیچمدانی کے خیال سے میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں کیا اور میری زباندانی کیا۔ البتہ جناب والد ماجد مرحوم، اضافت پڑھنے کے بڑے ماہر تھے۔ مجھے انہی کے طفیل، اضافت پڑھنا قدرے آگیا ہے۔ میرے معلم، میری بدقسمتی سے اضافت پڑھنے کے ماہر نہ تھے۔ جناب والد، بمقتضائے ادب، ان سے تو کچھ نہ کہتے تھے مگر جب میں اضافت غلط پڑھتا، تو مجھے جھڑک دیتے تھے، غرضکہ انہی جھڑکیوں کی بدولت، جن کو یاد کرکے مجکو روحانی مسرت ہوتی ہے، مجھے صحت اضافت کی کسی قدر مشق ہوگئی ہے۔

ہندو مسلم اتحاد بورڈ، کا ذکر بھی از راہ عنایت و اعتراف خدمت، کیا گیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہاں چند ہندو مسلم بھائی ایسے ہیں جنھوں نے واقعی نمایاں خدمتیں انجام دی ہیں اور وہ مستحق سپاسگزاری ہیں۔ مثلاً منشی نظیر علی خاں صاحب، شیخ محبوب بخش ... صاحب، پنڈت بھجن لال صاحب، پنڈت کھنو لال راوت، پنڈت رام دلارے صاحب اوستھی وغیرہ۔ چنانچہ جب کانپور میں سخت خونریزی ہوئی، تو یہاں بھی کچھ

ہوا بدلی تھی، مگر آپ ارکان بورڈ نے جن کے نام نامی اور اسم گرامی، میں لے چکا ہوں، جا بجا شہر کے حلقوں میں جلسے کیے، منادیاں کرائیں، بازاروں میں لکچر دیے اور دوکانیں بند تھیں وہ کھلوائیں انہی حضرات کی سعی سے رام نومی کے جلوس میں تمام ہندو مسلم پبلک نے شرکت کی اور شہر فتنہ و فساد سے محفوظ رہا۔ اہل شہر کو چاہیے کہ ان سب صاحبوں کا دلی شکریہ ادا کریں، البتہ میں بھی ان صاحبان کے ساتھ رہا کرتا تھا اور تمام خدمتوں میں شریک ہوتا تھا، مگر آپ سب صاحب میرے شریک غالب تھے۔ یہ خود آپ کی مہربانی ہے کہ مجھے آپ نے اپنی جماعت کا میر مجلس بنا رکھا ہے۔ آپ نے جو الفاظ سپاسنامہ میں میرے لیے استعمال کیے ہیں ان کو سنکر مجھے یہ شعر یاد آتا ہے ؎

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق   تحسیں کنند و او خجل از پائے زشت خویش

صاحبان والا شان! یہ لائبریری نہایت خاموشی کے ساتھ، بغیر کسی شورش کے، شہر کو تعلیمی فائدے پہنچا رہی ہے جس طرح رات کو اوس گرتی ہے اور ہم لوگ عالم خواب یا حالت استراحت میں ہوتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اوس کب گری اور اس نے کیا کیا فائدے پہنچائے لیکن وہ اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ شکر ہے کہ ہماری لائبریری میں اب تک پارٹی بندی نہیں ہے، حالانکہ اس شہر میں ہر جماعت میں پارٹیاں ہیں، جو اپنا اپنا مطلب دیکھتی ہیں۔ فائدہ عام سے ان کو کوئی غرض نہیں ہے۔ ان پارٹیوں سے کام بنتا تو کمتر ہے، مگر بقول سیل صاحب، مجسٹریٹ ضلع، کام بگڑتا بیشتر ہے۔ بعض اصحاب، جن پر انگریزیت غالب ہے، فرمایا کرتے ہیں کہ انگلستان میں بھی پارلیمنٹ میں (بیت الامرا، اور بیت العوام میں) پارٹیاں ہیں اسی طرح تمام فرنگستان اور امریکہ میں بھی جماعتیں ہیں، یہاں تک کہ کوئی مسئلہ جب تک کسی پارٹی کی طرف سے پیش نہ کیا جائے تو خارج از بحث سمجھا جاتا ہے۔ میں ان حضرات کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ فرنگستان اور امریکہ کا حال جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں، صحیح ہے، مگر ہندوستان کو حالت موجودہ میں انگلستان یا امریکہ اور فرنگستان پر قیاس کر لینا، قیاس مع الفارق ہے ؎

دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا   پہنچے کب اس کو ہاتھ ہمارے غبار کا

صاحبان ذیشان! فلسفیوں کا قول ہے کہ سوسائٹی کے حالات اور اس کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مختلف تمدنی گروہ کسی نہ کسی قانونی سلسلے میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ ہر جماعت اپنی متناسب جگہ پر کسی نہ کسی اصول کے موافق، قائم ہے۔ اگر ان سلسلوں میں سے

کوئی سلسلہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو نظام قومی درہم وبرہم ہو جائے گا۔ اسی بنا پر، ایک لائبریری کو، جو طلبہ کو تعلیم وتربیت دینے والی، شہر کے تمدن کو ترقی کے مدارج پر پہنچانے والی اور رعایا وحکام وقت میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے والی ہے، یہ سمجھنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کا وجود شہر کے حق میں باعث برکت اور چشمہ رحمت اور از بس غنیمت ہے۔

میرے لیے اگر کوئی فخر کی بات ہے تو یہ ہے کہ میں تینتیس۳۳ برس سے اپنے دوستوں اور عزیز ہموطنوں کا خدمتگزار اور اطاعت شعار ہوں اور گو خود عقل وتجربہ سے بہرہ نہیں رکھتا لیکن دانشمندوں اور تجربہ کاروں کی صحبت باسعادت مجھے میسر ہے اور اگرچہ خود حلیہ علم وہنر سے عاری ہوں مگر عالموں اور ہنرمندوں کی ہمنشینی کا عادی ہوں ؎

گرچہ از نیکاں نیم، خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

موسیقی کانفرنس کا پہلا اجلاس

بھارتی پاٹ شالہ کی نمائش کے سلسلہ میں بتاریخ ۲۲،۲۳ر جنوری ۱۹۳۳ء بمقام پلراپارک، ایک موسیقی کانفرنس منعقد ہوئی، بشران صاحب نے ماسٹر شبن لال سکریٹری کانفرنس کی درخواست پر جلسہ کی صدارت فرمائی اور حسب ذیل افتتاحیہ تقریر کی۔

حضرات انجمن! مجھے سب سے پہلے ارکان کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے ،جنھوں نے مجھے اس کانفرنس کی صدارت پر ممتاز فرماکر میری عزت افزائی فرمائی ہے، جس کے لائق میں اپنے آپ کو کسی طرح نہیں سمجھتا، کیونکہ میں فن موسیقی کا مذاق سلیم اور وجدان صحیح نہیں رکھتا۔ جو کچھ اس وقت عرض کروں گا وہ بے وقت کا راگ ہوگا۔

صاحبان والاشان! آج سامعین کی جماعت تھوڑی ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ موسیقی جیسے فن شریف سے یہاں کے لوگ دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ اس وقت ساون کی ایسی گھنگھور گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے، گویا ظلمات کی کیفیت نظر آرہی ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے چوطرفہ بادل فیل بے زنجیر کی طرح جھومتے جھامتے چل رہے ہیں۔ بجلی کی کڑک اور رعد کی گرج سن سن کر دہل رہے ہیں۔ کالے کوسوں تک فضا تیرہ و تار ہے ؎

ابر بھی چل نہیں سکتا یہ اندھیرا گھپ ہے   برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل
جس طرف سے گئی بجلی پھر اُدھر آنہ سکی   قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل
کبھی ڈوبی، کبھی اچھلی، مہ نو کی کشتی   بحر اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل
ابر، پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم   برق، بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل

گو کہ آسمان موسیقی و ترنم ریزی سے محظوظ ہونے کا مقتضی ہے مگر برق و باراں کی تبسم خیزی اور اشک ریزی کو دیکھ کر یہ توقع پہلے ہی سے نہ تھی کہ آج لوگ گھروں سے باہر نکل سکیں گے۔

حضرات! ہم سب کو بھارتی پاٹ شالہ کے منتظموں اور کارکنوں کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے اس کانفرنس کے ذریعہ چاہا ہے کہ فن موسیقی کو اس شہر میں عام طور پر رواج دیں، جو ہمارے پرانے رشیوں کا نہایت دل پسند فن تھا۔ وہ رشی جنھوں نے اس علم و فن میں کمال حاصل کیا اور چہار دانگ عالم

میں سنگیت گرو کہلائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ آج ہر ملک و ہر قوم کی زبان کے موافق راگ راگنیوں اور پردوں اور تانوں کے نام جداگانہ رکھ لیے گئے ہیں، مگر وہ سب ہندوستان ہی کے سرچشمہ علوم و فنون سے نکلتے ہیں۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور میں اس علم و فن کی قدردانی بہت زیادہ تھی۔ وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ، اس علم بدیع اور فن لطیف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ظہوری جو پایۂ تخت کا شاعر تھا، اُن کی شان میں کہتا ہے کہ "علم موسیقی را اصل و جملہ را فرع می دانند" یعنی ہمارے بادشاہ کا قول ہے کہ علم موسیقی تمام علوم کی جڑ ہے اور تمام علوم، موسیقی کی شاخیں ہیں۔

صاحبو! ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایسی کانفرنسوں کے ذریعہ، اس شہر کے لوگوں کے دلوں میں شوق پیدا کریں کہ وہ اس فن لطیف سے واقف ہوں اور اس سے پورا لطف حاصل کریں جس کو قدردانوں اور ماہروں نے غذائے روح کہا ہے۔ ہم یہ بات چاہتے ہیں کہ علم و فن موسیقی کو طلبہ کی تعلیم و تربیت کا ایک جزو بنا دیں، تاکہ جس طرح وہ اور علوم و فنون سیکھتے ہیں، اسی طرح وہ تعلیمی کورس کے ساتھ علم موسیقی بھی سیکھ جائیں، ہماری خواہش ہے کہ اس فن کو ان کے کورس کا جزو لاینفک بنا دیں تاکہ ان کے دلوں میں اس سے حظ روحانی اور کیف دوامی حاصل ہو۔

واضح ہو کہ علم و فن موسیقی کی ابتدا بلکہ ایجاد شری مہادیوجی سے ہوئی، جس سے غرض یہ تھی کہ عبادت الٰہی کے لئے بکار آمد ہو اور سب اس میں جی لگا کر شرکت کریں۔ عرب و عجم میں قرآن مجید بھی خوش گلوئی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بلال حبشی جو کہ رسول مقبول صلعم کے موذن خاص تھے، ان کی اذان میں اتنی موسیقیت تھی کہ مسلمانوں کے علاوہ، کفار عرب بھی سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ میں نے انعقاد جلسہ سے پیشتر اسی بزم میں ابھی بنے خاں کو بھی سنا، جنھوں نے بڑی سریلی دھن میں کلام پاک کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، جن کو سن کر حظ روحانی حاصل ہوا اور راگ راگنی کا مزہ آگیا۔ یہ اور بات ہے کہ ملک و قوم و زبان کے لحاظ سے اکثر راگ راگنیوں اور باجوں کے نام ہندوستان و عرب و ایران میں بدل گئے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں ایک راگنی کا نام جنگلا ہے۔ اس کا نام ایران میں "زنگلہ" ہے، اسی طرح باجوں کے ہندوستانی ناموں کو، ترمیم کر کے، اپنے اپنے مذاق قومی کے موافق بنا لیا گیا ہے۔ کسی میں دو تونبیاں لگا دیں، کسی کو بجائے مضراب کے کمانچہ سے بجایا اور اس کی صورت ادل میں کچھ

تاروں کا اضافہ کرلیا۔

واضح ہو کہ ہمارے یہاں چھ راگ ہیں یعنی مالکوس، سری راگ، میگھ راگ، دیپک راگ، ہندول راگ، اور بھیرویں راگ، ہر ایک میں پانچ پانچ راگنیاں ہوتی ہیں اس طرح کل تیس ۳۰ راگنیاں ہوتی ہیں۔ ان راگنیوں کی شاخیں بیشمار ہیں۔ اکثر دو راگنیوں کا اشتراک کر دیا جاتا ہے مثلاً رات کے دو بجے دیس اور سوہنی ملا دیتے ہیں۔ یہ سب علمی اصول ہیں جن کے قواعد وضوابط شیام وید میں درج ہیں اور وہی وید مقدس اس علم وفن کا سرچشمہ ہے۔ شیام وید اکثر گا کر پڑھا یا جاتا ہے۔ راگ راگنیوں کے الگ الگ اوقات مقرر ہیں۔ بارہ بجے رات سے بارہ بجے دن تک راگنیاں بہت زیادہ سہانی ہوتی ہیں۔ بارہ بجے شب کو بھاگ کا وقت ہے۔ دیس اور سوہنی ایک بجے شب سے دو بجے تک موزوں ہے ہبرج ۳ بجے صبح دلکش ہوتا ہے۔ بھیرویں کا سہانا راگ، صبح سے آٹھ بجے تک جس وقت چھیڑ دیا جائے، دلوں کو بیچین کردے۔ سارنگ دس بجے سے گیارہ بجے تک گایا جائے تو سننے والا محو ہو کر رہ جائے۔ گوری راگ چار بجے شام کو اور شیام کلیان راگ پانچ بجے سے چراغ جلے تک الاپا جائے تو دل تڑپ اٹھے۔ اسی طرح عرب وعجم میں ان تمام راگوں کے نام اور اوقات مقرر ہیں۔

صاحبو! امام فخرالدین رازی کا قول ہے کہ موسیقی کی ایجاد حکیم فلیثا غورث حکیم یونانی نے کی، جو حضرت سلیمان کا شاگرد تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد سے موسیقی کا ایجاد ہوا۔ یہ ویسی ہی بات ہے، جیسے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ روضۂ تاج گنج اٹلی کے کاریگروں کا بنایا ہوا ہے یہاناکہ لحن داؤدی مشہور ہے اور جس وقت حضرت داؤد گاتے تھے تو ہوا کے پرندے اتر آتے تھے اور وجد کی حالت میں نغمہ سنا کرتے تھے، بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان کی آواز سے لوہا نرم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے اکثر مطربوں کے نغمہ کی تاثیرات مشہور ہیں کہ کسی نے ملار گائی اور بادل آگیا اور پانی برسنے لگا۔ ہمارے سری کشن جی مہاراج کی نسبت تو سبھی جانتے ہیں کہ آٹھ دس برس کی عمر میں جب بانسری بجاتے تھے، تو گرد و پیش کے گوالے اور ان کی عورتیں اور بچے سب گھروں سے نکل آتے تھے اور وجد کی حالت میں بانسری سنا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گائیں جن کو چرانے کے لئے سری کشن جی مہاراج لے جاتے تھے، وہ بانسری کا نغمہ سننے کے لئے آ کر گرد و پیش کھڑی ہو جاتی تھیں

مطلب یہ ہے کہ خوش آوازی اور ماہریت اور بات ہے اور موجد اور مخترع ہونا دوسری بات ہے۔
بعض کا قول ہے کہ ققنس ایک پرند ہے اس کی آواز سے حکیموں نے موسیقی کا استخراج کیا ہے۔
ققنس کا حال سن کر آپ کو مزید دلچسپی ہوگی اور اس سے ہمارے یہاں کے راگ کی عظمت آپ کو
معلوم ہو جائے گی۔ ققنس کا جوڑا نہیں ہوتا۔ اس کی نسل چلنے کا عجیب ماجرا ہے۔ اس کی منقار میں
تین سو ساٹھ سوراخ ہوتے ہیں جن سے رنگا رنگ آوازیں نکلتی ہیں جب وہ بوڑھا ہوتا ہے تو
لکڑیاں اور تنکے وغیرہ جمع کرکے ان پر بیٹھتا ہے اور دیپک راگ گاتا ہے اس سے آگ لگ جاتی
ہے اور وہ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ پھر قدرت الہٰی سے اس خاکستر پر جب پانی برستا ہے اس راکھ
میں انڈا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے ققنس کی نسل قائم رہتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ دیپک راگ
نہیں گاتا بلکہ اپنے بال و پر پھڑپھڑاتا ہے اس ہوائے گرم سے آگ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ
جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اس پرند کا ذکر ایران و عرب کے لٹریچر میں بھی موجود ہے اور وہ لوگ
اس کو موسیقار کہتے ہیں۔ لفظ موسیقی اسی کے نام سے مشتق ہے۔

صاحبان ذیشان! جس طرح ہمارے یہاں سات پردے ہیں یا سات سر ہیں۔ اسی طرح
عرب و عجم میں بارہ پردے اور سُر ہیں۔ ہمارے یہاں سُروں کے نام [1] سا، [2] رکھب، [3] گندھار،
[4] مدھم، [5] پنچم، [6] دھیوت، اور [7] نکھاد ہیں عرب و عجم میں ان کو [1] رہاوی، [2] حسینی، [3] راست، [4] حجاز، [5] بزرگ،
[6] کوچک، [7] عراق، [8] صفاہان، [9] نوا، [10] عشاق، [11] اتکلہ اور [12] بوسلیک کہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں
باجوں کے نام ہیں ستار، سارنگی، سرسنگھار، بیلا، بانسری، جل ترنگ، نس ترنگ، الغوزہ
وغیرہ وغیرہ ویسے ہی عرب و عجم میں بھی ہیں عود، بربط، دلربا، طاؤس، سرود، رود، ارغنون
سرآیہ، چنگ، رباب، استراچہ، اسرار وغیرہ۔ ان میں جو باجے کمانچے سے بجائے جاتے ہیں
وہ زیادہ سریلی آواز دیتے ہیں۔ مثلاً سارنگی، سرسنگھار وغیرہ۔

حضرات! اس وقت، بارش کے خوشگوار مناظر اور سامعین کی قلت، دونوں باتیں اس کی
مقتضی ہیں کہ میں اب اپنی تقریر کو جو بے وقت کی بھیرویں، سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے۔
دوسرے وقت کے لئے ملتوی کروں تاکہ میں اور آپ راگ اور راگنیوں کی دلکش آوازوں
سے لذت اندوز ہوں اور موسم کا لطف اٹھائیں۔

موسیقی کانفرنس کا دوسرا اجلاس

بتاریخ ۲۲ جنوری ۱۹۳۳ء بوقت ۹ بجے شب، مشران نے پھر صدارت کی اور حسب ذیل افتتاحی تقریر فرمائی۔

میرے بھائیو اور دوستو۔ اس وقت مجھے پھر آپ نے صدارت کی عزت عطا فرما کر میرا پایۂ افتخار بلند کر دیا ہے۔ میں مکرر آپ صاحبوں کا شکریہ دلی ادا کرتا ہوں۔ اس بزم نشاط اور محفل سرور کے لیے پلرا پارک جیسا دلکش مقام نہایت زیبا ہے کیونکہ پلرا پارک آج کل نمائش کے سامانوں اور رنگا رنگ پھولوں اور سبزہ زار سے ایک گلزار پر بہار بنا ہوا ہے۔ جدھر دیکھیے چمن زار نظر آتے ہیں ؎

وہ بہار آئی نوا سنج ہیں مرغانِ چمن | غیرت باغ ارم آج ہے صحن گلشن
جوش میں زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار | کیا تعجب ہے کہ گویا ہو زبان سوسن
کرم ابر بہاری سے ہے سیراب بہیں | خاک اڑ کر نہیں ہوتی ہے غبار دامن
چھیڑتی ہے جو صبا تار رگ گل پیہم | تال دیتا ہے کف برگ سے ہر نخل چمن
آب شبنم سے کہاں کاسۂ گل ہیں لبریز | جل ترنگ آج بجانے کو ہے مشتاق چمن

صاحبو۔ دنیا میں دو چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے دل کو بزور اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ایک حسنِ صورت اور دوسرے حسنِ صوت لیکن دونوں کے دیکھنے اور سننے سے دو مختلف قسم کے جذبات دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پری پیکر گل اندام عورت جو آہو چشم اور غزالۂ مشکیں ہو اور وہ ہمارے سامنے آجائے تو ہم کو اس کے نظارہ میں حظ نفسانی حاصل ہوگا یعنی نفسانی جذبات برانگیختہ ہوں گے۔ لیکن کوئی گانے والا اگر لحن داؤدی میں ہم کو گانا سنائے تو ہمارے دل میں جو جذبات پیدا ہوں گے وہ پاکیزہ اور بے لوث ہوں گے یعنی ہم کو حظ روحانی حاصل ہوگا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ؎

بہ از روئے زیباست آواز خوش | کہ آن حظ نفس است و این قوت روح

ظاہر ہے کہ خوش آوازی کے ساتھ گانا غذائے روح ہے۔ اب فرض کیجیے کہ اسی گل اندام عورت میں، جس کے حسن گلوسوز کا ذکر کر چکا ہوں، اعلیٰ درجہ کی خوش آوازی کا وصف بھی ہو، گانے بجانے کے اصول و قواعد سے بھی وہ ماہر ہو، اس پر طرّہ یہ ہو کہ رقص میں بھی وہ کامل ہو، جو خصوصاً عورت کی ذات میں ہونا نہایت تقوے شکن ہے، تو دیکھنے اور سننے والوں کا حال کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ پرکالۂ آتش قتالۂ عالم سمجھی جائے گی۔ لوگ اس کے ناچنے پر مر مر جائیں گے اور تڑپ تڑپ جائیں گے۔ فرشتے بھی اپنی فرشتہ خصلتی پر قائم نہیں رہ سکتے۔ زاہد و عابد صد سالۂ مرتاض و صوفی سب زہد و تقوے بھول کر اس کے عشق میں بیخود ہو جائیں گے۔

ہماری رامائن میں اس کی مثال موجود ہے یعنی یہ کہ مہاراجہ دسرت نے اپنے دربار کی ایک اپسرا کو سنگی رکھ کے لانے کے لیے جنگل میں بھیجا۔ وہ اپسرا حسن و جمال میں بے مثل ہونے کے علاوہ گانے اور ناچنے میں بھی بے نظیر تھی، چنانچہ شنگی رکھ کو موسیقی کا جادو کر کے دربار میں لے آئی۔

منشی شنکر دیال فرحت نے جو ہندوؤں کے مذہبی شاعر بے نظیر ہیں اس موقع کو رامائن میں نہایت خوبی سے نظم کیا ہے۔ آپ کی تفریح طبع کے لیے دو چار شعر سناتا ہوں کہتے ہیں۔

گئی بن میں وہ محبوب زمانہ ۔۔۔ زباں پر تھا تکلم پر ترانہ
لباس پر تکلف تن میں پہنے ۔۔۔ تن گلرنگ میں پھولوں کے گہنے
بہار آسا رخ گلگوں پہ آنچل ۔۔۔ کمر میں بار گیسو سے پڑے بل
غرض گت ناچتی آئی جو بن میں ۔۔۔ بہار آئی ہر اک نخل کہن میں
پڑی گوش مہامُن میں جو آواز ۔۔۔ تو دل نے سوز الفت سے کیا ساز
دیئے گیسو کی صورت دل کو جھٹکے ۔۔۔ دکھایا اس نے رخ آنچل پلٹ کے
یہ بھولے اپنی درویشی کا لٹکا ۔۔۔ تصور بندھ گیا ناگن سی لٹ کا

صاحبو۔ واضح ہو کہ تمام راگ راگنیوں اور سروں، پردوں اور باجوں کا سرچشمہ انسان کا گلا ہے۔ کوئی ماہر گانے والا خوش آواز ہو تو اس کا گانا سننے میں جو مزہ آئے گا وہ کسی باجے کی آواز میں نہیں آسکتا۔ اگر کوئی شخص گانے میں ماہر ہو مگر باجا نہ بجاتا ہو، وہ ہر باجا شاگرد کو سکھا سکتا ہے اور اس کے شاگرد باجا بجانے میں ماہر ہو سکتے ہیں۔ یہاں

ایک شخص عوض خاں تھے وہ صرف گانا جانتے تھے اور کوئی باجا بجانے کی مہارت ان کو نہ تھی لیکن ان کے شاگرد سارنگی اور ستار وغیرہ بجانے میں بہت معروف و مشہور ہوئے۔ ایک ستار باز کو میں نے خود دیکھا اور سنا۔ جس وقت وہ مشق کرتا تھا، ستار میں سے دھواں اٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ بالفرض گانے کا ماہر اندھا بھی ہو وہ بھی شاگرد کا ہاتھ باجہ پر ٹھیک پردہ پر رکھوا دے گا۔ کیونکہ جب تک شاگرد ٹھیک پردہ پر انگلی نہ رکھے گا استاد غلطی بتاتا جائے گا، کیونکہ اُس کے کان سروں سے پورے آشنا ہیں۔ ماہروں کا قول ہے کہ محض گانا بغیر مزامیر (یعنی باجوں) کے بے لطف ہے۔ گانے کے ساتھ طبلہ کی تھاپ، پائیں کی کمک، مجیروں اور گھونگروؤں کی جھنکار ضرور ہونا چاہیے اور کوئی باجا مثل سارنگی یا ہارمونیم، سرنگھار وغیرہ کے ہونا چاہیے، ورنہ گانے کا لطف اُدھورا رہ جائے گا، گانے والے کا بھی جی نہ لگے گا اور سننے والوں کا بھی مزہ بگڑ جائے گا۔ گانے کے ساتھ باجے ہوں تو بعض وقت سے بندھ جاتی ہے اور اُس وقت لطف بہت بڑھ جاتا ہے۔

صاحبو۔ ہمارے ملک میں ماہروں کا قاعدہ ہے کہ کوئی راگ راگنی بے وقت نہ گاتے ہیں نہ بجاتے ہیں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج عرب و عجم میں بھی کسی نہ کسی صورت میں رہا۔ ہمارے ملک میں اگر کسی سے بے وقت راگ یا راگنی گانے یا بجانے کی فرمائش کی جائے تو وہ بیسیوں بہانے اور عذر کرے گا اور پیشہ ور تو ہرگز ہرگز نہ بے وقت گائے گا، نہ بجائے گا۔ اگرچہ اُس کو اپنی روزی جانے کا اندیشہ ہو۔ اعتقاد یہ ہے کہ جو راگنی گائی یا بجائی جاتی ہے وہ سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور بے وقت طلبی سے اپنی توہین سمجھتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی معزز شخص کو ہم بے وقت اپنے پاس بلائیں تو وہ ہم سے کیا خوش ہوگا۔ اگر مجبوری سے وہ آ بھی جائے تو اپنی ہتک سمجھے گا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ راگنیوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور گانے بجانے والوں کو بھی۔ کسی کا گلا بیٹھ جاتا ہے کسی کا ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ بے وقت راگ راگنی گانے، بجانے سے سننے والوں کو بھی مزہ نہیں آتا اور گانے بجانے والے کا جی بھی نہیں لگتا۔ فرض کیجیے کہ اس وقت جب کہ رات کے نو بجے ہیں اگر کوئی بھیرویں گائے یا بجائے تو سب کے نزدیک ایک بھونڈی بات ہوگی اور سب حاضرین کی طبیعت مکدر ہو جائے گی۔

پس اگر بدرجہ مجبوری ایسی غلطی کسی سے سرزد ہو جائے تو وہی بات ہوگی کہ ؎

سحر کی بھیرویں کو شام کلیاں اس جگہ سمجھو — کدارا چاندنی میں ہے اندھیری رات کا بانی
تب ہی مثل مشہور ہوئی ہے کہ "بے وقت کا راگ : یا وقت وقت کا راگ"۔

صاحبو۔ یہ مثل جو کہی جاتی ہے کہ "بے تالا اچھا مگر بے سُرا بُرا" یہ بھی بہت صحیح اور سچ ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک جماعت یا محفل میں تال سم کے سمجھنے اور جاننے والے تو کمتر ہوتے ہیں جو گرفت کر سکیں کہ فلاں موقع پر گانے یا بجانے والا بے تالا ہو گیا۔ سُر کے سمجھنے والے اناڑی بھی ہوتے ہیں۔ جہاں سُر بگڑا سب کے کانوں کو برا معلوم ہوگا کیونکہ سر کا بگڑنا ویسا ہی ہے جیسے، کسی زبان میں نہایت غیر فصیح الفاظ بولنا کہ سامعین کو فوراً کھٹک جاتے ہیں اور اگر کہیں گانیوالا قدرۃً بدآواز بھی ہو تب تو تمام محفل کے لوگ نہایت مکدر ہوں گے اور یہ چاہیں گے کہ گانا بند ہو جائے۔ وہی مثل ہوگی کہ ؎

گوئی رگ جاں می گسلد نغمہ نا سازش — ناخوش تر از آوازہ مرگ پدر آوازش

ہر شخص یہ کہے گا ؎

پنبہ ام در گوش کن تا نشنوم — یا درے بکشائے تا بیروں روم

کم سمجھ لوگوں نے معمولی گویّوں سے غزلوں اور دادروں کی فرمائشیں کر کر کے اعلیٰ درجہ کے پکے گانے کی قدر و منزلت گھٹا رکھی ہے۔ چونکہ غزلوں اور دادروں کے گانے میں سیدھی سیدھی تانیں ہوتی ہیں، لہذا ناواقفوں کو ان کے سننے میں مزہ آتا ہے۔ گلی کوچوں میں اکثر لڑکے، غزلیں گاتے ہوئے پھرا کرتے ہیں۔ اگر وہ خوش آواز ہیں تو اناڑیوں کو بھی سننے میں لطف آتا ہے۔ رفتہ رفتہ رواج ایسا ہو گیا ہے کہ معمولی رقص و سرود کی محفلوں میں عوام کو خوش کرنے کے لیے مغنیہ عورتیں غزلیں اور دادرے زیادہ گایا کرتی ہیں اور ٹھمری وغیرہ کمتر، لیکن کوئی جاننے والا کسی واقف کار مغنّی سے سوائے ٹھمری، ٹپّہ، دھرپد اور اعلیٰ درجہ کے راگ راگنیوں کے دوسری فرمائش نہ کرے گا کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ غزل یا دادرے کی فرمائش کرنا، جن میں راگ راگنیوں کے اتار چڑھاؤ کچھ نہیں ہوتے، اپنی اور گانے والے دونوں کی حقارت کرنا ہے۔

صاحبو۔ علم و فن موسیقی کے ماہروں کی قدر و منزلت راجاؤں اور مہاراجاؤں اور والیان ملک کے درباروں میں زمانہ قدیم سے دیکھی جاتی ہے۔ یہ لوگ درباروں کی زیب و زینت ہمیشہ سمجھے گئے۔

بادہ و جام کی طرح اس جماعت (مغنیاں) کا لقب "غم غلط" پڑ گیا ہے۔ ہمارے ملک میں زمانۂ حال میں دو چار موسیقی داں مشہور و معروف گذرے ہیں۔ تان سین اور بیجو ریاست گوالیار میں بڑے نامی گرامی گانے اور بجانے والے تھے۔ کل کی بات ہے کہ لکھنؤ کے بندا کا لکا علم اور فن موسیقی کے بے نظیر ماہر گذرے جن کا جواب سارے ایشیا میں نہ تھا۔ جس شاگرد نے اُن کے سامنے چھ مہینے بھی زانوے ادب تہ کیا وہ اپنے وطن میں ناموری اور شہرت کی دولت ساتھ لایا۔ میری دیکھی ہوئی بات ہے کہ جمنا رام جنی یہاں کی ایک طوائف نے چند روز (شاید زیادہ سے زیادہ چھ مہینے) بندا کالکا کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ واپس آتے ہی یہاں اُس کا پہلے سے دونا شہرہ ہوگیا اور کوئی محفل ایسی نہیں ہوتی تھی جہاں وہ خاص طور پر بلائی نہ جاتی ہو۔ خصوصاً اُس کا ناچنا ایسا تھا کہ ؎

رقص میں کشتہ تھا عالم اس بت خونخوار کا　　ہر قدم کا بڑھ کے پڑنا ہاتھ تھا تلوار کا

ہندوستان میں بندا کالکا کا وہی درجہ تھا جو خسرو پرویز بادشاہ عجم کے دربار میں باربد و نگیسا کا یا عرب میں ہارون اور مامون خلفائے عباسیہ کے دربار میں اسحاق موصلی اور ابراہیم کا۔ اسحاق کا مشاہرہ دس ہزار درم ماہانہ تھا۔ جو سکہ حالی کے حساب سے ڈھائی ہزار روپیہ کے برابر ہے۔ اس کو دربار ہارون میں ندیموں کے زمرہ میں جگہ دی جاتی تھی اور دربار میں فقہا کا لباس پہن کر آنے کی اجازت تھی جس سے اُس کا اعزاز خاص ظاہر ہوتا ہے۔ یہ شخص علاوہ موسیقی کے فقہ، نحو، انساب و روایات میں مجتہدانہ کمال رکھتا تھا اور علم و فن موسیقی میں اُس کی ایجادات و اختراعات کی بدولت اُس کو وہی مرتبہ دیا گیا ہے جو حکیم فیثا غورث کو فلسفہ یونانی میں حاصل تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے بنوامیہ و عباسیہ میں ایک بھی خلیفہ ایسا نہیں گذرا جو اس علم بدیع اور فن شریف میں اچھی دستگاہ نہ رکھتا ہو۔ بڑے بڑے مذہبی علماء اس چسکے سے خالی نہ تھے۔

صاحبو۔ میں آپ کی خدمت میں اسحاق کی ماہریت کے واقعات ظاہر کروں جو تاریخ عرب سے معلوم ہوتے ہیں۔ دربار ہارون میں عیسائی کنیزیں بزم عیش و طرب میں شریک ہوتی تھیں، جو گلے میں سونے کی صلیبیں لٹکائے، کمر میں سونے کے زنار پہنے، ہاتھوں میں گلدستے

لیے ہوئے محفل نشاط میں اپنے جلوے دکھایا کرتی تھیں۔ یہ کنیزیں نہایت پری پیکر و گل اندام، اعلےٰ درجہ کی خوش آواز، گانے بجانے میں ماہر، خوشنویسی، حاضر جوابی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی میں بے نظیر تھیں اور ایک ایک لاکھ درہم کی قیمت پر خریدی گئی تھیں۔ ایک روز ایسی بیس کنیزیں جو دیبائے رومی کے قیمتی لباس زیب تن کیے ہوئے تھیں، عود اور بربط بجا رہی تھیں۔ اتفاقاً اسحاق آیا، اُس نے کہا کہ ان میں سے ایک کی مضراب تار پر غلط پڑ رہی ہے۔ پھر ذرا غور کے بعد کہنے لگا کہ فلاں صف سے غلط آواز آرہی ہے۔ ذرا دیر بعد بولا کہ سب کنیزیں بجانا بند کریں صرف فلاں کنیز بجائے۔ جب اُس کنیز نے باجا بجایا اس کی غلطی ظاہر کردی۔ اس پر تمام محفل دنگ رہ گئی۔ اُس شخص کا کمال دیکھنا چاہیے کہ اسّی تاروں میں ایک تار پر مضراب غلط پڑ رہی تھی جو اُس کے کان میں کھٹک گئی۔ باوجود اس ماہریت کے وہ ایک کنیز غریب نامی کا شاگرد تھا جس نے ایک ہزار راگنیاں ایجاد کی تھیں۔ اُس کنیز کی کاملیت کا اندازہ کرنا چاہیے جس کی شاگردی کا فخر اسحاق ایسے استاد کامل کو تھا۔ اسحاق کی خوش آوازی اور لحن داؤدی کا اندازہ یوں کرنا چاہیے کہ ہارون کا قول تھا کہ جب اسحاق گاتا ہے تو مجھے ایسا سرور موفور ہوتا ہے گویا میری سلطنت میں کوئی ملک مفتوحہ اضافہ ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ بادشاہوں کو ملک فتح کرنے پر جو خوشی ہوتی ہے وہ کسی دوسری بات سے نہیں ہوتی۔ پس دیکھنا چاہیے کہ اُس خوشی کا درجہ کتنا بڑھا ہوا تھا، جو ہارون کو اسحاق کے گانے سے ہوتی تھی۔ غریب کنیز کی سوانح عمری اور موسیقی دانی میں ایک مستقل کتاب خلیفہ معتز باللہ نے لکھی ہے۔ دو کنیزیں ایسی ہی کامل اور ماہر تھیں اور ایک کا نام بذل اور دوسری کا نام زلزل تھا، جن کا تذکرہ کتب تاریخ میں بہت بسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ دونوں ہارون رشید کے شبستان عیش کی زیب و زینت تھیں۔

حضرات! رقص و سرود کی کیا تعریف کی جائے جبکہ اس کا ذکر بھی اتنا وجد انگیز اور دلکش ہے کہ میں عالم محویت میں کہاں سے کہاں جا پہونچا۔ ع یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں تھا، کہاں ہوں میں۔ اب آپ ماہرین فن کا گانا بجانا سنیے اور دلت سے راگ راگنیوں کا لطف اٹھایئے۔

"نویوک سُدھار سبھا"

فرخ آباد میں طلبار کی ایک جماعت ہے جس کا نام ہے نویوک سدھار سبھا یعنی نوجوانوں کی اصلاح کرنے والی جماعت۔ اپریل ۳۳ء نمایش کے موقع پر اس جماعت کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت مشیران صاحب نے فرمائی۔ اس جلسے کے آغاز اور خاتمے پر موصوف نے حسب ذیل تقریریں کیں۔

آغاز کی تقریر

میرے بھائیو اور دوستو! گو کہ میں اس وقت اس جلسہ کا صدر ہوں اور آپ کا مقرر کردہ ہوں لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہرگز آپ سے بہتر نہیں ہوں۔ اس سبھا میں بہت سے حضرات موجود ہیں جو کرسی صدارت پر رونق افروز ہونے کے لئے مجھ سے زیادہ موزوں ہیں جن خیالات کی بنا پر اس سبھا میں شریک ہوا ہوں وہ عرض کرتا ہوں۔ جب آپ کی سبھا کے چند صاحب مجھے بلانے آئے تھے، اس وقت میرے دل نے یہ کہا تھا کہ جو بھائی مجھے بلانے آئے ہیں، وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں، مجھے ان کی جماعت سے اشتراک عمل کرنا چاہیے، تاکہ میرے بھائیوں کا دل بڑھے اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ زیادہ عمر کے آدمی ہم لڑکوں اور ودیارتھیوں (طالب علموں) کی سبھا میں شریک ہونے سے بچتے ہیں اور پرہیز رکھتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ میں آپ کو چھوٹا بھائی کہہ رہا ہوں، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرتبہ اور عقل میں آپ مجھ سے چھوٹے ہیں بلکہ فقط عمر میں چھوٹے ہیں، ورنہ حقیقۃً تو آپ مجھ سے بڑے ہیں، کیونکہ "بزرگی بہ عقل ست نہ بہ سال"۔ میں نے صرف اس خیال سے آپ کو چھوٹا بھائی کہہ دیا کہ وہ فطرۃً زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ جو لوگ پرانے خیالات کے ہیں، بعض وقت کہا کرتے ہیں کہ ہم کو لڑکوں سے کیا مناسبت ہے۔ ہم سینگ کٹا کر بچھڑوں میں کیوں ملیں۔ یہ مثل تو اس وقت صادق آسکتی ہے، جب ہمارے چھوٹے بھائی لہو و لعب میں مشغول ہوں، یا کوئی کام قانون اخلاق کے خلاف کریں، اس وقت البتہ بڑے بوڑھے لوگوں کا شرکت نہ کرنا واجب اور مناسب ہے، لیکن جب کہ آپ اچھے سے اچھے کام کر رہے ہیں، تو بڑوں اور بزرگوں کو چاہیے کہ ضرور آپ کے شریک ہوں، تاکہ آپ کا جذبۂ عمل اس خیال سے اور نشو و نما پائے کہ جب ہمارے بزرگ ہمارے

کاموں میں شریک ہیں اور ہماری قدر کرتے ہیں تو یقیناً یہ کام اسی قابل ہے کہ اس کو انجام دیا جائے اور ہم کو اس میں ضرور کامیابی ہوگی۔

پیارے بھائیو! اگر آپ کے بزرگ آپ کی جماعت سے دوستوں کی طرح تعاون کریں تو آپ کو چار پانچ فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ آپ کو بڑی تقویت پہونچے گی۔ دوسرے آپ کی ہمت بڑھے گی اور کام کرنے کے شوق روز بروز میں اضافہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ بزرگوں کی مدد سے آپ کو اپنے مقاصد میں بہت جلد کامیابی ہوگی۔ چوتھے عوام آپ کی جماعت کو بہت عزت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ پانچویں بوجہ نوعمری کے اگر کوئی غلطی یا فروگذاشت آپ سے سرزد ہو جائے گی تو آپ کے بزرگ آپ کو سنبھال لیں گے اور راہ راست دکھائیں گے اور ہرگز بے راہ نہ چلنے دیں گے۔

صاحبان ذیشان! چونکہ یہ جلسہ عام ہے اور سیکڑوں بھائی ہمارے ایسے شریک ہیں کہ شاید پورے طور سے اس جماعت کے حالات سے واقف نہ ہوں، لہٰذا میں اس سمتی کے اصول و قواعد آپ صاحبوں کی واقفیت کے لئے بیان کرتا ہوں۔

(۱) اس سمتی (جماعت) کی بنیاد ماہ جون ۱۹۳۰ء میں پڑی۔ اس کے جلسہ مہینے میں دو دفعہ یعنی پندرہ روز بعد ہوا کرتے ہیں۔ جن میں مختلف مضامین پڑھے جاتے ہیں، جو خاص طور پر سیاسیات سے بچے ہوئے ہوتے ہیں۔

(۲) غرض و مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کی جسمانی، دماغی اور روحانی ترقیاں ہوں۔

(۳) ایک لائبریری بھی اس جماعت نے قائم کر لی ہے جس میں ہندی، اردو اور انگریزی کتابیں قریب چھ سو کے جمع ہو چکی ہیں۔ وہ سب نوجوانوں کی اصلاح و فلاح سے متعلق ہیں اور ان کے حق میں نہایت مفید ہیں۔ اس لائبریری میں دو چار اخبار بھی ہندی، اردو اور انگریزی کے آیا کرتے ہیں۔

(۴) اس جماعت کی ایک شاخ اسکاؤٹنگ ہے، جس کے اسکاؤٹ رام لیلا، نمائش اور آریہ سماج کے جلسوں میں اور جھانکیوں کے دنوں میں سیوا سمتی کی خدمت انجام دیا کرتے ہیں۔

(۵) اس سمتی نے ایک نائٹ اسکول بھی جنوری ۱۹۳۲ء سے کھولا ہے، جس میں سات بجے شام سے نو بجے رات تک مزدوروں اور غریب لڑکوں کو بغیر فیس کے پڑھایا جاتا ہے۔ اس مدرسہ

میں اب تک بیس طلبہ داخل ہو چکے ہیں۔

(۶) ایک جماعت ہدایت کرنے والی بھی ہے، جس میں بڑے بڑے وکیل، ہندو مسلمان پانچ سات شریک ہیں جو بوقت ضرورت مشورہ دیا کرتے ہیں۔

یہ ہیں اس جماعت کے وہ حالات، جن کی بنا پر ہر شخص کو اس میں حصہ لینا ضروری ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ جلسے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو آخر میں کچھ اور عرض کروں گا۔

جب جلسہ کی تمام ضروری کارروائی ختم ہو گئی، تو ایک سپاسنامہ بزبان ہندی، مشیران صاحب کی خدمت میں جماعت مذکور کی طرف سے پیش کیا گیا، جس کا ترجمۂ اردو یہ ہے۔

عوام کی خوشی اور شکریہ کا اعلان

یہ سپاسنامہ فاضل پنڈت سندر نرائن مشران، میر مجلس ہندو مسلم اتحاد بورڈ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

عالی جناب! ہم لوگ "جماعت اصلاح و فلاح نوجوانان" کے ارکان آج آپ کو اپنے درمیان دیکھ کر نہایت احسانمند اور شکرگذار ہیں۔ آپ نے ہماری سبھا کی صدارت قبول فرما کر ہم سب لوگوں کو زیر بار احسان فرمایا۔ آپ نے اپنی زندگی میں ہمارے شہر کی جو بے نظیر خدمتیں کی ہیں، ان کو فرخ آباد کے باشندے کبھی نہ بھولیں گے۔ اس شہر میں ایسی کوئی جماعت نہیں ہے جس کی ہمت افزائی آپ نے نہ کی ہو اور اس کو اپنی شرکت سے رونق نہ بخشی ہو اور اس کو آپ نے اپنی صائب رائے سے مستفیض نہ فرمایا ہو۔ فرخ آباد کی پبلک لائبریری آپ کی بے غرضانہ اسی دو پنج سالہ خدمت کی زندہ یادگار ہے۔ ہندو مسلم اتحاد بورڈ کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے آج بھی آپ اپنی بے بہا خدمتوں کے ذریعہ اس شہر کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ یہ کچھ کم خوش قسمتی کی بات نہیں کہ ہمارے شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہم کسی طرح کا عناد نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کی خوش تدبیریوں کا نتیجہ ہے کہ آج کل کے کشمکش کے زمانے میں بھی، یہاں کے ہندو مسلمان ایک ہیں۔ یہ آپ ہی کی شخصیت ہے جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اعتماد کلی ہے اور دونوں قوموں کو آپ پر فخر ہے۔ آپ کی لیاقت اردو، فارسی، عربی، ہندی، انگریزی

وغیرہ میں مسلم ہے اور عام فہم فصیح الکلامی اور زبان آوری کا نقش ہر ایک باشندہ شہر کے دل پر مرتسم ہے۔ وہ کون سی جماعت ہے جس کو آپ نے صدق دل سے زیب و زینت نہ دی ہو۔ آپ کے انہی اوصاف پر نازاں ہوکر، ہم ناتجربہ کار نوجوان آپ کی بزرگانہ رائے سے استفادہ کرنے کے لئے آرزومندی کے ساتھ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہماری جماعت کا مقصد خاص طبقۂ نوجوانان کی جسمانی، دماغی اور روحانی ترقی کے اسباب پیدا کرنا ہے۔

امید واثق ہے کہ آپ اپنے وسیع تجربہ سے ہم نوجوانوں کو فیض بخشیں گے اور ہم لوگوں کی طرف سے جو تحفہ محقر، پیش کیا جائے گا اس کو قبول و منظور فرماکر ہم سب کو ممنون فرمائیں گے۔

خاتمہ کی تقریر

میرے بھائیو اور دوستو! آپ کی جماعت کے جو اغراض و مقاصد ہیں، ان کی خوبی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، لیکن میں آپ کی خدمت میں بعض باتیں عرض کروں گا۔ ان پر امید ہے کہ آپ توجہ مبذول فرمائیں گے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ میں سے ہر شخص پہلے اپنی ذات کی اصلاح کرے، یعنی سچ بولنا وعدہ وفا کرنا اور دیانت و امانت اختیار کرنا سیکھے۔ یاد رکھیے کہ جو عادت لڑکپن میں پڑ جائے گی وہ عمر بھر نہیں جاسکتی، خواہ اچھی ہو یا بری، اپنے آپ کی اصلاح کے ساتھ ساتھ آپ کو چاہیے کہ اپنے گھر میں، اپنے خاندان میں جس کسی کو بے راہ چلتے دیکھیے خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اس کی اصلاح تہذیب اور ادب کے دائرہ میں رہ کر کیجیے۔ انگریزی میں مثل ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "خیرات (یعنی اچھا کام) اپنے گھر سے شروع کرو۔" میں نے خاندان کی اصلاح کا ذکر کیا۔ اس کا بیان کسی قدر تفصیل سے کرتا ہوں۔ جہاں آپ نے بڑے بڑے اچھے مقاصد رکھے ہیں، وہاں ایک مقصد خاص یہ بھی رکھیے کہ عورتوں کی تنظیم و تکریم اور قدر و منزلت بڑھائی جائے اور ان پر جو ظلم و ستم ہوا کرتے ہیں ان کی روک تھام کی جائے خصوصاً دکھیاری بیواؤں کی حالت درست ہو، جو بیچاریاں اس قدر بے زبان ہیں کہ اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں کا حال بھی بیان نہیں کرسکتیں اور یونہی طائر بےزبان کی طرح گھٹ گھٹ کر مرتی رہتی ہیں۔ میں آپ کو دو مثالیں سناتا ہوں (جو اسی شہر میں موجود ہیں) جن سے آپ کو واضح ہوگا کہ یہ کام نوجوانوں کے لئے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ صرف تھوڑی توجہ ضروری ہے (پہلی مثال) ایک ماں باپ کے تین لڑکے تھے۔ باپ اپنی بیوی پر بہت ظلم و ستم کیا کرتا تھا۔ چھوٹے لڑکے کو بوجہ

کم عمری کے اس کا احساس نہیں تھا۔ بڑا بیٹا اکتساب معاش کے دھندے میں مصروف رہا کرتا تھا اور ان معاملات سے پوری طرح باخبر نہ تھا، علاوہ بریں اس کا سوبھاؤ ایسا تھا کہ باوجود واقفیت کے باپ کو روکنے سے شرماتا تھا، مگر منجھلا لڑکا جس کی عمر سولہ برس کی تھی بہت منچلا تھا اور ماں باپ کا پیار اس پر زیادہ تھا۔ اس نے باپ کو روکا اور احتجاج کیا کہ تم کیوں میری ماں کو ستاتے ہو۔ پہلے تو باپ نے اس کو ڈانٹا کہ تو کون ہے جو دخل دیتا ہے لیکن لڑکے سے وہ ظلم نہ دیکھا گیا آخر کو اس نے صاف کہا کہ میں تمھارے گھر میں رہنا پسند نہیں کرتا اور آج سے اس وقت تک فاقے پر فاقے کروں گا جب تک کہ تم قسم نہ کھاؤ کہ آیندہ کبھی میری ماں پر ظلم نہ کروگے۔ جب بڑے بھائی کو اس کے عزم بالجزم کی خبر ہوئی، تو اس نے بھی اتفاق کیا کہ باپ کے ہوش و حواس جاتے رہے اور ایک ہی دن میں اس نے اپنی ضد سب چھوڑ دی اور بیچاری ماں آفتوں سے بچ گئی اور گھر میں امن و امان اور چین اور آرام سے سب بسر کرنے لگے۔ (دوسری مثال) دو بھائی تھے جن میں بہت محبت تھی۔ ایک بھائی مر گیا اور اس کی بیوی بیوہ ہو گئی۔ دیور نے ماں باپ اور سب عزیزوں کے سامنے کہا "اب میری بیوہ بھاوج گھر کی مالک ہے اور گھر کے انتظام کے لئے تمام تر اختیارات اس کو حاصل رہیں گے اور مجھے اور تمام خاندان کے چھوٹوں اور بڑوں کو اس کا کہا ماننا پڑے گا۔ اگر کسی کو کوئی شکایت انتظام وغیرہ کے متعلق ہو تو مجھ سے کہے۔ میری بھاوج سے ہرگز نہ کہے کیونکہ اس کا دل دکھے گا" نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیوہ بھاوج نہایت آسائش و آرام اور عزت و حرمت کے ساتھ رہنے لگی اور خاوند کے مرنے کا رنج بھول گئی۔ ہر شخص مرد و زن اس کی قدر و منزلت اور عزت کرتا تھا اور اس کا حکم مانتا تھا۔ دس بارہ برس کے بعد وہ دوسرا بھائی بقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔ اس وقت اس بیچاری بیوہ نے آہ سرد بادل پر درد کھینچ کر کہا کہ میں آج بیوہ ہوئی ہوں۔ آج تک مجھ کو میرے دیور نے محسوس نہیں ہونے دیا۔

حضرات! میں نے آپ کو یہ دونوں واقعات سنا کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ہمارے نوجوان کس طرح ادب اور تہذیب کی حد میں رہ کر، گھر کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ ان کو زیادہ محنت و کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ نہ زیادہ وقت لگانا پڑتا ہے۔ صرف خاص توجہ اور تھوڑی سی ہمت و جرات کی ضرورت ہے۔ پس آپ کو لڑکیوں اور بیواؤں کی تعلیم و تربیت کا کام سپرد نہیں کرنا

چاہتا کیونکہ یہ کام اصل میں بزرگوں کا ہے اور اس کے لئے روپیہ کی بھی ضرورت ہے اور وقت کی بھی، یہ دونوں چیزیں ابھی آپ کی طاقت سے باہر ہیں کیونکہ آپ طالب علم ہیں۔ میں نے آپ کو سہل کام بتائے جو آپ نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ آپ کی کوششوں کے نتیجے نہایت ہی شاندار اور دیرپا اور ملک و قوم کے حق میں نہایت خوش قسمتی کے باعث ہوں گے۔ آپ سب صاحب، اپنے اپنے خاندانوں پر نظر ڈالیں تو آپ ضرور دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی خاتون کو کوئی تکلیف پہونچتی ہوگی اور بیچاری بیواؤں پر ظلم و ستم ہوتے ہونگے۔ پہلے بزرگوں کو عجز و انکسار کے ساتھ راہ پر لانے کی کوشش کیجیے تاکہ وہ عورتوں کی بے قدری روا نہ رکھیں اور ان کے ساتھ بدسلوکی نہ کریں۔ اگر اس طرح نہ مانیں تو فاقوں پر فاقے کیجیے اور کہہ دیجیے کہ ہم خودکشی کرینگے، بلکہ اگر ماؤں بہنوں کی سچی محبت دل میں ہے تو آپ یہ نہ سوچیں کہ جان دینے سے کیا فائدے ہوں گے۔ میں سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں سو پچاس نوجوان، بلکہ صرف بیس پچیس ہی، اس بے بہا مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جان دیدیں، تو ملک سے عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی رسم قبیح اٹھ جائے اور ہر خاندان جو عورتوں کے لئے دوزخ ہے بہشت ہو جائے۔

اگر آپ سے ہو سکے تو یہ بھی کیجیے کہ بیواؤں کے ماں باپ کو سمجھائیے کہ ان کا پنربواہ (عقد ثانی) کریں۔ پہلے آپ کو بہت مشکلات کا سامنا ہوگا لیکن "ہمت مرداں مدد خدا" ؎

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود   مرد باید کہ ہراساں نہ شود

آپ رفتہ رفتہ فاقوں اور خودکشیوں کے ذریعہ اس اچھے کام کو انجام دیجیے۔ ممکن نہیں کہ پیاری اولاد کے فاقے اور خودکشیاں ماں باپ دیکھ سکیں۔ چار ناچار آخر میں راضی ہونا ہی پڑے گا اور بیوائیں بھی نہایت خوشی سے رضامند ہو جائیں گی۔

میں آپ سے ایک اور عرض کروں گا۔ جہاں آپ اور عمدہ عادتیں اور خصلتیں اختیار کریں، وہاں سرفروشی، جاں نثاری، عزم بالجزم، استقلال، پامردی اور جانبازی کا مادہ بھی ضرور پیدا کیجیے۔ ہم سب میں اس بات کی بڑی کمی ہے، یعنی ہم ملک و قوم کے فائدے کے لئے جان دینے اور سر کٹانے سے گریز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کوششیں بارآور نہیں ہوتیں اور ملک و قوم کے اصلی فائدے مفقود ہو جاتے ہیں۔ اگر فاقوں کے ذریعہ احتجاج کی عادت ڈالیں تو اس میں بھی بہت بڑی کامیابی ہو سکتی ہے۔ آپس کی عداوت کے باعث ہمارے ملک میں ہزاروں جانیں ضایع ہو جاتی ہیں اور بجائے فائدہ کے ملک

کو نقصان پہونچتا ہے، بجائے اس کے جذبۂ سرفروشی کے ماتحت یہ جانیں ضائع ہوں تو بجائے نقصان کے ملک کو فائدہ پہنچے، سرفروشی جس کی ہدایت میں کر رہا ہوں آپ ہی نوجوانوں کا کام ہے، بوڑھے آدمی یہ کام نہیں کر سکتے۔ اول تو ان کے قویٰ ضعیف اور مضمحل ہیں، اس کے علاوہ ان کو نوجوانی میں جانبازی اور جاں نثاری نہیں سکھائی گئی تھی۔ آپ یہ کام اسی عمر میں سیکھیے آپ کو سیکھنے کا پورا موقع ہے کیونکہ آپ جس ماحول میں پرورش پا رہے ہیں وہ سراسر جاں نثاری اور سرفروشی کے مظاہروں سے پُر ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ہزاروں طالب علم اُس وقت جان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جب کوئی ڈاکٹر یا عالم کسی دوا یا عمل کا تجربہ چاہتا ہے۔ وہ نہایت دلیری سے سینہ تان کر کہتے ہیں کہ کسی جانور پر تجربہ کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ہم موجود ہیں۔ اس دوا یا عمل کی کامیابی سے ملک و قوم کے بے شمار فائدے پہونچیں گے، پس اگر ایک ہماری جان چلی جائے تو ہم کو اس کی کچھ پرواہ نہیں۔

جب جاپان اور روس کے باہم جنگ ہو رہی تھی، اس وقت جاپان کے ایک خاندان میں صرف دو شخص تھے، ماں اور بیٹا۔ ماں نے بیٹے سے کہا کہ تم لڑائی میں سپاہی بن کر کیوں شریک نہیں ہوتے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر میں مارا جاؤں تو تمھاری دیکھ بھال کون کرے گا۔ ماں یہ بات سن کر اس وقت تو چپ ہو رہی، لیکن بعد میں اس نے ایک چٹھی لڑکے کے نام لکھی کہ "چونکہ تم میری موجودگی کے باعث جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے ہو، لہذا میں خودکشی کرتی ہوں، تاکہ تم کو میری فکر نہ رہے۔" یہ چٹھی لکھ کر اس نے خودکشی کر لی۔ لڑکے نے جب یہ چٹھی پڑھی تو اس نے وہی کیا، جو اس کا فریضہ تھا اور جس کی خاطر اس کی ماں نے جان دی تھی۔

دوستو! غور کرو کہ ایک موت نے کیا بیشمار فائدے ملک و قوم کو پہونچائے یعنی ہزاروں نوجوانوں کو آمادہ جنگ کر دیا، جنھوں نے سرفروشی کر کے روس کو شکست دی اور دنیا میں نام کر دیا۔ آپ بھی ایسے ہی سرفروشی کے کام کیجیے، جن سے موت کے بعد بھی دنیا میں نام زندہ رہے۔ بس یہی میرا آخری پیام ہے اور یہی آخری تمنا۔ خدا کرے میری یہ تمنا میری زندگی ہی میں پوری ہو جائے!

سیرۃ النبیؐ

۱۶ جون ۱۹۳۵ء کو ایک جلسہ عام بمقام فتحگڑھ بہ تقریب یوم النبیؐ زیر صدارت مشران صاحب بر مکان منشی عبد الجلیل خاں صاحب وکیل منعقد ہوا۔ جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے۔ چنانچہ چند ہندوؤں نے بھی سیرت نبوی پر تقریریں کیں۔ اور اپنے خیالات ظاہر کیے۔ مسلمان طلبہ نے نظمیں پڑھیں۔ اس موقع مبارک پر مشران صاحب نے بطور خطبۂ صدارت جو کچھ ارشاد فرمایا وہ درج ذیل ہے:۔

حضرات انجمن! مجھے سب سے پہلے آپ صاحبوں کی عنایت بےغایت کا شکریۂ دلی ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے مجھے اس جلسہ کی صدارت عطا فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی اور میرا پایۂ افتخار بلند کر دیا۔

صاحبان ذیشان! آج کا روز دلفروز درحقیقت بجائے خود نوروز ہے اور یہ یوم سعید بجائے خود روز عید ہے کہ ہمارے مسلم بھائی اپنے رسول مقبول صلعم کی ولادت باسعادت کی خوشی منا رہے ہیں اور ایسا سامان عیش و نشاط جمع کر رہے ہیں، جس کی بدولت تمام در و دیوار خوشی میں سرشار اور خس و خار، گل و گلزار نظر آتے ہیں۔ چشم نرگس نے بھی ایسی بہار کم دیکھی ہوگی۔ گوش گل نے بھی ایسے پرکیف منظر کا ذکر شاذ و نادر سنا ہوگا، جس کو دیکھ دیکھ کر برگ سوسن گویا زبان حال میں کہہ رہا ہے ؎

کس چاند کے آنے کی ہے عید آج جہاں میں آثار مسرت ہیں پھر عید آج جہاں میں
پھر طور کے جلوے کی ہے دید آج جہاں میں موسیٰ کی بر آئے گی امید آج جہاں میں

اس دن کا جو سب مول سوا آنک رہے ہیں
یوسف کے عزیز آج کنوئیں جھانک رہے ہیں
شمیم امروہوی

آج دنیائے اسلام میں ہر جگہ خوشی منائی جا رہی ہے۔ جس طرح ہم ہندو دھرم کے ۲۲ کروڑ ہندوستان میں رام نومی کے دن مسرت دلی کا اظہار کرتے ہیں، جو سری رام چندر جی کا یوم ولادت باسعادت ہے جن کو ہم شہنشاہ اجودھیا اور فاتح لنکا کہتے ہیں اور لاکھوں برس سے پیشوائے جہان و جہانیاں اور مقتدائے عالم

وعالمیاں سمجھتے چلے آتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے لیے آج مسرت تازہ اور بہجت بے اندازہ کا دن ہے، جس کی اہمیت کا اظہار زبان کند بیان سے ناممکن ہے۔

ہندو اور مسلم بھائیو! جناب پیمبر صاحب صلعم کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کا احصا کرنا اس ضیق وقت میں محال بلکہ لاطائل خیال ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کریں کیا مجال ہے۔ لہذا بطور مشتے نمونہ از خروارے اور قطرۂ از دریا بار عرض کروں گا۔

صبر و شکر

جناب پیمبر صاحب کا یہ طریق تھا کہ ہمیشہ رنج ومصیبت میں خداوند تعالےٰ کا شکر ادا کرتے تھے، جو خاصان خدا کا حصّہ ہے۔ عام لوگ اس طرح شکر نہیں کرسکتے بلکہ اُن کے لیے تو پورے طور پر صبر کرنا بھی آسان نہیں۔ رنج ومصیبت میں شکر کرنا صوفیانہ طریق ہے، جو دنیاداروں کے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی پہاڑ کو کاٹنا۔ آنحضرت کی اولاد ذکور باختلاف روایات کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی۔ لڑکیوں کی تعداد چار تھی۔ لیکن حضرت فاطمہؓ زہرا خاتون جنت کے سوا سب اولاد نے کمسنی یا جوانی میں جناب پیمبر صاحب کی آنکھوں کے سامنے بقضائے الٰہی قضا فرمائی۔ یہ زخم ایسا ہوتا ہے جو عمر بھر مندمل نہیں ہوتا۔ اِن حادثات کا اثر فقط اس قدر ہوا کہ چشمہائے مبارک بمقتضائے محبت فطری اشک آلود ہوگئیں لیکن زبان و دل پر ہمیشہ صبر وسکوت کی مہر لگی رہی اور عمر بھر کبھی کوئی کلمہ قضا و قدر کی شکایت کا زبان مبارک سے نہ نکلا بلکہ صبر و شکر فرمایا۔ آنحضرت کے صبر و شکر کی شان ظاہر کرنے کے لیے مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کروں۔ شیراز کے حمام میں دو صوفی جمع ہوئے۔ ایک بلخی اور دوسرا نیشاپوری۔ مثل ہے کہ "ولی را ولی می شناسد" دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ بلخی نے پوچھا کہ "نیشاپور میں صوفیوں کا کیا حال ہے؟" جواب ملا کہ "مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں ورنہ صبر کرتے ہیں۔" بلخی نے کہا کہ یہ عادت تو بلخ میں کتّوں کی بھی ہے۔ نیشاپوری نے دریافت کیا کہ "پھر بلخ میں صوفیوں کا حال کیا ہے؟" جواب دیا کہ "مل جاتا ہے تو بذل کر دیتے ہیں ورنہ شکر کرتے ہیں۔" یہی وہ شکر ہے جو اخلاق محمدیؐ میں داخل ہے اور صوفیوں نے یہ صبر و شکر اور رضا و تسلیم سب پیمبر صاحب ہی سے سیکھا ہے۔ اُن کی امت کو اِن اوصاف سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ میں نے بھی آنحضرت کے سوانح حیات پڑھ کر، اپنے لائق صبر و شکر کرنا سیکھا ہے اور مجھے اس کا اعتراف ہے۔

توکل

حضرت بلال جو حضور پر نور کے خادمِ خاص، موذن اور مہمات خانگی کے انجام دینے والے تھے، جب ہر شام کو یہ خبر دیتے تھے کہ ازواج مطہرات کے یہاں کل کے واسطے کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے اور مستحقین کو دیدی گئی ہے، تب جناب پیمبر صاحب گھر میں تشریف لے جاتے تھے، لیکن اپنی امت کو مصلحتاً اس قسم کے توکل کی تاکید نہیں فرماتے تھے، کیونکہ جانتے تھے کہ ہر شخص اس قدر اپنے نفس پر قادر نہیں ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ایک عرب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اثنائے کلام میں آپ نے پوچھا کہ تم نے اپنا اونٹ کہاں چھوڑا۔ جواب دیا کہ خدا کے بھروسے پر۔ آپ نے فرمایا، نہیں، درخت سے باندھ کر خدا کے بھروسے پر چھوڑنا چاہیے تھا۔ اِس ہدایت سے دو نکتے نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا عالم اسباب ہے، تدبیر سے غافل نہ ہو ع کہ خر بستہ بہ گرچہ دزد آشناست۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اونٹ ایسا جانور ہے کہ ایک بچہ اُس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے اُس کو لے جا سکتا ہے، وہ اطاعت سے منہ نہیں موڑتا، اِلّا اُس وقت کہ اُس کو خطرہ معلوم ہو۔ پس جناب پیمبر صاحب کا منشا یہ تھا کہ ایسا جانور جو فطرۃً نہایت مطیع اور عرب میں نہایت بکار آمد خصوصًا حالت سفر میں ہے، کیوں اس کی طرف سے غفلت کی جائے۔ اونٹ کے اوصاف اور اُس کا بکار آمد ہونا، فیضی فیاضی نے ایک ہی شعر میں کیا خوب نظم کیا ہے۔ کہتا ہے ؎

کماں گردن و تیز رو ہمچو تیر　　　　چو تیر و کماں در سفر ناگزیر

حضرات! اس مثال سے آپ پر واضح ہوا ہوگا کہ پیمبر صاحب کس قسم کا توکل اپنی امت کو سکھاتے تھے۔ اُن کی ہدایت ہمیشہ یہ رہی کہ اپنی طرف سے جد و جہد اور سعی و کوشش کرنے کے بعد نتیجہ کے لیے خداوند تعالیٰ پر بھروسا کرو، چنانچہ آپ کا قول ہے کہ "اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ"۔ اس کے برخلاف ہمارے ملک کے علمائے دین جس قسم کا توکل سکھاتے ہیں، وہ یہ ہے ؎

کارساز ما بہ فکر کار ما　　　　فکر ما در کار ما آزار ما

یا یہ کہ ؎ ہر چہ نصیب است بہم می رسد　　　　گر نستانی بہ ستم می رسد

لیکن، جناب پیمبر صاحب اِس کو کاہلی اور سستی پر محمول فرماتے تھے۔ وہ ہرگز گدائی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور ہمیشہ محنت و مشقت سے روزی پیدا کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ ان کی نظر میں توکل

کا فلسفہ یہ تھا کہ انسان تدبیر کرے اور اس کی کامیابی میں تقدیر پر توکل رکھے۔

عزم و استقلال

اشاعت و حفاظت اسلام کی غرض سے جناب رسول کریم صلعم نے مکّہ سے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی اور تبلیغ و فروغ اسلام میں سخت سے سخت تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں اور خونخوار لٹیروں سے معرکہ آرائیاں کیں۔ بعض مرتبہ غاروں میں پناہ لینا پڑی، لیکن دامنِ صبر وستِ استقلال سے نہ چھوٹا۔ دشمنوں کا حملہ ہو رہا ہے، لشکر اسلام سے معرکہ کارزار گرم ہے، مگر وہ شہنشاہ عرب از راہ انکسار زمین پر سجدہ میں گرا ہوا ہے اور فتح اسلام کے لیے دعا مانگ رہا ہے۔ کبھی مسجد نمازیوں اور صحابہ کرام کے لیے سجدہ گاہ اور خانقاہ بن جاتی تھی تو کبھی عجم و عرب کی مہمات کے واسطے سرداران لشکر کی مشورت گاہ اور کارگاہ ہو جاتی تھی۔ وہ شہنشاہ عرب کبھی تو پیشوائے دین بن جاتا تھا اور کبھی طعن و ضرب اور جنگ و حرب کے موقع پر ایک تجربہ کار اور بہادر جنرل اور قائدِ اعظم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ پھر صلح کے وقت ایک وزیر کبیر با تدبیر کی مانند شرائط صلح طے کرتا تھا۔ یہ جامعیت کسی اور نبی میں نہیں ہوئی۔ سادگی یہ تھی کہ مسجد یا بوریائے بے ریا پر بیٹھتے تھے، کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے اور اُن کا قول تھا کہ "اَلفقرُ فخرِی"، مگر اسی سادگی میں جاہ و جلال یہ تھا کہ بڑے بڑے سلاطین اولو العزم کے بدن میں، نام سن کر لرزہ پڑ جاتا تھا۔ یہ سب اُس عزم و استقلال کی بدولت تھا، جو آنحضرت کی طینت میں شامل تھا۔

دیانت و امانت و ایفائے وعدہ و ایفائے عہد

یہ اوصاف ایک تاجر کے محاسن اخلاق میں داخل ہیں۔ آنحضرت صلعم کو بعثت سے قبل تجارت میں اچھی دستگاہ حاصل ہو چکی تھی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے نکاح سے پہلے، جناب رسول مقبول عرب میں امین کے معزز لقب سے نزدیک و دور معروف و مشہور تھے۔ یہ شہرت سُن کر حضرت خدیجہ نے، جو ایک مالدار بیوہ اور آپ کی چچیری بہن تھیں، آپ کو اپنا گماشتہ مقرر کیا اور اسباب تجارت سپرد کر کے ملک شام بھیجا۔ یہ خدمت آپ نے نہایت دیانت و امانت سے انجام دی اور نفع کثیر حاصل کیا۔ اسی دیانت و امانت کی بنا پر حضرت خدیجہ نے اپنی طرف سے آپ کو نکاح کا پیغام دیا۔

ایثار و حلم و عفو

آنحضرت صلعم کے دشمنوں میں سے ایک عورت نعوذ باللہ آپ پر اپنے بالاخانے سے کوڑا پھینکا کرتی تھی،

لیکن آپ کچھ نہ کہتے تھے۔ اتفاق سے وہ کچھ دنوں دکھائی نہ دی۔ آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ وہ عورت کہاں ہے، بہت دنوں سے کوڑا نہیں پھینکتی۔ ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضور وہ تو بہت بیمار اور جاں بلب ہے۔ یہ سنتے ہی آپ نے فرمایا کہ چلو وہ ہماری پڑوسی ہے اور اُس کی عیادت کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ کہکر اُس کے گھر مع صحابہ کے رونق افروز ہوئے۔ اُس کی عیادت کر کے اس کے حق میں شافیٔ مطلق کی درگاہ میں صحت کامل اور شفائے عاجل کے لئے دعا مانگی۔ جناب پیمبر صاحب نے کبھی اپنے دشمنوں سے ذاتی طور پر بدلہ نہیں لیا بلکہ ہمیشہ اُن کو معاف کرتے رہے، ہم سب کو اِس اخلاق محمدی سے سبق سیکھنا چاہیے، جس کے بارے میں کسی شاعر[1] نے کہا ہے ؎

دم بھرتے ہیں اغیار بھی اخلاق وہ پایا — دل چھین لیا اس کا جو سر لینے کو آیا
ادنیٰ کو بھی پاس اپنے تواضع سے بٹھایا — جو کھا کے جواہر کے خزانوں کو لٹایا

بندوں پہ جو حضرت کا کرم عام ہوا ہے
اسلام، اسی خلق سے اسلام ہوا ہے

خدام خاص کے ساتھ فیاضانہ سلوک

عبداللہ بن مسعود خادم خاص تھے، جو سفر کی مہمات انجام دیتے تھے اور حضور کے وضو اور مسواک وغیرہ کا انتظام اُن کے سپرد تھا۔ اسی طرح حضرت بلال تمام انتظام خانہ داری کا انصرام کرتے تھے۔ غرضکہ یہ دونوں صاحب سفر و حضر کی خدمات انجام دیتے تھے۔ اِن کے سوا ایک صاحب اور بھی تھے جو کمسن تھے اور اُن کی ماں نے یہ کہکر اُن کو جناب پیمبر صاحب کے سپرد کر دیا تھا کہ اپنی خدمت خاص کا شرف اس کو حضور دیا کریں۔ اِن آخر الذکر خادم سے، بمقتضائے سن کبھی کبھی قصور رہو جاتے تھے مگر حضور پرنور ہمیشہ معاف کر دیتے تھے۔ اپنے کسی خادم خاص سے انھوں نے کبھی قصور پر بازپرس نہیں کی، نہ جبیں بہ جبیں ہو کر بات کی، بلکہ ہمیشہ برادرانہ برتاؤ کیا۔ ایک مرتبہ اپنے کمسن خادم کو حضور نے کہیں جانے کے واسطے حکم دیا۔ انھوں نے جواب دیا "میں نہ جاؤں گا"۔ کچھ دیر کے بعد آنحضرت نے پیچھے سے اُن کے کاندھوں پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیئے اور محبت بھرے لہجے میں فرمایا کہ اب تو جاؤ گے یا نہیں۔ خادم نے دست بستہ عرض کیا کہ "بسر و چشم"۔ دیکھیے حضرات! پیمبر صاحب نے شفقت سے خادم کو کیسا نادم کیا۔ یہ کام ڈانٹ

---

[1] از نسیم امروہوی ۱۲

ڈپٹ سے نہیں نکل سکتا تھا۔

میں ہندو بھائیوں سے معافی چاہ کر عرض کرتا ہوں کہ اُن کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ بہت بُرا ہے اور مسلم بھائیوں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ بہت اچھا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات تو مجھے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ آقا کون ہے اور نوکر کون۔ ہمارے مسلم بھائی نوکروں کے ساتھ بہت مساوات کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ہمارے ہندو بھائیوں کا برتاؤ تنگدلی کا ہے۔ اُن کو اخلاق محمدیؐ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ میں نے خود سبق سیکھا ہے اور نوکروں کے ساتھ بہت ہمدردی کا برتاؤ کرتا ہوں۔

قول و فعل یکساں

جناب رسول مقبول جو ہدایت فرماتے تھے، پہلے اُس پر خود عمل کر کے دکھا دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی ہدایت دل میں اثر کرتی تھی، بلکہ دل و دماغ پر مرتسم و منقش ہو جاتی تھی۔ ہمارے ملک کے بیشتر ہادیان و علمائے دین "خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت" کے مصداق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی ہدایت و نصیحت کا اثر دلوں پر نہیں ہوتا۔ دیکھیے مہاتما گاندھی کو جو آج تمام دنیا میں سب سے بڑے آدمی سمجھے جاتے ہیں، محض عامل ہونے کی وجہ سے اُن کو یہ بزرگی نصیب ہوئی ہے کہ تمام ہندوستان اُن کے اشارہ پر چلتا ہے، جو ہدایت وہ کرتے ہیں پہلے اُس پر عمل کر کے دکھا دیتے ہیں حقیقت میں اگر انسان علم تحصیل کرے اور عمل نہ کرے تو کیا فائدہ ؎

بار درخت علم ندانم مگر عمل　　　با علم اگر عمل نکنی شاخ بے بری

بھائیو! اِس وقت اسی عمل کی بدولت گاندھی جی کو وہ عظمت حاصل ہے کہ لوگ اُن کو حضرت عیسیٰ کا اوتار کہنے لگے ہیں، یا اُن کو کرشنا اوتار سمجھتے ہیں۔

جناب پیمبر صاحب کے راسخ العمل ہونے کا ایک واقعہ آپ کو سناؤں۔ ایک عرب آپ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا۔ اُس کے ساتھ اُس کا بیمار لڑکا بھی تھا۔ اُس نے عرض کیا کہ میرا لڑکا بیمار ہے اور معالج نے اِس کو ہمیشہ کے لیے شیرینی سے پرہیز بتایا ہے، مگر یہ نہیں مانتا۔ مٹھاس نہیں چھوڑتا۔ اگر حضور اپنی زبان فیض ترجمان سے ہدایت فرمائیں گے تو وہ مان لے گا اور تندرست رہے گا۔ آپ نے ذرا تامل کے بعد فرمایا کہ اچھا آج کے چالیسویں دن پھر اِس کو تم میرے پاس لانا۔ عرب واپس گیا اور حسب الحکم چالیسویں دن پھر حاضر خدمت ہوا۔ حضور پرنور نے لڑکے کو اپنے پاس بلا کر نہایت محبت و شفقت سے

اُس کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا مٹھاس سے پرہیز کرو، تم ہمیشہ اچھے رہو گے ورنہ تم کو مٹھاس سے نقصان پہونچے گا۔ آنحضرت نے اور بھی اِسی قسم کی معمولی باتیں کیں جو بزرگ اپنے خوردوں سے کیا کرتے ہیں اور عرب کو رخصت کر دیا۔ چلتے وقت اُس عرب نے بہت ادب سے عرض کیا کہ حضورِ والا! گستاخی معاف، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پہلے روز بھی حضور یہ کلمات فرما سکتے تھے، لیکن چالیس روز کی میعاد قائم کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ حضور نے جو کچھ جواب دیا، وہ سبق لینے کے لائق ہے، فرمایا کہ جب تم اس لڑکے کو لائے تھے اُس وقت میں اس قابل نہ تھا کہ اِس کو نصیحت کرتا، کیونکہ میں خود مٹھاس زیادہ کھاتا تھا، مجھے کھجوریں بہت پسند تھیں۔ میں نے چالیس دن مٹھاس سے پرہیز کیا اور چلّہ کھینچنے کے بعد اب اس قابل ہوں کہ اِس لڑکے کو مٹھاس سے پرہیز کی ہدایت کروں۔ اُس وقت اگر میں یہ نصیحت کرتا تو اس کے دل پر کچھ اثر نہ ہوتا، اب انشاء اللہ تعالےٰ اِس پر اثر ہوگا۔

صاحبانِ والاشان! پیغمبروں میں دو قسم کے انبیاء گذرے ہیں۔ ایک مثل حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کے، جن کو حکومت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ دوسرے مثل حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے، جو ملکوں اور قوموں پر حکومت کرتے تھے، لیکن حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلعم دونوں قسم کے پیغمبروں میں شامل تھے۔ کبھی وہ حضرت عیسےٰ اور یحیےٰ ہوتے تھے، کبھی موسیٰ، داؤد اور سلیمان بن جاتے تھے۔ گو عرب کے خزانے اُن کے دست تصرف میں تھے مگر کاشانۂ نبوت میں کبھی نرم بستر اور خلعت شاہانہ نظر نہ آیا۔ وہی بوریے کا فرش زمین اور لیف خرما کے پیوند کا لباس زیب تن۔ بقول سوانح نگار کے "وہ مکہ کا یتیم گلیم پوش آسمان کا فرشتہ نظر آتا تھا"

ہندو اور مسلم بھائیو۔ میں نے جناب رسول کریم کے وہ اوصاف پسندیدہ اور اخلاق حمیدہ بیان کیے ہیں جو تمام دنیا کے لیے تقلید کے قابل ہیں اور جن سے ہندو مسلم، یہود و نصارا، گبر و آتش پرست ہر قوم و ہر ملت و مذہب کے اشخاص فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب میں ختم کلام کرتا ہوں۔ کیونکہ اہل جلسہ میں سے چند اصحاب آپ صاحبوں کو اپنی تقریر دلپذیر سے محظوظ فرمائیں گے۔

تھیوزافیکل سوسائٹی کی ڈائمنڈ جوبلی

بتاریخ ۱۷ر نومبر ۱۹۳۵ء، تھیوزافیکل سوسائٹی کی شصت سالہ جوبلی (جس کو ڈائمنڈ جوبلی کہتے ہیں) تمام دنیا میں منائی گئی، چنانچہ فرخ آباد میں بھی زیر صدارت مشران صاحب ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں موصوف نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

بھائیو اور بہنو! آج ہم سب ایک جگہ جمع ہو کر تھیوزافیکل سوسائٹی کی ڈائمنڈ جوبلی کی خوشی منا رہے ہیں۔ یہ سوسائٹی ابتداءً بمقام نیو یارک واقع امریکہ میں، ۱۷ر نومبر ۱۸۷۵ء کو بلیوٹسکی اور کرنل آلکٹ کے زیر سرپرستی قائم ہوئی، جس کو آج پورے ساٹھ برس گذر چکے۔ ۱۶ فروری ۱۸۷۹ء کو دو بانیان سوسائٹی کا ورود مسعود بمقام بمبئی ہوا اور صوبہ مدراس میں اس سوسائٹی کا صدر مقام اس وجہ سے قائم کیا گیا کہ مشرقی مذاہب اور مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کے جاننے کے مواقع اس ملک میں آسانی سے مل سکتے ہیں۔

صاحبان والاشان! میں آپ کی خدمت میں اس سوسائٹی کا مقصد بیان کرنے سے پہلے تھیاسفی کی تعریف کروں گا کہ وہ کیا چیز ہے۔ تھیاسفی یونانی زبان کا لفظ ہے۔ تھئیس بمعنی خدا، سوفیہ بمعنی عقل جس سے مراد ہے علم الٰہی۔ تھیاسفی ایک سائنس ہے اور صحیح معنوں میں سائنس ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ انسان کی فطرت اعلیٰ کو سمجھا جائے جس کے ذریعہ انسان، حیوانات مطلق سے بالاتر سمجھا گیا ہے۔

حضرات! میں نے جو کچھ بیان کیا، میرے خیال سے یہ تھیاسفی کا تعارف کرانے کے لیے کافی ہے۔ اب میں تھیوزافیکل سوسائٹی کے مقاصد بیان کرتا ہوں۔ اس سوسائٹی کے تین مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے کہ بنی آدم میں بلا لحاظ قوم، ملک، ذات، رنگ، اور جنس کے محبت برادرانہ قائم ہو۔ دوسرا قوم آریہ اور دیگر اقوام مشرقی کے علوم و فنون و فلسفہ مذہب کی تحقیقات کی جائے، تاکہ دنیا پر ثابت ہو جائے کہ تمام مذاہب ایک ہی اصولی بنیاد رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ قوانین قدرت جن کا راز ہم سے اب تک مخفی ہے، اُن کی تحقیقات کر کے انسان کے قوائے روحانی کو ترقی دی جائے۔

ہماری جماعت سیاسی معاملات سے واسطہ نہیں رکھتی، نہ کسی شخص کے مذہبی خیالات، رواج و مراسم اور اعتقادات سے اُس کو کوئی تعلق ہے۔ ہر شخص کسی ملک و قوم کا ہو، ہماری سوسائٹی میں داخل ہو سکتا ہے

اور اپنے مذہبی رسم ورواج کو بھی قائم رکھ سکتا ہے، یہاں تک کہ اپنے تعصبات مذہبی کو بھی برقرار رکھ سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنے تعصبات کے باعث دوسروں کا دل نہ دکھائے اور رواداری کا سلوک کرے۔

آپ صاحبوں کو اِن مقاصد سے معلوم ہوا ہوگا کہ تین قسم کے اشخاص ہماری سوسائٹی کو پسند کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو بغیر خود غرضی کے یہ چاہتے ہیں کہ انسان انسان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرے اور ایک دوسرے کے خیالات و جذبات کا رواداری کے ساتھ احترام کرے، گویا اس شعر پر عمل کر سکتا ہو ؎

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا ‌‌ ‌ ‌ جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

دوسرے اِس قسم کے آدمی پسند کریں گے، جن کے دلوں میں قدیم مشرقی علوم و مذاہب اور قدیم مشرقی زبانوں کی قدر و منزلت ہے اور وہ آریہ قوموں کے کارنامے جاننا چاہتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ جو قوانین قدرت کے راز معلوم کرنا چاہتے ہیں اور طبیعت انسانی اور موجودات عالم کا علم حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ پس اب آپ دیکھیں کہ ہماری سوسائٹی کے مقاصد کس قدر وسیع ہیں کہ تمام دنیا، تمام اقوام اور تمام ممالک کے آدمی اُس میں شامل ہو سکتے ہیں اور شامل ہیں۔ ہماری سوسائٹی کوئی خاص محدود جماعت نہیں ہے، بلکہ ایک بین الاقوامی جماعت ہے، جس کو انگریزی میں انٹرنیشنل کہتے ہیں۔

صاحبان والا شان! یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری سوسائٹی میں جو کوئی شریک ہو۔ وہ اُس کے تینوں مقاصد پر عمل کرے، بلکہ پہلے مقصد پر عمل کرنا کافی ہے یعنی نوع انسان کے ساتھ بلالحاظ قوم و ملک وملت وغیرہ کے محبت برادرانہ قائم کرنا۔ باقی مقاصد سے اگر اُس کو ہمدردی نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ سوسائٹی بین الاقوامی جماعت ہے، یہی وجہ ہے کہ اِس وقت ۴۸ ملکوں کے باشندے اِس سوسائٹی کے ممبر ہیں، جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اُن میں ہر ایک پڑھا لکھا ہے اور بڑے بڑے عالم و فاضل اُس میں شامل ہیں۔ کوئی براعظم ایسا نہیں ہے جس کے ہر ملک میں ہماری سوسائٹی کی شاخیں نہ ہوں۔ گویا یہ ایک عالمگیر جماعت ہے، جس کا ادنیٰ مظاہرہ اس ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر اس طرح ہوا کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے آخر تک، مقامات ذیل سے مبارکباد کے پیامات آچکے ہیں۔ آسٹریا، آسٹریلیا، آئرلینڈ، نیدرلینڈ، رومانیہ، سوئیزرلینڈ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ ان پیامات کے علاوہ ماہ نومبر رواں میں جو پیغامات دنیا کے باقی حصوں سے آئے ہوں گے اُن کا حال آئندہ معلوم ہوگا اور اخبار تھیاسوفسٹ میں چھپ جائیں گے۔ سوسائٹی کی اس عالمگیریت کو دیکھکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری جماعت

مثل ایک خمیر کے ہے جو سنوں آٹے میں ملا دیا گیا ہے، ہنوز چند تہیں اس آٹے کی متاثر ہوئی ہیں لیکن وہ وقت قریب آتا ہے کہ تمام آٹا خمیر میں گھل مل کر خمیر ہو جائے گا۔

آج کل طالب علم مادیات پڑھ کر ہندوؤں کے بعض مراسم کو جو ہمارے رشیوں اور منیوں کے قائم کیے ہوئے ہیں، توہمات میں داخل سمجھتے ہیں۔ تھیوزافیکل سوسائٹی نے ان رسموں کی بنیاد از روئے مذہب و فلسفہ صحیح ثابت کی ہے اور اُن کا صحیح مقصد اور پوشیدہ راز بتایا ہے، یعنی اُن کی علمی بنیاد ظاہر کی ہے۔ مثلاً مردہ کی لاش جہاں رکھی جاتی ہے وہاں دس روز تک دن رات چراغ جلایا جاتا ہے، اِس سے فائدہ یہ ہے کہ مردہ کی روح سوکشم شریر یعنی جسم لطیف میں وہاں اس غرض سے آیا کرتی ہے کہ جو خواہشات اُس کی زندگی میں پوری ہونا باقی رہ گئی تھیں ان کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ روشنی کے باعث وہ وہاں نہ آئے گی اور نہ آنے سے غرض یہ نکلتی ہے کہ جب اُس کو خواہشات پوری کرنے کا موقع نہ ملے گا تو وہ جلد مایوس ہو کر یہ کوشش چھوڑ دے گی اور یہ خواہشات جب مر جائیں گی تو وہ روح سرگ لوک (وادی السلام) میں جائے گی ورنہ اِس مرت لوک (وادی برہوت) میں بھٹکتی رہے گی۔ پس چراغ جلانے کی رسم ایک نتیجہ خیز رسم ہے، جس کو اعتراض کی نظر سے دیکھنا نہیں چاہیے۔ دوسری رسم یہ ہے کہ مرتے وقت بیمار کو چارپائی سے نیچے اتار کر زمین پر لٹا دیتے ہیں۔ اِس سے فائدہ یہ ہے کہ زمین اپنی قوت جاذبہ سے حرارت غریزی کو جلد کھینچ لے اور بلا تکلیف دم نکل جائے، ورنہ بعض وقت جانکنی کی تکلیف زیادہ دیر تک اور بہت سخت رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پر سونا بُرا کہا جاتا ہے، کیونکہ حرارت غریزی کچھ نہ کچھ کم ہو جاتی ہے۔ اگر مرگ چھالا یعنی ہرن کی کھال بچھا لی جائے، پھر زمین کی قوت جاذبہ کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پُرانے رشی مُنی مرگ چھالا بچھا کر شبانہ روز اُس پر بیٹھتے تھے اور عبادت الٰہی کرتے تھے۔ ایک رسم یہ ہے کہ جب بیمار کی حالت آخر ہو جاتی ہے اور کوئی امید زیست باقی نہیں رہتی تو تیماردار اُس کو ہر چیز کھلانا پلانا اختیار کرتے ہیں اور کوئی پرہیز غذا وغیرہ کا نہیں رہتا۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ ہر خواہش مرنے والے کی پوری کر دی جائے۔ جس چیز کی طرف اُس کی خواہش ہو وہ چیز مہیا کی جائے تاکہ مرنے کے بعد اُس کی روح اُن چیزوں کے لیے بھٹکتی نہ رہے اور جلد سرگ لوک میں پہونچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بوڑھے ہو کر مرتے ہیں ان کا تابوت بنا کر بہت دھوم دھام سے اُن کی لاش کو لے جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ عمر پا کر یہ شخص مرا اور دنیا کی

خواہشات اِس میں باقی نہیں ہیں، یہ جلد سرگ لوک کو جائے گا اور اُس کی روح خواہشات پوری کرنے کے لیے دنیا میں بہت کم بھٹکے گی۔ ہماری سوسائٹی کے ایک بہت بڑے عالم فاضل لیڈر صاحب نے حسب ذیل چشم دید واقعات تحریر فرمائے ہیں۔

۱۔ ایک شخص قریب الموت تھا اور اپنے ایک دوست سے آخری وقت ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔ تیمارداروں نے اس کو خبر کی، لیکن اُس نے کچھ زیادہ پرواہ نہ کی۔ آخر میں بیمار کی روح اُس کی ملاقات کے لیے اُس دوست کے مکان پر گئی جو شاید کئی میل کے فاصلہ پر تھا اور اُس کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر وہ روح جسم لطیف میں دکھائی دی اور اُس نے کہا کہ تم جلد چلو، لوگ مجھے زندہ جلا دیں گے اور یہ کہہ کر فوراً وہ روح غائب ہوگئی۔ یہاں اُس کی لاش کو لے چلنے کا سب سامان کیا گیا۔ جب تھوڑا راستہ طے ہوا تھا تو وہ دوست مل گیا۔ اُس نے واقعہ بتا کر کہا کہ لاش اتارو، یہ شخص زندہ ہے۔ چنانچہ کفن وغیرہ سب ہٹایا گیا اور اُس کے جسم کو گرمی پہونچائی گئی تو وہ شخص زندہ ہوگیا اور اچھا ہوکر چند سال زندہ رہا۔

۲۔ ایک پادری صاحب رومن کیتھولک تھے۔ ایک روز اُن کے پاس ایک عیسائی عورت آئی اور اُس نے اپنے گناہوں کا اقرار اُن کے سامنے حسب قاعدہ کیا، جو انھوں نے لکھ لیا اور لکھنے کے بعد ایک کتاب میں وہ پرچہ رکھ کر اپنے مکان کے تہ خانے میں ایک طاق پر رکھ دیا اور شکار کو چلے گئے۔ سُوء اتفاق سے شکار میں وہ کسی صدمہ سے ہلاک ہوگئے۔ اُن کی روح اُس تہ خانے میں اکثر یہ دیکھنے آیا کرتی تھی کہ کسی نے وہ کاغذ نکال تو نہیں لیا ہے۔ آخر کار وہ مکان بک گیا اور جس نے خریدا اُس نے پادری صاحب کو بارہا اُس مکان میں آتے جاتے دیکھا۔ ایک دفعہ اُس نئے مالک مکان نے احباب کی دعوت کی۔ ایک دوست نے دیکھا کہ وہی پادری صاحب ایک کمرہ میں کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے میزبان کو خبر کی۔ اُس نے کہا کہ یہ پادری صاحب مدت سے میرے مکان میں آمد و رفت رکھتے ہیں، لیکن کچھ بات نہیں کرتے اور بات کرو تو غائب ہوجاتے ہیں۔ اُس دوست نے صاحب خانہ سے اجازت لیکر پادری صاحب سے پوچھا کہ آپ کی غرض یہاں آنے سے کیا ہے؟ اگر آپ بتائیں تو میں آپ کی مطلب برآری کروں۔ انھوں نے سب حالات ابتدا سے آخر تک بیان کر کے کہا کہ میں اسی غرض سے آیا کرتا ہوں کہ مبادا کسی نے وہ پرچہ نکالا ہو اور اس غریب کا راز افشا ہوگیا ہو۔ اُس مہمان نے پادری صاحب سے کہا

کہ آپ چل کر بتایئے کہ کس جگہ وہ طاق ہے۔ پادری صاحب نے تہہ خانہ کے اندر ساتھ جا کر وہ جگہ بتائی۔ اتفاق سے وہ طاق اینٹوں سے چنوا دیا گیا تھا اور اُس پر پلاسٹر کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ معمار کو بلوا کر پادری صاحب کے کہنے کے مطابق اُس جگہ کو کھودا گیا تو وہ طاق نکلا اور وہ کتاب اور پرچہ بدستور رکھا ہوا ملا۔ پادری صاحب کے کہنے کے مطابق وہ پرچہ جلا دیا گیا۔ اُس دن سے وہ پھر کبھی وہاں نہیں دکھائی دیے۔ زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ پادری صاحب کی آمد و رفت وہاں ساٹھ برس سے جاری تھی۔ اسی قسم کے چند واقعات اور بھی لکھے ہوئے ہیں جن کو میں طوالت کے خیال سے عرض کرنا نہیں چاہتا۔

صاحبان والا شان! جب سے میڈم بلیوٹسکی صاحبہ نے تھیاسفی کے راز اور اُس کے سچے مسلمات ۱۸۷۵ء میں ظاہر کیے، اُس وقت سے آج تک ساٹھ برس کے عرصہ میں تمام دنیا میں عجیب و غریب تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔

ساٹھ برس پہلے ــــ محبت برادرانہ بہت محدود حالت میں تھی یعنی خاندان، رنگ، ذات، جماعت یا زیادہ سے زیادہ ایک قوم میں محدود تھی اور جو لوگ اس سے اختلاف رائے رکھتے تھے وہ نیم وحشی خیال کیے جاتے تھے۔ خصوصاً کالے رنگ کی قومیں بہت کم درجہ کی سمجھی جاتی تھیں، خواہ کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی تہذیب و شائستگی اُن میں کیوں نہ ہو، مگر آج کل نسل و قوم کا تعصب جہالت کی علامت خیال کیا جاتا ہے اور جماعتوں کے اعتقادات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مذاہب متفق و متحد ہیں۔

ساٹھ برس پہلے ــــ انگلستان کی نوآبادیاں یعنی مقبوضات ماوراء البحر جدا جدا تھے۔ اب وہی نوآبادیاں متفق و متحد ہو کر ایک سلطنت عظیمہ بن گئی ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ اسی طرح تمام دنیا کی مختلف قومیں باہم مل جل کر بنی آدم کی ایک لامحدود جماعت بن جائیگی۔

ساٹھ برس پہلے ــــ علم کی تحصیل سے فقط یہ غرض تھی کہ واقفیت اور آگاہی حاصل ہو۔ طالب علم گویا سفید کورا کاغذ تھا، جس پر اُس کا استاد یا ولی، لکھ دیتا تھا کہ ہم تمہارے واسطے فلاں پیشہ یا کام تجویز کرتے ہیں۔ آج معلموں کا کام یہ ہے کہ شاگرد میں جو لیاقت و صلاحیت پوشیدہ ہے اُس کا پردہ اُٹھا دیں اور تعلیم سے فراغت کے بعد، خود شاگرد وہ پیشہ یا کام اختیار کرے جس کی صلاحیت اپنے دل و دماغ میں پائے۔

ساٹھ برس پہلے ــــ یہ بات اعتراض کے قابل نہیں تھی کہ انسان صحیح و تندرست رہنے کے لیے

جانوروں کا گوشت کھائے، کیونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اُس کی خوراک کے واسطے مخصوص ہیں، مگر آج بہت لوگوں نے رحم و کرم کی بنا پر اور صحت و قوت کی خاطر گوشت سے پرہیز اختیار کیا ہے اور تازہ ہوا، سورج کی روشنی، اور فطری غذاؤں سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

ساٹھ برس پہلے ـــ علم طبعیات اور مذہب، آپس میں دشمن سمجھے جاتے تھے۔ عالم طبعیات مذاہب کو جہالت کی علامت سمجھتا تھا اور پادریوں کی یہ حالت تھی کہ ان کا فروں کو مردود خیال کرتے تھے جن کا قول تھا کہ دنیا کی آفرینش کو صرف چار ہزار برس گذرے ہیں اور سوموار کی صبح سے سنیچر کی شام تک ایک ہفتہ کے اندر دنیا پیدا ہوئی ہے۔ آج ہمارے علماء کا قول ہے کہ پادریوں کی رائے علم طبعیات میں اسی قدر بے وقعت ہے، جس قدر ان علماء کی رائے مذاہب کے بارے میں ـــ

ساٹھ برس پہلے ـــ بہت لوگ اپنے مذہب کو خفیہ رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ معمولی طریقۂ خیال، خدا کی خدائی سمجھنے کے واسطے ہرگز استعمال نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ رسولوں اور نبیوں کی تعلیم سے خدا کی معرفت حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ عقیدہ نہ تھا کہ انسان خدا کو ذاتی تجربات سے بھی جان سکتا ہے۔ انبیا اور مُرتاضوں کا زمانہ گذر چکا تھا اور لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جو کام اگلے انسان کر گئے وہ اب نہیں ہو سکتے۔ آج تھیاسفی کے رواج سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ انسان فلسفی بھی بن سکتا ہے اور ساتھ ہی دیگر علوم و فنون اور فلسفۂ مذہب میں بھی اتنی حد پر پہونچ سکتا ہے، جس کے لیے اُس میں فطرۃً صلاحیت موجود ہے یہاں تک کہ مجاہدہ اور ریاضت سے اپنے آپ میں خدائی کا جلوہ دیکھ سکتا ہے ـــ

دوستو! میں تھیاسفی کی اہمیت، جامعیت اور نافعیت جس قدر بیان کروں، کم ہے۔ یہ تمام مذاہب کے سچے اعتقادیات ظاہر کرتی ہے اور مادیات کے عالم کو بتاتی ہے کہ بعض مسائل تب حل ہوں گے جب اُن کے روحانی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔ نوع انسان کے لیے تھیاسفی کی سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ جن مسائل کو ہم توہمات یا پرانے اعتقادیات کہتے ہیں، اُن کی صحت و سچائی ثابت کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ یہ سب بے حقیقت چیزیں نہیں ہیں، فطرت انسانی کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جو ابھی تک سمجھ میں نہیں آئے ہیں اور انسان کے خواب و خیال میں بھی اُن کے حل کرنے کا تصور نہیں گزرا۔ سچا تھیاسفسٹ دنیا کا سٹیزن ہے اور اُس کا مقصد آخری یہ ہے کہ بنی آدم کے بین الاقوامی مسائل کی ایک اصلی بنیاد قائم کرے۔ تھیاسفی کا جوہر یہ ہے کہ انسان جس میں خود الوہیت کا پرتو ہے، قدرت الٰہی کے

جاننے کا مادّہ رکھتا ہے اور اسی سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ بنی آدم میں باہم محبت کا برتاؤ ہونا چاہیے۔ تھیاسفی اعلیٰ درجہ کی عقل انسانی ہے، جو انسان کو بتاتی ہے کہ اُس کا وجود کیا ہے اور وہ کس مقصد سے دنیا میں پیدا کیا گیا ہے یا بھیجا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تھیاسفی ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جو ارتقا کے مسئلہ پر مبنی ہے اور فوق العادت باتوں سے دور ہے اور اُس میں بے انصافی، تعصب اور رعایت بیجا کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ گویا ڈارون یا اسپنسر کا مسئلہ ارتقا ہے جو قدرت کے دونوں پہلو، ظاہر و پوشیدہ، اور انسان کے نظام بدنی اور نظام روحانی دونوں کی ترقی تدریج ظاہر کرتا ہے۔ تھیاسفی یہ سکھاتی ہے کہ ایسا قانون اخلاقی موجود ہے جو، ہر اچھی بات، اچھے خیال اور اچھے کام کے لیے اچھا پھل اور ہر برے کام کے لیے برا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ اتفاق یا سوء اتفاق یا رعایت بیجا یا جادو کا دخل اُس میں نہیں ہے۔

صاحبان والا شان! تھیوزافیکل سوسائٹی کی شاخیں سیکڑوں تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ابر سفید کے اُن ٹکڑوں کی مانند ہیں جو بعض وقت آسمان مرئی پر چاروں طرف دکھائی دیتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ ابر سفید کے ٹکڑے تابش آفتاب سے معدوم نہ ہوں گے بلکہ بخارات ارضی سے وہ روز بروز بھاری ہوتے جائیں گے اور جہاں کہیں آسمان خالی ہوگا وہاں نئے ابر کے سفید ٹکڑے اور پیدا ہو جائیں گے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ابر سفید ابر سیاہ میں تبدیل ہو جائے گا اور گھنگھور گھٹا تمام آسمان پر چھا جائے گی اور پھر تمام روئے زمین پر ایک دم سے باران رحمت نازل ہونے لگے گا۔

آموں کی نمائش

بتاریخ ۴ر جولائی سنہ ۳۳ء ٹاؤن ہال فرخ آباد میں آموں کی نمائش ہوئی اور کلکٹر ضلع کے زیر صدارت جلسہ عام منعقد ہوا، جس میں عمائدین شہر کے علاوہ فتحگڑھ کے حضرات بھی شریک تھے۔ نمائش کمیٹی کی درخواست پر مشران صاحب نے اس جلسہ میں حسب ذیل تقریر فرمائی :-

میر مجلس اور حضرات انجمن۔ آج یہ پہلا موقع تاریخ فرخ آباد میں ہے کہ آموں کی نمائش کی جا رہی ہے۔ آم کے موضوع پر تقریر کرنا خاص و عام کا کام نہیں۔ یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو شیریں زبان ہیں مگر بعض احباب کے امتثال امر کے لئے جو کچھ میں جانتا ہوں، مختصراً عرض کروں گا امید ہے کہ اس پھل کے ذکر سے آپ کی ضیافت طبع کرسکوں۔

واضح ہو کہ اس ضلع میں دو سو چھیالیس قسم کے آم ہوتے ہیں، جن میں سے بہت زیادہ میٹھے، عام پسند چھ سات قسم کے ہیں۔ بمبئی، ٹکاری، نودھا، گوپال بھوگ، چون، دسہری، برے کی آمن۔ صرف ٹکاری ایسا ہے جو بنارس میں بھی ہوتا ہے اور وہاں وہ لنگڑا کہلاتا ہے۔ چونسا ابھی حال میں ہردوئی کے ضلع سے لایا گیا ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ کا آم ہے۔ جس طرح شام کا سیب، حلب کا انگور، دمشق کا شفتالو، مصر کا لیموں، سلطان کا ترنج مشہور ہیں، اسی طرح ہندوستان کا آم بھی معروف و مخصوص ہے۔ پھر ہندوستان کے مختلف مقامات کے آم اپنی اپنی جگہ زیادہ مقبول ہیں۔ مثلاً بمبئی کا آلفونزہ، لکھنؤ کا دسہری، ملیح آباد کا سفیدہ، میرٹھ کا فجری، بنارس کا لنگڑا، امروہہ کا ثمر بہشت اور لطیف علی والا، ہردوئی کا چونسا، فرخ آباد کا نودھا۔

فرخ آباد کے تین آم تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر سناتا ہوں۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے یہاں محمد خاں بنگش ایک معزز عہدہ فوجی پر ممتاز تھے۔ یہ وہی نواب محمد خاں ہیں جو بانی فرخ آباد تھے۔ بادشاہ ایک دن شکار کے قصد سے باہر نکلے اور ہاتھی پر سوار تھے۔ محمد خاں خواصی میں بیٹھے تھے۔ بادشاہ نے ایک آم کھایا جو وزن میں آدھ سیر تھا۔ گٹھلی محمد خاں کو دی کہ اپنے وطن بھیج دو۔ محمد خاں نے وہ گٹھلی ازراہ تعظیم رومال میں رکھ لی اور اپنے بیٹے نواب قائم خاں کو فرخ آباد بھیج دی۔ قائم خاں نے حیات باغ میں، جہاں بالآخر نواب محمد خاں کا مقبرہ بنا، وہ گٹھلی بودی۔ جب درخت تیار ہوا اور بور آنے لگا، اس وقت پیادوں کی ایک کمپنی اس درخت کی حفاظت کے لئے تعینات ہوئی۔ جب پھل لگنے کا وقت آیا تو تیس سیر دودھ اس کی جڑوں کو روزانہ پلایا گیا۔ نواب مظفر جنگ نے قلم کے ذریعہ

چاہا کہ درختوں کی افزائش ہو مگر صرف ایک پیڑ بچا۔ اس کا نام گولا رکھا گیا۔ نواب شوکت جنگ کے وقت میں حکیم مہدی علی خاں چکلہ دار محمدی واقع اودھ، فتحگڑھ میں مقیم ہوئے۔ حکیم صاحب کو وہ آم نواب نے بھیجے۔ انھوں نے کھا کر فرمایا کہ میں نے ایسا میٹھا اور لذیذ آم تمام عمر نہیں کھایا اور اس کی قلمیں طلب کیں۔ نواب نے اجازت دیدی۔ قلمیں دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ درخت کمزور پڑ گیا اور ایک سال کے اندر سوکھ گیا اور مارا گیا۔

نودھا آم فرخ آباد میں دکن سے آیا۔ عنایت خاں ایک شخص فرخ آباد کے متوطن دکن کی کسی ریاست میں سواروں میں نوکر تھے۔ جب وہ رضا (چھٹی) پر وطن آئے تو اس وقت ایک بڑی قسم کا آم وہاں سے اپنے ساتھ لیتے آئے۔ یہاں عزیزوں اور دوستوں کو نذر دیے۔ سب نے بہت تعریف کی اور کہا کہ اس کی قلم لاکر فرخ آباد میں لگانا چاہیے۔ جب عنایت خاں نوکری پر واپس آگئے۔ وہاں انھوں نے اس کی قلمیں تیار کرائیں اور جب وطن واپس آئے تو بہت سی قلمیں ہمراہ لائے اور یہاں اپنے دوستوں کے باغوں میں نصب کرا دیں۔ اس آم کا نام نودھار رکھا گیا اور عنایت خاں کے نام سے منسوب ہوا۔ چنانچہ یہ آم فرخ آباد میں نودھا عنایت خاں کہلاتا ہے۔

تیسرے آم کا حال یہ ہے کہ ایک درخت کا آم بہت بڑا ہوتا تھا۔ وزن میں قریب سیر بلکہ سوا سیر تک دیکھا گیا۔ آموں کی فصل تھی۔ اتفاق سے گدھے اس درخت کے نیچے پھر رہے تھے کہ ایک آم ٹپکا اور گدھے پر گرا اور کسی ایسی جگہ لگا کہ ہلاکت کا باعث ہوا۔ اس وقت سے وہ گدھا مار آم مشہور ہو گیا۔ گولا اور نودھا تو یہاں بہت مشہور ہیں مگر تیسری قسم کا حال معلوم نہیں کہ اب ہے یا نہیں۔

صاحبان عالی شان! پھلوں میں صرف آم ہی ایسا ہے جو کھانے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ باقی جتنے پھل ادنےٰ اور اعلےٰ ہیں سب مابین طعامین کھائے جاتے ہیں، غذاؤں کے بدرقے ہوا کرتے ہیں جن سے وہ جلد ہضم ہوتی ہیں یا ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پھلوں کے بھی بدرقے ہوتے ہیں مثلاً جس طرح چاول کے بعد ناریل اور گوشت کے بعد انجیر کھانا اور خربوزے پر شربت پینا مفید اور مصلح ہے اسی طرح آم پر جامن کھانے سے اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آم پر دودھ مفید ہے۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ دودھ بادجود یکہ اصلاح کرتا ہے لیکن بلغم بڑھاتا ہے۔ آپ کے شہر میں ایک طبیب حاذق سید اکبر حسین نام مرحوم بہت نامور حکیم تھے۔ وہ ہمیشہ آم پر جامن کھایا کرتے تھے۔

حضرات! آم صرف شیریں اور لذیذ میوہ ہی نہیں ہے، بلکہ بہت کارآمد بھی ہے۔ جب وہ کچا ہے تو چٹنی

اچار، مربے کا کام ایسا دیتا ہے کہ کوئی دوسرا پھل نہیں دے سکتا۔ سرکہ، عرق نعناع اور تیل، تینوں میں اس کی چٹنی اور اچار پڑتے ہیں اور کئی کئی طرح سے۔ کھٹائی جس کا دوسرا نام امچور ہے اس ملک میں ایک تجارتی چیز ہے، جو کچے آموں کو سکھا کر بنائی جاتی ہے اور نہایت عمدہ ترشی کی چیز ہے جو روزمرہ غریب و امیر کے باورچی خانہ میں خرچ ہوتی ہے کسی دوسری چیز کی کھٹائی اس کے مقابل کچھ بھی بکار آمد نہیں۔ بہت سے لوگ غریب آدمی آم کی گٹھلی بھون کر کھایا کرتے ہیں جو غذا کا کام دیتی ہے۔ پکے ہوئے آموں کا رس جمع کر کے سکھایا جاتا ہے اور چکلیتوں کی شکل میں بنا کر رکھ لیا جاتا ہے اور ہر موسم میں کھانے کی چیز ہے۔ اس کا نام امرس ہے۔

ہندوؤں کے یہاں آم کسی قدر پاک چیز سمجھی جاتی ہے۔ تیوہاروں اور تقریبوں پر اس کے پتوں کی بندھنوار یں بنا کر دروازوں پر یا اور نمایاں منظروں پر لٹکائی جاتی ہیں اور آم کا پھل پوجا کے سامان میں بھی شامل ہوتا ہے۔ جب آم کا درخت سوکھ جاتا ہے تو اس کی لکڑی ایندھن کا کام دیتی ہے اور بمقابلہ ڈھاک کے ہر موسم میں اور خصوصاً برسات میں جلانے میں زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ پرانا آم جس کو اوکھٹا آم کہتے ہیں عمارت کے کام بھی آتا ہے۔ غرضکہ آم جب سرسبز ہوتا ہے تب پھل دینے میں انتہا درجہ کا فیاض ہوتا ہے اور سوکھ جانے پہ بھی اعلیٰ درجہ کا بکار آمد ہے۔ شاعر کا یہ مقولہ ؏ گرت ز دست برآید چو نخل باش کریم۔ اس درخت انبہ پہ پورا اطلاق کرتا ہے۔ زمانہ حال میں ڈاکٹروں نے تحقیق کیا ہے کہ اس کی چھال کئی طرح پہ دوا کا کام دیتی ہے۔ سو سال گذشتہ سے امریکہ کے گرم خطوں میں آم کی کاشت کی گئی ہے جہاں کی زمین اس کے موافق سمجھی گئی ہے۔

صاحبان والا شان! میں نے آپ کی خدمت مبارک میں ہندوستان کے آم کے بارے میں عموماً اور فرخ آباد کے آم کے خصوصاً حالات عرض کیے چونکہ اس وقت آموں کی نمایش ہے اس لئے مجھے نمایش کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ واضح ہو کہ نمایش کے ذریعہ تمام دنیا میں تمدن انسانی کو حیرت انگیز اور گوناگوں ترقیاں میسر آئی ہیں اور علوم و فنون اعلیٰ مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں۔

نمایش کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قومی دوسری بین الاقوامی۔ اگر بالفرض ہندوستان کے مصنوعات کی نمایش کی جائے اور غیر ممالک کی ساخت کی چیزیں اس میں داخل نہ کی جائیں تو وہ نمایش قومی ہوگی اور اگر ساتھ ساتھ غیر ممالک کے مصنوعات کو بھی شامل کیا جائے تو وہ نمائش بین الاقوامی ہو جائے گی۔ آج کل دونوں قسم کی نمائشیں کی جاتی ہیں، لیکن اعلیٰ درجہ کے مہذب ممالک مثلاً برطانیہ، فرانس، جرمن وغیرہ میں زیادہ تر بین الاقوامی نمائشیں ہوا کرتی ہیں۔ قومی نمایش کا ایک نمونہ ہماری یہ نمایش بھی ہے، جس میں فرخ آباد کے ضلع کے آم جمع

کیے گئے ہیں۔

نمایش میں کاریگروں کو انعامات، تمغے اور سارٹیفکٹ دیے جاتے ہیں جس سے ان کی بہت ہمت افزائی ہوتی ہے اور اکثر ان کی بنائی ہوئی چیزیں قدرافزائی کے طور پر زیادہ قیمت میں لوگ خرید لیتے ہیں۔ جس سے ان کا حوصلہ بہت بڑھتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایجاد و اختراع کرتے رہتے ہیں اور صنعت کو ترقی ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں یہ حال ہے کہ آج جو چیز ایجاد ہوئی وہ دوسرے سال استعمال سے خارج کرنے کے قابل سمجھی جاتی ہے کیونکہ وہی چیز ترقی یافتہ شکل میں اور نیز بہت زیادہ بکارآمد صورت میں دوسرے صناعوں کے ذریعہ عالم وجود میں آجاتی ہے۔ ہزاروں ایجاد و اختراع کے لئے صناعوں کو پیٹنٹ دیے جاتے ہیں اور ایک شئے خاص کا موجد، جس نے پیٹنٹ حاصل کیا ہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس کو روپیہ کمانے کا پورا پورا موقع حاصل ہوتا ہے۔ امریکہ کا ایک نہایت معروف و مشہور صناع تمام دنیا میں بے نظیر گذرا ہے۔ اس کا نام مسٹر اڈیسن تھا مختلف ایجاد و اختراع کر کے اس نے اپنے مصنوعات کے واسطے ایک ہزار پیٹنٹ حاصل کیے تھے۔ حال میں اس نے قضا کی۔ اسی طرح ممالک یورپ و امریکہ کے ہزاروں اشخاص صنعت و حرفت میں نہایت نامبرآوردہ گذرے ہیں جنھوں نے انسانی تمدن کے تن پر ایجاد و اختراع کے گراں قیمت حاشیے چڑھا کر اس کو بہت بلند پایہ کر دیا ہے اور علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کر کے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

سنہ ۱۷۶۱ء میں انگلستان میں پہلی نمایش زیادہ تر آلات کشاورزی کی عالم وجود میں آئی اور کاریگروں کو انعامات تقسیم ہوئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۷۹۸ء میں فرانس میں نیپولین کے حکم سے نمائشوں کا سلسلہ قائم ہوا، جس کو قومی نمایش کہنا چاہیے۔ اس وقت سے سنہ ۱۸۴۹ء تک گیارہ نمائشیں فرانس میں ہوئیں جو سب قومی تھیں سنہ ۱۷۹۸ء میں ایک سو دس کاریگروں کے مصنوعات داخل ہوئے تھے اور سنہ ۱۸۴۹ء میں ۴۴۹۴ کی تعداد تھی۔ سنہ ۱۷۹۸ء میں فرانس نے ایک سونے کا تمغہ ایسے کاریگر کے لئے تجویز کیا جو اپنی ایجاد سے انگلستان کی صنعت و تجارت کو سخت صدمہ پہونچائے۔ سنہ ۱۸۴۹ء تک وہ قومی نمایشوں کا اس قدر دلدادہ تھا کہ جب یہ تجویز پیش ہوئی کہ غیر ممالک کے مصنوعات بھی داخل نمایش کیے جائیں تو وہاں کے وزیر صیغہ تجارت نے خیال کیا کہ فرانس کے دشمنوں نے یہ تجویز پیش کرائی ہے۔ سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں نمایش عالم وجود میں نہ آئی ہو ملک امریکہ میں دو نمائشیں نیویارک و واشنگٹن میں سنہ ۱۸۲۸ء اور سنہ ۱۸۴۴ء میں کی گئیں اور نہایت کامیاب رہیں سنہ ۱۸۵۱ء

میں بین الاقوامی نمایش لندن میں بہت بڑے پیمانہ پر ہوئی۔ ہائڈ پارک میں نمایش کی اشیاء کے واسطے سر جوزف پیکسٹن نے ایک شیشی محل تیار کیا تھا اور ایک قطعہ زمین علیحدہ دس لاکھ مربع فٹ کا مخصوص کیا گیا تھا نمائش کا افتتاح ملکۂ معظمہ وکٹوریہ نے کیا تھا۔ جو مصنوعات داخل نمایش ہوئے ان کی قیمت کا اندازہ دو کروڑ سترسٹھ لاکھ اٹھائیس ہزار نو سو چھتیس پونڈ تھا۔ (اس میں کوہ نور ہیرے کی قیمت شامل نہیں ہے لیکن منافع بہت زیادہ ہوا جو قریب قریب بتیس لاکھ کے تھا۔

اس کے بعد فرانس میں بین الاقوامی نمایش ۱۸۵۵ء میں ہوئی جس کا افتتاح شہنشاہ فرانس نے کیا اور بارہ ہزار کاریگروں کو تمغے دیے گئے۔ اس نمایش میں خاص بات یہ تھی کہ جس قدر اشیاء داخل نمائش ہوئیں وہ ان صناعوں کی تھیں، جو زندہ تھے بہ ۱۸۷۶ء میں پانچ برس کی تیاری کے بعد فیلاڈلفیا واقع امریکہ میں بہت بڑے پیمانہ پر نمایش ہوئی، جبکہ امریکن آزادی (یعنی سوراج) کی سو برس کی سالگرہ منائی گئی اس میں ساٹھ ہزار کاریگروں کو تمغے اور انعامات انواع واقسام کے عطا ہوئے تھے اور دنیا کی ۳۷ اقوام نے شرکت کی سنہ ۱۹۰۰ء میں فرانس میں نہایت بڑے پیمانہ پر بین الاقوامی نمایش ہوئی۔ اس کو چار کروڑ آدمیوں نے دیکھا۔ اس موقع پر فرانس اس قدر انتظام میں منہمک تھا کہ اس نے چند ملکی اور قومی مہمات کو ملتوی کر دیا تھا کہ مبادا نمائشں کو نقصان پہونچے۔

ہندوستان میں وقتاً فوقتاً نمائشیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہیوٹ صاحب گورنر کے وقت میں بمقام الہ آباد جو نمائش ہوئی تھی وہ نہایت کامیاب رہی۔ نمایش کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حاکم وقت کسی صنعت وحرفت کی ترقی واشاعت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو نمایش کے ذریعہ سے فروغ روزافزوں اور ترقی گوناگوں حاصل ہوتی ہے ورنہ ترقی کی رفتار نہایت سست ہو جاتی ہے ؎

ہنر ہر کجا یافت شہرت تمام بدولت خدائی برآورد نام

آخر میں میں آپ سب اہل کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ صاحبوں نے ازراہ قدردانی ومہربانی اس موقع پر مجھے یاد فرمایا۔

مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ باہتمام سید توسل حسین